سماجی نشیب و فراز اور طبقاتی کشمکش سے بھرپور ناول

# ٹوٹے تارے

انور احسن صدیقی

# کہانی کے زخم

یہ کہانی ان ہزارہا کہانیوں میں سے ایک ہے جو ہمارے ملک کے گوشے گوشے میں اور بالخصوص دیہی معاشرے میں جابجا بکھری پڑی ہیں اور جن تک پہنچنے کے لئے اور انہیں اپنے خیال و فکر کی گرفت میں لے کر' معروضی حقائق کی روشنی میں ان میں ایمائیت کا رنگ بھر کر انہیں منظر عام پر لانے کے لئے اور لاکھوں قارئین تک پہنچانے کے لئے ایک دلِ درد مند کے ساتھ ساتھ ایک ایسے سماجی رویے کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو سچائی سے اپنا رشتہ کبھی ایک لمحے کے لئے بھی منقطع نہ کرتا ہو اور زندگی کے خونچکاں عمل کی لحظہ بہ لحظہ' مو بہ مو نقش گری کو فن کی اساس قرار دیتا ہو۔

یہ کہانی ہے ان ٹوٹے ہوئے تاروں کی جو اپنی چمک دمک کا بھرپور مظاہرہ کرنے سے پہلے ہی ٹوٹ کر خلائے بسیط میں بکھر گئے اور ان کی جلی ہوئی راکھ کائنات کی وسعتوں میں منتشر ہو کر ہمیشہ کے لئے معدوم ہو گئی۔ وہ مٹ گئے' لیکن مٹتے مٹتے اپنے پیچھے روشنی کی ایسی لمحاتی لکیریں چھوڑ گئے جو ان کے وجود کی دلالت کرتی تھیں اور اس امر کی گواہی دیتی تھیں کہ ہاں' وہ کبھی تھے' آسمانِ زندگی کی لازوال روشنیوں میں کبھی ان کا بھی کوئی حصہ تھا' جسے وہ قائم اور باقی رکھنا چاہتے تھے لیکن نہ رکھ سکے۔

یہ کہانی ہے ان سیدھے سادے' بے گناہ' بے خطا' بے ضرر انسانوں کی جنہیں زندگی سے محبت تھی' جو امن' سلامتی اور خوشی کے ساتھ جینا چاہتے تھے' جن کو زندہ اور مطمئن رکھنے کے لئے محض چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہی کافی تھیں جن کے حصول کی خاطر وہ بھرپور جدوجہد کرتے رہے اور اپنی راہ کے کانٹوں کو اپنی پلکوں سے چنتے رہے لیکن ان کے لئے زندگی کے خار زار میں کانٹوں میں کمی واقع نہیں ہوئی۔

یہ کہانی ہے حسن' خیر اور مسرت کی جستجو کے لئے انسان کی ازلی اور ابدی جدوجہد کی' اور ان راستوں کے پیچ و خم اور نشیب و فراز کی جن سے اس جدوجہد کے دوران ہو

کر گزرنا پڑتا ہے اور پھر کسی کے حصے میں کیا آتا ہے' اس کا انحصار انسان کی صرف اپنی ہی کوششوں پر نہیں ہوتا۔

یہ کہانی ہے جبری مشقت کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے ان لاکھوں پاکستانی بچوں میں سے چند کی' جن کی زندگی میں کبھی کوئی بچپن ہی نہیں آتا' جو ہوش سنبھالتے ہی بالغ ہو جاتے ہیں اور اپنے ناتواں کندھوں پر بالغوں کی ذمہ داریاں سنبھال لیتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں کوئی کتاب' کوئی کھلونا' کوئی قلم' نہیں آتا' بلکہ ان کی ننھی ننھی نرم و نازک انگلیاں طرح طرح کے اوزاروں اور آلات کے ٹھنڈے اور بے حس مساس سے آلودہ ہو کر دیکھتے ہی دیکھتے پتھر کی طرح سخت ہو جاتی ہیں۔

یہ کہانی ہے زندگی کی نامہربانیوں کے مارے ہوئے ان مجبور والدین کی' جو روٹی کے گھٹتے ہوئے نوالوں کی کمی کو کسی نہ کسی طور پر پورا کرنے کی غرض سے اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو جبری مشقت کی بھٹی میں جھونک دیتے ہیں' جہاں وہ ساری زندگی جلتے رہتے ہیں۔

یہ کہانی ہے اس سماج کی جہاں بچوں کی جبری مشقت کے خلاف اکثر و بیشتر صدائے احتجاج بلند ہوتی رہتی ہے لیکن موجودہ معاشی تناظر میں اس کی حیثیت صدا بہ صحرا سے زیادہ کچھ نہیں۔

انور احسن صدیقی



بہت دور سے آنے والی کسی نامعلوم پرندے کی سریلی آواز نے آمدِ سحر کا اعلان کیا اور اس کے چند لمحوں کے بعد ایک دوسری سمت سے کسی دوسرے نامعلوم پرندے نے اس اعلان کی توثیق کی۔ رات اپنے تمام تر اسرار و رموز کو اپنے سینے کے اندر چھپائے ہوئے رخصت ہو رہی تھی اور اس کی کوکھ سے ایک نیا دن پھوٹ رہا تھا۔ روشنی' امید' آرزو' جدوجہد' لگن اور حرارت سے بھرپور ایک نیا دن' لیکن زمین کے لئے نوید سحر کے اس مسرت آگیں اعلان میں کوئی کشش نہیں تھی۔ پرندے کی آواز کے ساتھ ہی حسبِ معمول' روز کی طرح آج بھی اس کی آنکھ کھل گئی تھی اور آنکھ کھلنے کے ساتھ ہی وہ ان تمام دشواریوں' کلفتوں' مشقتوں' محرومیوں اور ذلتوں کے بارے میں سوچنے لگی تھی جن کا روز کی طرح آج بھی اس کو سامنا کرنا تھا۔ اسے نہ تو پرندے کی آواز اچھی لگی جو وداع شب کی خبر دے رہی تھی نہ ایک نئے دن کا طلوع ہونا۔ ابھی کچھ دیر اور رات رہتی تو اچھا ہوتا۔ وہ بے خبری کی نیند سوتی رہتی اور ان عذابوں سے محفوظ رہتی جو اس کے گھر کی دہلیز کے اندر اور باہر اس کے انتظار میں ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ مگر اب تو کئی اور پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں بھی فضا میں بلند ہونے لگی تھیں۔ وہ کسمساتی ہوئی اپنے بستر سے اٹھی۔ بوسیدہ' بدبودار اور میل سے اٹی ہوئی چادر کو اس نے ایک طرف ڈالا اور اپنے پہلو میں سوئی ہوئی دو سالہ بیٹی کلثوم کو غور سے دیکھنے لگی۔ جو دنیا کے ہر دکھ اور محرومی کے احساس سے بے نیاز' کسی ننھے فرشتے کی طرح نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس نے جھک کر آہستہ سے بچی کے رخسار کو بوسہ دیا اور پھر بستر سے نیچے اتر گئی۔

جب وہ کمرے سے نکل کر اپنے کچے گھر کے آنگن میں آئی تو اس وقت فضا سرمئی ہو رہی تھی یہ دن اور رات کے فراق و وصال کا وہ منظر تھا جو وہ روز ہی دیکھتی تھی۔ نہ اندھیرا تھا نہ اجالا تھا' نہ رات تھی نہ صبح تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ گھر کے کچے آنگن میں ایک جانب بنے ہوئے چولہے میں جس کے اوپر پرانے ٹین کی چادروں کا ایک سائبان تھا' آگ روشن کر کے بچوں کے لئے ناشتہ

تیار کرنے میں مصروف ہو گئی۔

ذرا دیر میں اس کی گیارہ سالہ بیٹی جنت بھی اندر آ گئی اور ہاتھ منہ دھو کر باورچی خانے میں اپنی امی کا ہاتھ بٹانے لگی۔ رات کی باسی روٹیاں ٹوکری میں رکھی ہوئی تھیں جنت نے انہیں نکالا اور گرم کرنے کے لئے توا چولہے پر چڑھا دیا۔ زیبن نے دال کی پتیلی کو پہلے ہی دیکھ لیا تھا دال کافی کم تھی اور اس وقت سب لوگوں کے لئے پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے مٹکی میں سے آدھا کٹورا پانی بھرا اور دال کی پتیلی میں ڈال دیا۔ پھر اس نے پتیلی کو چولہے پر چڑھا دیا رات کی باسی روٹیاں رات کی باسی دال' جس میں پانی ملا کر اس کی مقدار میں اضافہ کر دیا گیا تھا ناشتہ تیار ہو رہا تھا۔ ان بہت ساری جانوں کے لئے جو اس چھت کے نیچے پل رہی تھیں۔

ناشتہ تیار ہو گیا اور صبح کا اجالا بھی پوری طرح پھیل گیا۔ اندر کمرے میں سوئے ہوئے بچے ایک ایک کر کے اٹھ کر کمرے سے باہر آ گئے تھے۔ صرف ننھی کلثوم ابھی تک بستر پر لیٹی سو رہی تھی۔

"آؤ سب بچو۔" زیبن نے آواز لگائی۔ "جلدی جلدی ناشتہ کر لو۔ دیر ہو رہی ہے۔"

اس کی آواز کے ساتھ ہی تین چھوٹے چھوٹے بچے اِدھر اُدھر سے بھاگتے دوڑتے باورچی خانے میں داخل ہو گئے۔ ان کی سب سے بڑی بہن جنت پہلے سے باورچی خانے میں موجود تھی۔ اس نے تام چینی کی ایک بڑی سی رکابی میں جس کی چینی جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی تھی اور کنارے جھڑے ہوئے تھے' پانی جیسی پتلی دال نکال کر بچوں کے آگے رکھ دی اور روٹی کا ایک ایک ٹکڑا ان کے ہاتھوں میں پکڑا دیا۔ "لڑنا نہیں" زیبن نے بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "چپ چاپ انسانوں کی طرح روٹی کھا لو۔ اگر کسی نے دوسرے کی روٹی چھیننے کی کوشش کی تو چمڑی ادھیڑ ڈالوں گی۔"

"میں کسی کی روٹی نہیں چھینتی ماں۔" چھ سالہ نصرت نے کہا۔ "مگر بھیا میری روٹی چھین لیتا ہے۔"

"جھوٹی ہے۔" آٹھ سالہ ناصر نے کہا۔ "میں اس کی روٹی نہیں چھینتا۔ مجھے تو کلثوم نے اپنی روٹی میں سے....."

"ارے چپ ہو جاؤ کم بختو۔" زیبن نے بیزاری کا مظاہرہ کیا۔ "کیا کوؤں کی طرح کائیں کائیں کئے جا رہے ہو صبح صبح۔ صبح کے وقت تو آدمی کو خیر مانگنی چاہئے۔"



بچے خاموش ہو گئے جنت نے ایک دوسری رکابی میں تھوڑی سی دال نکال لی تھی اور روٹی کا ایک ٹکڑا اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور دوسرا اپنی ماں کے ہاتھ میں دے دیا تھا سب لوگ جلدی جلدی کھانے میں مصروف ہو گئے تھے کچھ دیر کے لئے فضا میں بڑی بوجھل اور ناگوار سی خاموشی چھا گئی تھی۔

زیبن نے قریب رکھا پانی سے بھرا ہوا المونیم کا گلاس اٹھایا جو کئی جگہ سے پچکا ہوا تھا اور جس کی شکل بگڑ چکی تھی اس کے ٹوٹے ہوئے کناروں میں کالا کالا میل بھرا ہوا تھا۔ اس نے ایک ہی سانس میں پورا گلاس خالی کر دیا۔

"میں اب چلتی ہوں۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "ذرا سی دیر ہو جاتی ہے تو چھوٹی چوہدرائن کے ماتھے پر ستر بل پڑ جاتے ہیں اور وہ فوراً بے عزتی کرنا شروع کر دیتی ہے۔ تم کلثوم کو دودھ دے دینا جب وہ سو کر اٹھے اور ساری چیزوں کا خیال کرنا۔ بچوں کو دوپہر کا کھانا دے دینا مجھے شاید شام کو واپسی میں دیر ہو جائے۔ چوہدریوں کے ہاں لاہور سے مہمان آنے والے ہیں شاید کام کچھ زیادہ ہو۔"

"کام کتنا ہی زیادہ لے لیں مگر پیسے تو زیادہ نہیں دیتے اماں۔" جنت نے شکایتی انداز میں کہا۔

"کیا کریں بیٹا؟" زیبن نے بے بسی کے ساتھ جواب دیا۔ "اب اگر نوکری کرنا ہے تو یہ سب کچھ برداشت کرنا ہو گا۔ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں۔ بندے کو ان کے سامنے سر جھکا کر رہنا پڑتا ہے۔"

"اماں یہ بڑے آدمی کہاں سے آتے ہیں؟" ناصر نے نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے اپنی ماں سے سوال کیا۔ نوالہ منہ میں رکھتے وقت تھوڑی سی پتلی دال اس میں سے ٹپک کر اس کے منہ اور قمیض کے گریبان پر گر گئی۔

"تیرے سر میں سے۔" زیبن نے اس کے کلے پر ایک گھونسہ رسید کرتے ہوئے کہا۔ جس کے ساتھ ہی اس کے منہ کا نوالہ آدھا باہر آ گیا اور اس نے جلدی سے اس کو دوبارہ منہ کے اندر دھکیل دیا۔ "کمینے نے ساری قمیض پر دال گرا لی۔"

نصرت کو اس منظر میں خاصی دلکشی محسوس ہوئی اور وہ ایک دم سے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"تُو..... تُو کیوں ہنس رہی ہے؟" زیبن نے اس کی پیٹھ پر ایک دو ہتھڑ رسید کیا۔ "اتنی بڑی گھوڑی کی گھوڑی ہو گئی۔ نہ کام کی نہ کاج کی۔ بس کتوں کی طرح دانت نکال کر

ہنسنا جانتی ہے۔"

ناصر اور نصرت دونوں ماز کھانے کے بعد سہمے ہوئے خاموشی سے کھانے میں مصروف ہو گئے۔ انہوں نے طوطوں کی طرح اپنی گردنیں نیچی کر لی تھیں اور آنکھیں جھکائے ہوئے باسی دال روٹی کھانے میں مصروف تھے۔

زمین باورچی خانے سے باہر نکل آئی اور اس کے ساتھ ہی جنت بھی باہر آ گئی۔ اب دن اچھا خاصا چڑھ آیا تھا۔ زمین نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں اور اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر قدرے تشویش کے آثار نمودار ہوئے۔

"دیر ہو رہی ہے۔" اس نے کہا اور جلدی سے دالان کی طرف بڑھنے لگی۔ عین اس وقت دوسرے کمرے میں سے ایک شخص آنکھیں ملتا ہوا نکل کر باہر آیا۔ اس شخص کے بال بری طرح بڑھے ہوئے' سوکھے' روکھے خشک اور میلے کچیلے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اس نے ایک طویل عرصے سے ان کو نہ تو کٹوایا ہو' نہ دھویا ہو۔ وہ سوکھی رسیوں کی طرح آپس میں الجھے ہوئے تھے۔ اس کی داڑھی تھی بھی اور نہیں بھی تھی۔ دیکھنے سے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ داڑھی نہیں رکھتا ہے لیکن اس نے شاید ہفتے بھر سے شیو نہیں بنایا ہے۔ داڑھی کے بڑھے ہوئے بالوں میں سفید رنگ کی آمیزش اچھی خاصی بڑھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ پتلا' جسم قدرے لاغر اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ اس کو دیکھنے کے بعد مجموعی طور پر ایک بیمار آدمی کا تاثر ذہن پر قائم ہوتا تھا۔ اس کا لباس بھی بے حد کثیف' بوسیدہ اور مسلا ہوا تھا۔

"ارے کچھ پیسے تو دیتی جا نیک بخت۔" اس آدمی نے گہری اور بھرائی ہوئی آواز میں اپنی بیوی زمین سے کہا۔ زمین نے کھا جانے والی نظروں سے اپنے نکھٹو شوہر غلام محمد عرف گامو کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر کبیدگی' ناگواری' خاموشی اور نفرت کا ایک ملا جلا تاثر ابھرا۔

"تیرے باپ نے خزانہ رکھوا دیا ہے نا میرے پاس' جس میں سے نکال نکال کر میں تجھ کو رقم دیتی رہوں گی۔ کہاں سے لاؤں میں پیسے تیرے لئے؟ نہیں ہیں میرے پاس۔"

"ارے تھوڑے بہت تو دیتی جا۔" گامو کا لہجہ خوشامدانہ اور عاجزانہ تھا۔ "کچھ بھی نہیں میری جیب میں۔"

"ارے تو باہر جا کر کوئی کمائی کیوں نہیں کرتا؟" زمین نے آنکھیں نکال کر کہا۔ "تیری جیب اگر بھیک کے پیالے کی طرح خالی ہے تو میں کیا کروں؟ تو مرد ذات ہے۔ محنت



مزدوری کیوں نہیں کرتا؟ کوئی کام دھندہ کیوں نہیں کرتا؟"

"اوئے دے دے کتیا۔" گامو نے سخت غصے اور نفرت کے عالم میں دانت پیس کر کہا۔ اس کے لہجے کی عاجزی اور مسکینی یک لخت رخصت ہو گئی تھی اور وہ بپھر گیا تھا۔

"ہر وقت زبان چلاتی ہے ہر وقت بھونکتی رہتی ہے۔"

"ارے میں کتی اگر اپنی ہڈیاں نہ پیلوں رات دن' تو تیرے ان پلّوں کا دوزخ کون بھرے گا؟" زمین نے ایک دم گرج کر کہا۔ "تو کھلائے گا ان کو؟ تو؟ ارے تو تو اپنے پیٹ کے لئے بھی روٹی کا ٹکڑا نہیں کما سکتا۔ تو کہاں سے کھلائے گا اتنی جانوں کو بے غیرت؟"

"چپ..... چپ رہ۔" گامو وحشیوں کی طرح چلایا۔ "مجھے آج پیسے چاہئیں۔ دے پیسے دے۔ نہیں تو میں تیری ہڈیاں توڑ ڈالوں گا....."

"نہیں دوں گی' ہرگز نہیں دوں گی۔" زمین بھیانک آواز میں چیخی۔ "نہیں ہیں میرے پاس تیرے نشے کے لئے پیسے۔ میں اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کر تجھے کچھ نہیں دے سکتی....."

"کیسے نہیں دے گی۔" گامو ڈکارا اور زمین پر پل پڑا۔ وہ زمین کو گھونسوں اور تھپڑوں سے مارنے لگا اور ساتھ ہی گالیاں بھی دے رہا تھا۔ زمین مزاحمت کر رہی تھی اور جواب میں اس سے زیادہ تیز و تند گالیاں دے رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ چھوٹا سا کچا' غربت اور افلاس کی دھند میں لپٹا ہوا محرومی اور پسماندگی کی فضا میں سانس لیتا ہوا گھر' ایک چھوٹے سے میدانِ کارزار میں تبدیل ہو گیا تھا۔

گامو زمین کو مار رہا تھا وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہی تھی۔ چھوٹے بچوں نے چلا چلا کر رونا شروع کر دیا تھا۔ اندر کمرے میں سے ننھی کلثوم کے رونے کی آوازیں بھی آنے لگی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک حشر برپا ہو گیا تھا۔

"ابا..... او ابا....." گیارہ سالہ جنت زور زور سے روتی ہوئی اور چلاتی ہوئی اپنے باپ کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ "اماں کو مت مارو ابا..... اماں کو چھوڑ دو۔"

"ہٹ پرے۔" گامو نے قہر آلود نگاہوں سے اس کو گھورتے ہوئے اس کے ایک لات رسید کی اور جنت لڑھک کر کچھ دور جا گری لیکن وہ فوراً ہی دوبارہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنی ماں کی حفاظت پر کمربستہ ہو گئی۔

زمین روتی جا رہی تھی اور اپنے شوہر کو برا بھلا کہتی جا رہی تھی۔ خوفزدہ سہمے ہوئے بچے زور زور سے رو رہے تھے۔ ناصر تیزی سے اٹھا اور گھر کا دروازہ کھول کر باہر

بھاگ لیا۔ اس وقت کھلے ہوئے دروازے سے پڑوس میں رہنے والی ماسی خیراں اندر داخل ہوئی۔ "ارے بے شرما..... ارے بے شرما۔" گھر کے آنگن میں گونجنے والی ملی جلی آوازوں میں ایک اور آواز شامل ہو گئی۔ یہ تیز و تند کھنکتی ہوئی بھاری آواز ماسی خیراں کی تھی۔ "زنانی پر ہاتھ اٹھاتا ہے تُو..... شرم نہیں آتی تجھ کو۔ چل دفع ہو ادھر سے۔ بے غیرت کہیں کا۔"

"تُو میاں بیوی کے معاملات میں دخل مت دیا کر ماسی خیراں!" گامو نے چلا کر کہا اور اس وقت زمین نے اسے زور سے دھکا دے کر اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑا لیا۔

"میاں بیوی کے معاملات؟" زمین نے نفرت کے ساتھ زمین پر زور سے تھوکا۔ "تُو میاں ہے میرا؟ ارے میاں ہے تو روٹی کیوں نہیں کھلاتا مجھے اور بچوں کو؟ تیرا ستیاناس۔ صرف کام چلانے کے لئے میاں ہے حرام خور۔ نکما' نامراد....."

"دیکھ لوں گا تجھ کو..... سمجھ لوں گا اچھی طرح تجھ سے۔" گامو بکتا جھکتا' خونی نظروں سے زمین کو گھورتا ہوا' واپس اسی کمرے کی طرف چلا گیا جدھر سے نکل کر وہ آیا تھا اور میلے کچیلے بستر پر گر پڑا۔ ناصر تو گھر سے باہر بھاگ گیا تھا اور باقی دونوں بچوں نے رونا بند کر دیا تھا صرف دو سالہ کلثوم روئے جا رہی تھی۔

"اٹھا نا جا کر اسے۔" زمین جنت پر بری طرح چلائی۔ "کب سے روئے جا رہی ہے وہ سنبھال اسے۔ میری تو زندگی موت سے بدتر ہو گئی ہے۔ اس سے تو اچھا ہے خدا مجھے موت دے دے۔"

"اے زمین صبح صبح ایسی بُری بُری باتیں زبان سے نہ نکالو۔" ماسی خیراں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "صبح صبح اللہ رسول کا نام لیتے ہیں اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں اب جاؤ جلدی کرو۔ تمہیں کام پر جانے میں دیر ہو رہی ہے۔"

زمین خاموشی سے سسکیاں لیتی رہی اس نے جلدی سے اندر جا کر اپنی پھٹی پرانی چادر اٹھا کر اپنے سر پر ڈالی' کپڑے کا وہ میلا کچیلا خالی تھیلا ہاتھ میں اٹھایا جسے وہ روزانہ اپنے ساتھ لے جاتی تھی اور گھر کے کھلے ہوئے دروازے میں سے باہر نکل گئی۔ باہر نکلتے ہی اسے ناصر کی ایک جھلک دکھائی دی جو ابھی تک گھر کے سامنے والے پیڑ کے نیچے بیٹھا ہوا تھا اور اب ماں کو گھر سے نکلتا دیکھ کر وہاں سے بھی بھاگ کھڑا ہوا تھا۔

☆=====☆=====☆

نیا دن شروع ہو چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی زمین کے لئے عذابوں کا وہ سلسلہ بھی



شروع ہو گیا تھا جس سے اس کا ہر دن عبارت تھا۔ وہ تیزی سے قدم بڑھاتی ہوئی جلدی جلدی راستہ طے کرتی ہوئی چوہدریوں کے گھر کی طرف جا رہی تھی آج بھی دیر ہو گئی تھی۔ اس بدنصیب گامو نے صبح ہی صبح جھگڑا شروع کر دیا تھا۔

وہ چوہدریوں کے حویلی نما مکان میں داخل ہوئی تو چھوٹی چوہدرائن اسے سامنے ہی نظر آ گئی۔ اس نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر چھوٹی چوہدرائن کو سلام کیا۔

"آ گئی مہارانی صاحبہ کی سواری؟" چھوٹی چوہدرائن نے خشمگیں نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کٹیلے انداز میں کہا۔ "ارے میں کہتی ہوں آخر تم جلدی کیوں نہیں آتیں؟ دس دفعہ کہا تم سے' بچوں کو صبح صبح اسکول جانا ہوتا ہے۔ کتنے بہت سارے کام ہوتے ہیں جو صبح ہی صبح کرنے ضروری ہوتے ہیں۔ مگر تم ہو کہ تمہارے کان پر جوں نہیں رینگتی۔" چھوٹی چوہدرائن کے لب و لہجے کی تلخی زمین کے شکستہ و ریختہ وجود میں سرایت کرتی چلی جا رہی تھی۔

"بس جی..... اب میں آ گئی ہوں چھوٹی چوہدرائن۔" اس نے اپنے آپ کو کچلتے ہوئے بڑی عاجزی کے ساتھ کہا۔ "جلدی جلدی سارے کام نمٹا دوں گی۔ آپ فکر نہ کیجئے جی۔"

"میں تم سے بار بار کہہ چکی ہوں زمین۔" چھوٹی چوہدرائن کا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔ "اگر تم کام نہیں کر سکتیں تو صاف صاف بتا دو۔ ہمارے پاس کام کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔"

"نہیں نہیں چھوٹی چوہدرائن۔" زمین نے جلدی سے چادر اتار کر ایک طرف ڈالی' تھیلے کو چادر کے ساتھ رکھا اور سیدھی باورچی خانے میں گھس گئی۔ چھوٹی چوہدرائن اس کے پیچھے پیچھے آئی اور اسے کام کے سلسلے میں ہدایات دینے لگی۔

صبح سے لے کر دوپہر تک اور پھر کھانے کے بعد دوپہر سے لے کر شام تک جان توڑ کام..... کام' کام اور کام۔ درجن بھر سے زیادہ لوگوں کے جھوٹے برتنوں کے ڈھیر' صفائی ستھرائی' جھاڑو' پوچا اور پھر اس کے ساتھ مسلسل ڈانٹ' پھٹکار' بگڑے ہوئے تیور' شکن آلود' پیشانیاں' تلخ الفاظ' کڑوے بول..... ذلتیں..... ذلتیں اور عذاب' عذاب..... عذاب اور ذلتیں اور جان توڑ مشقت۔ زندگی بس اسی سے عبارت ہو کر رہ گئی تھی۔

اسے یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑتا تھا نہ کرتی تو کیا کرتی؟ زندہ رہنے کے لئے انسان

کو کیسی کیسی مصلحتوں اور مفاہمتوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ آدمی ذلتیں سہتا ہے اور چپ رہتا ہے۔ اس کی روح زخمی ہو کر پھڑ پھڑاتی رہتی ہے اور وہ کچل کچل کر اسے خاموش کرتا رہتا ہے۔ وہ اپنے احساس کو اپنے سینے میں ہی مسل کر رکھ دیتا ہے۔ اس کا وجود اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتا رہتا ہے اور وہ خاموشی سے' ڈھٹائی کی چادر اوڑھ کر زندگی کی سنگلاخ شاہراہ پر دھکے کھاتا پھرتا ہے۔ یہی حال زمین کا بھی تھا۔ کبھی کبھی تو اس کا جی چاہتا تھا کہ باورچی خانے کے ایک کونے میں رکھا ہوا ڈنڈا اٹھا کر چھوٹی چوہدرائن کے سر پر اس زور سے مارے کہ اس کا بھیجہ باہر نکل پڑے لیکن وہ جانتی تھی کہ اس کی یہ مجہول اور منفعل خواہش کبھی عملی صورت اختیار نہیں کر سکے گی۔

چوہدریوں کے ہاں سارے دن اعصاب شکن کام کے دوران وہ بار بار اپنے کچے گھروندے کے بارے میں سوچتی۔ اس کا ذہن بھٹک کر اپنے بچوں کے پاس چلا جاتا جو سارا دن اس کے بغیر گھر میں رہتے تھے خاص طور سے وہ ننھی کلثوم کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہوتی رہتی تھی جس کی عمر ابھی صرف دو سال کی تھی اور جسے ماں کی ضرورت تھی لیکن ماں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی۔ یکبارگی اس کا جی چاہنے لگتا کہ وہ اس حویلی نما مکان سے یک دم نکل کر بھاگے اور اپنے اس کچے گھروندے میں پہنچ جائے جہاں اس کے چھوٹے چھوٹے بچے اس کی راہ تک رہے ہوں گے۔

اس روز بھی اس نے معمول کے مطابق سارا کام کیا دوپہر کا کھانا کھایا۔ بہت سی جھڑکیاں سنیں اور شام کے وقت دوپہر کے بچے ہوئے کچھ کھانے کو دن بھر کی ذلتوں کے ساتھ ایک پوٹلی میں باندھ کر اپنے تھیلے میں رکھ کر گھر کے لئے روانہ ہو گئی۔ یہی اس کا روزانہ کا توسہ تھا جسے وہ اپنے ساتھ لے جاتی تھی۔ دوپہر کا بچا ہوا تھوڑا بہت کھانا اور ذلتوں کی سوغات۔

گھر پہنچی تو سارے بچے گھر پر ہی موجود تھے اور اس کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ بچوں کو اس کی واپسی سے زیادہ اس کھانے سے دلچسپی ہوتی تھی جو وہ اپنے ساتھ لے کر آتی تھی یہ تھوڑا سا بچا کھچا کھانا اس کے لئے کسی نعمت سے کم نہیں ہوتا تھا۔ ان کے اپنے گھر میں تو ایسا کھانا کبھی پکتا ہی نہیں تھا۔ نہ ان کے گھر میں نہ ان کے آس پاس کے کسی گھر میں۔ وہاں تو کسی گھر سے ایسے کھانے کی خوشبو بھی نہیں نکلتی تھی۔ اگرچہ وہ بہت تھوڑا سا ہوتا تھا اور ہر ایک کے حصے میں بھی ذرا ذرا سا آتا تھا پھر بھی بچے اس ذرا سی نعمت کی آس میں سارا سارا دن انتظار میں گزار دیتے تھے۔ دنیا میں پھیلی ہوئی کرہ



ارض پر چار سُو بکھری ہوئی انواع و اقسام کی فراواں نعمتوں میں سے اس کے بچوں کا بس اتنا ہی حصہ تھا۔

وہ گھر میں داخل ہوئی تو بچوں کی نگاہیں سب سے پہلے اس کے تھیلے کا طواف کرنے لگیں ان معصوم' حریص نگاہوں میں ایک حسرت آمیز طلب تھی۔

گامو آج بھی حسب معمول گھر میں موجود نہیں تھا۔ زمین نے اس کے بارے میں پوچھنے کی ضرورت بھی نہیں محسوس کی۔ اس کو معلوم تھا کہ وہ گھر پر موجود نہیں ہو گا۔

زمین کے جسم کی ہر ہڈی بڑی درد کر رہی تھی۔ اس نے آتے ہی اپنا تھیلا جنت کے حوالے کر دیا اور چادر کو اتار کر ایک طرف ڈالتے ہوئے چارپائی پر ڈھے گئی۔

زندگی' زمین پر مہربان تو کبھی نہیں تھی لیکن اس درجہ نامہربان بھی نہیں تھی جتنی کہ اب تھی۔ اب تو زندگی کا ایک ایک لمحہ اس کے لئے درد بھرا عذاب بنا ہوا تھا۔ اس عذاب میں سے وہ خوشیوں کے چند لمحے تلاش کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ خوشی کے یہ لمحے وہ ہوتے تھے جب وہ اپنے بچوں کے ساتھ ہوتی تھی۔ وہ ان کے ساتھ خوش رہنا چاہتی تھی ذرا دیر کے لئے ہی سہی' لیکن پھر اچانک کوئی نہ کوئی بات ایسی ہو جاتی کہ بیوں اور نامرادیوں کا مارا ہوا اس کا دماغ' جس میں بے مہر ایام نے تلخیاں بھر دی ئیں' اچانک سلگ اٹھتا۔ وہ بچوں کو روئی کی طرح دھنک ڈالتی انہیں کوستی' برا بھلا کہتی اور پھر بعد میں انہیں سینے سے لگا کر سسکیاں لے لے کر روتی۔ خوشیوں کے سمیٹے ہوئے لمحے بکھر جاتے۔ وہ ان کی کرچیوں کو دوبارہ جمع کرتی اور انہیں جوڑنے کی کوشش میں لگ جاتی۔

زمین کا اصل نام تو زیب النسا تھا لیکن شاید ہی کسی نے کبھی اس کا اصل نام لیا ہو سب اسے زمین ہی کہتے تھے۔ یہی نام میکے میں تھا اور اسی نام کو ساتھ لے کر وہ سسرال آئی۔

☆=====☆=====☆

زیب النسا عرف زمین سیالکوٹ کے قریب ایک گاؤں کی رہنے والی تھی۔ اس کا باپ ایک غریب مزارع تھا۔ اس کے پاس اپنی کوئی زمین نہیں تھی اور وہ ایک مقامی زمیندار کی زمین پر کام کرتا تھا۔ زمین نے آنکھ کھولتے ہی اپنے گھر میں محنت مشقت کی فضا میں غربت کو پلتے دیکھا تھا۔ اس کا باپ صبح ہوتے ہی اپنے کام پر چلا جاتا اور ماں گھر کے کاموں میں مصروف ہو جاتی تھی۔ کاموں کا یہ سلسلہ اس درجہ طویل تھا کہ کسی طرح'

کسی وقت ختم ہونے ہی میں نہیں آتا تھا۔ زیبن اپنی ماں کو شاذو نادر ہی فارغ دیکھتی تھی۔ شاید اس کو کام کرنے کی عادت ہی اس قدر پڑ گئی تھی کہ وہ فارغ رہنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ جب وہ دوسری عورتوں کے خالی اوقات میں ان کے ساتھ باتیں کر رہی ہوتی تھی تو اس وقت بھی اس کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی کام ہوتا تھا اور کچھ نہیں تو وہ رسی ہی بٹتی جاتی تھی زبان کے ساتھ ساتھ اس کے ہاتھ بھی چلتے رہتے تھے۔ زیبن کو اپنے ماں باپ بہت اچھے لگتے تھے اور وہ بچپن سے خود بھی محنت مشقت کی عادی تھی۔ زیبن کا کوئی بھائی نہیں تھا اس کی بس ایک بہن اور تھی جو اس سے چھوٹی تھی۔ زیبن کے والدین کو بیٹے کی حسرت ہی رہی اور وہ کبھی ایک بیٹے کے والدین نہ بن سکے۔

آمدنی کے وسائل بے حد محدود تھے اور ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے لکھو کھہا' غریب گھرانوں کی طرح زیبن کے گھر میں بھی جس دولت کی سب سے زیادہ فراوانی اور ارزانی تھی وہ غربت و افلاس کی ہی دولت تھی جس میں ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ پیہم اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ یہی تو وہ واحد دولت تھی جو بغیر کسی کوشش کے برابر بڑھتی رہتی تھی۔ کنبہ چونکہ چھوٹا تھا اس لئے جو بھی تھوڑا بہت رزق میسر آ جاتا تھا اس سے کام چل جاتا تھا گھر میں کل چار افراد تھے۔ کسی نہ کسی طرح دو وقت کی روٹی میسر آ جاتی تھی۔

زیبن کا بچپن گھر کے کام کاج کرتے گاؤں کی گلیوں میں کھیلتے اور سہیلیوں کے ساتھ ہنستے بولتے گزر گیا۔ اس کے بچپن میں کوئی بھی ایسی خاص بات نہیں تھی جو یاد رکھنے کے قابل ہوتی۔ غریبی' پسماندگی اور نیم غلامی کی دھند میں لپٹا ہوا' محرومیوں میں ڈوبا ہوا لیکن محرومیوں کے احساس سے بھی عاری بچپن' جس میں ننھی منی' چھوٹی چھوٹی خوشیوں کی تلاش و جستجو ہی حاصل زندگی ٹھہرتی تھی۔

زیبن کو اس بات کا احساس بھی نہیں ہوا کہ کب بچپن رخصت ہوا اور کب اس نے نوجوانی کی انجانی اور طلسماتی دنیا میں قدم رکھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بہت کچھ بدل گیا تھا۔ بلکہ شاید سب کچھ بدل گیا تھا۔ دل میں خود بخود شگوفے سے پھوٹنے لگے تھے۔ بے ساختہ ہنسنے کو' کھلکھلانے کو' آسمانوں کی بلندیوں تک پرواز کرنے کو' ایک چھلانگ مار کر چاند کو چھو لینے کو جی چاہتا تھا۔ جذبوں کی توانائی حرارت اور قوت کے آگے سب کچھ ہیچ معلوم ہوتا تھا۔ یہ عجیب کیفیت تھی جس سے زیبن دو چار ہو گئی تھی اور گزر رہی تھی اسے یک بیک ساری دنیا اچھی لگنے لگی تھی۔ اداسی میں لپٹے ہوئے شام کے دھندلکے ہی اچھے نہیں



لگنے لگے تھے بلکہ دھوپ کی چمک اور تمازت بھی اچھی لگنے لگی تھی۔

جذبوں کی اس روشنی نے اس کے وجود کو اس وقت اور بھی زیادہ سندر کر دیا جب اس کو اس بات کا علم ہوا کہ اس کی شادی کی جا رہی ہے اور عنقریب وہ رخصت ہو کر اپنے شوہر کے گھر چلی جائے گی اور شوہر' محبت' بچے اپنا گھر' اپنی دنیا یہ سارے تصورات کس قدر مسحور کن' کتنے ہیجان انگیز اور روح پرور تھے۔ آنکھوں میں نشہ سا اتر آتا تھا اور دل میں کلیاں سی چٹکنے لگتی تھیں۔ ساری دنیا رنگ و نور میں ڈوبی ہوئی لگتی تھی۔ غربت' افلاس' پسماندگی اور محرومی سے لبریز زندگی میں بھی خوشیوں کے چھوٹے چھوٹے خوبصورت جزیرے ابھر آتے تھے اور ان میں سے ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے پر پھلانگتے رہنا کتنا اچھا لگتا تھا۔

زیبن اپنے ہونے والے شوہر سے پہلے سے واقف تھی لیکن اس کے اور گامو کے درمیان پہلے سے کوئی خصوصی تعلق خاطر [illegible] تھا۔ غلام محمد عرف گامو زیبن کی اپنی برادری کا لڑکا تھا اور سیالکوٹ کی ایک نواحی بستی میں رہتا تھا جس کا شمار شہری علاقے میں کیا جاتا تھا غلام محمد کا باپ مقامی غلہ منڈی میں مزدوری کرتا تھا اس کا ایک ہی بیٹا تھا۔ یہ [illegible] کنبہ صرف تین افراد پر مشتمل تھا میاں بیوی اور گامو۔ کمانے والے دو تھے گامو خود بھی اپنے باپ کے ساتھ غلہ منڈی میں کام کرتا تھا جب سے وہ بڑا ہوا تھا تب سے اس نے اپنے باپ کے ساتھ غلہ منڈی جانا اور وہاں کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ دونوں باپ بیٹے مل کر جو کچھ کماتے تھے اس سے ان کے گھر کا چولہا اچھی طرح روشن ہو جاتا تھا۔

زیبن سے کسی نے نہیں پوچھا کہ آیا وہ گامو سے شادی کرنے پر راضی ہے یا نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ جس معاشرتی حلقے سے زیبن کا تعلق تھا وہاں اس قسم کی باتوں کا کوئی تصور نہیں تھا تاہم زیبن کے دل میں اس وقت تک کسی اور نوجوان کا خیال موجود نہیں تھا وہ عشق کی کرشمہ سازیوں سے ناواقف تھی چنانچہ اس نے گامو کو بڑی خوشی کے ساتھ قبول کر لیا۔ گامو وہ پہلا نوجوان تھا جو اس کی زندگی میں داخل ہو رہا تھا اور وہ یکبارگی اسے پسند کرنے اور اس سے محبت کرنے لگی۔

زیبن کی شادی ہو گئی اور وہ رخصت ہو کر اپنے شوہر کے گھر آ گئی۔ یہ ایک نئی دنیا تھی لیکن اس کی پرانی دنیا سے بہت زیادہ مختلف نہیں تھی۔ اس گھر میں بھی غریبی کا ہی راج تھا' لیکن اسے یہاں اتنی زیادہ غریبی کا احساس نہیں ہوا تھا جتنا اپنے والدین کے گھر میں ہوا تھا۔ اس کا شوہر اور سسر دونوں ہی مزدوری کرتے تھے اور انہیں روزانہ کام مل

جاتا تھا۔ کام کی اجرت بھی روزانہ مل جاتی تھی۔ گھر کا خرچہ ایک خاص' لگے بندھے انداز میں چلتا رہتا تھا۔

شادی کے ابتدائی دن زمین کے لئے اس کی زندگی کے سب سے زیادہ نشاط آفریں اور سرور انگیز دن تھے۔ وہ کسی کی زندگی میں داخل ہو گئی تھی اور کوئی اس کی زندگی میں داخل ہو گیا تھا اور اپنائیت اور چاہت کا ایک ایسا جادو تھا جس نے اس کے سارے وجود کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ دو انسانوں کے درمیان اس قدر گہرا قرب' اس قدر مسحور کن اور ناقابل یقین یک جائی بھی ممکن تھی! اس کا تو اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ کیسے شب و روز تھے' جب ایک دوسرے پر مرمٹنے کو جی چاہتا تھا۔ ایک دوسرے پر پروانہ وار نثار ہو جانے کی سرور انگیز خواہش دلوں میں حشر برپا کر دیتی تھی۔ دلوں میں اگر محبت کا جذبہ موجزن ہو اور جینے کی امنگ موجود ہو تو کم مائیگی' درماندگی' پسماندگی اور افلاس میں جکڑے ہوئے روز و شب میں بھی انسان [illegible] خوشی اور مسرت کے قیمتی لمحوں کو تلاش کر ہی لیتا ہے اور یہی لمحے اس کی متاعِ حیات بن جاتے ہیں' اس کے جینے کا سہارا بن جاتے ہیں۔

شادی کے کچھ عرصے کے بعد جب زمین پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ ماں بننے والی ہے تو وہ ایک ایسی حیرت آمیز مسرت سے دوچار ہوئی جس کا اس سے پہلے اسے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ یہ سب کچھ کس قدر حیران کن' ناقابل یقین معلوم ہوتا تھا۔ وہ ماں بننے والی تھی۔ اپنے وجود سے ایک نئے وجود کو جنم دینے والی تھی۔ ایک نئی دنیا کی تخلیق ہونے والی تھی۔

اس کی ان بے پایاں مسرتوں میں اس پر جان چھڑکنے والا اس کا شوہر گامو برابر کا شریک تھا۔ گامو کے لئے بھی یہ ایک نئی دنیا کی تخلیق کا' نئے انکشاف کا مژدہ تھا۔

"خدا کرے بیٹا پیدا ہو۔" گامو نے ایک روز اپنی بیوی سے کہا۔ "بیٹا ہو جائے تو سمجھو کہ سب کچھ مل گیا۔"

"خدا کرے کہ بیٹا ہی ہو۔" زمین نے آہستہ سے کہا۔ "لیکن فرض کرو اگر بیٹا نہ ہوا تو....."

"تو بھی کیا؟" گامو نے جلدی سے کہا۔ "بیٹی بھی ہو گی تو وہ ہمارے کلیجے کا ٹکڑا ہو گی۔ ہم اس کو سینے سے لگائیں گے۔"

دراصل بیٹے کی خواہش زمین کے دل میں بھی اتنی ہی شدید تھی۔ یا شاید اس سے



بھی کچھ زیادہ' جتنی کہ گامو کے دل میں تھی۔ زمین کی ماں نے کسی بیٹے کو جنم نہیں دیا تھا۔ زمین کی صرف ایک بہن تھی اور وہ دونوں بہنیں اکثر اس بات پر ملال کرتی تھیں کہ ان کا کوئی بھائی نہیں تھا اور ماں باپ تو بس ساری زندگی اس حسرت میں رہے کہ ان کے ہاں ایک بیٹا ہو۔ والدین کے دل میں پلنے والی وہ دیرینہ خواہش اب ایک نسل کا سفر کرتی ہوئی زمین کے دل میں اتر آئی تھی' لیکن زمین اپنے شوہر اور دوسرے لوگوں کے سامنے اپنی اس خواہش کا برملا اظہار نہیں کرتی تھی۔ وہ تو سب کو اور خاص طور سے گامو کو یہ جتانے کی کوشش کرتی تھی کہ اگر بیٹی بھی ہو گی تو اس کو اسی طرح عزیز ہو گی جس طرح کہ بیٹا۔ وہ پہلے سے اس بات کے لئے ذہن ہموار کر رہی تھی کہ بیٹی کی پیدائش کی صورت میں اسے کسی ناخوشگوار صورتِ حال کا سامنا نہ کرنا پڑے اور اس کے شوہر کے دل کو کوئی دھچکا نہ پہنچے۔

زمین نے بیٹے کو نہیں بیٹی کو جنم دیا۔ اولاد کی خوشی تو ضرور تھی لیکن یہ ادھوری خوشی تھی۔ اگر بیٹا ہوتا تو یہ خوشی کہاں سے کہاں پہنچ جاتی۔

"خدا نے چاہا تو اگلی بار بیٹا پیدا ہو گا۔" گامو نے زمین کو اور خود اپنے آپ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"انشاء اللہ ضرور۔" زمین نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کہا۔ بیٹی کی پیدائش نے اسے ایک نامعلوم خوف سے دوچار کر دیا تھا لیکن اپنے شوہر کے مفاہمانہ رویئے کے باعث اسے جلد ہی اس خوف سے نجات مل گئی۔

جنت کی پیدائش کے تین سال بعد زمین نے ایک بیٹے کو جنم دیا اور تب اسے یوں لگا جیسے اس کے بدن کا ایک ایک رواں پوری طرح آسودہ اور اس کی روح مکمل طور پر شاداب و سرشار ہے۔ یہ ایک ایسی خواہش تھی جس کے انتظار میں اس نے وقت کی کڑی دھوپ میں تپتے ہوئے لمحوں کے سنگ ریزوں کی مار سہی تھی اور آج انتظار کی یہ گھڑیاں ختم ہو گئی تھیں۔ آنے والا آ گیا تھا اور اپنے ساتھ کتنے ہی دیکھے ان دیکھے خوابوں کی تعبیر لے کر آیا تھا۔

ناصر کی پیدائش کے بعد زمین کو یوں محسوس ہوا جیسے اب اس کے وجود کی تکمیل ہو گئی۔ وہ اب ایک بیٹے کی ماں بن چکی تھی۔ محبت کرنے والا شوہر تو پہلے سے اس کی زندگی میں داخل تھا۔

وقت گزر رہا تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زندگی میں تبدیلیاں رونما ہو رہی

تھیں۔ زمین کے اردگرد بھی بہت کچھ بدل چکا تھا اور بدل رہا تھا اور جو کچھ بدل رہا تھا وہ خوشگوار نہیں تھا۔

گھر میں پہلے سے موجود غریبی میں چپکے چپکے نامحسوس طریقے سے اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس اضافے کی دو بنیادی وجوہات تھیں۔ ایک تو مہنگائی میں پیہم اضافہ اور دوسرے گھر میں افراد کی تعداد میں اضافہ۔ گھر میں اب بچے بھی تھے۔ جن میں ایک لڑکی تھی اور لڑکی تو جب پیدا ہوتی ہے' اس وقت سے اس کے خاموش مطالبات کا سلسلہ بھی شروع ہو جاتا ہے۔ دور اندیش ماں باپ تو فوراً ہی اس کا جہیز جوڑنا شروع کر دیتے ہیں۔

گھر کا خرچہ بڑھ گیا تھا اور قیمتوں میں اضافے کے باعث آمدنی کم ہو گئی تھی۔ غریبی کی چادر جگہ جگہ سے پھٹتی چلی جا رہی تھی۔ بہت کھینچ تان کر کسی نہ کسی طرح گزارہ کرنا پڑ رہا تھا۔ زندگی مشکل ہوتی جا رہی تھی۔

ناصر کی پیدائش کے دو سال کے بعد زمین کی گود ایک بار پھر ہری ہو گئی لیکن ان سب لوگوں کے لئے یہ کوئی خوشی کی خبر نہیں تھی۔ سب ہی نے نہ جانے کیوں یہ فرض کر لیا تھا کہ اس بار بھی زمین کے بیٹا ہی پیدا ہو گا لیکن ایسا نہیں ہوا ان کی توقعات کے بالکل برخلاف زمین کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی۔ زمین کے گھر کے آنگن میں اب دو بیٹیاں کھیل رہی تھیں بیٹا تو ایک ہی تھا۔

حالات میں کچھ عجیب انداز کی تبدیلی آ رہی تھی۔ ملک کے تمام شہروں میں ایک دم بہت سارے خطرناک ہتھیار آ گئے تھے۔ اس سے پہلے کلاشنکوف کا نام کسی نے نہیں سنا تھا لیکن اب ملک کے طول و عرض میں لوگ اس ہتھیار کے نام سے واقف ہو رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی جگہ جگہ فائرنگ اور بموں کے دھماکے ہو رہے تھے۔ جن میں بے گناہ لوگ مارے جا رہے تھے اور ملک کی عام بول چال کی تمام زبانوں میں ایک اور نیا لفظ داخل ہو گیا تھا..... ہیروئن.....

یہ بڑا قاتل اور موذی نشہ تھا اور اس نے اس سے پہلے کے تمام نشوں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ لوگ پہلے تو اس کے نام سے بھی واقف نہیں تھے اور یہ ملک میں کہیں بھی نہیں پایا جاتا تھا لیکن پھر دیکھتے ہی دیکھتے ملک بھر میں شہر شہر' قریہ قریہ' نگری نگری اس نشے کا جیسے سیلاب آ گیا تھا۔ جگہ جگہ اس کی فروخت کے اڈے قائم ہو گئے تھے جہاں کھلے عام اس کا کاروبار ہوتا تھا اور کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ جو پوچھنے والے تھے' وہ خود اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھو رہے تھے۔ بلکہ نہا رہے تھے۔



اللہ داد خان اس بستی میں رہتا تھا اور اس کا بڑا بھائی پولیس میں ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ اللہ داد خان کوئی اچھی شہرت کا مالک نہیں تھا۔ بظاہر تو اس کا کاروبار پرانے سامان کی خرید و فروخت کا تھا لیکن بستی کے زیادہ تر لوگوں کو یہ بات معلوم تھی کہ وہ چوری کا مال خریدتا ہے اور پھر اسے منافع کے ساتھ آگے فروخت کر دیتا ہے۔ ایک بار تو اس کے مکان پر چھاپہ پڑا تھا اور شاید چوری کا کچھ مال برآمد بھی ہوا تھا لیکن پھر کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ سارا معاملہ وہیں دب کر ختم ہو گیا تھا۔

ملک میں ہیروئن کی فصل کی آمد کے کچھ ہی عرصے کے بعد سیالکوٹ کی اس نواحی بستی میں جس پر گامو اور زمین کا خاندان آباد تھا' اللہ داد خان نے ہیروئن فروشی کا کاروبار شروع کر دیا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ لوگوں کو اس نشے کا عادی بنایا جائے۔ یہ غریبوں اور مفلسوں کی بستی تھی اور یہاں کے رہنے والوں کی اکثریت معاشی اور معاشرتی محرومیوں' کلفتوں اور مصائب کے تحت دبی اور کچلی ہوئی' گوناگوں ذہنی اور نفسیاتی پیچیدگیوں کا شکار تھی۔ اللہ داد خان کو باآسانی ایسے لوگ ملنے لگے جو زندگی کی کڑی' جھلسا دینے والی اور تپتی ہوئی دھوپ میں ذرا سی دیر کے لئے کسی عارضی' خنک سائے کی تلاش میں تھے۔ اللہ داد کا کاروبار چل پڑا اور یہ صرف اللہ داد کا کاروبار نہیں تھا' یہ تو ادنیٰ ترین سطح سے لے کر اعلیٰ ترین سطح تک' ایک بہت مضبوط' مستحکم اور طاقتور مشینری کا کاروبار تھا۔ اللہ داد خان تو اس مشینری کا محض ایک چھوٹا سا پرزہ تھا۔ بستی کے سارے لوگوں کو معلوم تھا کہ اللہ داد خان نے منشیات کا' ہیروئن فروشی کا دھندہ شروع کر دیا ہے اور وہ علاقے کے لوگوں میں زہر تقسیم کر رہا ہے' لیکن کسی کی مجال نہیں تھی جو اس کے خلاف آواز بھی نکال سکتا۔ سب لوگوں کو معلوم تھا کہ اللہ داد کے خلاف کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ اللہ داد کا کاروبار بستی سے باہر تک پھیل رہا تھا۔

بستی کے جو لوگ ہیروئن کے عذاب میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ان میں بدنصیب گامو بھی شامل تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گامو کے گھر کے حالات زیادہ سخت اور ناسازگار ہوتے گئے تھے۔ ناصر کی پیدائش کے دو سال بعد جب زمین نے ایک اور بیٹی کو جنم دیا تو مفلسی میں یکبارگی اور اضافہ ہو گیا۔ ایک اور بیٹی..... ایک اور جہیز..... ایک اور شادی۔ تنکا تنکا جوڑو..... ابھی سے جوڑو..... ابھی سے جوڑنا شروع کرو تو شاید آگے چل کر کچھ ہو جائے۔

انہی دنوں ایک اور افتاد یہ آن پڑی کہ گامو کا باپ منڈی میں ایک بھاری بوری سمیت جو کہ اس کی پیٹھ پر لدی ہوئی تھی' گر پڑا اس کے پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی اور وہ کافی دنوں تک سرکاری ہسپتال میں پڑا رہا۔ اس کی روزانہ کمائی کا سلسلہ بند ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی اخراجات میں اضافہ ہو گیا۔ اس کے علاج پر اچھے خاصے پیسے خرچ ہو رہے تھے اور پھر گامو کے باپ کی کمائی کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔ اس کی ٹانگ کا آپریشن ناکام رہا تھا۔ اس میں زہر پھیل گیا تھا۔ وہ ایک عرصے تک ہسپتال میں رہنے کے بعد بالآخر چل بسا۔

باپ کی موت کے بعد گامو اپنے خاندان میں اکیلا کمانے والا رہ گیا تھا۔ آمدنی گھٹ گئی تھی' اخراجات بڑھ گئے تھے اور بڑھ رہے تھے' فکریں اور پریشانیاں بڑھ رہی تھیں' دماغ پر دباؤ بڑھ رہا تھا' اعصابی تھکن بڑھ رہی تھی سارا وجود روز بروز زیادہ بوجھل اور شکستگی و ریختگی کا شکار ہوتا جا رہا تھا۔

☆=====☆=====☆

حالات بدلتے ہیں تو جذبے بدلتے ہیں' رویئے بدلتے ہیں' تیور بدلتے ہیں' نظریں بدلتی ہیں۔ گامو اور زمین کے درمیان اب وہ شادی کے ابتدائی دنوں والی وارفتگی' شیفتگی اور آشفتگی نہیں رہی تھی۔ بے مہری' ایام کی کڑی اور تیز و تند دھوپ نے کتنے ہی نرم و نازک اور کومل جذبوں کو جلا کر' جھلسا کر خاک کر دیا تھا۔ اب وہ دونوں بات بات پر ایک دوسرے سے جھگڑ پڑتے تھے۔ جیسے جیسے زندگی کی الجھنیں بڑھتی جا رہی تھیں' ویسے ویسے دل و دماغ پر گرد و آلام کی تہیں زیادہ دبیز ہوتی جا رہی تھیں' ویسے ویسے مزاجوں کی یاس آمیز جھنجلاہٹ اور جھلاہٹ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور رویوں میں تلخیاں گھلتی جاتی تھیں۔

نصرت کی پیدائش کے دو سال بعد جب تیسری بیٹی صغرا پیدا ہوئی تو دکھوں کا اندھیرا کچھ اور گہرا ہو گیا۔ گامو کو خدا کی ذات سے بڑی امید تھی اس بار اس کے ہاں ضرور بیٹا پیدا ہو گا ایک اور بیٹا لیکن خدا نے اس کی یہ امید پوری نہیں کی اور ناامیدی اور مایوسی کی علامت بن کر ایک اور بیٹی اس کے گھر میں آن دھمکی۔ خود زمین تیسری بیٹی کی پیدائش پر چپکے چپکے بہت روئی اور دوسروں کے سامنے اپنے غم کا اظہار نہیں کر رہی تھی لیکن تیسری بیٹی کی پیدائش پر اس کے دل کا خون ہو گیا تھا۔ اسے لگتا تھا جیسے وہ اس غم کو برداشت نہیں کر پائے گی لیکن غم چاہے جتنے شدید کیوں نہ ہوں' انسان انہیں جھیل لیتا



ہے اور اسے کبھی بھی اس بات کا صحیح طور پر اندازہ نہیں ہو پاتا کہ اس کے اندر کتنا زیادہ غم برداشت کرنے کی قوت اور صلاحیت موجود ہے۔

روٹیاں تو گنی چنی تھیں اور ان کے طلب گار ہاتھوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ نتیجتاً ہر ایک کے حصے میں آنے والے نوالوں کی تعداد گھٹ رہی تھی اور زیادہ نوالوں کا حصول دشوار تر ہوتا جا رہا تھا۔ زمین اب چار بچوں کی ماں تھی' جن میں صرف ایک بیٹا تھا اور تین بیٹیاں تھیں۔ بچوں کی تعداد میں اضافے کے ساتھ ساتھ گھر کے کام کاج میں اتنا زیادہ اضافہ ہو گیا تھا کہ اس کو دم مارنے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ سب سے بڑی بیٹی جنت' صغرا کی پیدائش کے وقت صرف سات سال کی تھی اور وہ گھر کے کام کاج میں چھوٹے بھائی بہنوں کو سنبھالنے میں ماں کی کسی حد تک مدد کر دیتی تھی۔

صغرا کی پیدائش کے بعد سے زمین سے' بچوں سے' گھر سے گامو کی دلچسپی اور بھی کم ہو گئی تھی۔ وہ گھر میں آتا تو یہاں کی بیزار کن فضا میں اسے اپنے لئے کوئی کشش محسوس نہ ہوتی۔ بچے اِدھر اُدھر بھٹک رہے ہوتے' زمین میلے کچیلے کثیف کپڑوں میں ملبوس' بکھرے ہوئے بالوں اور میلے میلے چہرے کے ساتھ گھر کے کبھی نہ ختم ہونے والے کاموں میں مصروف رہتی۔ وہ اسے کسی بچے کے بیمار ہونے کی اطلاع دیتی یا آٹے کے کنستر کے خالی ہونے کی خبر سناتی یا گھر میں کسی چیز کی ضرورت کے لئے کہتی تو گامو کا ہاتھ اپنی خالی جیبوں میں گھومتا رہتا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کا دماغ بھی گھومتا رہتا۔

گامو کا زیادہ تر وقت اب باہر گزرنے لگا تھا اور وہ دوستوں کے ساتھ اِدھر اُدھر بیٹھا رہتا تھا اور یہیں سے غم غلط کرنے کی غرض سے اس نے ہیروئن کا استعمال شروع کر دیا' جس کا رفتہ رفتہ وہ عادی ہوتا گیا۔ اللہ داد خان کے آدمیوں نے ایک اور شکار حاصل کر لیا تھا جیسے جیسے وہ نشے کا عادی ہوتا گیا ویسے ویسے اس کی کام کرنے کی قوت گھٹتی گئی اور اس کے ساتھ ہی اس کو ملنے والی مزدوری بھی گھٹتی گئی اور اس کے نتیجے کے طور پر گھر میں کنستر میں آٹا گھٹتا گیا' ہر ایک کے پیٹ کو ملنے والے ٹکڑوں میں کمی ہوتی گئی اور میاں بیوی کے درمیان کبیدگی' کشیدگی اور تصادم میں اضافہ ہوتا گیا۔

☆==========☆==========☆

شادی کے ابتدائی دنوں کے محبت آمیز اور ولولہ انگیز جذبے تو اب جیسے خواب و خیال ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کی جگہ خشونت آمیز صدموں سے بوجھل ہر وقت کی تکرار تھی جس میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

نشہ گامو کے وجود کو دیمک کی طرح چاٹے جا رہا تھا اور اس کو ملنے والے کام میں بڑی تیزی کے ساتھ کمی ہوتی جا رہی تھی۔ زیبن کے لئے گھر کے چولھے کو روشن رکھنا دشوار سے دشوار تر ہوتا جا رہا تھا۔

جب چوتھی بیٹی کلثوم پیدا ہوئی تو اس وقت تک گامو کی یہ حالت ہو چکی تھی کہ اسے کئی کئی دن تک کوئی کام نہیں ملتا تھا۔ نشہ اس کو کھا رہا تھا۔ اس کی جسمانی قوت بڑی تیزی کے ساتھ زائل ہوتی جا رہی تھی' اس سے بوجھ نہیں اٹھایا جاتا تھا۔ منڈی میں صحت مند اور طاقتور مزدوروں کی کمی نہیں تھی جو بڑی آسانی سے بوجھ ڈھو سکتے تھے۔ ایسے میں گامو جیسے ہیروئنچی کو کون کام دیتا؟ اس سے تو اب کام ہوتا بھی نہیں تھا۔

زیبن آٹھ آٹھ آنسو روتی تھی اور گامو کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کرتی تھی لیکن گامو تو پتھر کا بنتا جا رہا تھا۔ اسے اپنے گھر کی' بیوی کی' بچوں کی کوئی فکر نہیں تھی۔ اسے تو بس رات دن ایک گونہ بے خودی کی ضرورت تھی جس میں ڈوب کر وہ اپنے سارے دکھ درد بھول جائے لیکن یہ ایک ایسی بے خودی تھی جس کی حدیں بے حسی سے جا ملتی تھیں۔ وہ خود بھی مر رہا تھا اور اپنے ساتھ اپنے ان گھر والوں کو بھی مار رہا تھا جن کی کفالت کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی تھی۔

پھر ایک وقت وہ آیا جب گھر میں فاقے ہونے لگے۔ گامو اب کوئی کام نہیں کرتا تھا اور وہ نشے کے لئے زیبن سے پیسے مانگتا تھا۔ زیبن کے پاس جو کچھ تھوڑے بہت پیسے محفوظ تھے' وہ ان میں سے ایک پائی بھی خرچ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ سب کچھ تو اس کی بیٹیوں کی امانت تھا۔ اس کے سینے پر تو چار چار بیٹیوں کا بوجھ دھرا ہوا تھا اور میاں ہیروئن کا زہر چاٹ چاٹ کر اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر رہا تھا۔ اسے قتل ہونے سے کوئی روک نہیں سکتا تھا۔ وہ شریک جرم ہونے کے لئے اسے پیسے کیوں دیتی؟ زیبن پیسے دینے سے انکار کرتی تو گامو اس کو گالیاں دیتا' برا بھلا کہتا اور پھر اس پر ہاتھ اٹھاتا۔ زیبن جواباً چیخ چیخ کر اسے گالیاں دیتی' برا بھلا کہتی اور مزاحمت کرتی اور اس وقت ان دونوں کے درمیان صرف نفرت کا دریا موجزن ہوتا تھا۔

گامو نے اب کام پر جانا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ نہ اس کو کوئی کام دیتا تھا اور نہ اس میں کام کرنے کی قوت باقی رہی تھی۔ وہ جب باہر نکلتا تو اِدھر اُدھر سے کسی سے قرض ادھار لے کر مانگ مانگ کر ہیروئن کی ایک پڑیا حاصل کرنے کی کوشش کرتا جسے وہ اپنے سارے دکھوں کا مداوا سمجھتا تھا لیکن اب تو دوست احباب اس کو قرض بھی نہیں دیتے تھے اور



اللہ داد خاں کے اڈے پر ادھار بالکل نہیں چلتا تھا۔ بغیر پیسے کے پڑیا مانگنے والوں کو اللہ داد خاں کے کارندے دھکے مار کر اڈے سے باہر نکال دیتے تھے۔

گامو نے اب اس کے لئے ایک دوسرا راستہ اختیار کیا تھا۔ وہ گھر کی چھوٹی موٹی چیزیں چپکے سے اٹھا لاتا تھا اور انہیں اونے پونے بیچ کر پڑیا حاصل کر لیتا تھا۔ پڑیا ہی اب اس کی زندگی تھی۔ پڑیا کے علاوہ اسے اب کسی چیز سے دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اس نے اپنے پورے وجود کو ایک ننھی سی پڑیا میں قید کر لیا تھا۔

گھر میں جب فاقے پر فاقے ہونے لگے اور قرض لینے کے سارے وسائل نے بھی جواب دے دیا تو پھر زیبن نے خود نوکری کر لی۔ اس نے شہر کے ایک مالدار گھرانے میں جس کے سربراہ کا نام چوہدری نورالدین تھا' گھریلو ملازمہ کی حیثیت سے نوکری کر لی۔ یہ نوکری بھی اس کو بڑی مشکل سے ملی تھی۔ کیونکہ کام کرنے والیوں کی تعداد زیادہ تھی اور ان کے لئے کام بہت کم تھا۔

زیبن کے نوکری کر لینے کے بعد گامو اور بھی زیادہ بے پروا ہو گیا۔ پہلے اگر کبھی بھولے بھٹکے بیوی بچوں کے بارے میں خیال کی کوئی درد انگیز رو اس کے دماغ میں دوڑ بھی جاتی تھی تو اب وہ ساکت ہو گئی تھی۔ وہ خوش تھا کہ اب وہ زیبن سے پڑیا کے لئے پیسے مانگ سکے گا اور اس کو گھر کی چھوٹی موٹی چیزوں پر ہاتھ صاف کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

لیکن زیبن اس کو نشے کے لئے پیسے دینے پر آمادہ نہیں ہوتی تھی۔ وہ جان توڑ محنت کر کے سارا سارا دن ذلتیں سہہ کر اور زیادتیاں برداشت کر کے نوکری سے جو تھوڑی بہت رقم کماتی تھی' وہی رقم اب اس کا واحد سہارا تھی۔ اس رقم سے سے گھر کا چولھا روشن رکھنا تھا۔ اسی رقم سے اپنا اور اپنے بچوں کا تن ڈھانپنا تھا اور اس رقم سے ریزہ ریزہ جمع کر کے اسے وہ توشے تیار کرنے تھے جنہیں وہ اپنی چار بیٹیوں کے حوالے کر کے انہیں اپنے گھر سے رخصت کر سکے۔ اس کے علاوہ آمدنی کا اب کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ وہ گامو کی طرف سے اب بالکل مایوس ہو گئی تھی۔ اس نے اور سب لوگوں نے ساری کوششیں کر کے دیکھ لی تھیں لیکن گامو نہیں سدھرا تھا۔ اس کی صحت روز بروز گرتی جا رہی تھی۔ وہ کمزور و ناتواں ہوتا جا رہا تھا۔ وہ جسمانی اور ذہنی ہر اعتبار سے انحطاط و زوال کا شکار تھا۔

جب زیبن اسے نشے کے لئے پیسے دینے سے انکار کرتی تھی تو گھر میں زور کا معرکہ

برپا ہوتا تھا۔ مار کٹائی کی نوبت آ جاتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے بچے چیخ چیخ کر رونے لگتے تھے اور ناصر عام طور سے گھبرا کر گھر سے باہر بھاگ جاتا تھا۔ پھر عام طور سے پڑوس میں رہنے والی ماسی خیراں آ کر نکھٹو ہیرو پنچی گامو کو برا بھلا کہتی' اسے شرم و غیرت دلانے کی کوشش کرتی اور زیبن کو اس کے پنجے سے چھڑاتی۔

بچے باپ کی شفقت اور محبت سے تو محروم ہو ہی چکے تھے۔ ماں کی محبت بھی جھلاہٹ' جھنجھلاہٹ اور کڑواہٹ کے دبیز پردوں میں چھپ کر رہ گئی تھی۔ زیبن بچوں پر جان چھڑکتی تھی۔ انہی کے پیٹ کو روٹی اور تن کو کپڑا دینے کے لئے وہ اپنے آپ کو سارا سارا دن گھلاتی رہتی تھی لیکن ان کی ذرا ذرا سی شوخیوں' شرارتوں اور غلطیوں پر اس کے تلخیوں سے بھرے ہوئے وجود میں ایک آگ سی بھڑک اٹھتی اور وہ ان کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتی۔ باپ کی شفقت سے محروم بچے ماں سے بھی خوفزدہ رہتے تھے۔

گامو کے لئے اس کے دل میں نفرت آمیز ہمدردی کی لہریں اٹھتیں اور ڈوب جاتیں۔ اس نے گامو کے ساتھ اپنی زندگی کے جو بہترین دن گزارے تھے' ان کی تو اب یادیں بھی ناقابل یقین بن چکی تھیں..... کیا واقعی گامو کبھی ایسا بھی تھا؟

زیبن کام پر چلی جاتی تو سب سے بڑی بیٹی جنت چھوٹے بھائی بہنوں کو سنبھالتی۔ گھر کا سارا کام کاج بھی کرتی۔ دوپہر کو کھانا پکاتی اور بھائی بہنوں کو کھلاتی۔ باپ بھی اگر گھر میں موجود ہوتا تو اس کو بھی کھلاتی۔ گامو عام طور سے دوپہر کو گھر سے نکل جاتا تھا اور پھر رات گئے کسی وقت آ کر سو جاتا تھا۔ زیبن کو تو اکثر اس کے آنے کی خبر بھی نہیں ہوتی تھی کیونکہ اس وقت وہ سو رہی ہوتی تھی۔

اس انداز کی زندگی گزارتے ہوئے وہ سب کے سب کسی نامعلوم منزل کی طرف رواں دواں تھے۔

زیبن کو اب اپنی اور گامو کی کوئی خاص فکر نہیں تھی۔ اس نے گامو کو تو صبر کر لیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ بڑی تیزی کے ساتھ اپنی قبر کی طرف بھاگ رہا تھا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ موت کی جانب اس دوڑ میں گامو تنہا نہیں ہے' کئی اور لوگ بھی تھے جنہیں یہ زہریلی پڑیاں چاٹ رہی تھیں اور ان پڑیوں کے کاروبار کو کوئی مائی کا لال نہیں روک سکتا تھا۔ زیبن کی ساری توجہ اور سارے فکر و تردد کا مرکز اس کی بیٹیاں تھیں۔ بیٹے کا تو کچھ نہیں تھا۔ وہ تو مرد ذات تھا' کچھ بھی کر سکتا تھا۔ کہیں سے بھی وہ روٹی کمانے کا



بندوبست کر سکتا تھا لیکن لڑکیاں تو آبگینے کی طرح نازک ہوتی ہیں اور آبگینے میں اگر ذرا سا بھی بال آ جائے تو اس کی قدر و قیمت ختم ہو جاتی ہے اور وہ کسی ٹھیکرے کی طرح بے مایہ ہو جاتا ہے۔ زیبن اپنی چاروں بیٹیوں کے بارے میں سوچتی تھی اور یہ چاہتی تھی کہ شادی کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی پہلے وہ اپنے اپنے گھروں کی ہو جائیں۔ نصرت' صغرا اور کلثوم تو ابھی بہت چھوٹی تھیں لیکن جنت اب گیارہ سال کی ہو چکی تھی اور زیبن کو اسے دیکھ کر خوف محسوس ہوتا تھا۔

نیم فاقہ کشی' غربت اور تنگ دستی کی فضا میں پرورش پانے کے باوجود گیارہ سالہ جنت ایک بولتا ہوا نسوانی پیکر بنتی جا رہی تھی۔ اس کی اٹھان ایسی تھی کہ وہ اپنی عمر سے چند سال بڑی ہی نظر آتی تھی۔ اس کا قد درمیانہ اور جسم بھرا بھرا تھا اور اس کے گول اور چکنے چکنے چہرے سے نوجوانی کا گرم و سرخ خون جیسے پھوٹا پڑتا تھا۔ اس کی گہری سیاہ اور بے حد روشن اور چمکدار آنکھوں میں زندگی انگڑائیاں لیتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ جب وہ چلتی' پھرتی' بھاگتی دوڑتی تھی تو اس کے انگ انگ سے توانائیاں موجیں مارتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔

"بس زیادہ سے زیادہ دو ایک سال اور....." زیبن لرز کر سوچتی۔ "اس سے زیادہ نہیں..... اس کے بعد اس کو اپنے گھر کا ہو جانا چاہئے۔ میرے سوا اس کا اور کون بیٹھا ہے؟ باپ تو مردے سے بدتر ہے۔"

لیکن وہ جنت کی شادی کے بارے میں سوچتی تو اس کی آنکھوں کے آگے دھند چھانے لگتی اور دماغ میں غبار سا بھر جاتا..... شادی کیسے ہو گی؟ کہاں سے ہو گی!

اس نے تو جنت کی پیدائش کے پہلے دن سے ہی اس کی شادی کے بارے میں سوچنا اور بندوبست کرنا شروع کر دیا تھا اور ناصر کی پیدائش کے بعد سے تو بیٹیوں کی لائن لگ گئی تھی۔ اس نے ان کے لئے کچھ نہ کچھ تو جوڑنا تھا لیکن جو کچھ جوڑا تھا اس کا بڑا حصہ اس کا شوہر چپکے چپکے زہریلی پڑیوں کی خریداری پر خرچ کر چکا تھا اور اس کو تو کافی دیر سے اس بات کا پتہ چلا تھا اور اس دن سے وہ پوری طرح محتاط ہو گئی تھی۔ اب تو وہ ایک ایک پائی چھپا کر رکھتی تھی۔ جو دو ایک چھوٹے موٹے زیور گامو کی دستبرد سے بچ رہے تھے انہیں بھی اس نے ماسی خیراں کے پاس رکھوا دیا تھا۔

وہ سارا دن چوہدریوں کے ہاں کام میں لگی رہتی اور اب اس کا ذہن بار بار بھٹک کر جنت کی طرف چلا جاتا تھا۔ جنت تو امربیل کی طرح بڑھ رہی تھی اور اس کی طرف سے

بہت سارے خدشات اس کے دل و دماغ میں پیدا ہو رہے تھے۔ گھر میں چھوٹے بچوں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوتا تھا۔ جنت سے بڑا گھر میں کوئی نہیں تھا۔

اس روز شام ڈھلے جب وہ کام سے گھر واپس آئی تو اس نے خلاف معمول جنت کو گھر میں موجود نہیں پایا۔ باقی چاروں بچے گھر کے کچے آنگن میں اودھم مچا رہے تھے۔

"چپ ہو جاؤ کمبختو.....!" وہ زور سے چلائی۔ "جنت کہاں ہے؟"

"آپا....." ناصر نے سمٹ کر ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا۔ "آپا تو مراد کے ساتھ گئی ہیں۔"

زمین کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

"کیوں گئی وہ مراد کے ساتھ؟" اس نے غیظ و غضب کے عالم میں آنکھیں نکال کر ناصر سے گرج کر پوچھا اور اس کے ساتھ ہی ایک زور کا دوہتڑ اس کی پشت پر مارا۔ "کہاں گئی ہے وہ؟"

"مجھے نہیں معلوم اماں۔" ناصر بلبلا کر اپنی جگہ سے اچھل پڑا لیکن غصے میں بھری ہوئی زمین نے اس کو چھوڑا نہیں۔ اس نے اس کے منہ پر ایک اور تھپڑ مارتے ہوئے چلا کر کہا۔ "کیوں نہیں معلوم تجھے کمینے.....؟ کیوں نہیں پوچھا تُو نے اس سے کہ وہ کہاں جا رہی ہے اور کیوں جا رہی ہے؟" جھنجھلاہٹ اور غصے کے عالم میں اس نے ناصر کی پیٹھ پر کئی تھپڑ رسید کر دیئے۔ ناصر مار کھا کر بری طرح رونے لگا۔ نصرت اور صغرا سہم کر ایک دوسرے کونے میں چلی گئیں اور دو سالہ کلثوم گھبرا کر زور زور سے رونے لگی۔

"چپ کیوں نہیں کراتی اسے؟" زمین نصرت پر زور سے چلائی اور اپنا تھیلا چارپائی پر رکھ کر چادر کو ایک طرف پھینک کر اندر کمرے کی طرف بڑھی۔ خوفزدہ چھ سالہ نصرت اپنی دو سالہ روتی بہن کو سنبھالنے لگی۔

گھر میں بچوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ گامو تو حسب معمول غائب تھا۔

"بھیک مانگ رہا ہو گا کہیں ایک پڑیا کی۔" زمین نے بڑی زہر آلود نفرت کے ساتھ سوچا۔ "سب کے آگے ہاتھ پھیلاتا پھرتا ہے اس کا بس چلے تو پڑیا کے لئے مجھے اور بچوں کو بھی بیچ دے۔" شدید غم و غصے کے عالم میں اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

گامو کا باپ تو بہت عرصہ پہلے ہی ٹانگ ٹوٹ جانے کی وجہ سے مر گیا تھا۔ گامو کی ماں بھی اپنے شوہر کی موت کے کوئی سال بھر کے بعد اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ ساس جب تک زندہ رہی زمین کو اس سے کافی سہارا رہا۔ وہ بچوں کی دیکھ بھال بھی کر لیتی تھی اور



گامو کو بھی سنبھالنے کی کوشش کرتی تھی لیکن اس کی موت کے بعد سے تو سب کچھ بالکل ہی منتشر ہو کر رہ گیا تھا۔ زمین کام پر چلی جاتی تو گھر پر بچوں کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ ہوتا۔

مراد چودہ سال کا تھا جو تین جھگیاں چھوڑ کر پیچھے رہنے والے ایک سبزی فروش یونس کا بیٹا تھا۔ سال ڈیڑھ سال پہلے وہ تقریباً بلا روک ٹوک اس گھر میں آیا کرتا تھا اور زمین کے بچوں کے ساتھ کھیلتا کودتا رہتا تھا۔ زمین کے سب ہی بچے اس سے چھوٹے تھے جنت اس سے تین سال چھوٹی تھی۔

جنت ایک دم سے بڑی ہونے لگی۔ یا شاید زمین کو یہ احساس ہونے لگا کہ جنت ایک دم سے بڑی ہو گئی ہے۔ کسی کسی وقت تو وہ زمین کو ایک پوری جوان لڑکی کی طرح نظر آنے لگتی تو زمین کی آنکھوں میں خوف اور تشویش کے سائے لہرانے لگتے اور پھر اس نے سہم کر مراد کو اپنے گھر آنے جانے سے روک دیا۔ اس سے پہلے تو مراد اور جنت کچھ دیر کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ گھر سے باہر بھی کہیں ادھر اُدھر چلے جاتے تھے لیکن پھر زمین نے جنت کو سختی کے ساتھ منع کر دیا کہ وہ مراد کے ساتھ کہیں بھی باہر اِدھر اُدھر نہ آئے جائے اور نہ ہی ماں کی عدم موجودگی میں اس کو گھر کے اندر آنے دے۔

مراد، غیر برادری کا لڑکا تھا اور زمین جس حلقے سے تعلق رکھتی تھی وہاں خاندان اور برادری کے نام پر انسانی زندگیوں کو قربان کر دینا ایک معمولی سی بات تھی۔ صدیوں پرانے فرسودہ رسم و رواج قدروں کا روپ دھارے ہوئے انسانی وجود سے بھوت پریت کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔ اسی لئے زمین ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ مراد اور جنت کا میل جول بڑھے اور کوئی اونچ نیچ ہو جائے۔ مراد اور اس کا گھرانہ زمین کے لئے ناقابل قبول تھا اور جس قدر وہ لوگ زمین کے لئے ناقابل قبول تھے اسی قدر جنت اور اس کا گھرانا، مراد کے باپ یونس اور اس کے گھر والوں کے لئے ناقابل قبول تھا۔ یہ چھوٹے چھوٹے بے معنی اور لایعنی خانوں میں بٹی ہوئی دنیا تھی جس کی حد بندیاں اب بھی کافی مضبوط تھیں۔

آج سے چند روز پہلے بھی ایک شام کو جب زمین گھر واپس آ رہی تھی تو اس نے مراد کو گلی کے نکڑ پر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ مراد نے اس کو دیکھ کر سلام بھی کیا تھا اور زمین خشک انداز میں جواب دیتے ہوئے آگے بڑھ گئی تھی۔

گھر آنے کے بعد زمین نے جنت سے پوچھا تھا کہ آیا مراد یہاں آیا تھا۔

"ہاں اماں!" جنت نے سہم کر کہا۔ وہ جھوٹ نہیں بولنا چاہتی تھی کیونکہ اس کا

ذہن ابھی تک اس پابندی سے مفاہمت نہیں کر سکا تھا جو اس کی ماں نے اس کے اور مراد کے میل جول پر لگائی تھی اور اس کے اپنے معصومانہ جذبات و خیالات کے مطابق اس کے اور مراد کے ایک دوسرے سے ملنے جلنے میں قطعاً کوئی حرج نہیں تھا۔ مراد تو بہت اچھا لڑکا تھا اس کے ساتھ اس کی بہت پکی دوستی تھی۔ وہ اس کے چھوٹے بھائی بہنوں کا بھی خیال رکھتا تھا ابھی پچھلے ہی ہفتے اس نے ناصر کو ایک لٹو لا کر دیا تھا سب بچے بھی مراد کو پسند کرتے تھے اور اس کے ساتھ کھیل کود کر خوش ہوتے تھے۔

"کیوں آیا تھا....." زمین نے ماتھے پر درجن بھر شکنیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"وہ..... بس ویسے ہی اماں۔" جنت نے رک رک کر کہا۔ "ادھر سے گزر رہا تھا تو ہمارے گھر بھی جھانکتا چلا گیا..... رکا نہیں۔ بس ذرا دیر دروازے میں کھڑا رہا تھا اور پھر چلا گیا۔"

"میں نے تجھ سے پہلے بھی کتنی بار کہا ہے اس کے ساتھ ہمارا میل جول ٹھیک نہیں ہے۔" زمین نے خشونت آمیز لہجے میں کہا۔ "اس کی برادری کچھ اور ہے ہماری کچھ اور ہے۔ اس کو ہمارے گھر آنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

جنت کی سمجھ میں یہ بات بالکل نہیں آتی تھی۔ آخر یہ برادری کیا چیز ہوتی ہے اور اس کی بنیاد پر ایک انسان کو دوسرے انسان سے الگ کیوں کیا جاتا ہے۔ اسے تو مراد اپنے ہی لوگوں جیسا ایک انسان ایک لڑکا لگتا تھا۔ جیسے سب لڑکے ہوتے ہیں ویسے ہی مراد بھی تھا۔ اسے مراد میں آج تک کوئی برائی نظر نہیں آئی تھی۔ تو پھر آخر یہ برادری کیا چیز تھی؟ یہ کہاں پائی جاتی تھی؟ اور کیوں پائی جاتی تھی؟ اور ایک برادری کے فرد کی دوسری برادری کے کسی فرد کے ساتھ میل جول میں کیا رکاوٹ تھی' اور کیوں تھی؟

"میں نے اس کو نہیں بلایا تھا اماں۔" اس نے اپنا دفاع کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"بلائے گی کیسے.....؟" زمین نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "تیری تو میں ہڈی پسلی ایک کر دوں گی۔ خبردار جو اب اس کو گھر میں بلانے کا نام بھی لیا ہو گا تُو نے۔ چل دور ہو۔ چھوٹی کو دیکھ' جب سے میں گھر میں آئی ہوں روئے جا رہی ہے۔ ہر وقت جیسے اپنے نصیبوں کو بھی روتی رہتی ہے بدنصیب۔"

جنت جلدی سے اس کے پاس سے بھاگ کر روتی ہوئی کلثوم کے پاس پہنچ گئی اور اسے اٹھا کر' کندھے سے لگا کر' چپ کرانے کی کوشش میں مصروف ہو گئی۔



اس واقعے کو ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ آج جنت مراد کے ساتھ گئی ہوئی تھی' اس نے غصے میں آکر سب سے پہلے ناصر کو پیٹ ڈالا اور پھر چلاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

وہ اپنی چارپائی پر بیٹھی ہوئی دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ بچے سہمے ہوئے ایک کونے میں دبکے ہوئے تھے۔ ناصر کچھ دیر تک رونے کے بعد خاموش ہو گیا تھا اور اب وہ چوری چوری زمین کے اس تھیلے کی طرف دیکھ رہا تھا جو صحن میں چارپائی پر پڑا ہوا تھا اور یہ سوچ سوچ کر ہی اس کے منہ میں پانی آ رہا تھا کہ آج نہ جانے کون کون سی نعمتیں اس جادو کے تھیلے میں سے برآمد ہوں گی۔ نصرت جو کلثوم کو گود میں لئے بیٹھی تھی اور اس کی نظریں بھی بار بار تھیلے کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

اس وقت کھلے ہوئے دروازے سے جنت اندر داخل ہوئی اور سب سے پہلے اس کی نظر صحن میں بچھی ہوئی چارپائی پر پڑے ہوئے تھیلے پر پڑی۔ تھیلے کی یہاں موجودگی کا مطلب تھا کہ اماں آ گئی تھیں۔ چھوٹے بھائی بہنوں کے سہمے ہوئے چہرے بھی اس امر کا پتہ دے رہے تھے کہ اماں آ چکی ہیں۔

"اماں آ گئی ہیں؟" اس نے سہم کر سرگوشی میں ناصر سے پوچھا۔

"ہاں۔" ناصر نے گھٹنوں پر سے اپنا چہرہ اٹھاتے ہوئے جنت کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں پوچھ رہی تھیں' اور مجھے مار رہی تھیں۔" جنت اور بھی زیادہ سہم گئی۔

زمین نے جنت کے بولنے کی آواز سن لی تھی۔ "ادھر آ۔" وہ کمرے سے زور سے چلائی۔ جنت ڈرتے ڈرتے کمرے کے اندر داخل ہوئی اور مجرموں کی طرح اماں کے سامنے جا کھڑی ہو گئی۔

"کہاں گئی تھی تُو؟" زمین نے اس کو کڑی نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"وہ..... اماں..... پچھلی گلی سے ایک بارات جا رہی تھی....." جنت نے سنبھل سنبھل کر کہا۔ "وہ دیکھنے گئی تھی۔"

"کیوں؟ کیا تیرے باپ کی بارات تھی وہ؟" زمین نے آنکھیں نکال کر کہا۔ "ساتھ میں کون تھا تیرے؟"

"وہ۔ اماں۔ مراد آیا تھا۔" جنت نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "اس نے مجھے بتایا تھا کہ پچھلی گلی میں بارات جا رہی ہے وہ دیکھنے جا رہا تھا میں بھی اس کے ساتھ چلی گئی....."

"کیوں چلی گئی تُو اس کے ساتھ؟" زیبن نے ایک ہاتھ سے اس کے بال پکڑ کر اس کے منہ پر ایک گھونسہ مارتے ہوئے چلا کر کہا۔ "کیوں گئی تھی تُو؟ نکھٹو باپ کی اولاد..... کتنی مرتبہ تجھ کو منع کیا ہے کہ اس کے ساتھ مت آیا جایا کر۔ مگر تیرے اوپر تو کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔ تو سمجھتی ہے کہ میں بھونکتی رہوں گی اور بھونک بھونک کر چپ ہو جاؤں گی..... میں اچھی طرح جانتی ہوں تجھ کو۔" وہ غصے میں چلاتی جاتی تھی اور جنت کو تھپڑوں اور گھونسوں سے مارتی جاتی تھی۔ اس وقت اس پر ایک جنون کی سی حالت طاری تھی اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ جنت کے ٹکڑے کر کے پھینک دے۔

جنت کوئی مزاحمت نہیں کر رہی تھی۔ وہ بڑی خاموشی اور بے بسی کے ساتھ رو رہی تھی۔ اس کی سسکیوں کی آواز شروع میں ہلکی تھی اور پھر بعد میں تیز ہوتی گئی۔

کمرے کے باہر بیٹھے ہوئے چھوٹے بچے خوف کے عالم میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے بیٹھے تھے۔ ناصر چاہتا تھا کہ اٹھ کر باہر بھاگ جائے لیکن اس سے جایا نہ گیا۔ اماں آپا کو مار رہی تھیں اور آپا رو رہی تھیں۔ وہ آپا کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔

اسی وقت ماسی خیراں گھر کے اندر داخل ہوئی اس نے چاروں چھوٹے بچوں کو آنگن میں ایک کونے میں سکڑے سمٹے بیٹھے ہوئے دیکھا اندر سے زیبن کے چلانے کی اور کسی کے سسکیاں لے لے کر رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"ماں کہاں ہے تمہاری؟" ماسی خیراں نے بچوں سے پوچھا۔

"اندر۔" ناصر نے انگلی سے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اور ماسی خیراں سیدھی اس طرف چلی گئی۔ جب وہ اندر کمرے میں پہنچی تو اس نے دیکھا کہ زیبن اپنی بیٹی کے بال پکڑے ہوئے اسے برا بھلا کہہ رہی تھی اور جنت رو رہی تھی۔

"ارے کیوں مار رہی ہو اس بے چاری کو؟" ماسی خیراں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "چھوڑو۔ سیانی لڑکی پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔"

زیبن نے جنت کو چھوڑ دیا جنت جلدی سے روتی اور سسکیاں لیتی ہوئی، کمرے سے باہر چلی گئی۔ وہ باہر جا کر آنگن کے ایک کونے میں اپنا سر گھٹنوں میں دے کر بیٹھ گئی اور چپکے چپکے رونے لگی۔ ناصر، نصرت اور صغرا تینوں اس کے پاس آ گئے۔ ناصر نے دو سالہ کلثوم کو بھی گود میں اٹھا رکھا تھا۔

کمرے کے اندر ماسی خیراں زیبن سے باتیں کر رہی تھی۔

"بے باپ کی بچی ہے ماسی خیراں۔" زیبن جلے بھنے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ "ہاں۔



میں اسے بے باپ کی ہی کہوں گی۔ باپ کہنے کو تو زندہ ہے۔ مگر کس کام کا؟ مردے سے بدتر نصیب۔ اولادیں پیدا کر کے بس سب کچھ چھوڑ بیٹھا ہے ..... اس کے کرموں کا بھگتان بھگتنے کے لئے بس میں ہی رہ گئی ہوں۔ وہ....."

"ارے تو ہوا کیا؟" ماسی خیراں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے کہا۔ "بات تو بتا۔ کیا ہوا؟"

"دیکھ نا ماسی..... میں نے اسے کتنی بار منع کیا ہے کہ اس نامراد مراد کے ساتھ میل جول نہ رکھے..... غیر برادری کا لڑکا ہے۔"

"کون مراد؟" ماسی خیراں نے جلدی سے کہا۔ "وہی یونس سبزی فروش کا بیٹا؟"

"ہاں، ہاں وہی ماسی۔" زیبن نے کہا۔ "اب یہ اتنی ننھی بچی تو نہیں ہے دودھ پیتی۔ خدا نہ کرے کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو میں تو بے موت ماری جاؤں گی۔ پہلے ہی کیا کم مصیبتیں لگی ہوئی ہیں میری جان کو کہ اور نئے نئے عذاب مول لے لوں۔ یہ بدنصیب ہے کہ سمجھتی ہی نہیں ہے بات کو۔ دس دفعہ منع کر دیا۔ اس کے ساتھ میل جول نہ رکھے اور وہ بھی ایسا منحوس ہے گھوم پھر کر اس گھر کے چکر لگائے جائے گا جیسے یہ اس کے باپ کا گھر ہے آئندہ اگر ادھر نظر آیا تو ٹانگیں توڑ دوں گی....."

"پاگل مت بنو زیبن۔" ماسی خیراں نے اس کو محبت آمیز لہجے میں ڈانٹتے ہوئے سمجھایا۔ "عقل سے کام لو۔ کیوں اپنا تماشا بنوانا چاہتی ہو خواہ مخواہ ..... بلاوجہ کی بات کیوں کر رہی ہو؟ ایک تو تم کو سیانی لڑکی پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہئے۔ اب اس کی عمر ایسی نہیں ہے کہ تم اس کو چھوٹے بچوں کی طرح مارو اور مراد سے یا اس کے گھر والوں سے کوئی ایسی ویسی بات نہ کہنا۔ اس سب کی بجائے کرو یہ کہ جنت کے لئے رشتہ تلاش کرو اور اس کے ہاتھ پیلے کرنے کی کوشش کرو۔ پہلے تو بات پکی کر لو۔ سال دو سال میں وہ شادی کے قابل ہو جائے گی تو اپنے گھر چلی جائے گی۔ تمہارے سر سے بوجھ ختم ہو جائے گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے ماسی۔" زیبن نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "چاہتی تو میں بھی یہی ہوں لیکن یہی سوچتی ہوں کہ کیا کروں کس طرح کروں، ہاتھ میں کچھ ہونا بھی تو چاہئے جو کچھ عرصہ پہلے تک جوڑ رکھا تھا وہ سب گامو نے نشے کی نذر کر دیا اب پھر سے جوڑ رہی ہوں۔ تم کو تو معلوم ہی ہے اب تو میں گھر میں کچھ رکھتی بھی نہیں ہوں۔"

"سال دو سال میں کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "اللہ سب کے

کام بناتا ہے تمہارے بھی بنائے گا۔"

"کیا کروں ماسی۔" زیبن نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "ایک ہو تو بھگت بھی لوں کسی نہ کسی طرح۔ یہاں تو چار چار پتھر کلیجے پر رکھے ہوئے ہیں۔ نصرت ابھی کہنے کو تو صرف چھ سال کی ہے لیکن وقت گزرتے کیا دیر لگتی ہے ماسی؟ اگلے چھ سال تو یوں گزر جائیں گے کہ پتہ ہی نہیں چلے گا..... اور پھر اس کے بعد صغرا ہے پھر کلثوم ہے..... نہ جانے میں تب تک زندہ بھی رہوں گی یا نہیں۔" اس پر رقت طاری ہو گئی اور وہ رونے لگی۔

"اللہ پر بھروسہ رکھو زیبن۔" ماسی خیراں نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "تم اتنی پریشان اور ناامید کیوں ہوتی ہو۔ اگر اللہ نے تم کو چار بیٹیاں دی ہیں تو ایک بیٹا بھی تو دیا ہے۔"

"ہاں ماسی۔" زیبن نے کہا۔ "بیٹا تو دیا ہے مالک نے بے شک مگر بس ایک ہی دیا اور وہ بھی ابھی بہت چھوٹا ہے۔"

"چھوٹا ہے تو کیا ہوا؟" ماسی خیراں نے کہا۔ "مرد ذات ہے اسے کام پر لگا دو کچھ کمائی کر کے لائے گا اور تمہارے ہاتھ پر دھرے گا تمہارا کچھ بوجھ ہلکا ہو گا۔"

"وہ کمائی کرے گا؟" زیبن نے قدرے حیرت اور افسوس کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کہا۔ "وہ تو ابھی صرف آٹھ سال کا ہے ماسی خیراں۔ وہ بھلا کیا کمائی کر سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں کر سکتا؟" ماسی خیراں نے کہا۔ "اس کی عمر کے تو کتنے ہی لڑکے ساری دنیا میں کمائی کرتے پھرتے ہیں۔ دیکھو نا' باپ تو اس کا کچھ کرتا دھرتا نہیں ہے اور نہ ہی اس کی ذات سے اب کوئی امید ہے کہ وہ کچھ کرے گا اس نے پڑیاں چاٹنا شروع کر دیں اور پڑیوں نے اس کو چاٹ چاٹ کر بالکل خالی کر دیا۔ اب تم اپنے بیٹے سے کچھ کام لو۔ اللہ نے تمہیں بیٹا دیا ہے وہ ابھی کام کرنا شروع کرے گا تو نوجوانی کی عمر تک پہنچتے پہنچتے کتنا کچھ کما چکا ہو گا۔"

"بات تو تمہاری ٹھیک لگتی ہے ماسی خیراں۔" زیبن نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "یہاں گھر پر بھی وہ سارا دن کیا کرتا ہے؟ گھر کا سارا کام کاج تو جنت سنبھالتی ہے۔ ناصر کو کوئی ہانڈی چولہا تو نہیں کرنا پڑتا۔ مگر..... وہ کیا کام کرے گا؟ اور کون اسے کام کے پیسے دے گا؟ اسے تو کوئی کام آتا ہی نہیں ہے ہاں کسی گھر میں چھوٹے موٹے کاموں کے لئے لگ جائے تو الگ بات ہے..... لیکن اتنے چھوٹے بچے کو گھر میں بھی کون



ملازمت دے گا؟"

"ایسا نہیں ہے زیبن۔" ماسی خیراں نے اس سے کہا۔ "اس کی عمر کے لڑکے تو بہت کام کرتے ہیں اور ہزاروں روپے لا کر ماں باپ کو دیتے ہیں۔"

"ہزاروں روپے؟" زیبن نے چونک کر کہا اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ "وہ کیسے ماسی خیراں؟"

"میری نند کا نواسہ ہے مشتاق۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "اب تو اس کی عمر دس سال کی ہو گئی ہے۔ جب اس کا باپ مرا تھا تو سات سال کا تھا بڑی بہن چودہ برس کی تھی۔ باپ مرا تو گھر میں کچھ تھا ہی نہیں اور جو کچھ تھوڑا بہت تھا بھی تو وہ قرض خواہ لے گئے گھر میں خاک اڑنے لگی بیٹی کی شادی سر پر کھڑی تھی۔ کیا کرتے وہ لوگ؟ تو پھر انہیں کسی نے مشورہ دیا اور انہوں نے مشتاق کو قالین بُننے والے ایک کارخانے میں بٹھا دیا۔ کارخانے کے مالک نے انہیں کئی ہزار روپے دیئے۔"

"کئی ہزار روپے؟" زیبن نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "اس چھوٹے سے بچے کی نوکری....."

"ہاں بھئی کئی ہزار روپے۔" ماسی خیراں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "کئی ہزار روپے دیئے تھے کارخانے کے مالک نے مگر اس نے پکا کاغذ لکھوایا تھا اور اس پر لڑکے کی ماں کا انگوٹھا لگوایا تھا۔ ان پیسوں سے بیٹی کی شادی ہو گئی اور مشتاق نے قالین کے کارخانے میں کام شروع کر دیا۔ تو اب اسے مہینے کے تھوڑے سے پیسے بھی مل جاتے ہیں۔ قرض کی رقم تنخواہ میں سے ہر مہینے کٹتی رہتی ہے۔"

"اور یہ کب تک کٹتی رہے گی؟" زیبن نے اس سے پوچھا۔

زیبن کے اس سوال پر ماسی خیراں کچھ سوچ میں پڑ گئی۔ یہ بات تو خود اس کو معلوم بھی نہیں تھی کہ یہ رقم کب تک کٹتی رہے گی کب سارا قرض اترے گا اور کب مشتاق ایک آزاد انسان کی حیثیت سے کام کر سکے گا۔

"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔" اس نے قدرے توقف کے بعد جواب دیا۔ "لیکن دیکھو نا' قرض اتر تو جائے گا ایک نہ ایک دن..... اور پھر مہینے کے کچھ نہ کچھ پیسے تو برابر ملتے رہتے ہیں۔"

بے چاری ماسی خیراں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ قرض کبھی نہیں اترے گا اور سود در سود کے پُر فریب اور مکارانہ چکر میں جکڑا ہوا معصوم مشتاق کبھی بھی ایک آزاد مزدور کی

حیثیت نہ اختیار کر سکے گا تاوقتیکہ وہ کوئی غیر معمولی قدم نہ اٹھائے۔

"تم..... ناصر کے بارے میں سوچو۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "اس کو کام پر بٹھایا جا سکتا ہے جو اکٹھی رقم تم کو ملے اس کو تم جنت کی شادی کے لئے رکھ سکتی ہو۔ سال دو سال کے عرصے میں وہ شادی کے قابل ہو جائے گی۔ تم اطمینان سے اس کی شادی کرنا اور تمہارا بیٹا کمائی کرتا رہے گا۔ تم دونوں ماں بیٹے مل کر کمائی کرتے رہو گے تو اللہ چاہے گا تمہاری باقی بیٹیوں کے لئے بھی کوئی نہ کوئی راہ نکل آئے گی۔"

"بس تو پھر تم کچھ کرو ماسی خیراں۔" زمین نے مضطربانہ اور ہیجانی انداز میں کہا۔ کئی ہزار روپے کی بات سن کر اس کے دل و دماغ میں مسرت آمیز حیرت کی ایک لہر ابھری تھی جس نے اس کے سارے وجود میں سنسنی دوڑا دی تھی اسے تو اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس کو کئی ہزار روپے کی رقم یوں آسانی سے مل سکتی ہے۔ اس نے تو اس قیمتی سکے کی اصل قدر و قیمت کا ٹھیک سے اندازہ بھی نہیں لگایا تھا جو اس کے گھر کے آنگن میں بے توقیری کے ساتھ اُدھر اِدھر لڑھکتا پھرتا تھا۔

"میں کروں گی بات۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "میں کل ہی اپنی نند کی طرف جاؤں گی اس سے بات کروں گی۔ مشتاق سے بھی بات کروں گی اور پھر بتاؤں گی....."

"تم ان لوگوں سے معلوم کر لو ماسی خیراں....." زمین نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "پھر میں اور تم دونوں کارخانے کے مالک کے پاس چل کر اس سے بات کر لیں گے۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔" ماسی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں کل تم کو بتاؤں گی اور اب لڑکی کے ساتھ مار پیٹ بالکل مت کرو اس سے کچھ حاصل نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" زمین نے کہا اور ماسی خیراں کے ساتھ ساتھ کمرے سے باہر نکل آئی۔

"اری آٹا گوندھ لے جا کر باورچی خانہ میں۔" زمین نے جنت کی طرف رخ کر کے قدرے نرم اور مفاہمانہ لہجے میں کہا۔ "بچوں کو دیر ہو رہی ہے روٹی کے لئے۔"

ماسی خیراں چلی گئی اور زمین تھوڑی دیر تک صحن میں پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھی اس بڑی رقم کے بارے میں سوچتی رہی اور خوش ہوتی رہی جو اسے اپنے آٹھ سالہ بیٹے ناصر کے "برسرروزگار" ہونے کی صورت میں مل سکتی تھی۔ اس نے اس سے پہلے اس قسم کے معاملات کے بارے میں کچھ تھوڑا بہت سنا تو تھا لیکن اسے تفصیل کے ساتھ کچھ نہیں



معلوم تھا۔

اگلے دن شام کو جب وہ کام پر سے واپس آئی تو اس کو ماسی خیراں کی آمد کا بڑی شدت کے ساتھ انتظار تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ خود ہی ماسی خیراں کے گھر چلی جائے گی لیکن جب وہ گھر آئی تو اس نے کلثوم کو بخار میں تپتے ہوئے پایا۔ وہ اس کی دیکھ بھال میں لگ گئی اور ماسی خیراں کے گھر نہیں جا سکی۔ ماسی خیراں خود ہی کچھ دیر کے بعد اس کے پاس آ گئی۔

"فی الحال اس قالین کے کارخانے میں تو کوئی جگہ نہیں ہے۔" ماسی خیراں نے زمین کو بتایا۔ "میں آج گئی تھی اپنی نند کی طرف اور وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر کارخانے گئی تھی لیکن کارخانے کے مالک نے بتایا کہ آج کل بازار بہت مندا جا رہا ہے۔ مال کی زیادہ کھپت نہیں ہے۔ اس لئے کام کی گنجائش بھی نہیں ہے۔ پھر بھی اس نے اپنے ایک رشتے دار کے بارے میں بتایا ہے جس کا اینٹوں کا بھٹہ ہے۔ وہاں کام کرنے والوں کی ضرورت ہے۔ اگر تم کہو تو....."

"ارے ماسی خیراں' کہیں بھی ہو۔" زمین نے جلدی سے کہا۔ "قالین بُننے کا کارخانہ ہو یا اینٹیں بنانے کا بھٹہ' ہمارے لئے اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ ہمارے بچے کے ہاتھوں نے تو کام کرنا ہے اور اس کے بدلے میں رقم چاہئے ہے۔ اب ان ہاتھوں سے چاہے قالین بنوا لو۔ چاہے اینٹیں بنوا لو' چاہے جھاڑو برتن کروا لو..... کچھ بھی کروا لو۔ ہاتھوں کی محنت تو بکنے کے لئے ہی ہے نا ماسی خیراں تو اسے کوئی بھی خرید لے۔ قالین والا یا اینٹوں کے بھٹے والا یا کوئی اور۔ کیا فرق پڑتا ہے؟"

"ٹھیک ہے۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "تو پھر میں کل جا کر حاجی مدد علی قریشی سے بات کروں گی۔"

"حاجی مدد علی قریشی کون ہے ماسی؟" زمین نے اس سے پوچھا۔

"اینٹوں کے بھٹے کا مالک ہے۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "قالین کے کارخانے کے مالک نے اس کا نام اور پتہ بتا دیا ہے۔ میں کل اس کے پاس جاؤں گی اور اس سے بات کروں گی۔"

"میں خود بھی تمہارے ساتھ چلتی ماسی' مگر مشکل یہ ہے کہ کام سے چھٹی نہیں کر سکتی۔" زمین نے کہا۔ "اگر آدھے دن کی بھی چھٹی کروں تو ان لوگوں کے ماتھے پر ستر بل پڑ جاتے ہیں اور مجھے ایسا معلوم ہونے لگتا ہے جیسے میں نے چھٹی کر کے کوئی بہت بڑا گناہ

کیا ہے۔"

"تمہارے جانے کی ابھی ضرورت نہیں ہے۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "بعد میں اگر ضرورت ہو گی تو تم چلنا۔ کام سے واپس آنے کے بعد بھی چل سکتی ہو۔ حاجی مدد علی قریشی کا گھر اور اینٹوں کا بھٹہ ایک ہی جگہ ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" زمین نے کہا۔ "تم خود ہی جا کر اس سے بات کر لو۔ ضرورت ہو گی تو میں بعد میں چلی چلوں گی لیکن ایک بات تو بتاؤ ماسی خیراں وہ پیسے تو دے گا نا؟ میرا مطلب ہے پیشگی....."

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" ماسی خیراں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "لو بھلا ..... اگر پیشگی نہیں دے گا تو پھر کام کا فائدہ کیا؟ اصل ضرورت تو یہی ہے کہ آدمی کو اکٹھی رقم مل جائے جو اس کے کچھ کام بھی آ سکے۔"

"ہاں ماسی خیراں۔" زمین نے کہا۔ "اصل ضرورت تو یہی ہے بس تم جلدی سے میرا یہ کام کرا دو تو....."

"اللہ نے چاہا تو ہو جائے گا۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "میں کل ہی جا کر بات کرتی ہوں۔"

اگلے دن چوہدریوں کے گھر میں اپنے تھکا دینے والے بوجھل اور اکتاہٹ سے بھرپور کام کے دوران زمین اس وقت کے بارے میں سوچتی رہی جب اسے اکٹھے کئی ہزار روپے مل جائیں اور ان سے وہ جنت کی شادی کر سکے گی۔

"میں ان پیسوں کو اپنے پاس نہیں رکھوں گی۔" اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا۔ "میں ان کو ماسی خیراں کے ہی پاس احتیاط سے رکھوا دوں گی۔ ابھی فوری طور پر تو ان کی ضرورت نہیں ہے مجھے۔ سال دو سال بعد جنت کی شادی ہو گی مگر اس دوران تیاری تو کرنی ہو گی..... بس' خدا کرے' کام مل جائے ناصر کو' اور پیسے بھی مل جائیں....."

شام کو وہ ایک اضطرابی کیفیت میں گھر واپس پہنچی۔ سارا دن امید و بیم کے عالم میں گزرا تھا۔ خدا جانے..... کام ملے یا نہ ملے..... کیا معلوم' قالینوں کے کارخانے کے مالک کی طرح' بھٹے کا مالک حاجی مدد علی قریشی بھی یہ کہہ کر معذرت کر لے کہ بازار مندا ہے اور اس کے پاس کام نہیں ہے۔

وہ جب اپنے گھر پہنچی تو اس نے ماسی خیراں کو وہاں پہلے سے موجود پایا۔ وہ جنت کے ساتھ بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی تھی' اور اس کے چہرے پر موجود طمانیت اور مسرت کی



جھلک سے یہ تاثر ملتا تھا کہ اس کے پاس زمین کو سنانے کے لئے کوئی نہ کوئی اچھی خبر ضرور موجود ہے۔ جنت کے علاوہ آج تو سارے بچے بھی گھر پر ہی موجود تھے۔

"میں حاجی مدد علی قریشی کے پاس گئی تھی۔" ماسی خیراں نے کہا اس کی آواز میں خوشی کی کھنک تھی۔ "اس کے پاس کام ہے' اور اس نے مجھ سے کہا کہ میں لڑکے کو اس کے پاس لے آؤں میں نے اس سے کہہ دیا کہ میں آج شام کو لے کر آؤں گی یا پھر کل شام کو۔ تو اب تم دیکھ لو۔ اگر آج چل سکتی ہو تو آج چلو اور اگر آج کی بجائے کل....."

"نہیں ماسی۔" زمین نے اس کی بات کاٹتے ہوئے جلدی سے کہا۔ "آج کا کام کل پر نہیں ٹالنا چاہئے۔ آج ہی چلتے ہیں حاجی مدد علی قریشی کے پاس۔ جب ایک کام کرنا ہی ٹھہرا تو پھر اس میں دیر کرنے سے کیا فائدہ؟" اور پھر وہ ناصر کی طرف دیکھ کر بولی۔ "چل اٹھ۔"

ناصر ایک دم گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ بچوں کو ابھی تک اس بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ ماسی خیراں اور زمین کے درمیان گزشتہ روز جو گفتگو ہوئی تھی وہ صرف انہی دونوں تک محدود رہی تھی۔ ناصر اپنی ماں کا حکم سنتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم لوگ کہاں جا رہے ہو اماں؟" جنت نے تجسس آمیز انداز میں پوچھا۔

"ناصر کو لے جا رہی ہوں کام پر بٹھانے کے لئے۔" زمین نے جنت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس کا باپ تو نکل گیا نکما' نابکار' نکھٹو' بے غیرت اسے تو نہ گھر کی کوئی پروا ہے نہ اولاد کی..... میں کہاں تک اکیلے یہ سارا بوجھ ڈھوتی رہوں گی۔ کوئی تو ہاتھ بٹانے والا ہو۔ آخر مرد بچہ ہے کچھ نہ کچھ کام تو کر ہی سکتا ہے۔"

"حاجی مدد علی قریشی کے اینٹوں کے بھٹے میں کام مل رہا ہے ناصر کو۔" ماسی خیراں نے بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "اکٹھے بہت سارے پیسے مل جائیں گے تو کام آئیں گے آخر تمہاری اور تمہاری بہنوں کی شادیاں بھی تو ہونی ہیں۔"

جنت کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا اور وہ اپنے پیر کے انگوٹھے سے زمین کریدنے لگی۔ اس کی نظریں زمین کو دیکھ رہی تھیں۔ ناصر حیران حیران نظروں سے اپنی ماں کی طرف اور ماسی خیراں کی طرف دیکھ رہا تھا اس چھوٹے بچے کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک یہ اینٹوں کا بھٹہ کہاں سے اس کی زندگی میں داخل ہو گیا۔

زمین ماسی خیراں کے ساتھ روانہ ہو گئی۔ ناصر بھی اس کے ساتھ تھا۔ حاجی مدد علی

قریشی کا اینٹوں کا بھٹہ ان لوگوں کی بستی سے بہت زیادہ دور نہیں تھا۔

☆=====☆=====☆

حاجی مدد علی قریشی ایک ڈھلتی ہوئی عمر کا آدمی تھا۔ اس کے سر اور داڑھی کے آدھے سے زیادہ بال سفید ہو چکے تھے اس کا جسم بھاری بھر کم تھا۔ اس کی آنکھیں بہت چھوٹی چھوٹی اور تیز تھیں۔

حاجی مدد علی قریشی کا گھر اور اینٹوں کا بھٹہ' دونوں ساتھ ساتھ' ایک بڑے قطعہ اراضی پر واقع تھے اور حاجی مدد علی زیادہ تر وقت اپنے بھٹے پر خود ہی موجود رہتا اور کام کی نگرانی کرتا رہتا تھا۔

ماسی خیراں نے ناصر اور اس کی ماں کو حاجی مدد علی قریشی کے سامنے پیش کر دیا۔ حاجی مدد علی قریشی نے گہری ناقدانہ نظروں سے ناصر کا جائزہ لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس ننھے سے جسم کے اندر موجود گوشت اور توانائی کو اپنی نظروں کے ترازو میں تول رہا ہو اور یہ جانچنے کی کوشش کر رہا ہو کہ اس توانائی کی وہ زیادہ سے زیادہ کیا قیمت ادا کر سکتا ہے اور یہ سودا کن داموں مناسب رہے گا۔ ماسی خیراں اسے اس بچے کے خاندانی حالات کے بارے میں تفصیلات پہلے ہی بتا چکی تھی۔ حاجی مدد علی قریشی نے زمین کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ "ہم تو حسب توفیق ایسے ضرورت مندوں کی مدد کرتے ہیں بہن۔ تمہارا بچہ ابھی بہت چھوٹا ہے۔ گو کہ یہ ابھی کسی کام کے قابل تو نہیں ہے لیکن محض تمہاری مدد کرنے کی غرض سے ہم اس کو اپنے پاس کام پر لگا لیں گے۔ صبح سے شام تک کام کرنا ہو گا۔ اور....."

"آپ پیشگی کتنا دیں گے حاجی صاحب؟" زمین نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"یہ تو تمہارے اوپر ہے کہ تم کتنی پیشگی چاہتی ہو؟" حاجی مدد علی قریشی نے کہا۔ "ویسے اگر تم چاہو تو ہم دس ہزار روپے تک پیشگی دے سکتے ہیں لیکن اس کے لئے ضروری ہو گا کہ تمہارا بیٹا یہ جگہ چھوڑ کر نہ جائے اور یہاں کام کرتا رہے۔ پیشگی کی رقم اس کی تنخواہ میں سے تھوڑی تھوڑی کر کے کٹتی رہے گی۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے بیٹے کو کچھ نہ کچھ ماہانہ اجرت بھی ملتی رہے گی اور قرض بھی ادا ہوتا رہے گا لیکن اگر کسی وجہ سے تمہارے بیٹے نے یہاں کا کام چھوڑ دیا' تو پھر تم کو یہ رقم واپس کرنی ہو گی۔"

حاجی مدد علی قریشی زمین کو تفصیلات بتا رہا تھا لیکن زمین ٹھیک سے کچھ نہیں سن رہی تھی اس کے دماغ میں تو بس ایک ہی آواز گونج رہی تھی۔ دس ہزار روپے۔ دس



ہزار روپے۔

"اور بہن پکے کاغذ پر انگوٹھا لگانا ہو گا جس میں یہ ساری شرائط لکھی ہوئی ہوں گی۔ آدمی سے بھول چوک ہو سکتی ہے اس لئے لکھ لینا ضروری ہے اور اللہ تعالیٰ کا بھی یہی فرمان ہے کہ اگر آپس میں کوئی معاہدہ کرو تو اس کو لکھ لو۔"

"جیسی آپ کی مرضی حاجی صاحب۔" زمین نے کہا۔ "تو اسے کل سے کام پر بھیج دوں؟"

"ہاں بھیج دو لیکن رقم لینے کے لئے کل شام کو آنا اس وقت تک میں کاغذ تیار کروا لوں گا۔ پانچ ہزار روپے تو میں کل شام کو تم کو دے دوں گا اور باقی پانچ ہزار روپے ایک ماہ کے بعد ملیں گے۔ اس طرح ایک ماہ کی مدت کے دوران مجھے تمہارے بیٹے کے کام کو جانچنے اور پرکھنے کا بھی موقع مل سکے گا۔"

"ٹھیک ہے حاجی صاحب!" زمین نے اپنے مسرت آمیز جذباتی ہیجان پر قابو پانے کی بھرپور کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "جیسی آپ کی مرضی میں کل صبح اس کو خود چھوڑ جاؤں گی اور پھر شام کو آؤں گی۔"

جب وہ لوگ وہاں سے واپس آ رہے تھے تو زمین بہت خوش تھی اور اسے ناصر پر تو آج بہت ہی زیادہ پیار آ رہا تھا۔ ناصر اس وقت اسے دنیا کا سب سے زیادہ پیارا اور قیمتی بچہ معلوم ہو رہا تھا۔

☆=====☆=====☆

وہ لوگ گھر واپس آ گئے اور زمین نے بڑے چاؤ اور خوشی کے ساتھ جنت کو بتایا کہ کل سے ناصر کام پر جایا کرے گا۔

"اس کے لئے صبح ہی صبح کھانا تیار کرنا ہو گا۔" زمین نے جنت سے کہا۔ "دوپہر کا کھانا ساتھ لے کر کام پر جایا کرے گا۔"

"کس کے لئے دوپہر کا کھانا تیار کرنا ہو گا؟" اچانک ایک کھرکھراتی ہوئی' ڈوبتی ہوئی کمزور اور بھیگی بھیگی سی آواز کچے دالان کی طرف سے بلند ہوئی۔ گامو نہ جانے کب گھر آ گیا تھا اور یہ قدرے غیر معمولی بات تھی وہ تو عام طور سے رات کو اس وقت گھر آتا تھا جب زمین سو چکی ہوتی تھی۔ زمین کو اس کی آمد کا پتہ ہی نہیں چلتا تھا اور صبح کو جب زمین جلدی جلدی اپنے کام پر جانے کی تیاریوں میں مصروف ہوتی تھی تو اس وقت گامو اندر کمرے میں پڑا سویا کرتا تھا۔ زمین کو تو اس وقت اتنی بھی فرصت نہیں ہوتی تھی کہ

وہ نظر اٹھا کر گامو کی طرف دیکھ لے۔

زیبن نے سر اٹھا کر دیکھا۔ گامو دالان میں کھڑا تجسّس بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "کون جا رہا ہے کام پر ہاں؟" گامو نے اس کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔

"شکر ہے، تمہیں اتنی توفیق تو ہوئی کہ کم از کم اتنا ہی پوچھ لو کہ کون کام پر جا رہا ہے۔" زیبن نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ "ناصر جائے گا کل سے کام پر۔"

"اچھا؟" گامو نے کہا۔ "ناصر جائے گا کام پر؟ کہاں جائے گا؟ کہاں کام کرے گا؟ کتنے پیسے ملیں گے؟"

"حاجی مدد علی قریشی کے اینٹوں کے بھٹے پر جائے گا۔" زیبن نے ایسے لہجے میں کہا جو فخر اور اعتماد سے بھرپور تھا۔ "اور پیسوں سے تمہارا کیا تعلق؟ تم کیوں پوچھتے ہو؟ ان پیسوں میں سے تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ یہ بات اچھی طرح سن لو وہ ننھی سی جان رات دن اپنا خون پسینہ بہا کر اس لئے نہیں کمائے گا کہ تم اس کو پڑیوں میں اڑا دو۔ تمہیں تو اس بات سے بھی شرم نہیں آئے گی کہ وہ اتنا چھوٹا سا بچہ کام کرے اور تم پڑے پڑے عیش کرتے رہو۔"

"ارے عیش کون کر رہا ہے نیک بخت؟" گامو نے بڑی تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ "جب جیب خالی ہو اور آدمی ایک ایک پیسے کے لئے ترس رہا ہو تو اس کو عیش کرنا کہتے ہیں؟ اچھا لا، کچھ تھوڑے سے پیسے تو دے دے۔ میری جیب میں تو آج پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔"

"نہیں ہے تو نہ ہو۔" زیبن نے تڑخ کر کہا۔ "میں کیا کروں؟ میرے پاس حرام کے پیسے تو نہیں ہیں جو میں تجھ کو پھونکنے کے لئے دے دوں۔"

"ارے نشے کے لئے نہیں مانگ رہا ہوں نیک بخت۔" گامو نے گھگھیاتے ہوئے کہا۔ "باہر جاؤں گا کہیں بیٹھ کر ایک آدھ پیالی چائے پیوں گا۔ کوئی یار دوست مل گیا تو اس کو بھی پلاؤں گا۔ آخر میں نے بھی تو برسوں کما کر تجھے کھلایا ہے۔" اچانک اس کی آواز رقت آمیز ہو گئی۔

"دے دو اماں۔" جنت کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ اس وقت جنت کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا باپ ایک فقیر ہے اور اس کی ماں کے دروازے پر کھڑا ہوا بڑے درد ناک انداز میں صدا لگاتا ہوا بھیک مانگ رہا ہے۔ جنت کو اس بھیک مانگنے والے فقیر پر



یکبارگی ترس آ گیا تھا۔

زیبن کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس کے ذہن میں ان اچانک گزرے ہوئے روز و شب کی تصویر ابھر آئی تھی جب شادی کے ابتدائی دنوں کے دوران وہ اور گامو ایک دوسرے کی محبت میں سرشار آسمانوں میں پرواز کرتے پھرتے تھے اور انہیں دنیا اپنے آگے ہیچ نظر آتی تھی۔ سب کچھ کتنا اچھا اور کتنا خوبصورت تھا۔ غربت اور تنگ دستی کے باوجود زندگی کتنی حسین تھی کیونکہ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے محبت کی قندیلیں روشن تھیں اور ان کی آنکھوں میں ایک دوسرے کی محبت کا نشہ تیرتا رہتا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کیا سے کیا ہو گیا تھا۔

زیبن نے اپنے سامنے کھڑے ہوئے ہڈیوں کے ڈھانچے پر ایک نظر ڈالی اور پھر چپکے سے کچھ پیسے نکال کر گامو کے ہاتھ میں دے دیئے۔ گامو کے سوکھے ہوئے پپڑیاں جمے ہوئے ہونٹوں پر ایک کمزور سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس کے مردار چہرے پر جیسے زندگی پھوٹ پڑنے لگی۔

"خدا تجھے خوش رکھے۔" گامو نے کہا اور جلدی سے پیسے جیب میں ڈال کر دروازے کی طرف چلا گیا۔ زیبن خاموشی کے ساتھ اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ آج کتنے دنوں کے بعد اس نے گامو کی زبان سے کوئی اچھی بات سنی تھی۔ "خدا تجھے خوش رکھے۔" کتنے اچھے، کتنے خوبصورت تھے یہ الفاظ..... ان میں تو جیسے ساری کائنات کا حسن سمٹ آیا تھا۔ زیبن کا دل پگھلنے لگا۔ بہت دنوں کے بعد آج وہ خوش ہوئی تھی۔ اس کی زندگی میں خوشی اور مسرت کی کچھ قیمتی ساعتیں آئی تھیں۔ اس کے بیٹے کو کام مل گیا تھا جس کے عوض اس کو دس ہزار روپے کی رقم ملنے والی تھی اور اپنی اس خوشی میں ذرا سی دیر کے لئے اس نے گامو کو بھی شریک کر لیا تھا۔

گامو تو باہر چلا گیا اور زیبن پُر جوش اور ہیجانی انداز میں جنت کو بتانے لگی کہ ناصر کے سلسلے میں اینٹوں کے بھٹے کے مالک حاجی مدد علی قریشی سے کیا بات ہوئی ہے۔

"پورے دس ہزار روپے ملیں گے۔" زیبن فرطِ مسرت سے پُراعتماد لہجے میں کہہ رہی تھی۔ "پورے دس ہزار..... پانچ ہزار تو وہ کل ہی دے دے گا اور باقی پانچ ہزار ایک مہینہ کے بعد دے گا ناصر کا کام دیکھ کر۔"

اس نے ان شرائط کا محض سرسری انداز میں ذکر کیا جو حاجی مدد علی قریشی نے لگائی تھیں۔ فی الحقیقت تو اس نے ان کو ٹھیک سے سننے کی ضرورت بھی نہیں محسوس کی تھی۔

جب اچانک دس ہزار روپے مل رہے ہوں تو پھر بھلا کچھ اور سننے کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے۔

"میرا بیٹا تو خوب کام کرے گا۔" زمین نے ناصر کو سینے سے لگا کر پیار کرتے ہوئے کہا۔ "خوب دل لگا کر کام کرے گا' محنت کرے گا' میرا کماؤ پوت ..... بہت سارے پیسے لا کر دے گا گھر میں۔"

ناصر کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے اور اسے بغیر کام کے پہلے سے اتنے بہت سارے پیسے کیوں مل رہے ہیں اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کو کیا کرنا ہو گا۔

"اماں..... پھر یہ رقم کس طرح ادا ہو گی؟" جنت نے اپنی ماں سے پوچھا۔

"ادا ہوتی رہے گی تھوڑی تھوڑی کر کے۔" زمین کے لہجے میں بے نیازی اور بے پروائی تھی۔ وہ ادائیگی کی بات کو کوئی اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں معلوم ہوتی تھی۔

"آج جلدی سو جانا میرا بچہ۔" زمین نے ناصر کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "صبح جلدی اٹھنا ہے۔ کل پہلا دن ہے۔ کام پر جلدی پہنچ جانا اچھا ہو گا۔ کل تو میں تم کو خود اپنے ساتھ لے کر چلوں گی پھر اگلے دن سے تم خود ہی چلے جانا۔"

"مگر اماں مجھے تو اینٹیں بنانی آتی ہی نہیں۔" ناصر نے بڑی معصومیت اور سادگی سے کہا۔ "میں کیسے بناؤں گا؟"

"تم اس کی فکر مت کرو۔" زمین نے کہا۔ "سب لوگ جانتے ہیں کہ تم کو اینٹیں بنانی نہیں آتیں۔ وہ لوگ تم کو سکھا دیں گے وہ سب کچھ سکھا دیں گے اور جیسا وہ لوگ کہیں ویسا تم کرتے جانا۔" ناصر اپنی ماں کا منہ دیکھتا رہا اس نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

"اور تم بھی۔" زمین نے جنت سے مخاطب ہو کر کہا۔ "جلدی سو جانا اور جلدی اٹھ جانا میں بہت تڑکے ناصر کو ساتھ لے کر نکلوں گی۔ پہلے اسے حاجی مدد علی کے بھٹے پر چھوڑوں گی اور پھر وہاں سے اپنے کام پر جاؤں گی۔ صبح ہی کو تازہ ترکاری بھی پکا دینا آلو تو رکھے ہوئے ہیں بس تم آلو کی بھجیا تیار کر دینا میں روٹی ڈال دوں گی ناصر دوپہر کا کھانا اپنے ساتھ لے کر جائے گا۔"

اس شام زمین کسی بچے پر نہیں چلائی۔ اس نے کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ آج تو اس نے ایک مدت کے بعد اپنے آوارہ اور نشے باز شوہر کو بھی کچھ پیسے دے دیئے تھے اور اس



کی دعائیں لی تھیں آج کی شام اس نے بڑی خوشی کے ساتھ گزاری تھی۔ مدتوں بعد زندگی نے اس کو ایک چھوٹی سے خوشی دی تھی جسے وہ پوری طرح سے بھرپور انداز میں برتنا چاہتی تھی۔

اس رات سب لوگ جلدی سونے کے لئے لیٹ گئے۔ زمین تو ویسے بھی روزانہ ہی جلدی سو جاتی تھی۔ وہ سارے دن کی تھکن کی ماری کھانا کھاتے ہی بستر پر جا پڑتی تھی اور پھر جنت باورچی خانے کا سارا کام سمیٹتی تھی بچوں کو سلاتی تھی جنت کو تو لیٹتے لیٹتے کافی دیر ہو جاتی تھی۔

کافی رات ہو گئی تھی۔ زمین کو سوتے ہوئے بہت دیر ہو چکی تھی بچے بھی سب سو چکے تھے سارے گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گامو کا اب تک کوئی پتہ نہیں تھا اور اس بات کا امکان بھی نہیں تھا کہ وہ جلدی آ جائے گا۔

گھر کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا کہ بوقت ضرورت کوئی جلدی سے فوراً اندر سے باہر جا سکے یا باہر سے اندر آ سکے اور اس نیم وا دروازے کے پاس کمرے کے اندر جنت اور مراد' ایک دوسرے کے پاس کھڑے ہوئے چپکے چپکے محتاط انداز میں باتیں کر رہے تھے۔

جنت مراد کو آج کے اہم ترین واقعے کے بارے میں بتا چکی تھی اور مراد اس کی پوری بات سن چکا تھا۔

"ہمارے ابا کہتے ہیں کہ آدمی کو قرض کبھی نہیں لینا چاہئے۔" مراد نے اس ساری صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ کہتے ہیں کہ قرض آدمی کو کھا جاتا ہے۔"

"مگر اماں تو قرض لے رہی ہیں۔" جنت نے آہستہ سے کہا۔ "دس ہزار روپے ملیں گے۔"

"مگر وہ یہ دس ہزار روپے ادا کہاں سے کریں گی؟" مراد نے پُرتشویش انداز میں کہا۔ "ناصر کی تنخواہ سے؟"

"ہاں۔" جنت نے کہا۔ "وہ تو یہی کہتی ہیں کہ ناصر کی تنخواہ میں سے تھوڑا تھوڑا کر کے قرض ادا ہوتا رہے گا۔"

"بھلا کتنی تنخواہ ہو گی ناصر کی' اور اس میں سے قرض کب تک جا کر ادا ہو سکے گا؟" مراد نے کہا۔ "اور پھر..... قرض دینے والے سود بھی تو لیتے ہیں وہ بھی بہت زیادہ' ہمارے ابا کہہ رہے تھے کہ سود پر لیا جانے والا قرض کبھی ادا ہی نہیں ہو پاتا۔ وہ تو

بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔"

"پتہ نہیں۔" جنت نے کہا۔ "ویسے..... اماں بہت خوش ہیں۔ وہ ماسی خیراں سے کہہ رہی تھیں کہ اس رقم سے سال دو سال بعد میری..... شادی کر دیں گی۔" اور اس کے ساتھ ہی اس نے نظریں جھکا لیں۔

عین اس وقت اندر سے زیبن کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ شاید وہ جاگ گئی ہو۔

"جاؤ۔" جنت نے سرگوشی میں مراد سے کہا۔ "اماں جاگ گئیں تو قیامت آ جائے گی۔"

مراد نیم وا دروازے میں سے باہر نکلا اور گلی کی نیم تاریکی میں غائب ہو گیا۔ جنت نے بہت آہستہ سے دروازے کو اندر سے بند کیا اور کنڈی لگا لی۔ اس کے بعد وہ دبے پاؤں اپنے بستر کی طرف بڑھی۔

"کیا ہوا جنت؟" زیبن نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "کون ہے؟"

"کوئی نہیں ہے اماں!" جنت نے آہستہ سے جواب دیا۔ "مجھے ایسا لگا جیسے دروازے پر کوئی ہے میں سمجھی کہ شاید ابا آ گئے ہیں۔ میں دروازے تک گئی تھی وہاں کوئی نہیں تھا۔"

"سو جاؤ۔" زیبن نے جنت سے کہا۔ "تمہارے ابا ابھی کہاں سے آ جائیں گے؟ وہ آدھی رات سے پہلے کب آتے ہیں؟ اور وہ تو پچھلے دروازے کا تالہ کھول کر آتے ہیں۔ وہ آدھی رات کو سامنے والے دروازے سے کب آتے ہیں؟"

جنت خاموشی سے اپنے بستر میں گھس گئی اور اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

زیبن اگلی صبح کو معمول سے بہت پہلے بیدار ہو گئی اور اس نے جنت کو بھی جگا دیا۔ سب لوگ ابھی سو رہے تھے۔ گامو بھی اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ رات کو وہ نہ جانے کس وقت آ گیا تھا۔

ماں بیٹیوں نے مل کر جلدی جلدی تازہ کھانا تیار کر لیا اور پھر زیبن نے ناصر کو جگا دیا اور اس سے کہا کہ ہاتھ منہ دھو کر تیار ہو جائے اور پھر جس وقت وہ اس کے لے جانے کے لئے کھانے کی پوٹلی باندھ رہی تھی تو اس کا رواں رواں خوشی سے سرشار تھا۔ وہ اپنے بیٹے کے لئے دوپہر کا کھانا باندھ رہی تھی جو کام پر جا رہا تھا کمائی کرنے جا رہا تھا۔ اس نے ناصر کو بڑی محبت اور بڑے چاؤ کے ساتھ ناشتہ کرایا دوسرے بچے ابھی سو رہے تھے۔ وہ ناصر کو ساتھ لے کر جانے کے لئے تیار ہو گئی۔



"میں چلتی ہوں ورنہ دیر ہو جائے گی۔" اس نے جنت سے کہا۔ "پہلے ناصر کو بھٹے پر چھوڑوں گی پھر چوہدریوں کے گھر جاؤں گی۔ تم بچوں کو ناشتہ کرا دینا اور گھر کا خیال رکھنا۔" اور وہ اسے گھر کے کام کاج کے بارے میں ضروری ہدایات دینے لگی۔ اس کے بعد ناصر کو ساتھ لے کر حاجی مدد علی قریشی کے اینٹوں کے بھٹے کی طرف روانہ ہو گئی۔

جب وہ وہاں پہنچے تو ابھی بہت سویرا تھا۔ وہ کافی جلدی آ گئی تھی۔ بھٹے میں صرف ایک ہی آدمی نظر آ رہا تھا جو ادھر اُدھر گھوم کر غالباً پکی ہوئی اینٹوں کی گنتی کر رہا تھا۔ زیبن اس آدمی کو پہچانتی تھی اس نے کل اس کو دیکھا تھا اس کا نام امیر علی تھا اور وہ یہاں کا منشی تھا۔ بات چیت کے دوران وہ موجود رہا تھا۔

"اچھا' تو تم اسے لے آئی ہو۔" منشی امیر علی نے اس کو اور ناصر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ چھوڑ جاؤ۔ حاجی صاحب نے مجھے اس کے بارے میں بتا دیا ہے تم شام کو آ جانا۔"

"اچھی بات ہے بھائی۔" زیبن نے کہا۔ "تم حاجی صاحب کو بتا دینا انہوں نے آج شام کو پیسے دینے کے لئے بھی کہا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔" منشی امیر علی نے کہا۔ "کاغذ تو میں ہی تیار کروں گا۔ آج کاغذ تیار ہو جائے گا اور انشاء اللہ شام کو تم کو پیسے مل جائیں گے۔ تم آ جانا۔ میں حاجی صاحب کو بتا دوں گا۔"

"بڑی مہربانی آپ کی بھائی۔" زیبن نے کہا اور وہاں سے جانے لگی۔ جانے سے پہلے اس نے ناصر کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اسے پیار کیا۔ "دھیان سے کام کرنا میرے بچے۔ جیسا تم کو بتایا جائے ویسا ہی کرنا۔"

ناصر نے ترسی ہوئی' سہمی ہوئی نظروں سے اپنی ماں کو دیکھا اور آہستہ سے گردن ہلا دی۔ زیبن وہاں سے چلی گئی وہ سارا دن زیبن نے بڑی بے چینی اور اضطراب و ہیجان کے عالم میں گزارا۔ آج وہ کافی جلدی اپنے کام پر آ گئی تھی اور جلدی ہی یہاں سے واپس بھی جانا چاہتی تھی۔ اس نے صبح ہی صبح آ کر اپنا کام شروع کر دیا تھا اور اس کا دھیان بار بار اینٹوں کے بھٹے کی طرف جا رہا تھا نہ جانے ناصر نے کیا کام کیا ہو گا..... نہ جانے حاجی مدد علی قریشی اور اس کے آدمی ناصر کے کام سے مطمئن ہوئے ہوں گے یا نہیں۔ معلوم نہیں شام کو رقم مل سکے گی یا نہیں۔

منشی تو کہہ رہا تھا کہ وہ کاغذ تیار کر لے گا..... بہت سارے خیالات و خدشات

تھے جو اس کے دماغ میں کھلبلی مچائے ہوئے تھے۔ شام ہوتے ہی اس نے جلدی جلدی کام سمیٹا اور چوہدریوں کے گھر سے روانہ ہو گئی۔ وہاں سے حاجی مدد علی قریشی کے بھٹے تک کا کافی فاصلہ تھا۔ اس نے جلدی جلدی مارا مار یہ فاصلہ طے کیا اور بھٹے پر پہنچ گئی۔ حاجی مدد علی قریشی وہاں موجود تھا اور اس کا منشی امیر علی بھی۔ ناصر ایک کونے میں فرش پر بیٹھا ہوا بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ماں کی شکل دیکھتے ہی اس کے چہرے پر رونق آ گئی۔

"آ گئیں زیبن۔" حاجی مدد علی قریشی نے اس کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تمہارا بیٹا ہمارے ہاں کچھ نہ کچھ کر لے گا۔ اس کو سکھانا پڑے گا۔ ابھی تو اس کو کچھ کام آتا نہیں ہے۔"

"آپ لوگ سکھائیں گے تو سب کچھ سیکھ لے گا حاجی صاحب۔" زیبن نے بڑی مشکل سے اپنی خوشی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" حاجی مدد علی قریشی نے کہا۔ "میں نے ساری شرطیں تو تم کو کل بتا ہی دی تھیں۔ انہیں پکے کاغذ پر لکھ دیا گیا ہے۔ اب تم اگر راضی ہو تو اس کاغذ پر انگوٹھا لگا دو اور پانچ ہزار روپے لے لو۔ پانچ ہزار ایک ماہ کے بعد ملیں گے۔"

"ہاں جی میں تو راضی ہوں بالکل راضی ہوں۔"

زیبن نے تقریباً کانپتی ہوئی آواز میں کہا اور حاجی مدد علی قریشی نے منشی امیر علی کی طرف رخ کر کے کہا۔ "انگوٹھا لگوا لو منشی جی اور رقم دے دو۔"

منشی امیر علی نے اس کا انگوٹھا لگوا لیا اور ان پڑھ زیبن نے جلدی سے اس اسٹامپ پیپر پر انگوٹھا لگا دیا جس کی تحریر کا ایک لفظ بھی اس نے نہ تو خود پڑھا تھا کیونکہ وہ ان پڑھ تھی اور نہ کسی سے پڑھ کر سنا تھا۔ منشی امیر علی نے رقم اس کے حوالے کر دی اور زیبن نے بڑی احتیاط سے نوٹوں کو اپنے ڈھیلے ڈھالے کرتے کی جیب میں رکھ لیا۔ اس کے بعد وہ حاجی اور منشی کی درازی عمر کی دعائیں کرتی ہوئی ناصر کو ساتھ لے کر وہاں سے روانہ ہو گئی۔ "کل صبح ہی یہاں آ جائے گا۔" اس نے چلتے چلتے حاجی مدد علی سے کہا۔ خوشی سے بے قابو ہانپتی کانپتی زیبن جب ناصر کے ساتھ گھر واپس پہنچی تو اس نے ماسی خیراں کو اپنے گھر میں موجود پایا۔ اس نے جلدی جلدی ماسی خیراں کو ساری بات بتا دی۔ "اب یہ پیسے تم اپنے پاس رکھ لو ماسی۔" زیبن نے ساری بات بتانے کے بعد ماسی خیراں سے کہا۔ "میں انہیں اپنے پاس نہیں رکھوں گی۔"

"صرف آج کی رات رکھ لو۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "آج میں اپنی نند کے ہاں جا



رہی ہوں اور رات کو وہیں رہوں گی۔ کل مجھے دے دینا۔ میں سنبھال کر رکھ لوں گی۔"

"ٹھیک ہے ماسی۔" زیبن نے کہا اور رقم کو ایک پھٹے پرانے کپڑے میں لپیٹ کر بڑی حفاظت کے ساتھ اپنے گھر کی ٹوٹی پھوٹی الماری میں کپڑوں کے نیچے چھپا کر رکھ دیا جو اس کے خیال کے مطابق ایک بہت محفوظ جگہ تھی۔

اس رات زیبن بڑے میٹھے میٹھے اور سہانے خواب دیکھتی رہی۔ اس نے جنت کو دلہن بنے دیکھا۔ جنت کا دولہا ایک بڑا خوبصورت گبرو جوان تھا اور جنت دلہن بنی ہوئی کس قدر خوبصورت لگ رہی تھی۔

صبح کو جب اس کی آنکھ کھلی تو خوشی اس کے چہرے پر کھل رہی تھی اور ہنسی اس کے ہونٹوں سے پھوٹی پڑتی تھی۔ اٹھنے کے بعد وہ فوراً ہی سیدھی الماری کے پاس گئی تاکہ رقم کو دیکھ کر اپنی تسلی کر لے۔

وہ پھٹا ہوا کپڑا جس میں اس نے نوٹوں کو لپیٹا تھا' سامنے ہی پڑا ہوا تھا اور رقم غائب تھی۔

زیبن بدحواسی کے عالم میں اِدھر اُدھر ہاتھ مارنے لگی لیکن وہ کپڑا تو سامنے پڑا ہوا تھا جس میں اس نے رقم لپیٹ کر الماری کے خانے میں رکھی تھی۔ اس نے وحشت کے عالم میں ساری الماری کو کھنگالنا شروع کر دیا۔ وہ سامان نکال نکال کر باہر پھینک رہی تھی اور اس کے ہاتھ بری طرح کپکپا رہے تھے۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی اور منہ کھلا ہوا تھا۔ اس کے دماغ میں سنسنی دوڑ رہی تھی پھر وہ اپنے ہاتھ پیروں میں یکبارگی اور کمزوری محسوس کرنے لگی۔

اس نے چند منٹ کے اندر اندر ساری الماری کو کھنگال کر رکھ دیا۔ اس میں مختصر سے پرانے سامان کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ وہ اس نے سارے کا سارا کھنگال کر دیکھ لیا۔ رقم وہاں موجود نہیں تھی۔

اس وقت جنت کمرے کے اندر داخل ہوئی اس نے دیکھا کہ اس کی اماں نے الماری کا سارا سامان نکال کر باہر بکھیر دیا ہے۔ اس کے ماتھے پر فوراً ہی بل پڑ گئے اور اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی ماں نے پانچ ہزار روپے کی وہ رقم جو وہ حاجی مدد علی قریشی سے لے کر آئی تھی رات کو حفاظت کے ساتھ اس الماری میں رکھ دی تھی۔

"کیا ہوا اماں؟" اس نے پُر تشویش مرتعش آواز میں پوچھا۔

"پیسے۔" زمین ہکلا رہی تھی۔ "پیسے..... پانچ ہزار روپے..... میں نے رات کو یہاں رکھے تھے۔ تم کو معلوم ہے۔ تم کو بتایا تھا میں نے۔ وہ اب یہاں نہیں ہیں۔" اور اچانک زمین کی آواز بھرا گئی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ "کوئی لے گیا۔ چوری ہو گئی جنت..... رات کو کوئی ہمارے گھر میں آیا تھا شاید۔"

"نہیں اماں۔" جنت نے مری ہوئی' بہت دھیمی آواز میں کہا۔ "گھر میں کوئی چور نہیں آیا تھا۔"

"کیا مطلب؟" زمین نے آنکھیں پھاڑ کر جنت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم کو کیسے معلوم..... تم۔ کیا....."

"اماں۔ ابا گھر سے غائب ہیں۔" جنت نے سسکتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں نے رات کے آخری پہر میں انہیں دروازہ کھول کر باہر جاتے دیکھا تھا۔ میں اس وقت ذرا دیر کے لئے اٹھی تھی۔"

"ہائے تجھ پر خدا کی مار۔" اچانک زمین نے پوری قوت سے اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "ارے تُو نے اس وقت اس کو کیوں نہیں روکا؟ مجھے کیوں نہیں جگایا تُو نے؟"

"اماں مجھے کیا معلوم کہ ابا....." جنت نے روتے ہوئے کہا۔ "میں تو یہ سمجھی کہ وہ اٹھ کر ویسے ہی کہیں باہر جا رہے ہیں۔ ان کا کیا بھروسہ وہ تو اس طرح آتے جاتے ہی رہتے ہیں۔"

"ارے وہ منحوس صبح کو تو کہیں نہیں جاتا۔" زمین نے روتے ہوئے کہا۔ "رات کو جس وقت بھی آتا ہے مُردے کی طرح پڑ جاتا ہے اور صبح کو اسی طرح مرا پڑا رہتا ہے۔ آج کیوں وہ صبح ہونے سے پہلے ہی اپنا منہ کالا کر گیا؟ ارے لوٹ لے گیا ہم لوگوں کو کتے کا پلا..... ارے خدا اس کو موت دے..... خدا غارت کرے اس لعنتی کو..... چل جلدی چل..... چل میرے ساتھ..... اس کو ڈھونڈتے ہیں۔ شاید کہیں مل جائے۔ شاید اس کے پاس سے پیسے بھی مل جائیں۔ یا میرے مولا۔ یہ کیا ہو گیا۔ ہائے۔ یہ کیا ہو گیا۔"

زمین بری طرح رو رہی تھی اور اس کے ساتھ جنت بھی رو رہی تھی۔ ناصر اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ شروع شروع میں اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے اور یہ رونا پیٹنا کس لئے ہے۔



"کیا ہوا آپا؟" اس نے اپنی بڑی بہن کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ارے لے گیا لے گیا۔" جنت کی بجائے زمین نے زارو قطار روتے ہوئے کہا۔ "تیرا باپ وہ ساری رقم لے گیا جو کل ہم لوگوں کو حاجی مدد علی قریشی نے تیرے کام کے بدلے میں دی تھی..... ہائے اب کیا ہو گا؟ ارے..... ارے میں تو لٹ گئی..... برباد ہو گئی..... اری چل نا منحوس۔" اس نے اپنے قریب کھڑی ہوئی جنت کی پیٹھ پر ایک زور کا دوہتڑ رسید کیا' جنت بلبلا اٹھی۔

زمین نے جنت کے ساتھ اپنے گھر سے نکل کر پڑوس میں ماسی خیراں کے دروازے پر دستک دی۔ ماسی خیراں نے دروازہ کھولا دیکھا اور زمین اور جنت کو وہاں کھڑا دیکھ کر حیران ہو گئی۔

"ماسی خیراں' گامو ساری رقم لے کر بھاگ گیا۔" زمین نے روتے ہوئے کہا۔ "نہ جانے کس طرح اس کو پتہ چل گیا اور وہ رات کو رقم نکال کر لے گیا۔ میں جنت کو ساتھ لے کر اسے ڈھونڈنے جا رہی ہوں شاید مل جائے۔ تم ذرا اتنی مہربانی کرنا کہ بچوں کو ناشتہ کرا دینا اور ناصر کو کام پر بھیج دینا۔"

"ہے ہے..... غضب خدا کا۔" ماسی خیراں نے اپنا ایک ہاتھ ماتھے تک لے جا کر زور سے مارتے ہوئے کہا۔ "اس سے تو اچھا تھا کہ میں کل ہی وہ رقم اپنے پاس رکھ لیتی میں نے تو اس لئے نہیں رکھی تھی کہ میں اپنی نند کے گھر جا رہی تھی اور وہاں سے میں کافی رات گئے واپس آئی تھی۔ ہائے۔ یہ کیا ظلم ہو گیا۔"

"بس ماسی' ہم لوگ جا رہے ہیں۔" زمین نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "تم ناصر کو کام پر ضرور بھیج دینا بچوں کو دیکھ لینا۔"

"تم بے فکر ہو کر جاؤ۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "خدا کرے وہ کم بخت مل جائے کہیں۔" دونوں ماں بیٹیاں وہاں سے چل دیں۔ زمین اس پوری صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

گامو عام طور سے رات کو بہت دیر سے گھر آیا کرتا تھا۔ اس وقت دن بھر کے تھکے ہارے سب لوگ سو رہے ہوتے تھے اور کوئی دروازہ کی کنڈی کھولنے کی ڈیوٹی نہیں دے سکتا تھا۔ چنانچہ اس کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا تھا کہ مکان کے پچھلے دروازے میں باہر سے تالا ڈال دیا گیا تھا جس کی ایک چابی گامو کے پاس بھی رہتی تھی۔ گامو رات کو جس وقت بھی آتا پچھلے دروازے کا تالا کھول کر اندر آ جاتا اور پھر دروازے کو اندر سے بند کر

لیتا۔ یہ روز کا معمول تھا۔ مدتوں سے ایسا نہیں ہوا تھا کہ گامو سرِ شام گھر آ گیا ہو۔ وہ رات گئے واپس آتا اور دن چڑھے تک سوتا رہتا جب وہ کافی دیر سے سو کر اٹھتا تو جنت اسے کچھ کھانے کو اور ایک پیالی چائے بنا دیتی تھی۔ گامو کو چائے کی طلب بہت رہتی تھی۔ ناشتہ کرنے کے بعد بھی وہ عام طور سے گھر میں ہی پڑا رہتا تھا اور پھر دوپہر کا کھانا بھی گھر پر کھانے کے بعد سہ پہر کو باہر نکل جاتا تھا اور پھر اس کا کوئی علم نہیں رہتا تھا کہ وہ کب واپس آئے گا۔ کبھی کبھی وہ دوپہر کے کھانے سے پہلے ہی نکل کھڑا ہوتا تھا۔

یہاں تک تو ساری بات زمین کی سمجھ میں آتی تھی گامو رات کو معمول کے مطابق دیر سے پچھلے دروازے سے آیا لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اس کو بالکل ٹھیک ٹھیک اس بات کا علم کس طرح ہو گیا کہ زمین حاجی مدد علی قریشی سے رقم لے آئی ہے۔ الماری میں رقم تلاش کر لینا تو کوئی ایسی مشکل بات نہیں تھی۔ گامو کو صرف اتنا معلوم تھا کہ ناصر' حاجی مدد علی کے اینٹوں کے بھٹے پر کام شروع کرنے والا ہے۔ اس کے علاوہ باقی تفصیلات کا اسے کوئی علم نہیں تھا۔

"اماں..... ہم کہاں جا رہے ہیں؟" اچانک جنت کی آواز سن کر زمین چونک پڑی۔ "ہم ابا کو کہاں ڈھونڈیں گے؟" زمین گامو کو ڈھونڈنے تو چل کھڑی ہوئی تھی لیکن اپنے خیالات کی رو میں یہ بھول گئی تھی کہ اس کو اس کی تلاش میں کہاں جانا چاہئے۔

"ہم سب سے پہلے اللہ داد خان کے اڈے پر چلتے ہیں۔" زمین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "بدنصیب لعنت کا مارا وہیں سے پڑیا خریدتا ہے شاید اس وقت بھی وہاں پڑا ہوا ہو۔"

لیکن جنت کو اپنی ماں کے اس خیال سے اتفاق نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا باپ اتنا بے وقوف ہرگز نہیں ہے کہ اتنی بھاری رقم لے کر وہ کسی ایسی جگہ جا کر پڑا رہے جہاں اسے باآسانی تلاش کیا جا سکے۔ تاہم اس نے اپنی ماں سے اس بارے میں کچھ نہیں کہا وہ اپنی ماں کو اور زیادہ مایوس اور ناامید نہیں کرنا چاہتی تھی۔

وہ دونوں اللہ داد خان کے مکان پر پہنچ گئیں اور انہوں نے وہاں گامو کے بارے میں معلوم کیا وہاں ان کا سواگت خشمگیں اور ناپسندیدہ نگاہوں سے کیا گیا اور انہیں بتایا گیا کہ ایک شریف اور معزز آدمی کا گھر ہے اور یہاں ایروں غیروں کے لئے پڑے رہنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

وہ دونوں وہاں سے مایوس لوٹیں اور پھر انہوں نے گامو کے کئی دوستوں کے گھروں



پر جنہیں وہ جانتی تھیں دستک دی لیکن گامو انہیں کہیں نہ ملا۔ ایک کے علاوہ ان میں سے کسی کو بھی گامو کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ صرف ایک دوست نے یہ بتایا کہ دو روز پہلے گامو اس کے پاس آیا تھا اور بڑی خوشامد کر کے اس سے کچھ پیسے ادھار لے گیا تھا۔ اس نے اس سے یہ کہا تھا کہ اس کی چھوٹی بچی بہت بیمار ہے اور اس کے پاس اس کی دوا کے لئے پیسے نہیں ہیں۔ وہ پیسے لے کر چلا گیا تھا اور پھر نہیں آیا تھا۔

"خدا کی مار اس پر۔" زمین نے روتے ہوئے کہا۔ "کس قدر جھوٹ بولتا ہے حرام خور۔ ارے اس نے تو بچوں کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے خدا سمجھے گا اس کو۔"

دونوں ماں بیٹیاں' اِدھر اُدھر دھکے کھاتی ہوئی' گامو کو ان تمام ٹھکانوں پر تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھیں جن سے وہ واقف تھیں اور جہاں اس کے پائے جانے کے امکانات موجود ہو سکتے تھے لیکن گامو کا تو کہیں کوئی پتہ نہیں تھا۔

زمین نے رو رو کر برا حال کر لیا تھا۔ وہ روتی جاتی تھی اور گامو کو کوستی جاتی تھی۔ کل صبح کو جب گامو خلاف معمول صبح صبح بیدار ہو کر گھر سے باہر جا رہا تھا اور اس نے زمین سے پیسے مانگے تھے تو زمین نے جنت کی سفارش پر اسے کچھ پیسے دے دیئے تھے اور مدتوں بعد اس کے دل میں گامو کے لئے نرم جذبہ پیدا ہوا تھا وہ ذرا دیر کے لئے خوش ہو گئی تھی لیکن اب ..... اب وہ نرم جذبہ نفرت کی پھنکاریں مارتا ہوا زہر میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اگر گامو اس کو مل جائے تو وہ اس کے جسم کی ایک ایک بوٹی کاٹ کر پھینک دے۔ اس کے گوشت کو کتوں کے آگے ڈال دے۔ اس وقت گامو سے زیادہ قابل نفرت شخص دنیا میں اس کے لئے اور کوئی نہیں تھا۔

بہت دیر ہو گئی اِدھر اُدھر بھٹکتے بھٹکتے' اور لوگوں کے دروازوں پر دستک دیتے دیتے اور اپنی درد بھری داستان سناتے سناتے سب جگہوں پر دیکھ لیا تھا وہ کہیں نہیں تھا۔

"وہ نہیں ملیں گے اماں۔" جنت نے کمزور اور نیم مردہ آواز میں کہا۔ "وہ کسی بھی ایسی جگہ نہیں ہوں گے جہاں ہم انہیں تلاش کر سکیں وہ تو چھپ کر نہ جانے کہاں بیٹھ گئے ہوں گے۔"

"قبر میں جا کر بیٹھ گیا ہو منحوس۔" زمین نے دانت پیس کر کہا۔ "ارے' ایک بار مر جاتا تو صبر آ جاتا۔ ایک ہی بار اس کو رو پیٹ کر بیٹھ جاتے۔ مگر وہ تو ہم میں سے ہر ایک کو مار رہا تھا قاتل ہے وہ ہم لوگوں کا وہ ہم سب لوگوں کو قتل کر رہا ہے خدا اس کو غارت کرے کسی کتے کی موت آئی ہو' اس کو آ جائے۔" اور وہ زور زور سے سسکیاں لیتی ہوئی

رونے لگی۔

خود جنت کا دل بھی بوجھل ہو رہا تھا۔ اسے رات کی مراد کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ مراد بتا رہا تھا اس کا باپ تو اس قسم کے قرضوں کے سخت خلاف تھا کیونکہ ان کی ادائیگی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اور یہاں تو قرضہ استعمال میں بھی نہیں آیا تھا کہ سارے کا سارا غائب ہو گیا۔ اب کیا ہو گا؟ اب کیا ہو گا؟ یہ سوچ سوچ کر اس کا دل دہلا جا رہا تھا۔

زمین کو آج اپنے کام پر جانے کا بھی ہوش نہیں تھا۔ وہ تو رقم کے چوری ہو جانے کے بعد سب کچھ بھول چکی تھی۔ اسے صرف گامو کی تلاش تھی۔ کاش ایک بار اسے گامو مل جائے اور وہ اپنے ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹ سکے لیکن گامو نہیں ملا۔ وہ کہیں بھی نہیں تھا۔ وہ اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئی تھی۔

"چلو اب حاجی مدد علی کے بھٹے پر چلتے ہیں۔" بالآخر اس نے اپنی بیٹی سے کہا۔ "وہاں چل کر ناصر کو دیکھ لیں۔ کام پر پہنچا یا نہیں پہنچا۔ ویسے' امید تو یہی ہے کہ ماسی' خیراں نے سارا کام کر دیا ہو گا۔"

"ہاں اماں' چلو۔" جنت نے کہا۔ "میں تو خود بھی تم سے یہی کہنے والی تھی کہ ہمیں حاجی مدد علی کے بھٹے پر چل کر ناصر کو دیکھ لینا چاہئے۔"

وہ دونوں وہاں سے روانہ ہوئیں اور کافی دیر کے بعد حاجی مدد علی کے اینٹوں کے بھٹے پر پہنچیں اس وقت وہ دونوں جس جگہ تھیں وہاں سے بھٹہ بہت دور تھا۔

بھٹے کے وسیع احاطے میں داخل ہوتے ہی زمین کی متجسس اور متوجہ نظروں نے سب سے پہلے اپنے بیٹے کو تلاش کر لیا۔ ناصر وہاں موجود تھا اور ایک طرف سر جھکائے ہوئے کام میں مصروف تھا۔ وہ اپنے کام میں اس درجہ منہمک تھا کہ اس نے اپنی ماں اور بہن کو بھٹے کے اندر داخل ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔

زمین جنت کو ساتھ لئے ہوئے سیدھی ناصر کے پاس پہنچ گئی اور جب وہ دونوں عین ناصر کے سر پر پہنچ گئیں تو اس وقت ناصر نے ان کو دیکھا اور اس کے چہرے پر حیرت آمیز مسرت کے آثار نمودار ہوئے۔ ناصر اس وقت کچی مٹی کو گوندھ کر اینٹوں کے لئے تیار کر رہا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ مٹی میں لتھڑے ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ اور بال خشک مٹی میں اٹے ہوئے تھے۔

"اماں تم.....؟" اس نے جلدی سے اپنے دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑتے ہوئے کہا اور مٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اس کے ہاتھوں سے الگ ہو ہو کر زمین پر



گرنے لگے۔

"ہاں بیٹا۔" زمین نے تیز تیز سانسوں کے ساتھ جواب دیا۔ وہ صبح سے اب تک اتنا پیدل چل چکی تھی کہ بالکل تھک گئی تھی اور اب اس کا سانس پھول رہا تھا۔ "تم آ گئے تھے ٹھیک وقت پر؟ کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں اماں۔" ناصر نے جواب دیا۔ "ماسی خیراں نے ناشتہ کرا دیا تھا مجھ کو اور انہوں نے میرے ساتھ لانے کے لئے روٹی بھی پکا دی تھی جلدی جلدی' ترکاری انہوں نے مجھے گھر سے لا کر دے دی تھی اور پھر میں کھانا ساتھ لے کر سیدھا یہاں چلا آیا۔"

"جیتا رہے میرا بچہ۔" زمین نے اپنی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارا کام تو ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے نا؟"

"ہاں اماں....." ناصر نے بجھی ہوئی آواز میں کہا اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا کچھ فاصلے پر کھڑا ہوا ایک آدمی ناصر کو ان دونوں عورتوں سے باتیں کرتے دیکھ رہا تھا اور اس کے چہرے پر کوئی خوشگوار تاثر نہیں تھا۔ ناصر نے اس آدمی کی طرف دیکھا اور پھر وہ جلدی سے دوبارہ مٹی گوندھنے میں مصروف ہو گیا۔

"اچھا ٹھیک ہے بیٹا کام کرو۔" زمین نے اس سے کہا۔ "شام کو سیدھے گھر ہی واپس آ جانا۔ راستے میں کہیں اِدھر اُدھر نہ رک جانا۔" جواب میں ناصر نے صرف آہستہ سے سر ہلا دیا۔ زمین اور جنت اس کے پاس سے چلی آئیں۔

حاجی مدد علی قریشی اپنے کمرے میں موجود تھا۔ یہ کمرہ بھٹے کے وسیع احاطے میں ایک جانب بنا ہوا تھا اور یہ گویا حاجی مدد علی قریشی کے دفتر کا کام دیتا تھا۔ منشی امیر علی بھی اس وقت وہاں موجود تھا۔

حاجی مدد علی قریشی زمین اور اس کے ساتھ ایک نوعمر لڑکی کو دیکھ کر چونک پڑا۔ زمین کا ستا ہوا چہرہ اور بھیگی بھیگی' قدرے سُوجی ہوئی سرخ آنکھیں کوئی المناک داستان بتانے پر آمادہ معلوم ہوتی تھیں۔ زمین نے حاجی مدد علی کو دیکھتے ہی ایک دم رونا شروع کر دیا۔

"ارے ارے..... کیا ہوا؟" حاجی مدد علی قریشی نے گھبراتے ہوئے کہا۔ "تمہارا بیٹا تو ٹھیک ٹھاک ہے؟" اور اس نے جلدی سے منشی امیر علی کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔

"وہ تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہے حاجی صاحب۔" منشی امیر علی نے فوراً جواب دیا۔

"ابھی ذرا دیر پہلے میں چکر لگا کر آیا ہوں۔ وہ کام کر رہا تھا میں نے فخرو سے اس کے بارے میں پوچھ بھی لیا تھا۔"

"ناصر تو ٹھیک ہے حاجی صاحب۔" زمین نے سسکیاں لے کر روتے ہوئے کہا۔ "ہم لوگ تو اور ہی بربادی کا شکار ہو گئے ہیں۔ تباہ ہو گئے۔ لٹ گئے ہم لوگ۔ برباد ہو گئے۔"

"ارے تو ہوا کیا؟" منشی امیر علی نے جلدی سے تجسس آمیز انداز میں پوچھا۔ "کیا بات ہو گئی؟ کچھ بتاؤ تو....."

"جو رقم کل میں آپ کے پاس سے لے کر گئی تھی وہ چوری ہو گئی۔" زمین نے روتے ہوئے کہا۔

"اوہ..... یہ تو بہت افسوس کی بات ہے۔" حاجی مدد علی قریشی نے کہا۔ "پھر تم نے تھانے میں رپورٹ لکھوائی؟"

"رپورٹ کس کے خلاف لکھواؤں حاجی صاحب؟" زمین نے رو رو کر کہا۔ "لے جانے والا بھی تو گھر ہی کا آدمی تھا۔ میرا چرسی' موالی' ہیرو پنجی میاں وہ ساری رقم لے کر بھاگ گیا۔"

"اچھا؟ گامو؟" حاجی مدد علی قریشی نے کہا۔ "وہ..... وہ تو کل شام کو میرے پاس آیا تھا۔"

"کیا؟" زمین نے چونک کر کہا۔ "وہ آیا تھا آپ کے پاس؟ کیوں؟ کس لئے؟"

"وہ تمہارے جانے کے بعد آیا تھا کل شام کو۔" حاجی مدد علی قریشی نے کہا۔ "میں تو اس کو پہچانتا بھی نہیں تھا میرا منشی اس کی شکل سے واقف تھا۔ گامو نے خود اپنے بارے میں مجھے بتایا کہ وہ ناصر کا باپ ہے اور مجھ سے کہا کہ اس کے بیٹے ناصر کو یہاں کام کے عوض جو رقم ملنی طے ہوئی ہے وہ رقم میں اس کو دے دوں میں نے اس کو بتایا کہ میں اس کو نہیں جانتا اور میں اس کو کوئی رقم نہیں دوں گا میں نے اس سے کہا کہ رقم کا معاملہ ناصر کی ماں کے ساتھ طے ہوا ہے اور ناصر کی ماں رقم لے گئی ہے۔"

"ہائے میرے مولا۔" زمین نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو پکڑتے ہوئے کہا۔ "وہ..... یہاں آیا تھا؟ رقم مانگ رہا تھا؟"

"ہاں زمین۔" حاجی مدد علی قریشی نے زمین پر سرسری سی نظر ڈال کر جنت کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور اگر میں تم کو پیسے نہ دے چکا ہوتا تو بھی میں اس



کو رقم نہ دیتا۔ میرا اس کے ساتھ کوئی معاملہ نہیں طے ہوا تھا۔ میرا معاملہ تو تمہارے ساتھ طے ہوا تھا اور میں تم کو ہی رقم دے سکتا تھا۔ اس کو نہیں۔"

"رقم تو وہ لے ہی گیا ساری۔" زمین نے روتے ہوئے کہا۔ "میں صبح سے اس کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی ہوں اور ہم دونوں نہ جانے کہاں کہاں کے دھکے کھاتی پھر رہی ہیں....."

"یہ کون ہے؟" حاجی مدد علی قریشی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے جنت کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"بیٹی ہے میری۔" زمین نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "جنت نام ہے اس کا۔"

"کیا یہ بھی کہیں کام کرتی ہے؟" حاجی مدد علی قریشی نے جنت کو سر سے پاؤں تک بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی نہیں۔" زمین نے جواب دیا۔ "اگر اس کو بھی کام کرنے کے لئے بھیج دوں حاجی صاحب تو پھر گھر میں چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ میری سب سے چھوٹی بیٹی تو ابھی صرف دو سال کی ہے۔"

"خیر تو اب ایک بات تم اچھی طرح سمجھ لو زمین۔" یکایک حاجی مدد علی قریشی کے لہجے میں قدرے درشتی اور بھاری پن آ گیا۔ "جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا اس کا مجھے افسوس ہے لیکن میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں میں نے تم کو پانچ ہزار روپے کی رقم پوری کی پوری دے دی تھی تم نے رقم وصول کر لی تھی اور کاغذ پر دستخط کر دیئے تھے۔ وہ رقم اب تمہارے ذمے ہے۔ میں نے وہ رقم تم کو دی ہے اور تم پر اس کی واپسی لازم ہے اب چاہے وہ رقم تمہارے پاس رہی یا تمہارا نشے کا عادی شوہر اس کو لے بھاگا۔ یہ تم لوگوں کا اپنا ذاتی مسئلہ ہے۔"

"آپ کی بات تو بالکل ٹھیک ہے حاجی صاحب۔" زمین نے روتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں بہت غریب ہوں مجھے تو اب شوہر کے ہوتے ہوئے بھی بیوہ ہی سمجھئے میں تو خود ہی محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتی ہوں۔ میرا تو اور کوئی سہارا بھی نہیں ہے۔ حاجی صاحب چار بیٹیاں ہیں میری۔"

"اللہ تمہاری مدد کرے گا بی بی۔" حاجی مدد علی قریشی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہاری سب سے بڑی بیٹی ہے یا اس سے بھی بڑی کوئی اور ہے؟"

"نہیں جی۔" زمین نے کہا۔ "یہ میری سب سے بڑی بیٹی ہے۔"

"ٹھیک ہے پھر اب تم جاؤ۔" حاجی مدد علی قریشی نے کہا۔ "یہ پانچ ہزار روپے تمہیں ادا کرنے ہی ہیں۔ تمہارا بیٹا محنت کرتا رہے گا کام کرتا رہے گا جتنا اچھا کام کرے گا اتنی ہی جلدی یہ رقم ادا ہو جائے گی اور میں ایک ماہ کے بعد تم کو پانچ ہزار روپے اور دے دوں گا لیکن اس بات کو اچھی طرح یاد رکھنا کہ جو رقم تم لے چکی ہو وہ تمہارے اوپر واجب الادا ہے اور تمہارے لئے اس کی ادائیگی لازمی ہے۔"

زمین نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس وقت دو گاہک آ گئے جنہیں اینٹوں کی ضرورت تھی اور حاجی مدد علی قریشی ان کے ساتھ گفتگو میں مصروف ہو گیا۔

"جاؤ بی بی اب تم جاؤ۔" منشی امیر علی نے زمین سے کہا۔ "بات تو ہو گئی تمہاری حاجی صاحب سے بس اب تم جاؤ۔"

کچھ اور گاہک بھی آ گئے تھے۔ وہ آتے ہی منشی امیر علی سے باتیں کرنے لگے۔ زمین اور جنت کی طرف کوئی توجہ نہیں تھی ان کا اب وہاں رکنا بے کار تھا ویسے بھی حاجی صاحب نے اس کو صاف صاف بتا دیا تھا یہ رقم تو اس کو ہر حال میں ادا کرنی ہی ہو گی۔ اس میں کوئی رعایت نہیں ہو سکتی تھی۔

زمین بوجھل اور تھکے تھکے قدموں سے باہر نکلی۔ اس نے ناصر کو دیکھا جو کافی دور اپنے ہی جیسے کئی چھوٹے چھوٹے لڑکوں کے ساتھ بیٹھا ہوا مٹی گوندھ رہا تھا اور اس کی نظریں اس کمرے کے دروازے کی طرف لگی ہوئی تھیں جہاں اس کی ماں اور بہن کچھ دیر پہلے داخل ہوئی تھیں۔

زمین ایک بار پھر اپنے بیٹے کے پاس پہنچ گئی اور اسے کام کرتا دیکھ کر ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اس سے مخاطب ہو کر بولی۔ "محنت سے کام کرنا بیٹا..... خوب محنت سے کام کرنا اب تم ہی ہم لوگوں کا واحد سہارا ہو۔"

"کام ہی تو کر رہا ہوں اماں۔" ناصر نے آہستہ سے جواب دیا اور گردن جھکا کر کام کرنے لگا زمین اور جنت وہاں سے روانہ ہو گئیں۔

☆=========☆=========☆

"دیکھا تم نے؟" زمین نے جنت سے کہا۔ "وہ لعنت کا مارا منحوس یہاں آیا تھا اب معلوم ہوا کہ اسے، کس طرح خبر ہو گئی تھی کہ ہم یہاں سے پیسے لے کر گئے ہیں اور گھر میں پیسے رکھے ہیں۔ وہ بے ایمان ٹوہ میں لگا ہوا تھا اس نے کل صبح کو سن لیا تھا کہ ناصر بھٹے پر کام شروع کرنے والا ہے بس اسی وقت سے اس کی نیت میں فتور آیا۔ یہاں پہنچا



رقم لینے کے لئے اور جب یہاں سے رقم نہ ملی تو اس نے گھر میں رقم تلاش کر لی۔ ارے خدا اس کو غارت کر دے مر جائے تباہ ہو جائے یہ..... سب لوگوں کو تباہ کر رہا ہے بدنصیب۔ کچھ پتہ بھی تو نہیں ہے کہ کہاں مر گیا ہے جا کر..... اگر ایک دفعہ مل جائے تو میں اپنے ہاتھوں سے اس کی گردن مروڑ دوں۔"

"ابا نہیں ملیں گے اماں۔" جنت نے آہستہ سے کہا۔ "وہ خوب جانتے ہوں گے کہ ہم انہیں کہاں کہاں تلاش کر سکتے ہیں' اور وہ ان میں سے کسی بھی جگہ موجود نہیں ہوں گے۔ وہ تو کہیں لمبے ہی نکل گئے ہوں گے۔"

"میرے بچوں کی امانت میں خیانت کی ہے اس نے۔" زمین نے روتے ہوئے کہا۔ "اللہ چاہے گا تو پھوٹ پھوٹ کر نکلے گی اس کے بدن سے۔ راس نہیں آئے گی اس کو۔"

"ان کو بھلا کیا چیز راس آئے گی اماں۔" جنت نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "وہ تو خود ہی اپنے آپ کو تباہ و برباد کر رہے ہیں۔ اپنے ساتھ دشمنی کر رہے ہیں۔"

زمین جنت کو ساتھ لئے گھر آئی۔ تقریباً دوپہر ہو چکی تھی۔ آدھا دن برباد ہو گیا تھا۔ گھر پر ماسی خیراں موجود تھی گھر پر تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی تھا۔

"کچھ پتہ چلا گامو کا؟" ماسی خیراں نے ان دونوں کی شکل دیکھتے ہی پوچھا۔

"نہیں ماسی۔" زمین نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیا۔ "کچھ پتا نہیں چلا ہم نے اس کو ہر اس جگہ تلاش کیا جہاں اس کی موجودگی کے امکانات ہو سکتے تھے لیکن وہ کہیں نہ ملا۔"

"رقم لے کر کہیں دور نکل گیا۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "ارے کب تک اس مال کو نشے میں پھونکے گا؟ آخر ایک دن یہ رقم ختم ہو جائے گی اور بہت جلدی ختم ہو جائے گی کیونکہ بہت سے کھانے چاٹنے والے یار دوست پیچھے لگ جائیں گے جو دھیرے دھیرے کر کے پائی پائی جھڑوا لیں گے بدنصیب سے۔"

"وہاں بھٹے پر پہنچا تھا ماسی۔" زمین نے ماسی خیراں کو اس واقعے کی تفصیل بتائی۔

"اوہو..... تو یہ بات تھی۔" ماسی خیراں نے جلدی سے کہا۔ "اس کو معلوم ہو گیا تھا کہ رقم گھر میں آ چکی ہے اور وہ بس موقع پاتے ہی اس کو لے اڑا..... ہائے ظالم نے ننھے ننھے بچوں کا ذرا خیال نہیں کیا۔ اس بات کا خیال نہیں کیا کہ اس ننھی سی جان کو برسوں تک بغیر پیسے کوڑی کے کام کرنا پڑے گا۔ کاش میں نے وہ رقم کل ہی اپنے پاس رکھ لی ہوتی..... اگر وہ تمہارے گھر میں موجود نہ ہوتی تو محفوظ رہتی۔"

"بس ماسی، سب مقدر کے کھیل ہیں۔" زیبن نے ایک سرد آہ کے ساتھ کہا اور پھر وہ جنت سے مخاطب ہو کر بولی۔ "لے اب سنبھال بچوں کو انہیں کھانا وانا کھلا دینا۔ میں اب چلتی ہوں چوہدریوں کی طرف آدھا دن تو ختم ہو ہی گیا باقی وقت ہی کچھ نہ کچھ کام تو کر ہی لوں، ورنہ سب کے منہ پھول جائیں گے اور کل مجھے سینکڑوں باتیں سننی پڑیں گی۔ باتیں تو خیر اب بھی سننی پڑیں گی مگر کیا کروں مجبوری ہے۔"

زیبن نے گھر اور بچوں کو جنت کے حوالے کیا اور خود چوہدریوں کے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

☆=========☆=========☆



بہت دور کھڑے ہوئے مراد نے زیبن کو گھر سے نکل کر جاتے ہوئے دیکھا اور پھر اس نے ماسی خیراں کو بھی گھر سے نکلتے دیکھا اس سے پہلے وہ زیبن اور جنت کو گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ محلے میں تو صبح ہی ہنگامہ برپا ہو گیا تھا کہ گامو اپنے گھر سے پانچ ہزار روپے کی رقم لے کر بھاگ گیا ہے اور لوگوں کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ زیبن اور جنت اس کی تلاش میں نکلی ہوئی ہیں۔ مراد بہت دیر سے ان لوگوں کی واپسی کا منتظر تھا اور دریافت حال کے لئے بے چین تھا۔ جنت کے گھر والوں پر گہری چوٹ لگی تھی اسے اس صورت حال سے بڑا دکھ پہنچا تھا اور یہ درد مراد کو صرف جنت کے حوالے سے تھا۔ مراد اس وقت عمر کی اس منزل سے گزر رہا تھا جو نازک ترین اور لطیف ترین جذبات و احساسات کی تعمیر و تشکیل کا دور ہوتا ہے اور اس کے قلب میں صورت پذیر ہونے والے یہ جذبات و احساسات ایک مخصوص ہستی کے ساتھ وابستہ ہو گئے تھے اور وہ ہستی تھی گیارہ سالہ جنت۔ مراد نہیں جانتا تھا کہ محبت کیا ہوتی ہے اور محبت کیونکر ہوتی ہے؟ وہ تو صرف یہ جانتا تھا کہ جنت سے مل کر جنت سے باتیں کر کے جنت کے قریب رہ کر اسے دنیا کی سب سے بڑی خوشی حاصل ہوتی تھی اس کے لئے کوئی بھی دوسری شے جنت کے قرب سے زیادہ نشاط انگیز، راحت افزا اور روح پرور نہیں تھی۔ جنت کو خوش دیکھنا اس کے لئے سب سے بڑی خوشی تھی اور جنت کا ہر دکھ خود اس کا اپنا دکھ تھا بلکہ اپنے دکھ سے بھی زیادہ ملال انگیز۔ ایسا کیوں تھا یہ مراد نہیں جانتا تھا لیکن وہ یہ ضرور جانتا تھا کہ ایسا ہی ہے۔

جنت خود اگرچہ ابھی بہت چھوٹی تھی لیکن وہ اس جذبے کی گرمی اور توانائی کو بخوبی محسوس کر سکتی تھی جو مراد کے لئے اس کے دل میں تھا اور اسے یہ سب کچھ اچھا لگتا تھا۔ اس کی ماں اسے مراد سے ملنے سے روکتی تھی لیکن جنت کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مراد سے ملنے میں کیا برائی ہے۔ مراد تو بہت اچھا تھا جنت کے دل میں مراد کے لئے مہر و التفات کے جذبات تھے اور ماں کی طرف سے لگائی جانے والی پابندیوں کے باوجود ان جذبات کے

حسن اور توانائی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کے برخلاف ان کی شدت میں کچھ اضافہ ہی ہو گیا تھا۔

مراد نے جب اس امر کی تسلی کر لی کہ گھر میں اب کوئی بڑا موجود نہیں ہے تو وہ جلدی سے وہاں پہنچ گیا۔ جنت اس وقت ننھی کلثوم کا منہ دھلا رہی تھی مراد کو دیکھتے ہی اس کے تھکے ستے ہوئے چہرے پر ایک پھیکی اور افسردہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"کچھ پتہ چلا جنت؟" مراد نے تقریباً سرگوشی میں اس سے پوچھا۔

"نہیں مراد۔" جنت نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیا۔ "اور اب پتہ چلے گا بھی نہیں۔ ابا کوئی یہاں تھوڑی بیٹھے ہوں گے۔ وہ تو خدا جانے کہاں کے کہاں پہنچ چکے ہوں گے۔ پانچ ہزار روپے کی رقم ہے ان کی جیب میں کوئی معمولی بات تو نہیں ہے۔"

"بہت برا ہوا جنت۔" مراد نے ملول و افسردہ لہجے میں کہا۔ "بہت بڑی رقم تھی اور وہ بھی ادھار کی....."

"ناصر بے چارہ کام کرتے کرتے مر جائے گا اور اس کے بدلے میں کیا ملے گا؟" جنت نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "جو کچھ ملا تھا وہ تو ابا پہلے ہی لے اڑے....."

جنت بہت اداس تھی اور اس کی اداسی مراد کے دل و دماغ پر ایک اذیت ناک بوجھ بن کر چھائی ہوئی تھی لیکن اس کے پاس کوئی ایسا طریقہ نہیں تھا جس کے ذریعے وہ اس کی اداسی کو دور کر سکے۔ وہ صرف اس کے دکھ میں شریک ہو سکتا تھا۔ اس کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھ کر اس میں پوری طرح سے شامل تھا۔ وہ کچھ دیر تک جنت کے ساتھ رہا اور پھر وہاں سے چلا آیا۔ ماسی خیراں کسی وقت بھی دوبارہ وہاں آ سکتی تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ زمین تک یہ خبر پہنچے کہ وہ اس کی عدم موجودگی میں گھر میں آیا تھا۔

زمین ہانپتی کانپتی آدھے دن کے بعد چوہدریوں کے گھر پہنچی تو چھوٹی اور بڑی چوہدرائن' دونوں جیسے اسے کھانے کے لئے دوڑ پڑیں۔ دونوں کے تیور خشمگیں جنگی بلیوں کی طرح بگڑے ہوئے تھے اور وہ زمین کو پنجے مارنے کے لئے بری طرح بے چین تھیں۔

"یہ تمہارا وقت ہے کام پر آنے کا؟" بڑی چوہدرائن نے آنکھیں نکال کر کہا۔ "کچھ تمہارا دماغ ٹھیک ہے یا نہیں؟" زمین کا دماغ تو واقعی ٹھیک نہیں تھا۔ پہلے تو اس نے یہی سوچا تھا کہ وہ آج کام پر نہیں جائے گی لیکن پھر یہ سوچ کر کام پر آ گئی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ اس کو نوکری سے نکال دیں۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کے لئے بڑی مشکل پیدا ہو جاتی کیونکہ دوسری نوکری ملنا کوئی آسان کام نہیں تھا اور ان لوگوں کو تو کام کرنے والیاں



بہت مل سکتی تھیں اور چوہدرائن تو آئے دن اس کو دھمکی دیتی رہتی تھی کہ وہ اس کو نکال کر اس کی جگہ دوسری عورت کو رکھ لیں گی۔

"ارے..... ارے میں تو لٹ گئی چوہدرائن۔" زمین نے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے کہا۔ "میں تو بالکل برباد ہو گئی میرا تو سب کچھ تباہ ہو گیا۔ میں کہاں جاؤں کس سے فریاد کروں۔"

"ارے ہوا کیا؟" بڑی چوہدرائن نے قہر آلود حیرت کے ساتھ اس سے پوچھا۔ "کیا بات ہو گئی؟"

اس کے جواب میں زمین نے اپنی پوری داستانِ غم ان دونوں کو سنا دی۔ ان دونوں کو یہ بات تو بہت پہلے سے معلوم تھی کہ زمین کا میاں ہیروئنچی ہے' نشہ کرتا ہے اور کوئی کام دھندا نہیں کرتا زمین خود ہی گھر چلا رہی ہے اور اپنے بچوں کی پرورش کر رہی ہے۔

"تو یوں کہو کہ تم نے اپنے آٹھ سال کے بیٹے کو بھٹے والوں کے ہاتھوں دس ہزار روپے میں فروخت کر دیا تھا۔" چھوٹی چوہدرائن نے جو بارہ جماعتیں پڑھی ہوئی تھی اور بڑی پابندی سے اردو کا اخبار پڑھا کرتی تھی ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔ "کتنے ظالم ہو تم لوگ..... اپنے بچوں کے ساتھ کتنا ظلم کرتے ہو کہ انہیں فروخت کر دیتے ہو انہیں کم عمری میں مشقت پر لگا دیتے ہو اور پھر شور مچاتے ہو' جبری محنت جبری محنت..... چائلڈ لیبر..... چائلڈ لیبر....."

زمین چھوٹی چوہدرائن کی بات کو کچھ نہیں سمجھی اور اس نے زیادہ سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ وہ تو صرف یہ جانتی تھی کہ اگر اس کا ننھا سا بیٹا بھی کما کر لائے گا تو اس کے گھر کے چولہے میں آگ زیادہ دیر تک روشن رہ سکے گی۔

"ارے پولیس میں رپورٹ کی تم نے؟" بڑی چوہدرائن نے تقریباً ڈپٹ کر اس سے پوچھا۔

"لو جی۔ پولیس میں کیا رپورٹ کروں گی؟" زمین نے کہا۔ "چرانے والا تو گھر کا ہی آدمی ہے..... پولیس کیا کرے گی؟"

"پولیس کرے گی یہ کہ اس کو ڈھونڈ کر پکڑے گی اور پچاس جوتے لگا کر اس کو جیل میں بند کرے گی۔" چھوٹی چوہدرائن نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ "ایسے بدمعاش کا اس کے سوا بھلا اور کیا علاج ہو سکتا ہے؟ مگر تم جیسی عورتیں۔ ہونہہ۔ جوتے کھائے جائیں گی اور خاوند کے نام کا کلمہ پڑھے جائیں گی۔"

بڑی چوہدرائن کو اپنی بہو کی یہ بات کچھ زیادہ پسند نہیں آئی۔ "اب بیوی اپنے خاوند کی ایسی دشمن بھی تو نہیں ہو سکتی۔" اس نے کہا۔ "کیا کیا جائے۔ مجبوری ہے۔ چل۔ زیبن تُو کام تو شروع کر آدھا دن تو برباد ہو گیا۔"

زیبن نے کام شروع کر دیا اور قدرے اطمینان محسوس کیا ان لوگوں نے اس کو نکالنے کی دھمکی نہیں دی تھی۔

شام کو جب زیبن کام ختم کر کے گھر واپس آئی تو خود کو ہر دن سے زیادہ تھکا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ آج کی تھکاوٹ میں شدید ناامیدی اور مایوسی کی آمیزش تھی کل رات کو اس نے کیسے کیسے سہانے خواب دیکھے تھے جنت کو دلہن بنے ہوئے دیکھا تھا۔ جنت کی شادی ہو رہی تھی وہ اپنے خوبصورت دولہا کے ساتھ رخصت ہو کر گھر سے جا رہی تھی اور زیبن خوشی اور غم کے ملے جلے احساسات سے سرشار تھی اور صبح ہوتے ہی اس کے یہ سارے خواب خاک میں مل گئے تھے کچھ بھی تو باقی نہیں بچا تھا۔ اس نے بہت کچھ پا کر بھی بہت کچھ کھو دیا تھا ایک بار پھر وہی محرومیوں کا ڈیرا تھا وہی مایوسیوں کی یلغار تھی اور وہی ناامیدیوں کا لشکر تھا جس کے نرغے میں وہ اپنے آپ کو گھرا ہوا پا رہی تھی۔

گھر واپس آئی تو کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا دل بیٹھا جا رہا تھا کچے آنگن میں پھیلتا ہوا اندھیرا کچھ زیادہ ہی تیزی کے ساتھ بڑھتا اور پھیلتا جا رہا تھا اور یہ سارا اندھیرا جیسے اس کے اپنے وجود کے اندر اترتا چلا جا رہا تھا۔

آنے والے دنوں کے دوران ' زیبن ایک دم سے بوڑھی ہو گئی اس کی عمر میں جیسے یک لخت کئی برسوں کا اضافہ ہو گیا اس کے بالوں میں چاندی کے سفید تاروں کی جگہ پورے کچھے چمکتے نظر آنے لگے چہرے پر ایک دم جھریاں نمودار ہو گئیں' زندگی' جو پہلے بھی بے رحم اور نامہربان تھی اب اور بھی زیادہ بے رحم اور نامہربان ہو گئی تھی۔

اینٹوں کے بھٹے نے ناصر سے اس کا بچپن چھین لیا۔

آٹھ سال کی عمر میں جب پہلے دن ناصر بھٹے میں کام کرنے کے لئے گیا تو اس کا بچپن بھٹے کی حدود کے باہر ہی کھڑا رہ گیا وہ اپنے بچپن کو بھٹے کے باہر چھوڑ کر ایک کمائی کرنے والے بالغ مرد کی حیثیت سے بھٹے کے اندر داخل ہوا بھٹے کی حدود میں قدم رکھتے ہی زندگی کا پورا اسلوب بدل گیا تھا۔

منشی امیر علی نے اس کو فخرو کے حوالے کر دیا جو خود بھی ایک مزدور تھا اور اس کے ساتھ ہی وہ نئے لڑکوں کو کام سکھاتا تھا ان کے کام کی نگرانی بھی کرتا اور کسی کو ایک پل



بھی خالی نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔

بھٹے میں ناصر کے علاوہ اور بھی کئی کم عمر لڑکے کام کرتے تھے لیکن فی الوقت سب سے کم عمر ناصر ہی تھا جب وہ کام کرنے کے لئے وہاں پہنچا تو خود کو اس پرندے کی طرح خوفزدہ اور بے بس محسوس کر رہا تھا جسے پہلی بار پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو۔

جب شکیل نامی لڑکے کے منہ پر فخرو کا ایک زور دار تھپڑ پڑا تو صرف شکیل ہی نہیں بلبلایا ناصر بھی اس کے ساتھ بلبلا اٹھا تھا اور خوف و دہشت کی ایک تیز و تند لہر اس کے سارے وجود میں دوڑتی چلی گئی تھی۔ شکیل سے کام کے دوران کوئی معمولی سی غلطی ہو گئی تھی جس کے عوض یہ زور دار تھپڑ اس کو انعام کے طور پر ملا تھا اس کے ساتھ ہی دو چار بھاری بھرکم گالیوں کی آواز بھی ناصر کے کانوں میں پڑی۔ ناصر کا کلیجہ کانپ اٹھا مار کھانا اگرچہ اس کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی گھر پر اماں اس کو اکثر مارتی رہتی تھیں ڈانٹتی اور برا بھلا بھی کہتی رہتی تھیں لیکن وہ انداز کچھ مختلف ہوتا تھا۔ اول تو اماں اتنے زور سے نہیں مارتی تھیں دوسرے یہ کہ ان کی مار میں شقاوت اور بے رحمی کا یہ انداز کبھی نہیں شامل ہوتا تھا۔

ناصر نے فخرو کے تھپڑ کی حقیقی دھمک اپنے گال پر تقریباً دو گھنٹے کے بعد محسوس کی۔ تھپڑ اتنے زور کا تھا کہ ناصر کا سارا وجود جیسے ہل کر رہ گیا اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا اور اس کا سر بھنا گیا۔ "اُلو کے پٹھے!" فخرو چلا رہا تھا۔ "اتنا زیادہ پانی ملا دیا مٹی میں اب تیرا باپ اس سے اینٹیں بنائے گا؟ آنکھیں کھول کر دھیان سے کام کیا کر اب اس میں اور مٹی ملا۔ سارے کام کا ستیاناس کر کے رکھ دیا بیوقوف کے بچے نے۔"

فخرو کے لہجے میں اس کے انداز میں صرف جھلاہٹ اور غصہ ہی شامل نہیں تھا اس کے لہجے میں نفرت تھی بیزاری تھی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ساری دنیا سے نفرت کرتا ہے اور اس نفرت کا غبار ان لڑکوں پر نکالتا ہے جو اس کی ماتحتی میں کام کرتے ہیں اور انہیں بلاوجہ معمولی معمولی بات پر پیٹ پیٹ کر اپنے اس نامعلوم قسم کے جذبۂ نفرت کی تسکین کرتا ہے۔

پہلے دن ناصر دو بار پٹا اور اس نے اپنے علاوہ دوسرے لڑکوں کو بھی فخرو کے ہاتھوں پٹتے ہوئے دیکھا۔ بھٹے میں کام کرنے والے دوسرے تمام چھوٹے لڑکے بھی ناصر کی طرح اجرتی قیدی تھے۔ جنہیں حاجی مدد علی قریشی نے ان کے والدین سے ایک خاص رقم کے عوض خرید کر پکے کاغذ پر انگوٹھے لگوائے تھے اور اب ان بچوں کے جسم و جاں کا

بلا شرکت غیرے مالک بن چکا تھا اس نے قانون سے اپنے لئے یہ حق ملکیت خرید لیا تھا۔

ناصر کا پہلا دن بھٹے میں بہت برا کٹا وہ سارا دن خوف سے سہما گھبرایا کام میں مصروف رہا فخرو ان لوگوں کے اردگرد بھوت کی طرح منڈلاتا رہتا تھا اور جس لڑکے کو بھی کام میں ذرا سی کوتاہی کرتے دیکھتا اسے وہیں بلا کسی تمہید کے فوراً مارنا شروع کر دیتا سارے لڑکے اس سے سخت خوفزدہ نظر آ رہے تھے۔

شام کو جب ماں آئی تو ناصر کو اسے دیکھ کر اس سے مل کر یوں لگا جیسے وہ ایک طویل عرصے کے بعد ایک محبت بھری شفیق ہستی کو' اپنی ماں کو دیکھ رہا ہے اس نے پورا دن اپنی ماں سے الگ رہ کر ایک اجنبی' نامانوس' بیگانہ اور درشتی آمیز فضا میں گزارا تھا جہاں اس کے لئے کوئی لطافت نرمی اور محبت نہیں تھی اور جب ماں آئی تو جبری مشقت کا یہ حصار ٹوٹ گیا اور وہ ماں کے ساتھ خوشی خوشی گھر واپس آ گیا جہاں کا ایک ایک ذرہ آج اس کو بہت پیارا معلوم ہو رہا تھا یہاں تو سب اس کے اپنے تھے۔

لیکن اگلے دن سے جبری مشقت کا یہ حصار ناصر کی زندگی کا جزو بن گیا وہ علی الصبح کھانے کی پوٹلی ہاتھ میں لے کر بھٹے پہنچ جاتا جہاں وہ سارا دن کام میں مصروف رہتا اور اس دوران فخرو کے نہ جانے کتنے چانٹے' کتنے گھونسے اور کتنی گالیاں اپنے ننھے اور ناتواں وجود میں جذب کرتا رہتا۔ صبح سے لے کر شام تک سانس لینے کا ذرا سا وقت بس وہی ہوتا تھا جب کھانے کا وقفہ ہوتا تھا۔ اس وقفے کے دوران فخرو کے ہاتھ بھی رک جاتے تھے اور زبان بھی مگر تھوڑی دیر کے بعد یہ سلسلہ پھر شروع ہو جاتا تھا۔ جیسے جیسے دن گزرتے جاتے تھے ناصر کو جبری مشقت کے اس سخت گیر حصار سے نفرت ہوتی جا رہی تھی۔ اس حصار کے بندھن اسے کچلے جا رہے تھے اسے مارے ڈال رہے تھے یہاں اس کی دلچسپی کا دل بستگی کا کوئی سامان نہیں تھا کچھ نہیں تھا وہ صبح سے لے کر شام تک مٹی گھولتا' گوندھتا اور وہ سارے دوسرے کام کرتا جن کے لئے فخرو اس سے کہتا وہ فخرو کے بھوت کو ہر وقت اپنے گرد منڈلاتا ہوا محسوس کرتا۔ ذرا ذرا سی بات پر فخرو تھپڑوں اور گالیوں سے اس کے وجود کو اس کی روح کو زخمی کر کے رکھ دیتا۔ اس کا جی چاہتا فخرو کی گردن کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر مروڑ دے اور اس کی جان نکال لے لیکن اس کے ہاتھ ابھی بہت ناتواں تھے اور فخرو کی گردن بہت موٹی اور مضبوط تھی۔

گھر کے آنگن میں اودھم مچانا' گلی میں دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنا' کودنا' دوڑنا بھاگنا' چیخنا چلانا' شور مچانا' یہ سب کچھ اب محض خواب و خیال بن کر رہ گیا تھا۔ اب تو صبح



سے شام تک وہ ایک ایسے قید خانے میں بند رہتا تھا جہاں اکتا دینے والی بوجھل' غیر دلچسپ اور زبردستی کی مشقت کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ جہاں زور سے بات کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا کیونکہ فخرو کو لڑکوں کا زور زور سے بولنا بالکل پسند نہیں تھا۔ "مت کتے کے پلوں کی طرح شور مچایا کرو حرام زادو!" وہ غضب ناک ہو کر چلاتا اور قریب موجود لڑکوں میں سے کسی کے یوں ہی ایک آدھ ہاتھ رسید کر دیتا خواہ وہ لڑکا بالکل خاموشی سے کام کیوں نہ کر رہا ہو۔

بھٹے کی فضا گہری دھند میں لپٹی ہوئی تھی۔ یہاں آ کر بچے' بچے نہیں رہتے تھے وہ ایک دم سے بڑے بن جاتے تھے وہ بڑوں کی طرح کام کرتے تھے انہماک سے' مشقت سے' توجہ سے' ان کا دماغ اور ان کے ہاتھ کسی نہ کسی نوع کے تخلیقی عمل میں مصروف ہو جاتے تھے لیکن پھر بھی وہ بچے ہی رہتے تھے اور انہیں بے دردی کے ساتھ مارا پیٹا جاتا تھا ان پر سختی کی جاتی تھی اور ان پر سختی کرنے والوں کو اس بات کی کوئی پروا نہیں ہوتی تھی کہ وہ اپنے والدین سے اس بات کی شکایت کر دیں گے۔ والدین تو ان کو آجروں کے ہاتھوں فروخت کر چکے تھے ان کی اس محنت کے عوض جو وہ کر رہے تھے۔ رقم وصول کر چکے تھے۔

آٹھ سالہ ناصر کی بچپن سے خالی' بالغ زندگی اب ایک بنے بنائے سانچے میں ڈھل گئی تھی۔ صبح صبح ماں اسے ناشتہ کرانے کے بعد کھانے کی پوٹلی اس کے ہاتھ میں تھماتی اور وہ خاموشی سے گھر سے نکل پڑتا اور پھر بھٹے میں پہنچنے کے بعد وہ کسی مشینی پرزے کی طرح کام میں لگ جاتا۔ کام' مار اور گالیاں۔ بے آرامی اور تھکن اس کے لئے تو سارے دن کی جان لیوا مصروفیت کا بس یہی ماحصل تھا۔ اس کام کے بدلے میں اجرت کے نام پر جو تھوڑی بہت رقم ملی تھی یا مل رہی تھی یا ملنے والی تھی اس سے ناصر کا کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ وہ تو اس کے بارے میں پوری تفصیلات جانتا بھی نہیں تھا۔

بھٹے میں دوسرے تمام لڑکے ناصر سے بڑی عمر کے تھے انہی میں پرویز نامی ایک لڑکا بھی تھا جو کوئی بارہ سال کا تھا اول دن سے ہی پرویز نے ناصر کو ناپسند کیا تھا اپنی اس ناپسندیدگی کا برملا اظہار بھی کیا تھا۔ "ہیرو پنچی کی اولاد ہے۔" اس نے دوسرے لڑکوں سے کہا تھا۔ "اس سے بچ کر رہنا۔" اور اس سے اگلے دن جب سارے لوگوں کو یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ ناصر کا باپ گھر سے رقم لے کر بھاگ گیا پرویز نے اسے "چور کی اولاد" کہنا شروع کر دیا تھا۔ پرویز موقع پاتے ہی اس کی تضحیک کرتا تھا اور اس کی جانب

ایک خاص قسم کا معاندانہ رویہ رکھتا تھا۔ ناصر خاموشی سے اس کی باتیں برداشت کر لیتا تھا وہ چاہتا تو فخرو سے اس کی شکایت بھی کر سکتا تھا لیکن وہ تو فخرو سے اس قدر ڈرتا تھا کہ اس سے بات کرنے کی بھی اس میں جرأت نہیں تھی اور جہاں تک گھر کا تعلق تھا تو گھر میں کسی سے شکایت کرنے سے کیا فائدہ تھا؟ اسے تو گھر میں یہ بات بتاتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوئی تھی کہ پرویز اسے "چور کی اولاد" کہتا ہے۔

اس روز جب وہ کام پر سے واپس آ رہا تھا تو پرویز کے علاوہ دو لڑکے اور بھی اس کے ساتھ تھے۔ کچھ دور ساتھ چلنے کے بعد میں ان میں ایک کا راستہ الگ ہو گیا اور صرف دو لڑکے ناصر کے ساتھ رہ گئے جن میں ایک پرویز تھا دوسرا نعیم۔ ناصر ان دونوں سے الگ ہو کر دوسرے راستے پر جانے لگا تو اچانک پرویز نے اس کو روک لیا۔ "تم بھی بڑے ہو کر اپنے باپ کی طرح چور بنو گے نا؟" اس نے تضحیک آمیز انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔ "جیسے تمہارا باپ چور، ویسے ہی تم چور۔"

"بکواس مت کرو اور مجھے جانے دو۔" ناصر نے مضمحل انداز میں کہا اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا تھا کہ اس کا باپ چور تھا۔

"زیادہ زبان چلائی تو منہ توڑ دوں گا۔" پرویز نے لپک کر ناصر کا گریبان پکڑ لیا وہ بالکل جھگڑا کرنے پر تلا ہوا تھا۔ "میں بکواس کر رہا ہوں؟ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟ ہے نہیں تیرا باپ چور؟"

"چھوڑ یار۔" نعیم نے اس کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "کیوں بلاوجہ جھگڑا کر رہے ہو؟"

"اس نے کہا کہ میں بکواس کر رہا ہوں۔" پرویز نے غصے میں آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔ "اس کی تو میں زبان کھینچ لوں گا۔" اور اس کے ساتھ اس نے ناصر کے گریبان کو ایک جھٹکا دیا۔ "کیوں بے چور کی اولاد۔ لگاؤں تیرے پچاس جوتے؟"

عین اسی وقت سامنے سے مراد آ گیا وہ لپک کر ان لوگوں کے پاس آ گیا۔

"کیا ہے؟ کیا ہو رہا ہے؟" اس نے آتے ہی پرویز کو زور سے ایک دھکا دیا پرویز کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"مجھ سے بلا وجہ کا جھگڑا کر رہا ہے یہ۔" ناصر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے چور کی اولاد کہتا ہے چور کہتا ہے میں نے اس کا کیا چرایا ہے۔"

"اگر آئندہ تو نے ناصر کو پریشان کیا تو تیرے دانت توڑ کر حلق میں گھسیڑ دوں گا۔"



مراد نے پرویز کو زور سے ایک اور دھکا دیتے ہوئے کہا۔ "اس کو چھوٹا سمجھ کر بہادری دکھاتا ہے؟ اس کو اکیلا مت سمجھنا مار مار کے حلیہ بگاڑ دوں گا تیرا۔"

خوف زدہ ہونے اور سہمنے کی اب پرویز کی باری تھی۔ مراد نے اس کو اچھی طرح سے تنبیہہ کر دی اور احتیاطاً ایک تھپڑ بھی اس کے منہ پر رسید کر دیا۔ نعیم نے اس سارے معاملے میں کوئی مداخلت نہیں کی۔

"چلو۔ میں تمہیں گھر تک چھوڑ آؤں۔" مراد نے ناصر سے کہا اور اس کو اپنے ساتھ لے کر وہاں سے چل پڑا۔ راستے میں مراد اس سے بھٹے میں اس کے کام کے بارے میں پوچھتا رہا اس سے پہلے بھی دو ایک بار جب وہ اس کو گھر کے باہر ملا تھا تو اس نے اس سے اس کے کام کے بارے میں پوچھا تھا۔ مراد کا رویہ اس کے ساتھ ہمدردانہ، دوستانہ، برادرانہ اور رفیقانہ تھا۔ مراد اس کو ہمیشہ سے ہی عزیز رکھتا تھا اور وہ خود بھی مراد کو بہت پسند کرتا تھا یہی وجہ تھی کہ اس نے کبھی بھی اپنی ماں کو مراد کی آمد کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کی ماں نے مراد کو اپنے گھر آنے سے منع کر رکھا ہے۔ تاہم اس کی عدم موجودگی میں مراد ایک دو بار ان لوگوں کے گھر آیا اور کچھ دیر وہاں رہا۔ جنت سے باتیں کرتا رہا اور جب وہ چلا گیا تو جنت نے اپنے بھائی سے کہا۔ "اماں سے نہ کہنا کہ مراد آیا تھا ارے ہاں خواہ مخواہ کے لئے وہ ناراض ہوں گی۔ کیا فائدہ اور اس بے چارے نے ہمارا کیا بگاڑا ہے۔" ناصر نے کبھی بھی اپنی ماں کو مراد کی آمد کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔

مراد نے اس کو اس کے گھر کے دروازے تک چھوڑا۔ "اگر آئندہ کبھی وہ لڑکا پرویز تم کو تنگ کرے تو مجھ کو بتانا۔" مراد نے کہا۔ "میں اس کا دماغ سیدھا کر دوں گا ساری بدمعاشی بھول جائے گا۔"

گھر واپس آنے کے بعد رات کو اس نے چپکے سے جنت کو آج کے اس واقعے کے بارے میں بتایا۔ جنت یہ بات سن کر بہت خوش ہوئی اور بولی۔ "وہ تمہیں اپنے چھوٹے بھائی کی طرح عزیز رکھتا ہے۔"

اس دن کے بعد سے پرویز نے ناصر کو کبھی تنگ نہیں کیا لیکن وہ ناصر کو ٹیڑھی نظروں سے دیکھتا ضرور رہتا تھا۔ دن تیزی سے گزرتے رہے یہاں تک کہ تقریباً ایک سال کا عرصہ گزر گیا۔ اس ایک سال کے دوران ان سب لوگوں کی دنیا میں بہت کچھ بدل گیا زمین کے بڑھاپے اور جنت کی جوانی نے پیش قدمی کی زمین دیکھتے ہی دیکھتے ایک دم

بوڑھی ہوتی جا رہی تھی ایک سال کے اندر اندر اس کی عمر میں جیسے کئی سال کا اضافہ ہو گیا تھا۔ وقت نے بڑی بے رحمی کے ساتھ اس کے وجود کو شکست و ریخت کا شکار بنا تھا۔ پیہم صدمات اس کی جان کو گھلائے ڈال رہے تھے چوہدریوں کے گھر میں کام بڑھا جا رہا تھا اور بڑھتے ہوئے کام کے ساتھ جھڑکیوں اور ڈانٹ پھٹکار میں روزانہ ملنے والی ذلتوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ چھوٹی چوہدرائن نے دو جڑواں بچوں کو جنم دیا تھا۔ تاہم یہی غنیمت تھا کہ زمین کی نوکری برقرار تھی اور ان لوگوں نے اس کو نکالا نہیں تھا۔

جنت اب تقریباً بارہ سال کی ہو گئی تھی۔ زمین جب اس کو دیکھتی تھی تو اس کے دل میں دکھ' خوشی اور خوف کا ایک ملا جلا تاثر پیدا ہوتا تھا۔ جنت خوش شکل تھی اور گزرتے ہوئے دنوں کے ساتھ اس کی دلکشی نکھرنا شروع ہو گئی تھی۔ "بس جلدی سے کسی نہ کسی طرح اس کا رشتہ ہو جائے۔" زمین تھرا کر سوچتی۔ "یہ بوجھ جتنی جلدی میرے سر سے اتر جائے اتنا ہی اچھا ہو۔ ایک کا ٹھکانہ ہو جائے تو پھر دوسری کے لئے کچھ سوچوں اور تیاری کروں۔"

گامو کا اس عرصے کے دوران کوئی پتہ نہیں چلا۔ خدا معلوم' وہ زندہ بھی تھا یا نہیں۔ زمین اس کو بڑی شدت کے ساتھ یاد کرتی تھی اور اکثر رات کی تنہائیوں میں اس کے لئے آنسو بہایا کرتی تھی۔ کچھ بھی ہو وہ کم بخت اس کا شوہر تو تھا۔ اس کے دم سے اس کے ہاتھوں کی چوڑیاں سلامت تھیں اور آنکھوں میں کاجل کی تحریر روشن تھی اس نے گامو کو ہزاروں بددعائیں دی تھیں اس کی موت کی دعائیں مانگی تھیں لیکن وہ سب کچھ اس نے شدید مایوسی' جھنجلاہٹ غصے اور پریشانی کے عالم میں کیا تھا اور اب اس کا جی چاہتا تھا کہ گامو زندہ ہو۔ اس کو گامو کی کوئی خیر خبر نہیں تھی لیکن اس کے دل میں خواہش تھی کہ وہ زندہ ہو اور جہاں کہیں بھی ہو زندہ رہے۔ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں گامو کے لئے نفرت کم ہوتی جا رہی تھی گامو اس کی اور اس کے بچوں کی زندگی سے نکل گیا تھا۔ اس کے ساتھ وابستہ جذبات کی شدت اور تندی میں بھی کمی ہوتی جا رہی تھی۔

زمین نے ماسی خیراں اور دوسری عورتوں سے بھی کہہ رکھا تھا کہ وہ جنت کے لئے کوئی مناسب اور معقول سا رشتہ تلاش کریں حاجی مدد علی قریشی سے ملنے والی پانچ ہزار روپے کی رقم تو گامو لے کر بھاگ گیا تھا لیکن اس کے ایک ماہ کے بعد حاجی مدد علی قریشی نے پانچ ہزار روپے کی رقم کی دوسری قسط ادا کر دی تھی۔ اس بار زمین بہت محتاط رہی



تھی اور اس نے وہ ساری رقم فوراً ماسی خیراں کے حوالے کر دی تھی جس نے اس کو بحفاظت رکھ لیا تھا اور اب وہ رقم پوری طرح محفوظ تھی کچھ تھوڑے بہت پیسے وہ کسی نہ کسی طرح اپنی اور ناصر کی تنخواہ میں سے پس انداز کرنے کی کوشش کرتی تھی۔

"بس جنت کی شادی ہو جائے کسی طرح سے۔" وہ دل میں سوچتی۔ "پھر کچھ عرصہ کے لئے تو میں اطمینان کا سانس لے سکوں گی۔" جنت کے لئے رشتہ کی تلاش جاری تھی۔

اس روز شام کو زمین جب کام سے واپس آئی تو بہت زیادہ تھکی ہوئی تھی گزرتے ہوئے دنوں کے ساتھ ساتھ تھکن کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ طاقت روز بروز جواب دیتی جا رہی تھی۔ خاص طور سے ہاتھ پیروں میں تو اب بہت زیادہ درد رہنے لگا تھا۔ وہ آ کر چارپائی پر لیٹ گئی۔ ناصر ابھی تک بھٹے سے واپس نہیں آیا تھا۔

اچانک دروازے پر بڑے زور کی خاصے خشمناک انداز کی دستک ہوئی۔ یہ کوئی اجنبی ناآشنا اور بے مروت قسم کی دستک تھی۔ زمین چونک کر اٹھ گئی اور دروازے کی طرف بڑھی جنت بھی اسی وقت اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی تھی لیکن زمین نے اس کو روک دیا۔ "میں دیکھتی ہوں۔" اس نے کہا اور دروازہ کھول دیا۔

دروازے پر حاجی مدد علی قریشی کا منشی امیر علی' ناراضگی اور خشونت کی تصویر بنا کھڑا تھا۔

"ناصر کہاں ہے؟" اس نے ڈپٹ کر پوچھا۔ "وہ آج کام پر کیوں نہیں آیا؟"

"کیا؟" زمین نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "کام پر نہیں آیا؟ مگر وہ تو صبح کو روز کی طرح کام پر جانے کے لئے گھر سے نکلا تھا۔" اور اس کے ساتھ ہی کچھ دن قبل پیش آنے والے واقعات زمین کے دماغ میں گردش کرنے لگے۔ "لیکن وہ تو گھر سے یہی کہہ کر گیا تھا کہ وہ کام کرنے کے لئے جا رہا ہے۔" زمین نے شدید بدحواسی اور سراسیمگی کے عالم میں منشی امیر علی کے خشمگیں چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اس کے دماغ میں کئی چیزیں ایک ساتھ گڈمڈ ہو رہی تھیں۔

"وہ..... وہ اگر کام پر نہیں گیا تو کہاں چلا گیا..... ہائے میرے مولا....."

"اب میں کیا جانوں کہ وہ کہاں چلا گیا۔" منشی امیر علی نے کڑوی کڑوی نظروں سے اس کو دیکھتے ہوئے غیر ہمدردانہ انداز میں کہا۔ "کیا معلوم کہاں آوارہ گردی کرنے نکل گیا اس کو تلاش کرو اور کل کام پر بھیجو۔ بلکہ خود اس کو لے کر آؤ حاجی صاحب بہت ناراض

ہیں۔ وہ تم سے اس معاملے میں بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"میں..... میں دیکھتی ہوں....." زیبن نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ "مگر اس نے اس سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ اس سے پہلے تو اس نے کبھی ناغہ نہیں کیا تھا؟ وہ برابر کام پر آتا رہا ہے۔"

"ہاں ہاں' اس سے پہلے تو وہ برابر کام پر آتا رہا ہے۔" منشی امیر علی نے کہا۔ "لیکن آج نہیں آیا اور تم کہہ رہی ہو کہ وہ صبح کو گھر سے یہی کہہ کر نکلا تھا کہ وہ کام پر جا رہا ہے۔"

"ہاں بھائی منشی امیر علی!" زیبن نے جلدی سے کہا۔ "میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں وہ میرے سامنے ہی گھر سے نکل گیا تھا میں تو اس کے جانے کے ذرا دیر بعد نکلی ہوں روز کی طرح کھانا بھی اس کے ساتھ تھا۔"

"پھر..... پھر اپنے عزیزوں رشتے داروں وغیرہ میں اس کو تلاش کرو۔" منشی امیر علی کے لہجے میں ذرا نرمی اور ہمدردی کی جھلک پیدا ہوئی۔ "شاید وہاں کسی کو اس کے بارے میں کچھ معلوم ہو۔"

"میں معلوم تو کروں گی منشی جی۔" زیبن نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "لیکن ہم لوگوں کے کون سے ایسے عزیز رشتے دار بیٹھے ہوئے ہیں جن کے گھروں کے ہم چکر لگایا کریں؟ یہاں کسی کے پاس وقت کہاں ہے کہیں آنے جانے کا ہیں؟ خدا جانے میرا بچہ کہاں چلا گیا۔ یا میرے مولا..... اس کی حفاظت کرنا"..... اور وہ اپنے آنسوؤں پر قابو نہ پا سکی۔

بات تھی بھی بے حد تشویشناک۔ کوئی ایک دو گھنٹے کا معاملہ نہیں تھا۔ ناصر تو صبح کو معمول کے مطابق کھانے کی پوٹلی ہاتھ میں لے کر بھٹے پر جانے کے لئے گھر سے نکلا تھا اور اب چراغ جل چکے تھے۔ ناصر نہ تو بھٹے پر پہنچا تھا اور نہ ہی گھر واپس آیا تھا۔ صبح سے لے کر رات تک اتنا وقت گزر چکا تھا اور ناصر کا کچھ پتا نہیں تھا۔

"میں چلتا ہوں....." منشی امیر علی نے خشک انداز میں کہا۔ "صبح کو بھٹے پر آ کر حاجی صاحب سے ضرور مل لینا۔ خواہ ناصر کا کچھ پتہ چلے یا نہ چلے۔"

"میں آؤں گی۔" زیبن نے روتے ہوئے کہا۔ "ضرور آؤں گی یا اللہ..... میرا بچہ....."

منشی چلا گیا اور زیبن جب پلٹی تو اس نے اپنے پیچھے جنت کو کھڑے ہوئے پایا۔ جنت



کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا اس نے منشی اور اپنی ماں کے درمیان ہونے والی گفتگو پوری سن لی تھی۔

"اماں..... اماں....." جنت کی آواز میں وحشت گھلی ہوئی تھی۔ "ناصر کہاں چلا گیا؟ کہاں گیا؟"

"ارے جلدی سے جا کر ماسی خیراں کو بلا کر لاؤ۔" زیبن نے کانپتی ہوئی آواز میں جنت سے کہا اور جنت تیر کی طرح گھر سے نکل کر بھاگی اس کے دل و دماغ میں ایک ساتھ بہت سارے طوفان گرج رہے تھے۔

ماسی خیراں گھر پر ہی موجود تھی' وہ جنت کی بات سنتے ہی فوراً بھاگی ہوئی زیبن کے پاس آ گئی۔ زیبن اپنے گھر کے دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔

"ماسی!" ماسی خیراں کو دیکھتے ہی زیبن نے روتے ہوئے کہا۔ "ماسی..... میرا بچہ..... نہ جانے وہ کہاں چلا گیا ہے....." اور اس کے ساتھ ہی وہ ماسی خیراں کے کندھے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"صبر سے کام لو زیبن۔" ماسی خیراں نے اس کو تسلی دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اتنا زیادہ پریشان مت ہو' وہ انشاء اللہ مل جائے گا۔ اس کا پتہ چل جائے گا۔"

زیبن کے گھر میں کوئی مرد تھا ہی نہیں۔ کون ناصر کی تلاش میں نکلتا؟ جسے ناصر کو ڈھونڈنے کے لئے گھر سے نکلنا چاہئے تھا' وہ تو خود ہی لاپتہ ہو گیا تھا اور سب کو چھوڑ چھاڑ کر کسی نامعلوم دنیا کا حصہ بن گیا تھا۔ خود اس کا کوئی پتہ نہیں تھا تو وہ اپنے اچانک غائب ہو جانے والے بیٹے کو کیا تلاش کرتا؟ زیبن کو اپنی بے بسی کا اس سے زیادہ شدید احساس شاید اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

ماسی خیراں نے محلے کے کئی نوجوانوں کو بلایا' اور انہیں ناصر کی گمشدگی کے بارے میں بتایا۔ یہ غریب لوگوں کی وہ بستی تھی جہاں کسی ایک کے دکھ کو سب لوگ اپنا دکھ سمجھ کر رضاکارانہ طور پر اس کی مدد کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں' جہاں لوگ ایک دوسرے کے گھریلو اور ذاتی معاملات میں کچھ اتنے زیادہ دخیل رہتے ہیں جتنے کہ خود اپنے معاملات میں' اور ایک دوسرے کے بارے میں مکمل معلومات و اطلاعات حاصل کرنا اپنا سماجی فریضہ سمجھتے ہیں۔

ناصر کی گمشدگی کے بارے میں سنتے ہی کئی نوجوان فوراً اس کی تلاش میں جانے پر آمادہ ہو گئے۔ انہوں نے زیبن سے اس کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کیں اور

پھر وہاں سے چل پڑے۔ زمین خود بھی' جنت کو ساتھ لے کر اور باقی بچوں کو ماسی خیراں کے حوالے کر کے گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔

وہ گھر سے نکل تو آئی' لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں جائے' جو کچھ دور پرے کے عزیز رشتے دار تھے ان سے ناصر کو کوئی دلچسپی نہیں تھی' اور وہ اکیلا کبھی بھی ان کے ہاں نہیں جاتا تھا اور خود زمین کا یہ عالم تھا کہ اس کو تو مرنے کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی وہ بھلا دور دراز کے عزیز رشتے داروں میں کہاں بھٹکتی پھرتی!

لیکن اب کہیں نہ کہیں تو جانا ہی تھا۔ ناصر کو کہیں نہ کہیں تو تلاش کرنا ہی تھا! اس نے اپنے محلے سے ہی اس کام کا آغاز کیا' اور کئی ایسے گھروں کے دروازے کھٹکھٹائے جن میں ناصر کی عمر کے اس کے ساتھ کھیلنے کودنے والے لڑکے رہتے تھے' لیکن ان گھروں میں کسی سے بھی ناصر کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ کچھ اور لوگ ناصر کی تلاش میں شامل ہو گئے اور اس کو ڈھونڈنے کے لئے اِدھر اُدھر نکل گئے۔

دونوں ماں بیٹیاں حیران و پریشان' حواس باختہ' افتاں و خیزاں اس گلی میں سے گزر رہی تھیں جس میں محمد یونس سبزی فروش کا مکان واقع تھا کہ اچانک سامنے سے مراد آتا ہوا نظر آیا۔

اگر جنت اکیلی ہوتی تو مراد کے لئے یہ بہت مسرت آگیں اور نشاط انگیز لمحات ہوتے وہ گلی میں دو چار لمحے کے لئے رک کر جنت سے بات کر لیتا' اور اچانک مل جانے والی اس خوشی کے خزانے کو سمیٹ کر احتیاط کے ساتھ اپنے دل کے اندر چھپا لیتا لیکن جنت کے ساتھ تو اس کی ماں بھی تھی' اور اس کا مطلب تھا کہ مراد کو قطعی طور پر محتاط اور اجنبی رویہ اختیار کرنا چاہئے' اسے ان لوگوں کے پاس سے کترا کر بیگانوں اور ناآشناؤں کی طرح نکل جانا چاہئے۔

مراد ایک طرف کو ہو گیا' تاہم اس کے قدموں کی تیزی میں کمی آ گئی۔ یہ لمحے بھی کچھ کم غنیمت تو نہیں تھے جب جنت اس کے سامنے قریب موجود تھی اور وہ اس کے وجود کی خوشبو کو اپنے اردگرد پھیلتا ہوا محسوس کر سکتا تھا۔ ان لمحوں کو بھی طول دینے کی' انہیں زیادہ سے زیادہ دراز کرنے کی ضرورت تھی۔ مراد ہلکے قدموں کے ساتھ' ایک طرف کو ہٹ کر چلتے ہوئے دزدیدہ نظروں سے جنت کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کے چہرے پر لہو کی اس حدت آمیز سرخی کو تلاش کر رہا تھا جو مراد کو دیکھنے سے اس کے چہرے پر دہک اٹھتی' لیکن جنت کے چہرے پر اس وقت ایسی کوئی سرخی نہیں دہکی۔ اس کے



چہرے سے تو جیسے ویرانیاں برس رہی تھیں اور اس کی آنکھیں نم اور میلی میلی سی لگ رہی تھیں۔

اور پھر ایک عجیب بات ہوئی جس کی مراد کو توقع نہیں تھی۔ زمین نے اس کی جانب رخ کر کے اس کو روک لیا' اور اس سے مخاطب ہو کر بولی۔ "اے بیٹا مراد..... تم نے آج ناصر کو تو کہیں نہیں دیکھا؟"

انہی لمحوں کے دوران' جبکہ زمین اس سے ہم کلام تھی' مراد نے دیکھ لیا کہ دونوں ماں بیٹیوں کے چہرے دھواں دھواں ہو رہے تھے۔ زمین کے چہرے پر مراد کو دیکھ کر کسی قسم کے غصے یا کرختگی کا کوئی تاثر پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس کی بجائے وہاں بے بسی اور بے چارگی کی گرد ملی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ مراد کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔

"ناصر کو؟" اس نے زمین کے مٹی جیسے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "نہیں تو چاچی..... مگر کیا ہوا؟ کیا ناصر کام سے لوٹ کر ابھی تک گھر واپس نہیں آیا؟"

"وہ تو آج کام پر پہنچا ہی نہیں بیٹا۔" زمین نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "حاجی مدد علی قریشی کا منشی آیا تھا وہ کہہ رہا تھا کہ وہ آج کام پر ہی نہیں پہنچا' حالانکہ گھر سے تو وہ روز کی طرح کام پر ہی روانہ ہوا تھا۔"

"اچھا؟" مراد نے تشویش اور تعجب کے ساتھ کہا۔ "تو پھر..... پھر وہ کہاں جا سکتا ہے؟ میں اس کو ڈھونڈتا ہوں چاچی..... تم..... تم..... پریشان مت ہو۔ میں اسے تلاش کروں گا میں ابھی سیدھا بھٹے پر جاتا ہوں' پھر کچھ دوسرے لڑکوں کے گھر جاؤں گا جو بھٹے میں اس کے ساتھ کام کرتے ہیں' میں اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلوم کر کے آؤں گا۔ ہو سکتا ہے وہ کسی وجہ سے کہیں رک گیا ہو۔ کہیں کسی کھیل تماشے میں پھنس گیا ہو....."

"نہیں بیٹا..... بھلا صبح سے رات ہونے کو آئی۔ اب تک کیا کھیل تماشے میں ہی پھنسا ہوا ہو گا؟" زمین نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔ "خدا میرے بچے کی حفاظت کرے۔ نہ جانے اس کے ساتھ کیا ہو گیا ہے۔"

مراد نے ایک نظر جنت کے چہرے کی طرف دیکھا اور اس وقت جنت نے بھی اپنی لمبی لمبی سیاہ گھنی پلکیں پوری کی پوری اٹھا کر اس کی طرف دیکھا دونوں کی نظریں آپس میں ملیں اور مراد کو جنت کی آنکھوں میں گہرے دکھ کے سائے لہراتے ہوئے نظر آئے اس کا دل ہل گیا جنت کتنی دکھی تھی..... وہ جنت کو خوش کرنے کے لئے سب کچھ کر سکتا

تھا۔

"اچھا چاچی تم اور جنت گھر جاؤ۔" اس نے جنت کو مخاطب کرنے سے گریز کرتے ہوئے کہا۔ "تم لوگ کہاں ماری ماری پھرو گی میں سب سے پہلے تو بھٹے پر جاتا ہوں۔"

"اگر وہ بھٹے پر موجود ہوتا تو منشی امیر علی ہمارے گھر اس کی تلاش میں کیوں آتا؟" جنت نے مراد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اس کی آواز بھرائی ہوئی لگ رہی تھی۔ "وہ بھٹے میں تو نہیں ہے وہ وہاں گیا ہی نہیں ہے۔"

"میں..... اور دوسرے لڑکوں کے گھر جاؤں گا۔" مراد نے جلدی سے کہا وہ اس غیر متوقع صورت حال سے خود بھی پریشان ہو گیا تھا اور فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس کو کیا کرنا چاہئے۔ "کہیں نہ کہیں سے اس کے بارے میں معلوم کروں گا۔"

"خدا تمہیں جیتا رکھے بیٹا۔" زمین نے پہلی بار مراد کو دعا دیتے ہوئے غمناک لہجے میں کہا۔ "تم اس کو تلاش کرنے میں ہماری مدد کرو۔ ہم لوگ تو اسے محلے میں تلاش کر رہے ہیں۔"

"میں جاتا ہوں۔" مراد نے جلدی سے کہا۔ "کچھ دیر کے بعد واپس آ کر تم کو بتاؤں گا۔" اور اس کے ساتھ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہاں سے چلا گیا اس نے ان دونوں میں سے کسی کے بولنے کا انتظار نہیں کیا۔

زمین اور جنت اس کے جانے کے بعد محلے کے کئی مزید گھروں کے دروازوں پر دستک دیتی پھریں، لیکن کسی بھی جگہ سے ان کو ناصر کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہو سکا پھر انہوں نے دور دراز کے عزیزوں رشتہ داروں کے گھروں کا رخ کیا اور توقع کے عین مطابق، وہاں بھی ناصر کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہو سکا، البتہ ایک بات ضرور ہوئی اور وہ یہ کہ ناصر کی گمشدگی کی خبر تیزی سے ایک گھر سے دوسرے گھر تک پھیلتی چلی گئی۔

بہت رات گئے دونوں تھکی ماندی، ملول و ناکام، گھر واپس آئیں۔ اس وقت ان کے گھر میں ماسی خیراں کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔ ماسی خیراں نے بچیوں کو کھانا وغیرہ کھلا کر انہیں سلا دیا تھا۔

"کچھ پتہ چلا؟" ماسی خیراں نے ان دونوں کے اترے ہوئے اداس چہروں کی طرف دیکھ کر ایک ایسا سوال کیا جس کا جواب اسے ان کے چہروں پر ہی تحریر نظر آ رہا تھا۔

جواب میں زمین نے آہستہ سے نفی میں گردن ہلا دی۔

"میں نے زبیر اور مجید کے ساتھ مل کر اس کو بہت سی جگہوں پر تلاش کر لیا چاچی"



رحمت نامی لڑکے نے کہا، جو پڑوس میں رہنے والے نائی کا بیٹا تھا۔ "ہم لوگ بڑے اسپتال بھی گئے تھے..... خدانخواستہ کوئی حادثہ وغیرہ نہ ہو گیا ہو، لیکن وہاں بھی اس کا کوئی پتہ نہیں چلا....."

جنت کی نگاہیں گھر میں موجود لوگوں کے درمیان ایک خاص شخص کو تلاش کر رہی تھیں، لیکن وہ خاص شخص وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ ماسی خیراں سے پوچھنا چاہتی تھی کہ آیا مراد ابھی آیا تھا کہ نہیں لیکن اپنی ماں کے خوف سے وہ خاموش رہی گو کہ اس وقت وہ مراد کا انتظار صرف اس لئے کر رہی تھی کہ شاید مراد، ناصر کے بارے میں کچھ معلوم کرنے میں کامیاب ہو سکا ہو۔

زمین نے تو شاید اس بات کو محسوس بھی نہیں کیا کہ مراد ابھی تک واپس نہیں آیا ہے۔ وہ ان لوگوں سے باتیں کرنے میں مصروف ہو گئی جو گھر میں موجود تھے اور اپنی بھاگ دوڑ کے بارے میں اس کو بتا رہے تھے۔

"صبح جب وہ کام پر جانے کے لئے گھر سے نکلا تھا تو اس کی طبیعت تو بالکل ٹھیک تھی نا چاچی؟ ایک نوجوان نے زمین سے سوال کیا۔ "کچھ بیمار تو نہیں تھا؟"

"ارے نہیں بیٹا!" زمین نے رندھے ہوئے گلے کے ساتھ جواب دیا۔ "وہ تو بالکل اچھا بھلا گھر سے نکلا تھا..... اگر اسے کوئی تکلیف ہوتی تو وہ ضرور مجھ کو یا جنت کو بتاتا۔ لیکن اس نے تو ایسی کوئی بات نہیں کہی۔"

"آج کل آس پاس کے علاقے میں بچوں کو اغوا کرنے کی وارداتیں بھی بہت ہو رہی ہیں۔" پڑوس کی ایک عورت، زمین کی طرف محتاط انداز میں دیکھ کر کہنے لگی۔ "پرسوں میری دیورانی گاؤں رسول پور سے آئی ہے وہ بتا رہی تھی کہ پچھلے ایک ماہ کے اندر اندر اس کے گاؤں اور آس پاس کے گاؤں سے تین بچے غائب ہو گئے۔ تینوں لڑکے تھے، اور ان میں سے کسی کی بھی عمر بارہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ گاؤں کے لوگ ان کو تلاش کر رہے ہیں، لیکن ان کا کوئی پتہ نہیں چل سکا ہے۔"

زمین کا دل دہل گیا..... یا اللہ..... رحم.....

"تو پولیس میں رپورٹ تو لکھوائی ہو گی؟" ماسی خیراں نے اس سے پوچھا۔

"ہاں ہاں ماسی کیوں نہیں۔" اس عورت نے فوراً جواب دیا۔ "مگر پولیس والے کیا کرتے ہیں ماسی؟ پولیس والے تو خود ڈاکوؤں سے، خرکاروں سے، بردہ فروشوں سے ملے ہوئے ہوتے ہیں وہ تو ان سے پیسے کھاتے ہیں وہ بھلا ان کے خلاف کیا کارروائی کریں

گے۔"

زمین کا رواں رواں ایک ان جانے خوف سے کانپ رہا تھا۔ اسے کچھ پچھلی باتیں بھی یاد آ رہی تھیں جن کا اس نے ابھی تک کسی سے ذکر نہیں کیا تھا کیونکہ اس نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ نہ جانے کیا ہو رہا تھا کیا ہو گیا تھا۔ یا کیا ہونے والا تھا..... وہ سخت عذاب کا شکار تھی۔

"پھر بھی زمین!" ماسی خیراں نے اسے مشورہ دیا۔ "تم صبح کو تھانے میں رپورٹ درج کرا دینا۔ ویسے تو خدا کرے وہ رات میں کسی وقت خود ہی گھر آ جائے' یا اس کا کوئی پتہ چل جائے۔ ورنہ تم صبح کو تھانے میں رپورٹ ضرور لکھوا دینا۔"

"ہاں چاچی!" رحمت خود اس کی تائید کرتے ہوئے بولا۔ "میں چلا چلوں گا تمہارے ساتھ تھانے' وہاں ایک سپاہی ابا کا جاننے والا ہے اس نے پچھلے سال ہم سے دو لحاف بھروائے تھے۔"

پھر وہ لوگ آہستہ آہستہ رخصت ہو گئے۔ جنت کی نگاہیں بار بار کھلے ہوئے دروازے کی طرف اٹھتی تھیں اسے مراد کا شدت سے انتظار تھا لیکن مراد تو ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ معلوم نہیں وہ کہاں چلا گیا تھا۔

سب لوگ چلے گئے تھے اور صرف ماسی خیراں رہ گئی تھی چھوٹی بچیاں سو رہی تھیں اور گھر میں یکایک گہرا سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ لوگوں کے چلے جانے سے خاموشی یکبارگی گہری ہو گئی تھی۔ سارا گھر ایک اجنبی نامانوس آسیبی فضا میں لپٹا ہوا لگ رہا تھا۔ پُرہول' پُراسرار سناٹا اپنے اندر نہ جانے کیا کچھ چھپائے ہوئے دلوں کو ڈرا رہا تھا۔

"اب تم لوگ بھی لیٹ جاؤ۔" ماسی خیراں نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ "اتنی زیادہ رات ہو چکی ہے اب تو کہیں باہر جا کر اس کو ڈھونڈ بھی نہیں سکتے۔ خدا نے چاہا تو پھر صبح کو چل کر دیکھیں گے تم جب بھٹے جانے لگو تو مجھ کو بھی اپنے ساتھ لے لینا۔"

"اچھا ماسی۔" زمین نے ایک ٹھنڈی اور گہری سانس بھرتے ہوئے اور فضا میں کھلے ہوئے درد کو اپنی سانس کے ساتھ نگلتے ہوئے کہا۔ "تم جا کر سو جاؤ۔ کب تک ہم لوگوں کے ساتھ پریشان ہوتی رہیں گی؟ ہمارے تو مقدر میں ہی دھکے کھانا لکھا ہے۔ سو ہم کھاتے رہیں گے۔ جتنے بھی دھکے ہمارے مقدر میں ہیں وہ تو ہم کو ملیں گے ہی۔ چاہے ہم کچھ بھی کر لیں۔"

"صبر سے کام لو زمین۔" ماسی خیراں نے اس کو تسلی دینے کی کوشش کرتے ہوئے



کہا۔ "خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اللہ پر بھروسہ رکھو اور اب آرام کرو۔"

ماسی خیراں جانے لگی اور زمین کے ساتھ ساتھ دروازے تک آئی۔ زمین کے ساتھ جنت بھی تھی۔ جنت کے دل میں یہ خواہش دھیمی دھیمی آنچ بن کر سلگ رہی تھی کہ ماسی خیراں ابھی نہ جائے وہ ابھی کچھ دیر اور رکے' شاید..... شاید..... اس دوران مراد واپس آ جائے..... اور تو کسی کو اب آنا نہیں تھا بس ایک مراد کے آنے کی آس باقی تھی۔ معلوم نہیں وہ کہاں رہ گیا تھا۔ اس نے کہا تو تھا کہ وہ آئے گا..... مگر اب تک تو نہیں آیا تھا.....

☆==========☆==========☆

ماسی خیراں چلی گئی اور زمین نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ بہت رات ہو چکی تھی۔

زمین کی زبان پر ایک بار بھی مراد کا نام نہیں آیا تھا ایسا لگتا تھا جیسے وہ مراد کے ساتھ ہونے والی ملاقات کو بالکل ہی بھول گئی ہو جبکہ جنت شدید اضطراب اور تشویش کے عالم میں اس کے بارے میں سوچ رہی تھی اور اس کا انتظار کر رہی تھی لیکن وہ نہیں آیا تھا..... "شاید اب وہ نہیں آئے گا۔" جنت نے مایوسی کے ساتھ سوچا۔ "اتنی زیادہ رات ہو گئی ہے شاید اس نے سوچا ہو کہ اب وہ کل صبح کو ہی آئے گا۔

اسی وقت کلثوم سوتے سے اٹھ گئی اور اس نے رونا شروع کر دیا۔ زمین اس کو چپ کرانے کے لئے اس کے پاس چلی گئی اور جنت کی نگاہیں ایک بار پھر دروازے پر جم گئیں جس کی اب اندر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ بے حس چوبی دروازہ جس کی لکڑی کئی جگہ سے گل گئی تھی' بڑی لاتعلقی اور بے نیازی کے ساتھ اپنی جگہ پر خاموش کھڑا ہوا تھا۔ اسے نہ تو کسی کا انتظار تھا نہ کسی کے آنے کی خوشی نہ کسی کے نہ آنے کا ملال..... خاموش' بے حس' مردہ دروازہ! جنت کی نگاہیں اس کے جگہ جگہ سے ادھڑے ہوئے ٹوٹے پھوٹے جسم کا بار بار جائزہ لے رہی تھیں۔

پھر اچانک اس بے حس' مردہ دروازے میں حرکت اور زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی کسی نے دروازے پر دستک دی تھی سویا ہوا خاموش دروازہ ایک دم بیدار ہو گیا تھا اور اس کے وجود میں لہریں اٹھنے لگی تھیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ لہریں جنت کے وجود میں بھی اٹھ رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے دروازے کے وجود میں اٹھنے والی لہریں خود بخود جنت کے وجود میں منتقل ہوتی جا رہی ہیں' ڈھلتی جا رہی ہیں۔

جنت نے جلدی سے آگے قدم بڑھایا' لیکن زمین نے اس کو روک دیا۔ "ٹھہرو..... میں دیکھتی ہوں۔" اس نے کہا۔ "اتنی رات گئے کون آیا ہے۔"

جنت کو یقین تھا کہ اتنی رات گئے آنے والا مراد کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ مراد تو کہہ کر گیا تھا کہ وہ آئے گا اسے ضرور آنا چاہئے تھا۔

زمین نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو اس کو وہاں مراد کھڑا ہوا نظر آیا۔ جنت اپنی ماں کے ساتھ ہی اس سے تقریباً ایک قدم پیچھے کھڑی ہوئی تھی اس نے بھی مراد کو دیکھ لیا تھا' اور اس کے دل میں یکبارگی اعتماد کی روشنی پھیل گئی تھی۔

"مراد؟" زمین نے کہا۔ "آؤ بیٹا' آ جاؤ..... کچھ پتہ چلا؟"

مراد اندر آ گیا اور اس نے آہستہ سے نفی میں گردن ہلا دی۔ "تم لوگوں کو کوئی بات معلوم ہوئی کہیں سے؟" اس نے زمین کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں" زمین نے جواب دیا۔ "نہیں کہیں سے کچھ معلوم نہیں ہوا....."

"میں سب سے پہلے تو بھٹے گیا تھا۔" مراد نے کہا۔ "وہاں سے تو مجھے صرف یہی معلوم ہو سکا کہ وہ آج کام پر نہیں پہنچا اور یہ بات تو مجھے پہلے سے معلوم تھی۔ ان لوگوں نے یہ بھی بتایا کہ اس سے پہلے کبھی آج تک ایسا نہیں ہوا کہ وہ کام سے غیر حاضر رہا ہو۔ اس کے بعد میں بھٹے پر کام کرنے والے کئی دوسرے لڑکوں کے گھر گیا....." اچانک مراد بولتے بولتے رک گیا اور غور سے زمین کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ "چاچی....." اس نے رک رک کر کہا۔ "تم نے..... گھر کی چیزوں وغیرہ کا تو جائزہ نہیں لیا ہو گا ابھی؟"

"کیا مطلب؟" زمین ایک دم چونک پڑی اور جنت بھی گھبرا کر مراد کی شکل دیکھنے لگی۔

"مطلب یہ ہے چاچی کہ گھر میں سے کوئی قیمتی چیز' کوئی رقم وغیرہ غائب یا کم تو نہیں ہے؟" مراد نے سنبھل کر محتاط انداز میں کہا وہ دھیمے لہجے میں اور رک رک کر بول رہا تھا۔

زمین نے مشتبہ نظروں سے مراد کی طرف دیکھا وہ اس کا مطلب اچھی طرح سمجھ گئی تھی' لیکن اس کو مراد کی یہ بات بالکل بھی اچھی نہیں لگی تھی۔ مراد اس کے بیٹے پر کوئی بیہودہ قسم کا الزام لگا رہا تھا اس کے دل میں مراد کے لئے چھپی ہوئی نفرت یکبارگی عود کر آئی۔ یہ کمینہ سبزی فروش کا بیٹا..... یہ الٹی سیدھی باتیں کر کے اس کو اور زیادہ



پریشان کرنا چاہتا تھا تاہم اس نے کوشش کر کے اپنے دل میں ابھرنے والی غصے اور نفرت کی لہر کو دبا لیا اور ٹیڑھی نظروں سے مراد کو دیکھتے ہوئے ترش لہجے میں بولی۔ "تم یہ بات کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"بات یہ ہے چاچی کہ صرف ناصر ہی نہیں غائب ہے بلکہ بھٹے پر کام کرنے والا ایک اور لڑکا بھی غائب ہے۔" مراد نے آہستہ سے کہا۔ "اس لڑکے کا نام مسعود ہے' اور وہ اپنے گھر سے کچھ نقد رقم بھی ساتھ لے گیا ہے....."

"ہائے میں مر گئی۔" زمین بدحواس ہو کر چلائی اور سیدھی اٹھ کر کمرے کی طرف بھاگی۔

ہر ماہ کی بچت کی جو بھی تھوڑی بہت رقم ہوتی تھی' اس کا زیادہ تر حصہ تو زمین ماسی خیراں کے پاس جمع کرا دیتی تھی' جو اس رقم کا پائی پائی کا حساب رکھتی تھی اور زمین کو تازہ ترین "بیلنس" سے واقف رکھتی تھی۔ تاہم گھر کے اخراجات کے لئے بھی کچھ نہ کچھ رقم تو گھر میں رکھی ہی ہوتی تھی اور یہ رقم زمین اپنے کمرے کی اسی الماری میں رکھتی تھی جس میں سے اس کا شوہر تقریباً سال بھر پہلے پانچ ہزار روپے کی بھاری رقم لے کر بھاگ گیا تھا اور آج تک نہیں پلٹا تھا کسی کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔

الماری میں رکھی ہوئی اس رقم کے بارے میں جنت کو بھی معلوم رہتا تھا' اور ناصر کو بھی اور ان دونوں میں سے کسی نے بھی ماں کی اجازت کے بغیر' اس رقم کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ زمین خود ہی ناصر کو جیب خرچ کے لئے کچھ تھوڑے بہت پیسے دے دیتی تھی جو ناصر کی برائے نام ضروریات کے لئے کافی ہو جاتے تھے۔ ناصر نے ازخود یہاں سے کبھی کوئی رقم نہیں نکالی تھی۔

زمین سراسیمگی کے عالم میں کمرے کی طرف بھاگی اور گھبراہٹ میں جنت بھی اس کے پیچھے پیچھے بھاگ پڑی دونوں ماں بیٹیاں ایک دوسری کے آگے پیچھے' کمرے میں داخل ہوئیں اور زمین نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے الماری کے پٹ کھول کر اس طرف ہاتھ مارا جہاں ایک کپڑے میں لپٹے ہوئے پیسے رکھے تھے۔ اس نے جلدی سے کپڑے کو کھولا۔

پہلی ہی نظر میں' گنے بغیر ہی زمین کو اس بات کا اندازہ ہو گیا رقم کم ہے.....

دو مہینے کی بچت کے پیسے اس نے ابھی تک ماسی خیراں کے پاس جمع نہیں کرائے تھے۔ کئی بار اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ وہ بچت کے پیسے ماسی خیراں کے پاس رکھوا دے' لیکن پھر کسی نہ کسی کام میں پھنس کر وہ اس بات کو بھول جاتی تھی' اور وہ پیسے اس

کے پاس ہی رکھے رہے' وہ الماری میں جوں کے توں رکھے ہوئے تھے اور انہیں کسی نے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ زیبن کو اس بات کا پورا اطمینان تھا کہ ان کو کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا۔

لیکن اس وقت اس کا یہ اطمینان دم توڑ رہا تھا وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی کہ رقم کم ہے اس کی مضطرب اور مرتعش انگلیوں نے جلدی جلدی نوٹ گننے شروع کر دیئے..... اچھی خاصی رقم کم تھی..... لیکن سب کی سب غائب نہیں تھی۔

دونوں ماں بیٹیوں نے ایک دوسرے کی طرف تھکی ہوئی' ترسی ہوئی' سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ دونوں ہی کی آنکھوں میں ایک سوال تھا اور وہ ایک دوسرے کے چہرے پر اس کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن وہاں کچھ نہیں تھا۔

"وہ لے گیا۔" زیبن نے بھرائی ہوائی آواز میں اپنی بیٹی سے کہا۔ "وہ آدھے سے زیادہ پیسے لے گیا....."

زیبن کی نگاہوں کے سامنے آج سے ایک سال سے کچھ زیادہ عرصے پہلے کا وہ منظر گھوم رہا تھا جب وہ اس طرح الماری کھولے کھڑی تھی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس خالی جگہ کو دیکھ رہی تھی جہاں کپڑے میں لپٹی ہوئی رقم رکھی ہوئی تھی۔ وہ باپ کا کارنامہ تھا' اور یہ بیٹے کا.....

لیکن زیبن ناانصافی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ ان دونوں واقعات کے مابین موجود فرق کو اس عالم میں بھی نظرانداز نہیں کر رہی تھی جبکہ حیرت' غم اور غصے کے مارے اس کے حواس مضمحل ہوئے جا رہے تھے۔ گاموجو رقم لے کر بھاگا تھا۔ اس پر اس کا کوئی حق نہیں تھا۔ وہ اس کی کمائی ہوئی رقم نہیں تھی اس نے تو چوری کی تھی اور وہ ساری کی ساری رقم لے کر نشے میں اڑانے کے لئے بھاگ گیا تھا۔ وہ نشہ باز' بے حس' بے غیرت اور چور تھا جبکہ ناصر جو کچھ لے کر گیا تھا' اس میں اس کی اپنی کمائی بھی شامل تھی اور پھر ..... وہ چاہتا تو ساری رقم لے جا سکتا تھا لیکن اس نے ساری رقم نہیں لی تھی۔

آن کی آن میں یادوں کے کتنے ہی کارواں سنسناتے ہوئے گزر گاہ خیال سے گزرتے چلے گئے..... وہ رقم کو گننے کے بعد بچے کھچے نوٹوں کو ہاتھ میں لئے کھڑی تھی۔ اس کے دل میں ابھی کچھ دیر پہلے مراد کے خلاف اضافی نفرت اور غصے کا جو طوفان اٹھا تھا' وہ یکبارگی ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ وہ خود کو بالکل شکستہ و راندہ محسوس کرنے لگی تھی۔

"وہ ساری رقم نہیں لے گیا اماں!" جنت نے بہت آہستہ سے کہا وہ نہیں جانتی تھی کہ ماں اس کی اس بات سے اتفاق کرے گی یا پھر برافروختہ ہو کر اس کو گالیاں دے گی۔



"اس نے کچھ رقم چھوڑ بھی دی ہے۔"

زیبن نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس تازہ انکشاف کے بعد اس کے خیالات و خدشات کا رخ ایک دم بدل گیا تھا۔ اب تک تو یہ سوچ سوچ کر اس کی جان نکلی جا رہی تھی کہ کہیں ناصر کے ساتھ کوئی حادثہ نہ پیش آ گیا ہو۔ کہیں کوئی اسے زبردستی اٹھا کر نہ لے گیا ہو..... لیکن اب آنِ واحد میں ان سارے ابہام و خدشات نے دم توڑ دیا تھا۔ ناصر کو کسی نے اغوا نہیں کیا تھا۔

"آؤ....." زیبن نے بچی کھچی رقم واپس اس جگہ رکھ دی اور جنت کو ساتھ لئے ہوئے کمرے سے باہر صحن میں آ گئی' جہاں چارپائی پر بیٹھا ہوا مراد ان دونوں کی واپسی کا منتظر تھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے تھے مراد....." زیبن نے ایسی آواز میں کہا جیسے اپنے وجود کی نفی کر رہی ہو۔ "کچھ رقم غائب ہے۔"

"بس تو پھر اب بات صاف ہو جاتی ہے چاچی۔" مراد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "وہ یہاں سے کہیں چلا گیا ہے اور اکیلا نہیں گیا ہے اس کا دوست مسعود اس کے ساتھ ہو گا۔ یقیناً اس کے ہی ساتھ ہو گا دونوں ایک ساتھ ہی کہیں گئے ہوں گے۔"

"مسعود کے گھر والے کیا کہتے ہیں؟" جنت نے اس سارے عرصے کے دوران پہلی بار مراد سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ "کیا انہیں اس کے بارے میں کچھ علم ہے؟"

"نہیں۔" مراد نے جواب دیا۔ "انہیں اس بارے میں کچھ علم نہیں ہے کہ وہ کہاں چلا گیا ہے۔ وہ تو بس اتنا ہی جانتے ہیں کہ وہ گھر سے غائب ہے اور ساتھ ہی کچھ رقم بھی اپنے ساتھ لے گیا ہے اور وہ بھی بالکل اس انداز میں گیا ہے جس انداز میں ناصر گیا ہے۔ یعنی صبح گھر سے یہ کہہ کر روانہ ہوا کہ وہ کام پر جا رہا ہے لیکن وہ کام پر نہیں پہنچا۔ شام کو بھٹے سے ایک آدمی پوچھنے کے لئے آیا کہ وہ کام پر کیوں نہیں آیا اور تب گھر والوں کو اس بات کا علم ہوا کہ وہ تو آج کام پر ہی نہیں گیا اور پھر انہیں اس بات کا بھی علم ہو گیا کہ گھر میں سے کچھ رقم بھی غائب ہے۔ انہوں نے اس کی تلاش شروع کر دی بہت سی جگہوں پر اس کو ڈھونڈا لیکن اس کا کوئی پتہ نہیں چلا اس وقت تک ان کو یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کے علاوہ بھٹے کا کوئی اور لڑکا بھی اپنے گھر سے غائب ہے۔ ناصر کے بارے میں تو ان کو میری زبانی معلوم ہوا اب وہ سب لوگ بھی اتنے ہی زیادہ پریشان ہیں۔"

"ہائے میرے مولا۔" زیبن نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو پکڑتے ہوئے کہا۔

"خدا جانے وہ دونوں کہاں نکل گئے ہوں گے شہر میں تو نہیں ہوں گے اب تک شہر سے باہر جا چکے ہوں گے۔ صبح کے نکلے ہوئے ہیں اب تک تو نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ چکے ہوں گے۔ یا میرے مولا..... اب وہ کیسے واپس آئیں گے؟ کون ان کو واپس لائے گا؟ میرا ناصر..... وہ تو ابھی بہت چھوٹا ہے۔ نہ جانے کن لوگوں کے ہتھے چڑھ جائے۔"

اور وہ ایک دم سے سسک سسک کر رونے لگی اور اس گریہ وزاری کے وقت وہ اس بات کو بالکل بھول گئی تھی کہ وہ مراد کے سامنے رو رہی ہے جس کو وہ دل سے سخت ناپسند کرتی ہے اور جس کی اپنے گھر میں آمدورفت پر اس نے پابندی لگا رکھی تھی اس وقت وہ اتنے بڑے صدمے سے دوچار تھی جس نے دوسرے تمام جذبات و احساسات کو ایک ثانوی حیثیت دے دی تھی۔

"روؤ مت چاچی!" مراد نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "وہ یہاں کے حالات سے دل برداشتہ ہو کر بھاگا ہے' عین ممکن ہے کہ اس کو ان سے بھی زیادہ خراب حالات کا سامنا کرنا پڑے۔ اس صورت میں اس کا پورا امکان ہے کہ وہ خود ہی گھر واپس آ جائے۔ اور دوسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے چاچی کہ پولیس ان دونوں کو تلاش کر لے اور انہیں پکڑ کر واپس سیالکوٹ لے آئے۔"

"میں نے سنا ہے کہ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو بچوں کو پکڑ کر ان کے ہاتھ پیر توڑ کر انہیں اندھا لولا لنگڑا بنا کر ان سے بھیک منگواتے ہیں۔" جنت نے نہایت درجہ سہمی ہوئی' خوف و تشویش سے بھرپور آواز میں کہا' اور زبین نے اس کو بہت ہی کڑی اور ناگوار نظروں سے گھورا۔

"اری مت کر ایسی باتیں بدنصیب۔" زبین نے اس کی گردن کی پشت پر ہاتھ رکھ کر زور سے اسے دھکا دیتے ہوئے کہا۔ "کوئی خیر کا کلمہ زبان سے نکال۔ کیوں ایسی بری بری باتیں کہتی ہے۔"

"جنت غلط نہیں کہہ رہی ہے چاچی۔" مراد نے بڑے دھیمے انداز میں جنت کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔ "ایسا ہوتا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ ناصر ایسے لوگوں کے ہتھے نہیں چڑھے گا اور پھر مسعود بھی تو اس کے ساتھ ہے اس سے بڑا ہے۔"

"مسعود کی کیا عمر ہے؟" زبین نے جلدی سے پوچھا۔

"کوئی تیرہ سال کی ہے۔" مراد نے کہا۔

"اس کا مطلب ہوا کہ وہ ناصر سے کوئی چار سال بڑا ہے۔" زبین نے کہا۔ "میرا



ناصر تو اب نو سال کا ہے۔"

"وہ دونوں ساتھ ہی ہیں تو یہ اچھا ہے چاچی۔" مراد نے کہا۔ "الگ الگ ہوتے تو....."

"تم یہ بات یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ دونوں اب ساتھ ہی ہوں گے؟" جنت نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "یہ بات تو کسی کو بھی نہیں معلوم ہے۔"

"ہاں ظاہر ہے کہ انہیں ساتھ ساتھ جاتے ہوئے تو کسی نے بھی نہیں دیکھا ہے۔" مراد نے جنت کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ایک ساتھ ہی' ایک ہی پروگرام کے تحت گئے ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ان دونوں میں دوستی بھی بہت تھی۔ بھٹے میں وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے۔ کام بھی ایک دوسرے کے نزدیک رہ کر ہی کرتے تھے۔"

"ان باتوں سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ دونوں ایک ساتھ ہی گئے ہوں گے۔" زبین نے کہا۔ "اور جہاں کہیں بھی ہوں گے وہ اب ساتھ ہی ہوں گے۔"

"خدا ان کو عقل دے اور وہ گھر واپس آ جائیں۔" مراد نے کہا۔ "کچھ بھی ہو' آدمی کو اپنا گھر نہیں چھوڑنا چاہئے۔"

زبین نے مراد کی طرف غور سے دیکھا۔ مراد کی بات اس کے دل کو لگی تھی لیکن وہ اس کا اعتراف نہیں کرنا چاہتی تھی وہ مراد کو ناپسند جو کرتی تھی!

"میں اب چلتا ہوں چاچی۔" کچھ دیر کے بعد مراد نے کہا۔ "بہت دیر ہو گئی ہے' کل میں اس کے بارے میں اور زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ کوئی نئی بات معلوم ہو گئی تو ضرور تم کو بتاؤں گا اور چاچی' اگر کسی کام کی ضرورت ہو کہیں آنا جانا ہو' کوئی کام ہو تو مجھ کو بتانا۔"

زبین نے اس کی بات کے جواب میں صرف آہستہ سے گردن ہلا دی۔ وہ یہ جان رہی تھی کہ مراد اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان لوگوں کے قریب آنے کی کوشش کرے گا اور وہ ایسا نہیں چاہتی تھی' لیکن مجبوری تو یہ تھی کہ وہ اس موقع پر مراد کو دھتکار بھی نہیں سکتی تھی۔ اس نے خود ہی تو رو رو کر مراد کو اپنی مصیبت کا احوال سنایا تھا۔

"چاچی۔ تم لوگوں نے کھانا بھی کھایا یا نہیں؟" اچانک' چلتے چلتے' جیسے مراد کو خیال آ گیا۔

"بس اب تھوڑا بہت کھالیں گے۔" زمین نے گول مول سے انداز میں بات کرتے ہوئے کہا۔ "ماسی خیراں نے بچوں کو تو کھلایا تھا۔ خدا اس کا بھلا کرے۔ کتنا خیال کرتی ہے وہ بے چاری ہم لوگوں کا۔"

"تم لوگ بھی کچھ کھا لو چاچی۔" مراد نے نرم' التجا آمیز لہجے میں کہا اور جنت کی طرف دیکھا۔ "کھانا گرم کر دو جنت۔ خود بھی تھوڑا بہت کھالو اور چاچی کو بھی کھلا دو۔"

"اچھا۔" جنت نے آہستہ سے جواب دیا اور اس کے بعد مراد وہاں سے چلا آیا۔ گھر کے دروازے سے باہر نکلتے وقت اس نے ایک بھیگی بھیگی نظر جنت کے چہرے پر ڈالی اور باہر نکل گیا۔

زمین کچھ کھانے کے لئے تیار نہیں تھی اور خود جنت کا بھی کھانے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن پھر بھی جنت نے اپنی ماں کو تھوڑا بہت کھانے پر راضی کر لیا اور چولہا جلا کر کھانا گرم کرنے لگی۔ شاید وہ خود ایک لقمہ بھی نہ کھاتی اور نہ اپنی ماں سے کھانے کے لئے اصرار کرتی اگر مراد چلتے وقت اس سے یہ نہ کہہ دیتا کہ وہ خود بھی کچھ کھالے اور اپنی ماں کو بھی کچھ کھلا دے۔

زمین نے دو چار لقمے حلق سے نیچے اتارے' اور اوپر سے دو گلاس پانی پی کر مزدوروں کی طرح اپنے بستر پر گر گئی۔ گامو کے رقم لے کر بھاگنے کے بعد سے وہ دوسری بار ایک اور بہت بڑے صدمے سے دوچار ہوئی تھی اور یہ صدمہ تو ایسا تھا جو اس کے وجود کو کچلے ڈال رہا تھا' زخمی کئے دے رہا تھا۔ اس صدمے کے باعث تو اس کو اپنی آئندہ زندگی کی ساری راہیں مسدود ہوتی نظر آ رہی تھیں۔ جنت کی دبے پاؤں لیکن پوری قوت کے ساتھ ابھرتی ہوئی ہر ہر لمحے اپنے فروغ پذیر وجود کا احساس دلاتی ہوئی جوانی' اور جنت کے بعد نصرت' پھر صغرا' پھر کلثوم۔ ابھی چھوٹی تھیں تو کیا ہوا۔ دن تو ہوا کے جھونکوں کی طرح گزر جاتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے لڑکیوں کی جوانی والدین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اور ناصر کافرار۔ اب کون سہارا دے گا؟ وہ تو بڑھاپے کی لاٹھی تھا۔ آئندہ زندگی کی عمارت کا ایک بہت اہم ستون تھا۔ وہ غائب ہو گیا تھا۔ خدا جانے..... وہ اب واپس آئے گا بھی یا نہیں اور اگر آئے گا تو کس حال میں۔ زمین نے دوپٹے کے پلو میں اپنا پورا چہرہ چھپا لیا اور چپکے چپکے رونے لگی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ دوسری چارپائی پر لیٹی ہوئی جنت اس کے رونے کی آواز سن کر اور زیادہ دل گرفتہ اور افسردہ خاطر ہو۔ اس بے چاری نے آنکھ کھولنے کے بعد دنیا میں کون سے سکھ دیکھے تھے۔



زمین پچھلے دنوں کے اس واقعے کو یاد کرنے لگی جس کی اہمیت کا اس نے اس وقت تو کوئی احساس نہیں کیا تھا' اور اسے اس وقت اور بعد میں یکسر نظر انداز کر دیا تھا لیکن اب اس کو اس واقعے کی ایک ایک تفصیل یاد آ رہی تھی۔

یہ بات تو زمین کو شروع دن سے ہی معلوم تھی کہ ناصر نے بھٹے میں اپنے کام کو پسند نہیں کیا ہے اور وہ اس صورت حال سے ذرا بھی خوش نہیں ہے۔ تاہم اس چھوٹے سے بچے نے اپنی ماں سے کھل کر کوئی احتجاج نہیں کیا تھا۔ وہ مارے باندھے' روزانہ کام پر چلا جایا کرتا تھا۔ سارا دن بھٹے میں جانوروں کی طرح محنت مشقت کر کے جب وہ شام کو اپنے گھر واپس آتا تھا تو بہت تھکا ہوا ہوتا تھا' اور کھانا کھانے کے بعد جلد ہی سو جاتا تھا۔ زمین اس سے جب بھی اس کے دن بھر کے کام کے بارے میں پوچھتی تو ناصر کے جواب میں تلخی' ترشی' بیزاری' ناپسندیدگی اور ناخوشگواری کی جھلک موجود ہوتی۔ اس نے اپنے اس رویے کو اپنی ماں سے چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی' تاہم اس نے بھرپور طریقے سے' احتجاجی انداز میں' اس کا اظہار بھی نہیں کیا تھا۔

لیکن اس روز شام کو جب وہ گھر واپس آیا تو وہ بہت نڈھال اور افسردہ خاطر تھا اور ساتھ ہی سخت کبیدگی اور بیزاری کا شکار بھی۔

"اماں' میں وہاں کام نہیں کرنا چاہتا۔" اس نے آنے کے تھوڑی دیر بعد اپنی ماں سے کہا۔

"کیوں؟" زمین نے اپنے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے اس سے پوچھا۔ "کیوں کام نہیں کرو گے؟"

"وہ فخرو چاچا ہے نا' وہ بہت ہی خراب آدمی ہے۔" ناصر نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔ "وہ سب لڑکوں کو مارتا ہے' وہ مجھے بھی مارتا ہے اور گالیاں دیتا ہے۔ آج اس نے مجھ کو بہت مارا۔"

"وہ تم لوگوں کو کام سکھاتا ہے۔" زمین نے جواب میں کہا۔ "استاد ہے تمہارا' استاد کی مار کا برا نہیں ماننا چاہئے۔ استاد تو بچوں کو اس لئے مارتا ہے کہ ان کو تعلیم دے' ان کو ہنر سکھائے۔"

"وہ استاد نہیں ہے' وہ جلاد ہے۔" ناصر نے فوراً کہا اور زمین کو اس کی زبان سے یہ لفظ سن کر بڑا تعجب ہوا یہ لفظ اس نے کہاں سے سیکھا تھا؟ اور گفتگو کا یہ انداز اس نے کس سے سیکھا تھا؟ "وہ سکھاتا کم اور مارتا زیادہ ہے۔" ناصر نے اپنی بات جاری رکھتے

ہوئے کہا۔ ”وہ بڑا کمینہ آدمی ہے اماں۔ وہ لڑکوں کو بلا وجہ مارتا ہے خواہ قصور ہو یا نہ ہو بس مارنا شروع کر دیتا ہے جانوروں کی طرح‘ کتنا بھی کام کرو کتنا ہی کام کرو‘ پھر بھی مارتا ہے۔ میں وہاں کام نہیں کروں گا اماں۔“

”پاگل ہوا ہے؟“ زیبن نے جھنجھلا کر کہا۔ ”کام نہیں کرے گا تو کیا کرے گا؟ ارے‘ فخرو اگر مارتا ہے تو کام سکھانے کے لئے مارتا ہے۔ وہ تو تم لوگوں کا بھلا چاہتا ہے۔“

”میں اس کے ساتھ کام نہیں کروں گا اماں۔“ ناصر نے ضد کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ بہت برا آدمی ہے خدا کرے وہ مر جائے‘ خدا کرے وہ جلتی ہوئی بھٹی میں گر کر جل جائے۔“

”ارے کیوں بکواس کرتا ہے منحوس۔“ زیبن نے اس کی پیٹھ پر ایک زور کا دوہتڑ مارتے ہوئے کہا۔ ”کیوں بری بری باتیں زبان سے نکال رہا ہے۔“

”نہیں کروں گا میں اس کے ساتھ کام۔“ یک بیک ناصر جیسے بھڑک اٹھا۔ اس کا ننھا سا وجود ایک جلتا ہوا‘ دہکتا ہوا شعلہ بن گیا تھا۔ سر سے پاؤں تک جلنے لگا تھا۔ زیبن نے اس کا یہ رنگ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ اس کے بیٹے کا ایک بالکل نیا روپ تھا اور اسے بالکل پسند نہیں آیا تھا۔

”کام نہیں کرے گا تو کمائے گا کہاں سے؟“ اچانک زیبن کا پارہ چڑھ گیا۔ ”تیرے باپ نے خزانہ لا کر رکھ دیا ہے میرے پاس؟ پیسے پیڑ میں لگتے ہیں؟ اتنی بہت سی جانوں کا پیٹ کون بھرے گا؟ باپ تو تیرا نکما ناکارہ نکل گیا‘ ہڈحرام‘ حرام خور بدمعاش اور تو کہتا ہے کام نہیں کرے گا؟ کیسے نہیں کرے گا کام؟“

”میں بھٹے پر کام نہیں کروں گا اماں۔“ ناصر نے ضد کرتے ہوئے کہا۔ ”میں بھٹے پر کام نہیں کروں گا۔ مجھے وہاں بالکل اچھا نہیں لگتا ہے۔ میں نہیں جاؤں گا وہاں۔“

”ارے جائے گا کیسے نہیں بدنصیب۔“ زیبن نے دانت پیس کر اس کو بری طرح مارنا شروع کر دیا۔ ”دس ہزار روپے لئے ہیں بھٹے والوں سے‘ جن میں سے پانچ ہزار روپے تو تیرا کمینہ باپ لے کر بھاگ گیا ایک پیسہ بھی اس میں سے ہم لوگوں کو نہیں مل سکا ساری کی ساری رقم لے کر بھاگ گیا وہ کون ادا کرے گا؟ کہاں سے ادا ہو گا وہ قرضہ؟ ایں بول؟“ اس نے ایک اور تھپڑ ناصر کے منہ پر رسید کیا۔ ”کام سے بھاگے گا؟ ٹانگیں توڑ کر رکھ دوں گی۔ گلا دبا دوں گی۔“

زیبن پر ایک جنونی کیفیت طاری ہو گئی تھی ناصر کی ضد اور اس کی زبان درازی



نے زیبن کو سخت برافروختہ کر دیا تھا۔ وہ اس قسم کے رویے کو بالکل برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے تو اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر ناصر کے لئے یہ ملازمت‘ اور اس کے عوض اتنی بڑی رقم حاصل کی تھی۔ ناصر کے کام نہ کرنے کی صورت میں اس کو یہ رقم واپس کرنی ہو گی۔ وہ کس طرح اس کی متحمل ہو سکتی تھی؟ ناصر کو کام تو بہرحال کرنا تھا۔

”رہنے دو اماں‘ رہنے دو۔“ جنت نے آگے بڑھ کر اپنی ماں کو روکا جو اس وقت ایک جلالی کیفیت کا شکار تھی‘ اور اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ناصر کی چمڑی ادھیڑ کر رکھ دے۔ وہ اس کے سارے کئے دھرے پر پانی پھیر دینا چاہتا تھا۔ آخر وہ کیا کرے گی؟ بیٹیوں کے اس لشکر کو لے کر کہاں جائے گی؟ کس کے دروازے پر دستک دے گی؟ کس کے آگے ہاتھ پھیلائے گی؟ اتنی بہت ساری تو بھیک بھی نہیں مل سکتی تھی۔

”کہتا ہے کام نہیں کرے گا حرام خور۔“ زیبن نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”اپنے باپ جیسا بننا چاہتا ہے۔ کیسے کام نہیں کرے گا؟ کام نہیں کرے گا تو ٹھونسنے کے لئے روٹی کہاں سے ملے گی؟ ہم لوگوں کا کلیجہ نوچنے کے لئے ایک اس کا باپ کیا کم تھا‘ جو اب یہ بھی ہمیں اس طرح سے آنکھیں دکھانے لگا ہے۔“ ناصر زارو قطار رو رہا تھا۔ جنت نے اس کو زیبن کے ہاتھوں سے چھڑایا اور ایک طرف کو لے گئی۔ زیبن غصے کے عالم میں بکتی جھکتی رہی۔ زندگی کی پے در پے سنگین ٹھوکروں اور پیہم بدنصیبیوں کی ظالمانہ مار نے اس کو چڑچڑا اور زود رنج بنا دیا تھا۔ مایوسیوں‘ تلخیوں‘ نامرادیوں اور محرومیوں نے طبیعت میں بے رحمانہ اشتعال پذیری پیدا کر دی تھی جس میں گزرتے ہوئے دنوں کے ساتھ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

”کون خوشی سے یہ جبری مشقت کرتا ہے؟“ ناصر کو بری طرح پیٹنے کے بعد وہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔ ”کیا میں خود صبح سے شام تک جو گدھوں کی طرح کام کرتی ہوں اور ان لعنتی بیگمات کی ڈانٹ پھٹکار سنتی ہوں‘ ان کے ہاتھوں بے عزت ہوتی ہوں‘ ہر لمحہ جیتی ہوں اور پھر مرتی ہوں‘ تو مجھے یہ سب کچھ اچھا لگتا ہے؟ مگر کیا کروں..... سب قسمت کا پھیر ہے۔ جب آدمی کے نصیب میں ہی دھکے کھانا لکھا ہو تو پھر وہ کیا کر سکتا ہے؟ آج اگر گھر والا کسی ڈھنگ کا ہوتا تو میں کیوں سب کچھ کرتی‘ اور اس ننھی سی جان کو کیوں بھٹے پر کام کرنے کے لئے بھیجتی؟“

جب اس کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو اس نے سوچا کہ آئندہ وہ مار توڑ اور ڈانٹ پھٹکار کی بجائے‘ ناصر کو نرمی اور پیار سے سمجھائے گی۔ مزاج کی مشتعل کیفیت کے خاتمے کے بعد

وہ یکبارگی ایک نامعلوم سا خوف محسوس کرنے لگی تھی۔ بچے پر سختی نہیں کرنی چاہئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ واقعی ضد پر آمادہ ہو جائے اور کام کرنے سے صاف انکار کر دے یا کام پر جانے کے باوجود ٹھیک سے کام نہ کرے اور کوتاہی کا مظاہرہ کرے تو پھر حاجی مدد علی قریشی کو وہ کیا جواب دے گی؟ اس نے اگر ناصر کو بھٹے سے نکال دینے کا فیصلہ کر لیا تو پھر کیا ہو گا؟ وہ اس کے قرضے کی رقم کہاں سے واپس کرے گی؟ نہیں۔ وہ اس رقم کو واپس نہیں کر سکتی اس میں سے پانچ ہزار تو پہلے ہی غائب ہو چکے ہیں۔ صرف پانچ ہزار ہی تو باقی رہ گئے ہیں۔ جنت کی شادی.....

"میں کسی وقت حاجی مدد علی قریشی کے پاس خود جاؤں گی' اور اس سے کہوں گی کہ اس کتے کی اولاد فخرو کو ذرا قابو میں رکھے۔ بچوں کو کیوں اس طرح مارتا ہے کہ وہ اس سے اور اس جگہ سے نفرت کرنے لگتے ہیں اور وہاں سے بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کمینہ انسانوں کی طرح بچوں کو نہیں سمجھا سکتا؟" اس کے دل میں فخرو کے خلاف نفرت کا لاوا ابلنے لگا تھا' اور وہ لاشعوری طور پر اپنے ننھے اور معصوم بیٹے کی اس خواہش میں شریک ہو گئی تھی کہ خدا کرے فخرو اینٹوں کی بھٹی میں گر جائے اور جل کر بھسم ہو جائے۔

اگلی صبح کو اس نے ناصر کو سینے سے لگا کر پیار کیا' اور بڑی محبت کے ساتھ اس کا ناشتہ کرایا۔ وہ گزشتہ رات کو ہو جانے والے نقصان کی تلافی کرنا چاہتی تھی' اپنی اس کارروائی کے ممکنہ نتائج کی روک تھام کرنا چاہتی تھی جو اس نے گزشتہ رات مایوسانہ غیظ و غضب کے عالم میں کی تھی۔

"دل لگا کر کام کرنا بیٹا۔" اس نے ناصر کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "اگر محنت سے اور دل لگا کر کام کرو گے تو فخرو چاچا تم کو نہیں ماریں گے۔ ویسے میں کسی دن بھٹے پر آؤں گی اور فخرو سے خود کہوں گی کہ بچوں کو زیادہ نہ مارا کرے۔"

ناصر نے ماں کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے خاموشی سے ناشتہ کیا۔ کھانے کی پوٹلی بغل میں دبائی اور کام پر جانے کے لئے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

زیبن نے اطمینان کا سانس لیا۔ ناصر نے اس وقت کوئی ضد نہیں کی تھی' اور نہ کام پر جانے سے انکار کیا تھا۔ وہ تو بڑی خاموشی سے کام پر چلا گیا تھا۔ اس کے کچھ دیر بعد زیبن خود بھی اپنے کام پر روانہ ہو گئی۔

اس روز وہ زیادہ تر وقت ناصر کے بارے میں سوچتی رہی۔ کل رات کو اس نے



ناصر کو بہت مارا تھا اور اب اس کو اس بات سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ آئندہ ایسا نہیں کرے گی۔

شام کو جب وہ گھر واپس آئی سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ ناصر بھی اپنے وقت پر ہی کام سے گھر واپس آ گیا تھا اور اس نے کوئی شکایت بھی نہیں کی تھی۔ بلکہ اس نے تو آج کے دن کے بارے میں کوئی بات ہی نہیں کی تھی وہ بس خاموش رہا تھا۔

☆=====☆=====☆

اس دن کے بعد سے ناصر نے بھٹے پر اپنے کام کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ وہ زیادہ تر خاموش رہتا۔ صبح کو وہ ناشتہ کر کے اور کھانے کی پوٹلی ہاتھ میں لے کر کام پر چلا جاتا اور شام کو واپس گھر آ جاتا۔ زیبن بہت خوش اور مطمئن تھی۔ بس اب سناٹے کا سا عالم تھا اور زیبن کو اس بات کا قطعی علم نہیں تھا کہ سناٹے کے پیچھے ایک زبردست طوفان چھپا ہوا ہے جو عنقریب ظاہر ہونے کے لئے مچل رہا ہے۔

اس نے سوچا تھا کہ وہ کسی دن بھٹے پر جا کر حاجی مدد علی قریشی سے فخرو کے رویے کے بارے میں بات کرے گی' اور اگر موقع ملا تو خود ہی فخرو سے کہے گی کہ بچوں کے ساتھ نرمی برتے لیکن وہ صبح سے شام تک' چوہدرائن کے ہاں کام کرتے جب واپس آتی تو اتنی زیادہ تھک چکی ہوتی تھی کہ اس کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ وہ بھٹے پر جائے اور ان لوگوں سے بات کرے اور ناصر نے بھی اس کے بعد سے فخرو کی کوئی شکایت نہیں کی تھی۔ چنانچہ وہ بات بس ٹلتی ہی گئی اور زیبن بھٹے پر نہیں گئی۔ اس کو تو اس بات کا اطمینان ہو گیا تھا سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے۔

لیکن اس کے صرف دس دن کے بعد ہی اس پر بجلی گرا دینے والا یہ واقعہ رونما ہو گیا۔ ناصر کچھ پیسے لے کر گھر سے بھاگ گیا تھا۔

نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی' اور اپنے پھٹے پرانے بستر پر پڑی ہوئی زیبن اپنے خیالات کے پیچاک میں گم تھی۔ آنے والا کل اس کے لئے ایک بہت بڑا سوالیہ نشان بن گیا تھا جس کے اندر بہت سے چھوٹے چھوٹے سوالیہ نشانات چھپے ہوئے تھے' اب کیا ہو گا؟ اب کیا ہو گا؟ جنت' نصرت' صغرا' کلثوم چار چار بھاری پتھر کلیجے پر دھرے ہوئے تھے۔ انہیں کون اٹھائے گا؟ کیسے اٹھائے گا؟ وہ توانائی کہاں سے حاصل ہو سکے گی جس کی مدد سے ان پتھروں کو اٹھایا جا سکے؟ وہ ناصر کو کہاں اور کس طرح تلاش کرے؟ پورا ایک دن گزر چکا تھا۔ خدا جانے اب تک وہ کہاں پہنچ چکا ہو گا۔ "یا پاک

پروردگار اس کی حفاظت فرما۔" اس کی آنکھوں سے بار بار آنسو بہہ نکلتے تھے جو اس کے چہرے کو گیلا کر دیتے تھے اس نے ان آنسوؤں کو روکنے کی اور اپنے گیلے چہرے کو پونچھنے کی کوشش نہیں کی۔

وہ رات کو بہت کم وقت سو سکی۔ وحشت اور پریشانی کے عالم میں بار بار آنکھ کھل جاتی تھی۔ آج پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اس کا گھر اس کے اکلوتے بیٹے کے وجود سے خالی تھا۔ ناصر تو جس دن پیدا ہوا تھا' اس دن سے آج تک کبھی ایک رات کے لئے بھی اپنی ماں سے جدا نہیں ہوا تھا۔ اسے بھلا کہاں جانا تھا؟ اسے تو یہیں اس گھر میں اپنے گھر والوں کے ساتھ رہنا تھا۔ مگر اب اچانک وہ مفقود الخبر ہو گیا تھا۔

جب کسی نامعلوم پرندے کی پہلی آواز نے امید سحر کی خبر سنائی تو زمین اس وقت جاگ رہی تھی۔ وہ رات کو بہت تھوڑی دیر کے لئے سو سکی تھی۔ سوتے میں بھی کئی بار اسے ناصر مختلف انداز میں خواب میں دکھائی دیتا رہا تھا۔ کبھی تو وہ یہ دیکھتی کہ ناصر صبح کے وقت ناشتہ کرنے کے بعد' کھانے کی پوٹلی ہاتھ میں لئے ہوئے' کام پر جانے کے لئے گھر سے رخصت ہو رہا ہے اور وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے رخصت کر رہی ہے کبھی اس کو یوں دکھائی دیتا کہ شام کے وقت ناصر کام پر سے واپس آیا ہے' اور ہاتھ منہ دھو کر چارپائی پر بیٹھا ہوا' کھانے کا انتظار کر رہا ہے' ایک بار اس نے یہ بھی دیکھا کہ ناصر چارپائی پر بیٹھا ہوا' آنکھوں میں آنسو بھرے' اس سے شکوہ کر رہا ہے کہ وہ اس کو بہت مارتی ہے۔

"مجھے تو سب مارتے ہیں اماں۔" وہ گلوگیر آواز میں کہہ رہا ہے۔ "تم بھی مارتی ہو' فخرو بھی مارتا ہے' سب مل کر مجھے مارتے ہیں۔ کوئی میری بات نہیں سنتا۔" زمین کا دل تڑپ اٹھا' اور وہ ایک دم بلک بلک کر رونے لگی۔

اور سحر کی اطلاع دینے والے پرندے کی آواز اسے درد و کرب میں ڈوبی ہوئی لگی۔ پرندہ جس دن کے طلوع ہونے کی نوید دے رہا تھا وہ زمین کے لئے کوئی خوش گوار' پُرامید دن نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ ملال و مایوسی کی دھند میں لپٹا ہوا دن تھا' جس کا ایک ایک لمحہ زمین کے دل میں نوکیلے نشتروں کی طرح چبھنے کے لئے آمادہ تھا۔

جنت بھی جاگ گئی تھی۔ بلکہ وہ پہلے سے ہی جاگ رہی تھی۔ دونوں ماں بیٹیوں نے صبح کے ملگجے اجالے میں ایک دوسرے کی صورت دیکھی' اور دونوں کے چہروں پر پھیلی ہوئی اداسی اور زیادہ گہری ہو گئی۔ دونوں کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور ان میں



آنسوؤں کی کیچڑ بھری ہوئی تھی۔

انہوں نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی اور بڑی خاموشی کے ساتھ روزمرہ کے معمولات انجام دینے میں مصروف ہو گئیں۔ زندگی بڑی ظالم اور سفاک شے ہے۔ انسان کا دل اندر سے خوف کے آنسو روتا ہوتا ہے اور وہ زندہ رہنے پر' زندگی کے معمولات کو سرانجام دینے پر' زندگی کی ضروری سرگرمیوں میں حصہ لینے پر مجبور ہوتا ہے۔ وہ سب کچھ کرنے پر مجبور ہوتا ہے جس کو کرنے کی سکت وہ اپنے اندر نہیں پاتا۔ مگر یہ سکت اسے اپنے اندر پیدا کرنی پڑتی ہے۔

زمین کو اپنا گھر جیسے بالکل خالی لگ رہا تھا۔ سب لوگ موجود تھے' صرف ناصر نہیں تھا لیکن اس ایک وجود کی کمی سے سارا گھر خالی خالی' ویران ویران لگ رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد بچیاں بھی اٹھ گئیں اور ان کی اداسی کچھ اور زیادہ گہری اور پھیکی ہو گئی۔ ایک بڑا گہرا اور اذیت ناک سناٹا جو زمین کی زخمی روح میں اترتا چلا جا رہا تھا اور اس کو اور زیادہ زخمی کر رہا تھا۔

کچھ دیر کے بعد ماسی خیراں بھی آ گئی' اور زمین نے جلدی جلدی اس کو وہ سب کچھ بتا دیا جو رات کو مراد کی زبانی اس کو معلوم ہوا تھا۔

"اس سے کم از کم ایک بات کی تسلی تو ہو جاتی ہے۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "اور وہ یہ کہ اس کو کوئی پکڑ کر نہیں لے گیا ہے' اور نہ وہ کسی حادثے کا شکار ہوا ہے' اللہ نے چاہا تو جلد ہی گھر واپس آ جائے گا۔"

"میں تو یہ سوچ سوچ کر مر رہی ہوں ماسی کہ اب کیا ہو گا۔" زمین نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ "اگر وہ جلد واپس نہیں آیا تو پھر کیا ہو گا۔ حاجی مدد علی قریشی تو....."

"خدا پر بھروسہ رکھو زمین اور اس سے بھلائی کی امید رکھو۔" ماسی خیراں نے اس کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا کم خوشی کی خبر ہے کہ وہ زندہ ہے اور خیریت سے ہے؟"

زمین نے آہستہ سے ایک درد بھری سانس لی اور پھر وہ جلدی جلدی چلنے کی تیاری کرنے لگی۔ اسے سب سے پہلے تو بھٹے پر جانا تھا اور ماسی خیراں وہاں اس کے ساتھ جا رہی تھی۔

☆=====☆=====☆

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں بھٹے پر جانے کے لئے روانہ ہو گئیں۔

"ہم مسعود کے گھر والوں سے بھی ملیں گے۔" راستے میں ماسی خیراں نے کہا۔ "ان

سے معلوم کریں گے کہ ان لوگوں کے عزیز رشتے دار کہاں کہاں موجود ہیں۔ شاید انہیں کچھ اندازہ ہو کہ وہ لوگ کہاں جا سکتے ہیں۔"

"مگر کون جائے گا ان کی تلاش میں؟" زمین نے شکستہ لہجے میں کہا۔ "میں کس کو بھیجوں گی؟"

ماسی خیراں کے پاس اس کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں بھٹے پر پہنچ گئیں منشی امیر علی دفتر میں موجود تھا۔ چند منٹ کے بعد حاجی مدد علی قریشی بھی وہاں آن پہنچا۔ اس نے ماسی خیراں اور زمین کے سلام کا جواب بڑی بے رخی، رعونت اور قدرے خشونت کے ساتھ دیا۔

"کیا ہوا؟" اس نے کڑی نظروں سے زمین کے چہرے کو گھورتے ہوئے کہا۔ "کہاں ہے تمہارا بیٹا؟"

"اس کا کچھ پتہ نہیں چلا حاجی صاحب۔" زمین نے روتے ہوئے کہا۔ "ہم نے اس کو ہر جگہ تلاش کیا۔"

"زمین بے چاری بہت پریشان ہے حاجی صاحب۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "اس کا لے دے کر بس ایک ہی تو بیٹا ہے۔ میاں تو سال بھر سے زیادہ ہوا ایسا غائب ہوا کہ....."

"ایک بات اچھی طرح جان لو زمین۔" حاجی مدد علی قریشی نے ماسی خیراں کی بات کاٹتے ہوئے زمین سے مخاطب ہو کر کہا۔ "یا تو تم فوراً اپنے لڑکے کو کام پر حاضر کر دو اور اگر وہ کام پر نہیں آتا تو پھر بارہ ہزار روپے کی ادائیگی کا بندوبست کرو۔"

"بارہ ہزار؟" زمین نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں حاجی صاحب؟"

"ہاں، بارہ ہزار۔" حاجی مدد علی قریشی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "کیوں؟ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"بلکہ جب پورا حساب کتاب کیا جائے گا تو اس سے کچھ زیادہ ہی کی رقم نکلے گی تمہاری طرف۔" منشی امیر علی نے لقمہ دیئے ہوئے کہا۔

"مگر حاجی صاحب آپ نے تو مجھے صرف دس ہزار روپے دیئے تھے۔" زمین نے تشویش گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہاں وہ تو ٹھیک ہے۔" حاجی مدد علی قریشی نے کہا۔ "لیکن یہ بھی تو دیکھو کہ ایک



سال کے اندر اس رقم پر سود کتنا ہو گیا ہے میں تمہارے بیٹے کو ہر ماہ تنخواہ بھی تو دے رہا ہوں۔"

"مگر وہ کام بھی تو کرتا رہا ہے حاجی صاحب۔" زمین نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ "آپ بیشک اسے تنخواہ دیتے ہیں لیکن وہ اس تنخواہ کے بدلے میں کام بھی کرتا ہے اور آپ قرض کی رقم بھی تو تنخواہ میں سے کاٹتے ہیں، اس لئے تو تنخواہ کم ہے۔ آپ نے خود مجھ کو یہ بات بتائی ہے۔"

"تو میں کب انکار کر رہا ہوں بی بی؟" حاجی مدد علی قریشی نے خشمگیں انداز میں زمین کو گھورتے ہوئے کہا۔ اسے زمین کا یہ بحث کرنے والا انداز بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ "تنخواہ میں سے تھوڑی تھوڑی رقم کٹ رہی ہے تب ہی کل واجب الادا رقم بارہ ہزار روپے کے قریب بنے گی اگر میں تنخواہ میں سے قرض کی کٹوتی نہ کر رہا ہوتا تو یہ رقم بارہ ہزار روپے سے زیادہ بن جاتی۔"

"مگر حاجی صاحب رقم تو دس ہزار تھی اور ناصر یہاں برابر کام کرتا رہا ہے اور....."

"بی بی تم لوگوں کی سمجھ میں یہ حساب کتاب نہیں آئے گا۔" منشی امیر علی نے مداخلت کرتے ہوئے زمین کی بات کاٹ دی۔ "کسی پڑھے لکھے سمجھ دار آدمی کو بلا کر لانا اور اسے وہ کاغذ پڑھوا دینا جس پر تم نے انگوٹھا لگایا ہے وہ تم کو سارا حساب کتاب سمجھا دے گا تم خواہ مخواہ اس معاملے میں اپنا سر پھوڑنے کی کوشش مت کرو اپنے بیٹے کو تلاش کر کے لاؤ اور اگر اس کو نہیں لا سکتی تو پھر رقم کی ادائیگی کی فکر کرو۔"

زمین ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، اسے یوں لگ رہا تھا جیسے چاروں طرف سے نامعلوم خونی پنجے اس کے ناتواں اور کمزور وجود کی طرف بڑھ رہے ہیں اور اس کو نوچ نوچ کر لہولہان کر دینا چاہتے ہیں۔

"خالی رونے دھونے سے کام نہیں چلے گا بی بی!" منشی امیر علی نے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔ "اس کو کام پر حاضر کرنے کی سبیل کرو اگر نہیں آئے گا رقم تو تم کو ہر حال میں دینی ہو گی۔ آخر کسی کے پاس پیسے مفت میں تو نہیں آ جاتے جو وہ یوں لٹاتا پھرے....." منشی امیر علی کا اپنے مالک کے مفادات کے ساتھ وفاداری کا اظہار زیادہ سے زیادہ گھناؤنی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔

"منشی جی، ہمیں پتہ چلا ہے کہ اس بھٹے میں کام کرنے والا کوئی بڑی عمر کا لڑکا بھی کل

سے اپنے گھر سے غائب ہے....." ماسی خیراں نے بات کو دوسری طرف لے جاتے ہوئے کہا۔ "اس کا نام مسعود ہے ہو سکتا ہے کہ وہی ناصر کو بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ لے گیا ہو۔"

"مسعود کے گھر والوں سے ہم نمٹ رہے ہیں۔" حاجی مدد علی قریشی نے فوراً کہا۔ "ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ مسعود بھی کل سے اپنے گھر سے بھاگا ہوا ہے اور وہ اپنے ساتھ کچھ رقم بھی لے گیا ہے بہرحال ہمارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ یا تو لڑکے کو کام پر حاضر کرو اور اگر ایسا نہیں کر سکتے تو پھر ہماری قرض کی رقم مع اس سود کے واپس کرو جو کہ اس پر واجب الادا ہے۔"

"پولیس میں رپورٹ لکھوا دو بی بی۔" منشی امیر علی نے مشورہ دیا۔ "اور اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو کہ ہم زیادہ انتظار نہیں کریں گے اس معاملے میں جتنی زیادہ دیر ہو گی اتنا ہی زیادہ تمہارا نقصان ہو گا۔"

"رقم بڑھتی جائے گی۔" حاجی مدد علی قریشی نے کہا۔ "ہم بھی تو مجبور ہیں بی بی کیا کریں ہمیں تو کتنے بہت سے لوگوں کا دینا ہوتا ہے۔"

☆=========☆=========☆

ان دونوں کا اب وہاں مزید رکنا بے کار تھا حاجی مدد علی قریشی کو جو کچھ کہنا تھا وہ اس نے کہہ دیا تھا اور اس کے نمک خوار منشی نے بھی بڑی حد تک حقِ نمک ادا کر دیا تھا وہ دونوں وہاں سے چل پڑیں۔

جیسے ہی وہ بھٹے کے احاطے سے باہر نکلیں انہیں مراد نظر آیا وہ بھٹے کے احاطے کے باہر شاید انہی کے انتظار میں کھڑا ہوا تھا وہ دونوں اس کو دیکھ کر رک گئیں اور مراد جلدی سے ان کے پاس آ گیا۔

"اس بات کی تصدیق ہو گئی ہے چاچی کہ ناصر اور مسعود ساتھ ساتھ گئے ہیں۔" اس نے ان دونوں کے ساتھ سلام دعا کے بعد کہا۔ "ایک لڑکے نے مجھے بتایا ہے کہ اس نے کل صبح کو ان دونوں کو ایک ساتھ بسوں کے اڈے کی طرف جاتے دیکھا تھا۔"

"پھر؟ پھر؟" زبین نے ایک دم مضطربانہ انداز میں پوچھا۔ "اس کے بعد وہ کہاں گئے؟"

"یہ نہیں معلوم چاچی۔" مراد نے کہا۔ "اس لڑکے نے صرف اتنا ہی دیکھا تھا کہ وہ دونوں تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے بسوں کے اڈے کی طرف جا رہے تھے پھر اس کے



بعد وہ وہاں سے کہاں گئے' یہ اس کو نہیں معلوم کیونکہ اس نے ان کا پیچھا نہیں کیا تھا۔"

"پھر اب کیا کریں؟" زبین نے مراد کی طرف دیکھ کر بے بسی کے عالم میں اس طرح کہا جیسے مراد کوئی بزرگ ہو اور وہ اس کے مقابلے میں بہت چھوٹی' ناتجربہ کار اس سے مشورے کی طالب اور محتاج ہو۔

"میرا خیال تو یہ ہے چاچی کہ پولیس میں گمشدگی کی رپورٹ تو درج کروا دینی چاہئے۔" مراد نے کہا۔ "مسعود کے گھر والے بھی اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروا رہے ہیں میں صبح اس کے گھر گیا تھا لیکن وہ لوگ رپورٹ میں یہ نہیں لکھوائیں گے کہ مسعود گھر سے کچھ رقم بھی ساتھ لے گیا ہے کیونکہ اس صورت میں اس پر چوری کا کیس بن جائے گا میرا خیال ہے چاچی تم بھی رپورٹ میں یہ مت لکھوانا کہ ناصر گھر سے کچھ پیسے بھی لے گیا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو بیٹا۔" ماسی خیراں نے فوراً اس کی بات کی تائید کی۔ "معاملہ اگر چوری کا ہو تو پھر بالکل دوسری ہی بات ہو جاتی ہے اور پولیس والے فوراً مار پٹائی شروع کر دیتے ہیں۔"

"ہاں۔" مراد نے کہا پھر وہ زبین کی طرف رخ کر کے بولا۔ "حاجی صاحب کیا کہتے ہیں؟ انہیں کچھ اور معلوم ہوا اس بارے میں؟"

"حاجی صاحب تو دس ہزار روپے کے بارہ ہزار بنائے بیٹھے ہیں۔" زبین کے لہجے میں نفرت آمیز تلخی گھلی ہوئی تھی۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ دس ہزار کے بارہ ہزار کیسے ہو گئے جبکہ سال بھر سے ناصر یہاں کام بھی کر رہا ہے اور اس کی تنخواہ میں سے قرضے کی رقم بھی ہر ماہ برابر کٹ رہی ہے۔"

"میرے ابا کہتے ہیں کہ یہ سود در سود کا چکر بہت برا ہوتا ہے۔" مراد کی زبان سے ایک دم نکل گیا لیکن پھر وہ فوراً ہی سنبھل گیا شاید اس کو یہ بات اس طرح نہیں کہنی چاہئے تھی۔ "اس میں..... اس میں تو بس رقم بڑھتی ہی رہتی ہے اصل تو ادا ہو ہی نہیں پاتا اور سود برابر بڑھتا چلا جاتا ہے۔"

"اب وہ بارہ ہزار مانگ رہا ہے۔" ماسی خیراں نے ایک لمبی اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "بجائے اس کے کہ رقم دس ہزار سے کم ہوتی وہ اور زیادہ بڑھ گئی اب کہتا ہے کہ بارہ ہزار دینے ہوں گے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ جتنے زیادہ دن گزرتے جائیں گے اتنا ہی زیادہ رقم میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا۔"

مراد کے پاس اس الجھن کا کوئی حل نہیں تھا وہ اس قسم کے معاملات کی پیچیدگی اور باریکیوں کو سمجھنے کے لئے ابھی بہت کم عمر تھا اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ اس جواب میں کیا کہے۔ اس نے سوچا کہ وہ بعد میں مسعود کے گھر والوں سے ملے گا اور سے پوچھے گا کہ وہ اس سلسلے میں کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ مالی معاملات کے یہ مسائل اس کی ذہنی سطح سے بہت بلند تھے اور پھر وہ ان میں الجھ کر کر بھی کیا سکتا تھا؟

وہ تینوں وہاں سے روانہ ہوئے اور تھانے پہنچ گئے۔ زمین تھانے کے احاطے قدم رکھتے ہوئے سخت خوفزدہ تھی ایک بار تو اس کا جی چاہا کہ وہ واپس چلی جائے اور رپورٹ درج نہ کرائے لیکن ماسی خیراں نے اس کی ہمت بندھائی اسے سمجھایا کہ ایسا ضروری ہے پولیس اگر ناصر کو کہیں دیکھ لے گی تو پکڑ کر گھر واپس پہنچادے گی۔

پولیس والوں نے بہت سارے سوالات پوچھے اور زمین سنبھل سنبھل کر ان جوابات دیتی رہی۔

"حاجی مدد علی قریشی کہتا ہے کہ یا تو لڑکے کو کام پر حاضر کرو ورنہ بارہ ہزار روپے کرو۔" زمین نے روتے ہوئے پولیس والوں کو اپنی داستان غم کے آخر میں بتایا۔ "میں غریب' بے سہارا عورت..... میں بھلا بارہ ہزار روپے کہاں سے لاؤں گی۔"

"اس بات سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے بی بی۔" پولیس افسر نے کہا۔ "یہ معاملہ تمہارا اور بھٹے کے مالک کا ہے تم دونوں جانو۔ ہم اس سلسلے میں کچھ نہیں کرسکتے۔ ہمارا تو بس تمہارے بیٹے کی تلاش تک محدود ہے۔ تمہارے پاس اس کی کوئی تصویر موجود ہے؟"

"تصویر؟" زمین حیرت سے پولیس افسر کی طرف دیکھنے لگی جیسے اس نے کوئی بہت ہی ناقابل یقین قسم کی بات کہہ دی ہو۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اپنے بچوں کی تصویریں کھنچوائے گی جہاں گنی روٹیاں اور گنے نوالے ہوں وہاں بھلا تصویر کھنچوانے کی عیاشی کون کراتا ہے؟

"ہاں ہاں تصویر..... فوٹو....." پولیس افسر نے جھنجھلا کر کہا۔ "فوٹو سمجھتی ہو نا؟"

"ہاں صاحب جی کیوں نہیں سمجھتی ہوں۔" زمین نے کہا۔ "مگر ہمارے بچوں کی تصویریں بھلا کون کھینچتا ہے؟ کہاں کھنچتی ہیں ہمارے بچوں کی تصویریں؟ میرے پاس میرے کسی بھی بچے کی تصویر موجود نہیں ہے۔"



"اچھا تو پھر حلیہ ہی لکھوا دو۔" پولیس والے نے بے دلی اور بیزاری کے ساتھ کہا۔

☆==========☆========☆

ناصر نے بھٹے کی مسموم اور نامہربان فضا میں اپنے لئے کوئی کشش محسوس نہیں کی تھی یہ سراسر جبر اور وحشت کی دنیا تھی یہ جان توڑ مشقت اور اذیت رسانی کی دنیا تھی یہاں فخرو جیسا جلاد آدمی موجود تھا جو بات بے بات مار مار کر چمڑی ادھیڑ دیتا تھا اور گالی کے بغیر بہت کم بات کرتا تھا۔ ناصر نے جب یہاں کام کرنا شروع کیا تو وہ بالکل سراسیمہ اور بدحواس ہو کر رہ گیا اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے وہ اپنی خواہش سے نہیں بلکہ اپنی ماں کی مرضی اور خواہش سے یہاں کام کرنے آیا تھا۔ ماں چاہتی تھی کہ وہ یہاں کام کرے اس لیے وہ بڑی معصومیت سادہ دلی اور خاموشی کے ساتھ کڑے موسم کے اس جبر کو برداشت کرتا رہا اور کام کرتا رہا لیکن اس کے دل میں اس پورے گورکھ دھندے کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا گیا اور اس کی ایک بڑی وجہ فخرو کا رویہ بھی تھا۔

ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ ناصر کے دل میں فخرو کے لئے نفرت بڑھتی گئی وہ اس ماحول اور اس فضا سے بیزار اور برگشتہ ہوتا گیا اس کا جی چاہتا کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہاں سے بھاگ جائے اور اپنے گھر کی گلی میں دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر خوب شور مچائے یا اپنے گھر کے آنگن میں اپنی بہنوں کے ساتھ کھیلے اور کود پھاند کرے جیسا کہ وہ پہلے کرتا تھا لیکن یہ سب کچھ تو اب خواب و خیال معلوم ہوتا تھا۔ وہ جس حصار میں آکر قید ہو گیا تھا وہاں سے باہر نکلنے کی کوئی صورت اس کو نظر نہیں آتی تھی جہاں تک اس معاملے کے مالی پہلوؤں کا تعلق تھا تو اسے ان کے بارے میں نہ تو ٹھیک سے معلوم تھا اور نہ اسے ان سے کوئی دلچسپی تھی۔ ساری باتیں تو اس کی ماں نے طے کی تھیں اور وہی ان کے بارے میں بہتر جانتی تھی اور جب اماں سب کچھ جانتی تھی تو پھر اس کے لئے ان سب کے جاننے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

لیکن مسعود اس کے مقابلے میں زیادہ جانتا تھا۔

مسعود اور ناصر تقریباً ایک ہی وقت میں بھٹے میں کام کرنے کے لئے آئے تھے مسعود' ناصر سے کوئی ایک ہفتہ پہلے وہاں آیا تھا اس وقت اس کی عمر بارہ سال کی تھی اور وہ ناصر سے چار سال بڑا تھا اور یہ صرف عمر کا ہی فرق نہیں تھا زندگی اور ماحول سے حاصل کردہ تجربات کی شدت کا بھی فرق تھا۔

مسعود کے باپ کا نام امتیاز تھا' وہ بھی سیالکوٹ کی اسی نواحی بستی میں رہتا تھا شہر کے

ایک ہوٹل کے تندور میں روٹیاں لگانے کا کام کرتا تھا اور برسوں پہلے اپنے چھ سالہ بیٹے مسعود اور اپنی نوجوان حسین بیوی آمنہ کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزارتا تھا۔ آمدنی محدود تھی وسائل محدود تھے تو اس کے ساتھ ہی کنبہ بھی محدود تھا اور ضروریات بھی محدود تھیں دونوں میاں بیوی ایک دوسرے اور اپنے بچوں کے ساتھ خوش تھے مزید بچوں کے متمنی بھی تھے۔

اس روز جب امتیاز حسب معمول رات گئے تندور سے گھر واپس آیا تو اس نے آمنہ کو خاصا مضمحل پایا۔ اس کے چہرے سے تھکاوٹ اور گراوٹ کا احساس ہو رہا تھا آنکھیں بھی کچھ بجھی بجھی سی تھیں۔ امتیاز کے پوچھنے پر آمنہ نے بتایا کہ آج صبح سے اس کو تیز بخار ہو گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ کمزوری بھی محسوس کر رہی ہے۔

پچھلے ایک یا دو ماہ سے آمنہ کو ہلکا ہلکا بخار رہتا تھا اسے اپنا جسم گرم لگتا تھا اور پیٹ اور پیٹھ میں سے ہلکی ہلکی آنچ نکلتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ خود امتیاز کو بھی آمنہ کا بدن گرم لگتا تھا لیکن یہ معمولی سی حرارت کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کی خاطر پریشان ہو کر حکیموں اور ڈاکٹروں کے پاس جانے کی ضرورت تھی یہ سب کچھ تو زندگی کے معمولات میں داخل تھا ایسی چھوٹی موٹی بیماریاں تو چلتی ہی رہتی ہیں آمنہ کچھ گھریلو دوائیں استعمال کر لیتی تھی اور اس کا خیال تھا کہ اس کو ان دواؤں سے فائدہ بھی ہوتا ہے۔

لیکن ایک صبح اس کا بخار ایک دم بڑھ گیا اور وہ بالکل نڈھال ہو گئی بخار کی شدت سے اس کا جسم جل رہا تھا اور وہ بڑی بے چینی محسوس کر رہی تھی گھر کا کام کاج کم ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ تھا آخر پورا گھر تھا افراد کم تھے تو کیا ہوا؟ کام تو تھا۔ گھر کے سارے کام کر کے وہ نڈھال ہو کر چارپائی پر گر گئی اور پھر زیادہ تر وقت لیٹی ہی رہی چھ سالہ مسعود کافی دیر تک اس کے پاس ہی بیٹھا رہا وہ اس سے باتیں کرتی رہی پھر باہر گلی میں بچوں کے ساتھ کھیلنے چلا گیا۔

مسعود اب چھ سال کا ہو گیا تھا اور آمنہ اکثر اس کے بارے میں سوچا کرتی تھی کہ اس کو پڑھنے بٹھا دے۔ مولوی مشرف حسین اپنے مکتب میں جو انہوں نے اپنے گھر کی بیٹھک میں قائم کر رکھا تھا بچوں کو اردو اور قرآن شریف کی تعلیم دیتے تھے اور کچھ مقررہ نذرانہ بھی لیتے تھے۔ کچھ لڑکے ان کے مکتب میں شام کو پڑھنے چلے جاتے تھے لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی کیونکہ اس بستی کے رہنے والے زیادہ تر بچے حصول تعلیم کی عیاشی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے اور کسی نہ کسی طور پر کسب معاش کی جدوجہد میں اپنے



والدین کے ساتھ شریک رہتے تھے۔ آنکھ کھولتے ہی ہوش سنبھالتے ہی وہ طرح طرح کے ڈھیروں بوجھ اپنے ناتواں کاندھوں پر اٹھائے ہوئے زندگی کے بے رحم خارزاروں میں نامعلوم و نامفہوم منزلوں کی طرف چل پڑتے کارواں در کارواں۔

لیکن مسعود ابھی ایسے کسی کارواں میں شامل نہیں ہوا تھا کیونکہ اس کے والدین کو اس کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی امتیاز کی کمائی ان تین جانوں کے لئے کافی تھی اور فی الحال اس میں کسی اضافے کی ضرورت نہیں محسوس کی جا رہی تھی۔ آمنہ چاہتی تھی کہ مسعود کچھ تھوڑا سا پڑھ لکھ جائے اس کے اور اس کے شہر کے خاندانوں میں دور دور تک کوئی حرف شناس موجود نہیں تھا اگر مسعود کچھ پڑھ لے تو کتنا اچھا ہو۔ اس نے ایک دو بار اپنے شوہر سے اس بات کا ذکر بھی کیا۔ امتیاز نے اس کی مخالفت نہیں کی تاہم اس نے یہ ضرور کہا تھا کہ مسعود ابھی بہت چھوٹا ہے۔

رات کو امتیاز جب واپس گھر آیا اور اس نے آمنہ کو تیز بخار میں جلتے ہوئے دیکھا تو آمنہ سے کہا کہ کل وہ حکیم کے پاس جا کر دوا لے آئے اور کچھ دن تک دوا استعمال کرے۔

اگلے دن آمنہ جا کر حکیم سے دوا لے آئی اور اس نے کئی دن تک دوا استعمال کی۔ اس کا بخار کم ہو گیا لیکن پھر بھی مکمل طور سے ختم نہیں ہوا۔ رات میں کسی کسی وقت اس کی آنکھ کھل جاتی اور اس کو اپنی پیٹھ بری طرح جلتی ہوئی محسوس ہوتی۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ پیٹھ پر خوب ٹھنڈا ٹھنڈا پانی ڈال لے۔ وہ اپنی اس کیفیت سے خاصی پریشان رہنے لگی تھی اور ساتھ ہی اسے اپنے جسم میں کمزوری کا بھی احساس ہونے لگا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے اس کے کام کرنے کی قوت میں کمی واقع ہوتی جا رہی ہے۔ وہ جلد تھک جاتی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بستر پر لیٹ جائے جبکہ اس سے پہلے وہ گھنٹوں کام کرتی رہتی تھی اور تھکن کا دور دور تک پتہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ دو ایک بار حکیم کے پاس بھی گئی اور اس نے اس کو کچھ نئی دوائیں دینے کے ساتھ ساتھ یہ مشورہ دیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ کھائے اور خوب کام کرے، محنت کرے اس نے حکیم کے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش بھی کی لیکن سب کچھ ویسا نہیں ہو پا رہا تھا جب کہ وہ جانتی تھی اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے اندر سے کوئی چیز غائب ہوتی جا رہی ہے۔ کچھ کم ہوتا جا رہا ہے اس کے اندر سے، وہ خود کو پہلے جیسا نہیں محسوس کر رہی تھی۔

اسی دوران اس کے اصرار پر امتیاز نے مسعود کو مولوی مشرف حسین کے مکتب میں

داخل کرادیا۔

مسعود نے اس سے پہلے مولوی مشرف حسین کو ہزار بار دیکھا تھا اور کبھی بھی ان کے بارے میں کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں محسوس کی تھی۔ مولوی صاحب تو بس مولوی صاحب تھے بچوں کو پڑھاتے تھے اور بس۔ مسعود کو ان کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ اور جاننے کی ضرورت بھی نہیں تھی' لیکن مولوی صاحب کو' ان کے مزاج اور ان کے طریق تدریس کو اس نے اس وقت سمجھنا شروع کیا جب پہلی بار مولوی صاحب کی چھڑی اس کی پشت پر پڑی۔ وہ بلبلا اٹھا۔ مار کھانا اس کے لئے کوئی انوکھی یا غیر معمولی بات تو نہیں تھی لیکن اس قسم کی زور دار اور کراری مار کا وہ عادی نہیں تھا۔ ماں کبھی کبھار غصے میں آکر اس کے ایک آدھ دو ہتڑ جڑ دیتی تھی یا باپ یوں ہی ہولے سے ایک دو دھپ لگا دیتا تھا جو مارنے سے زیادہ دھمکانے کا انداز ہوتا تھا لیکن مولوی صاحب نے تو اس زور سے چھڑی ماری تھی کہ مسعود کو اس کی چوٹ سیدھی اپنے دماغ پر محسوس ہوئی تھی۔ "ٹھیک سے پڑھ" مولوی صاحب نے چھڑی مارنے کے ساتھ ہی زور سے جھڑک کر کہا تھا ان کی آنکھوں سے جیسے آگ نکلنے لگی تھی مسعود کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سے غلطی کہاں ہوئی تھی اور اس نے پڑھنے میں کہاں کوتاہی کی تھی جس طرح مولوی صاحب نے بتایا تھا اس طرح اس نے پڑھا تھا تو پھر یہ چھڑی؟ یہ شاید آئندہ غلط نہ پڑھنے کی پیش بندی کے طور پر تھی۔

مکتب میں مسعود کے علاوہ جو دوسرے لڑکے تھے ان پر بھی مولوی صاحب کی چھڑی بار بار بجلی بن بن کر گرتی تھی اور وہ بھی تڑپ کر بلبلا کر رہ جاتے تھے مولوی صاحب سراپا خشونت اور قہر و غضب کی تصویر بنے ہوئے نہ صرف یہ کہ چھڑی سے ان لڑکوں کی چمڑی ادھیڑتے بلکہ کڑوے کسیلے الفاظ کے سخت اور دلوں کو زخمی کردینے والے پتھر بھی بڑی بے رحمی کے ساتھ ان پر برسایا کرتے تھے۔ پہلے ہی دن کا تجربہ مسعود کے لئے نہایت درجہ نامسعود اور ناخوش گوار ثابت ہوا۔ وہ دوسرے دن خود کو مکتب جانے کے لئے بمشکل ہی تیار کرسکا تھا۔

پھر تو رفتہ رفتہ یہ صورت ہوگئی کہ اسے مولوی مشرف حسین کی صورت سے خوف آنے لگا مولوی صاحب اس کے لئے قہر و غضب اور اذیت و عقوبت کی علامت بن کر رہ گئے تھے۔ وہ مارتے تھے اور بے دریغ مارتے تھے یوں لگتا تھا جیسے مارنا اور اذیت ناک انداز میں سزا دینا کچھ ان کی سرشت میں شامل تھا وہ ایسا کئے بغیر رہ نہیں سکتے تھے یہ قطعی



ضروری نہیں تھا کہ طالب علم کو کسی غلطی پر ہی ماریں وہ بغیر غلطی کے بھی اتنا ہی مار سکتے تھے اور مارتے تھے جتنا کہ غلطی پر' انہیں تو بس سزا دینے کا بہانہ چاہئے ہوتا تھا۔

مسعود کو مولوی مشرف حسین کا وہ مکتب ایک عقوبت خانے کی طرح معلوم ہونے لگا وہاں اس کی دلچسپی کا کوئی سامان نہیں تھا وہاں پڑھنے والے لڑکے جب مکتب کے اندر ہوتے تھے تو اس وقت وہ ایسے خوفزدہ' بے زبان پرندوں کی طرح سہمے ہوئے ہوتے تھے جنہیں صیاد نے زخمی کرکے ایک پنجرے میں بند کردیا ہو۔ وہ آپس میں بات کرنا تو درکنار ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے بھی ڈرتے تھے۔ نظر اٹھنے سے پہلے ہی کانپنے لگتی تھی اور پھر وہیں کی وہیں دم توڑ دیتی تھی۔ مکتب کے اندر ہر چیز جیسے سانس لینے سے خوفزدہ ہوتی تھی۔ مولوی مشرف حسین گرج گرج کر ایک ایک لڑکے پر جھپٹتے تھے اور جیسے اس کی جان نکال لینے پر آمادہ نظر آتے تھے۔ اس عالم میں لڑکے سیکھتے کم بھولتے زیادہ تھے اور تعلیم انہیں ایک نعمت نہیں ایک لعنت معلوم ہونے لگتی تھی اور وہ تعلیم کے اس طویلے سے رسیاں تڑوا کر بھاگنے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔

مسعود نے بھی مکتب سے بھاگنا شروع کردیا اپنے گھر میں اس نے بارہا اپنے والدین سے مولوی مشرف حسین کی شکایت کرتے ہوئے کہا تھا کہ مولوی صاحب بہت مارتے ہیں اور بے خطا اور بلاوجہ مارتے ہیں اور والدین نے بڑی محبت اور چاہت کے ساتھ اس کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ مولوی صاحب تو جو کچھ کرتے ہیں وہ ان لوگوں کی بھلائی کے لئے کرتے ہیں اور یہ کہ مار کھائے بغیر کبھی علم حاصل نہیں ہوتا۔ پڑھائی کے ساتھ تھوڑی بہت پٹائی بہت ضروری ہے مگر مسعود کا ذہن اور ذہن سے زیادہ اس کا جسم اپنے والدین کی اس دلیل کو قبول نہیں کرسکا وہ اپنے آپ کو مزید مار کھانے کے لئے مزید اذیت برداشت کرنے کے لئے تیار نہ کرسکا۔ وہ پہلے جھوٹ نہیں بولتا تھا کیونکہ اس کو اس کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی لیکن اب اس نے جھوٹ بولنا بھی شروع کردیا وہ مکتب کے وقت بستہ سنبھال کر گھر سے نکل جاتا لیکن مکتب جانے کے بجائے اِدھر اُدھر گھوم پھر کر چھٹی کے وقت گھر واپس آجاتا۔ باپ تو گھر پر ہوتا نہیں تھا ماں عام طور سے نڈھال ہی بستر پر پڑی ہوتی تھی اور یہی سمجھتی تھی کہ وہ مکتب سے آیا ہے اگلے دن مکتب میں وہ مولوی صاحب سے کہہ دیتا کہ اس کی ماں کی طبیعت خراب تھی اس لئے وہ مکتب نہیں آسکا ماں نے اس کو روک لیا تھا گھر پر اور کوئی تھا ہی نہیں۔

لیکن اس کا یہ جھوٹ زیادہ عرصے تک چل نہیں سکا۔ جلد ہی اس کے والدین اور

مولوی صاحب کو بھی اس کا علم ہوگیا۔ مولوی صاحب نے اس کو وہ چار چوٹ کی مار دی کہ مسعود نے مکتب جانے سے توبہ کرلی اس روز جب وہ بے تحاشہ مار کھا کر گھر واپس آیا تھا اس کی ہڈی ہڈی دکھ رہی تھی اس نے اپنی ماں سے کہہ دیا کہ وہ مولوی مشرف حسین سے پڑھنے ان کے مکتب نہیں جائے گا۔

آمنہ کی طبیعت کافی خراب تھی اس نے مسعود سے کچھ زیادہ نہیں کہا سنا البتہ رات کو جب امتیاز کام پر سے واپس آیا تو اس نے اس کو ساری بات بتائی۔ امتیاز اس دن کسی اور ہی الجھن میں تھا اس کے ہوٹل کے مالک کو پولیس پکڑ کر لے گئی تھی کیونکہ اس نے ان تین پولیس والوں سے جنہوں نے دوپہر کو وہاں کھانا کھایا اور اسپیشل آرڈر پر مرغی روسٹ کروائی تھی اصرار کیا تھا کہ وہ کھانے کی قیمت ادا کریں' جبکہ پولیس والے اس کے لئے تیار نہیں تھے۔ اس وقت تو انہوں نے پیسے ادا کردیئے تھے لیکن بعد میں سہ پہر کو ایک پولیس پارٹی ہوٹل کے مالک کو پکڑ کرلے گئی اس پر الزام یہ تھا کہ وہ ناجائز اور خلاف قانون ذبیحہ کرتا ہے رات تک پولیس والوں نے مالک کو چھوڑا نہیں تھا اور مالک کے رشتے داروں سے تھانے والوں کے مذاکرات جاری تھے کوئی تصفیہ ابھی تک نہیں ہوپایا تھا پولیس والے ہوٹل کو بند کروانے کی دھمکی دے رہے تھے جس کی وجہ سے امتیاز بہت پریشان تھا۔

"چلو بعد میں کسی اور مولوی یا ماسٹر کو دیکھ لیں گے۔" اس نے بے دلی اور عدم توجہی کے ساتھ اپنی بیوی سے کہا۔ "اب اگر وہاں جاکر پڑھنے پر تیار نہیں ہے تو کوئی جان سے تو نہیں مار دیں گے۔"

بات آئی گئی ہوگئی تھی بعد میں کسی اور مولوی یا ماسٹر کو تلاش نہیں کیا جاسکا کسی نے اس طرف دھیان ہی نہیں دیا اور وقت گزرتا گیا مسعود کی تعلیم اردو کی معمولی شُد بُد سے آگے نہ بڑھ سکی۔ آمنہ کی بیماری روز بروز طول پکڑتی جارہی تھی اور بخار اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا تھا بخار کے ساتھ خشک کھانسی کے دورے بھی اس کو پریشان کرتے رہتے تھے۔ حکیم کے علاج کے ساتھ ساتھ دنیا بھر کے گھریلو ٹونے ٹوٹکے بھی ہوتے رہتے تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی چیز آمنہ کے لئے صحت یابی کی نوید نہیں بن سکی یہاں تک کہ وہ وقت بھی آیا کہ آمنہ بالکل بستر سے لگ گئی اور اس کے ساتھ ہی گھر کے کام کاج کا مسئلہ شدید اور پیچیدہ ہوگیا۔

فریدہ آمنہ کی رشتے کی خالہ زاد بہن اور آمنہ سے دو سال چھوٹی تھی اس کی شادی



آج سے کئی سال پہلے کرم دین نامی ایک شخص سے ہوئی تھی جو جوا کھیلنے کا رسیا تھا اس نے فریدہ کے تمام زیورات اور دیگر قیمتی اشیاء جوئے میں اڑا دیں۔ دونوں میاں بیوی میں تعلقات انتہائی تلخ اور کشیدہ تھے کرم دین فریدہ کو بری طرح مارتا پیٹتا تھا فریدہ اس کے گھر سے چلی آئی اور اس نے خاندان کے بڑوں سے صاف کہہ دیا کہ وہ کرم دین کے ساتھ گزارا نہیں کرسکتی۔ لوگوں نے کرم دین کو راہِ راست پر لانے کی کافی کوشش کی لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا اس نے جوئے کی عادت ترک نہیں کی۔

بالآخر فریدہ سے کرم دین نے طلاق دینے کی قیمت وصول کی تھی اس نے فریدہ کے گھر والوں سے اچھی خاصی رقم اینٹھی اس کے بعد اس نے فریدہ کو آزاد کیا تھا اور اس کے بعد سے فریدہ اپنے والدین کے ساتھ ہی رہ رہی تھی جو اس کی دوسری شادی کی فکر میں تھے لیکن ایک طلاق یافتہ عورت کے لئے رشتہ ملنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

آمنہ بستر سے لگ گئی تو اس زمانے میں فریدہ نے اپنی رشتے کی بہن کی تیمارداری کرنے اور اس کے گھر کے کام کاج میں مدد دینے کی غرض سے وہاں آنا جانا شروع کردیا اس میں کوئی شک نہیں کہ شروع میں یہ سب کچھ خالص انسانی ہمدردی اور مدد کرنے کے جذبے پر ہی مبنی تھا لیکن واقعات و حالات انسانی ارادوں اور خواہشات سے ماورا خود ہی اپنی راہ متعین کرتے ہیں۔

آمنہ خوش تھی کہ اس کی بہن نے اس کے گھر آکر کام کاج کرنے اور گھر کو سنبھالنے میں اس کی مدد کرنی شروع کردی تھی۔ آمنہ اپنی بیماری کے باوجود اس بات کی کوشش کرتی تھی کہ گھر کا زیادہ سے زیادہ کام خود ہی کرلیا کرے کیونکہ گھر میں اور تو کوئی تھا ہی نہیں۔

آمنہ کی صحت تیزی سے روبہ زوال تھی حکیم کے علاوہ اب محلے کے ایک ڈاکٹر کا بھی علاج ہورہا تھا لیکن اس سے بھی اسے کوئی فائدہ نہیں ہورہا تھا۔ ڈاکٹر حسین بخش کوئی باقاعدہ کوالیفائڈ ڈاکٹر نہیں تھا کسی زمانے میں وہ ایک سرکاری ڈسپنسری میں کمپاؤنڈر ہوا کرتا تھا وہاں سے اس کو دوائیں چرانے کے الزام میں نکال دیا گیا تھا۔ کچھ دنوں تک تو وہ اِدھر اُدھر چھوٹی موٹی پرائیوٹ ڈسپنسریوں وغیرہ میں کام کرتا رہا پھر اس کے بعد اس بستی میں ڈاکٹر حسین بخش کے نام کا بورڈ لگا کر بیٹھ گیا اور اس نے باقاعدہ پریکٹس شروع کردی اب وہ ڈاکٹر حسین بخش کہلاتا تھا اس کے بارے میں بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم تھی کہ وہ کوئی سند یافتہ ڈاکٹر نہیں ہے ویسے بھی اس بستی کے رہنے والوں کے لئے اس فرق کا کوئی

خاص مطلب ہی نہیں تھا۔

"امتیاز بھائی' آپ آمنہ آپا کو شہر کے کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھائیں۔" فریدہ نے ایک روز امتیاز کو مشورہ دیا۔ "ڈاکٹر حسین بخش کے علاج سے تو ان کو کوئی خاص فائدہ ہو نہیں رہا ہے غفور چاچا کہہ رہے تھے کہ وہ تو نقلی ڈاکٹر ہے۔"

"میں..... میں کسی ڈاکٹر کو جانتا بھی نہیں ہوں۔" امتیاز نے قدرے بے بسی کے ساتھ کہا..... "کس کو دکھاؤں؟"

"اچھا میں غفور چاچا سے ہی معلوم کرکے بتاؤں گی۔" فریدہ نے کہا۔ "انہوں نے اپنے بیٹے سلطان کا علاج شہر کے کسی اچھے ڈاکٹر سے کروایا تھا اور وہ بالکل ٹھیک ہوگیا تھا آپ آمنہ آپا کو اس ڈاکٹر کو دکھایئے۔"

آمنہ کی طبیعت واقعی بہت زیادہ خراب ہوگئی تھی اس کے بدن کا گوشت تو جیسے بالکل گھل گیا تھا ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ اس روز امتیاز نے بہت دنوں کے بعد آمنہ کو غور سے دیکھا اور وہ جیسے دہل گیا اسے فوری طور پر شدید احساس ہوا کہ وہ آمنہ کو نظرانداز کرتا رہا ہے اس کو تو پہلے ہی کسی اچھے ڈاکٹر سے علاج کروانا چاہئے تھا۔

اگلے دن فریدہ نے اس کو ایک ڈاکٹر کا نام بتایا جس کا شہر میں اپنا پرائیویٹ کلینک تھا اس ڈاکٹر کا نام عبدالرسول تھا۔ امتیاز آمنہ کو لے کر اس کے پاس گیا فریدہ بھی ان لوگوں کے ساتھ تھی۔

ڈاکٹر عبدالرسول نے بڑی تفصیل اور توجہ کے ساتھ آمنہ کا معائنہ کیا اور اب تک کے علاج کے بارے میں جاننا چاہا لیکن ان لوگوں کے پاس مریضہ کا کوئی میڈیکل ریکارڈ موجود نہیں تھا۔

ڈاکٹر عبدالرسول نے فوراً ہی کئی ٹیسٹ وغیرہ لکھ کر دیئے اور تاکید کی کہ یہ ٹیسٹ فوراً کروائے جائیں اور ان کی رپورٹوں کے ساتھ دوبارہ اس کے پاس آیا جائے۔ ٹیسٹوں اور ایکسرے وغیرہ میں بہت سارے پیسے خرچ ہوگئے امتیاز گھبرا گیا اس کو تو اس بات کا اندازہ بھی نہیں تھا کہ علاج اتنا زیادہ مہنگا ہوگا لیکن اب تو ایک بار یہ سب کچھ شروع ہوچکا تھا اور پھر فریدہ کا اصرار تھا کہ ڈاکٹر عبدالرسول سے ضرور علاج کروایا جائے کیونکہ وہ بہت لائق اور ہوشیار ڈاکٹر ہے۔

تقریباً ایک ہفتے کے بعد ڈاکٹر عبدالرسول نے آمنہ کی بیماری کی اصل تشخیص کردی آمنہ کو پھیپھڑوں کی ٹی بی تھی اس کے دونوں پھیپھڑے بالکل ناکارہ ہوچکے تھے اور ٹی بی



اپنے آخری مرحلے میں داخل ہوچکی تھی۔ ڈاکٹر عبدالرسول نے امتیاز کو علیحدگی میں سب کچھ صاف صاف بتا دیا اور امتیاز اس کی بات سن کر سناٹے میں آگیا اس کو تو اس بات کا ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ صورت حال اس درجہ ابتر ہوچکی ہے فریدہ یہ سب کچھ سن کر رونے لگی لیکن ان لوگوں نے آمنہ کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

ڈاکٹر نے دوائیں تو دے دی تھیں لیکن ساتھ ہی صاف طور پر ان لوگوں کو یہ بتا دیا تھا آمنہ کے بچنے کے امکانات کم ہیں کیونکہ اس کے دونوں ہی پھیپھڑے چھلنی ہوچکے ہیں بس جب تک زندگی ہے.....

آمنہ اب زیادہ تر وقت بستر پر مردے کی طرح پڑی رہتی وہ سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ ہوگئی تھی۔ آمنہ کی کہانی ختم ہونے والی تھی اور اس کے ساتھ ہی ایک دوسری کہانی نے جنم لینا شروع کردیا تھا۔ یہ فریدہ کی کہانی تھی فریدہ اور امتیاز کی کہانی..... آمنہ نے جلد ہی خود بھی اس بات کو محسوس کرلیا تھا کہ اس کا شوہر فریدہ میں غیر معمولی طور پر دلچسپی لینے لگا ہے اور فریدہ بھی اس کی جانب پوری طرح سے ملتفت ہے اور آمنہ اپنے آپ کو وقت سے پہلے مرتا ہوا محسوس کرنے لگی۔ فریدہ اس کی دوست' ہمدرد اور تیمار دار کی حیثیت سے اس گھر میں آئی تھی اور اب وہ اس گھر کی مالکن بنتی نظر آرہی تھی۔ آمنہ اپنی بے گوشت کی مٹھی بھر ہڈیوں کے ساتھ بڑی تیزی کے ساتھ موت کی طرف بڑھنے لگی' اور بالآخر وہ ایک دن ختم ہوگئی۔ ایک کہانی اپنے انجام کو پہنچی اور دوسری کہانی پوری طرح سے صورت پذیر ہونے لگی۔

آمنہ کی موت کے صرف چند ماہ کے بعد ہی امتیاز نے فریدہ سے شادی کرلی' فریدہ جو ابھی تک مسعود کے لئے خالہ فریدہ تھی۔ اب سوتیلی ماں بن کر اس گھر میں مستقل طور پر آگئی۔ اس وقت مسعود کی عمر تقریباً ساڑھے آٹھ سال کی تھی۔ وہ اچھا خاصا سمجھدار تھا اور ساری صورت حال کو اپنے ذہن کے مطابق سمجھ رہا تھا۔ وہ جان رہا تھا کہ اس کی ماں مرچکی ہے اور اس کے باپ نے دوسری شادی کرلی ہے اور خالہ فریدہ' جو پہلے صرف خالہ فریدہ تھیں اب اس کے باپ کی بیوی اور اس کی سوتیلی ماں ہیں گھر میں سب کچھ کس قدر تیزی کے ساتھ بدل گیا تھا۔ فریدہ نے اس کی ماں کی بہت ساری چیزیں جن میں اس کے کپڑے بھی شامل تھے۔ باہر پھینکوا دی تھیں یا کسی کو دے دی تھیں۔ مرحومہ ٹی بی کی مریضہ تھی۔ احتیاط لازمی تھی۔

مسعود کی زندگی میں اگرچہ بہت کچھ بدل چکا تھا' تاہم اسے کسی مشکل کا سامنا نہیں

کرنا پڑا' کیونکہ وہ پہلے کی طرح اب بھی اپنے باپ کی آنکھوں کا تارا تھا اور فریدہ بھی ا
کا بہت خیال رکھتی تھی۔ اس کی کوشش تھی کہ مسعود کو آمنہ جیسا پیار دے سکے اور ر
رفتہ مسعود آمنہ کو بھولتا جارہا تھا۔

شادی کے ایک سال بعد' جب مسعود کی عمر تقریباً ساڑھے نو سال کی تھی' فریدہ
دو جڑواں بیٹیوں کو جنم دیا۔ پہلے شوہر سے فریدہ کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ پہلی بار ما
تھی۔ اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ تو جیسے ہواؤں میں پرواز کررہی تھی۔ خوش
امتیاز بھی تھا' لیکن اس کی دلی خواہش یہ تھی کہ اس کے ہاں ایک اور بیٹا پیدا ہوتا۔ تا
اس نے دونوں بیٹیوں کو بھی عطیہ خداوندی سمجھ کر قبول کیا۔

بیٹیوں کی پیدائش کے بعد سے ہی گھر کے اخراجات بڑھنے لگے۔ آمنہ مرحومہ کے
دوا علاج پر اور پھر اس کی تجہیز و تکفین اور دیگر رسومات پر پہلے ہی اچھی خاصی رقم صرف
ہوچکی تھی۔ آمدنی میں اضافے کی کوئی سبیل نہیں تھی۔ مہنگائی میں البتہ اضافہ ہوتا جارہا
تھا۔ گھر میں تنگی شروع ہوگئی۔ مگر گھر کسی نہ کسی طرح چل ہی رہا تھا۔

تب اس نے ایک روز اپنے شوہر سے مسعود کے بارے میں بات کی۔ اس نے بہت
سوچ سمجھ کر مسعود کے بارے میں کچھ سوچا تھا۔ اب وہ چاہتی تھی کہ اس کا شوہر اس کے
مشورے پر عمل کرے۔

"مسعود سارا دن اِدھر اُدھر آوارہ پھرتا ہے....." اس نے اس رات اپنے شوہر
سے کہا۔ "تم نے اس کو کہیں اسکول وغیرہ بھی نہیں بھیجا۔ اب تو خیر' وہ کافی بڑا ہوگیا
ہے۔ اس کو....."

"ہم نے اس کو مکتب میں پڑھنے کے لئے بھیجا تھا لیکن وہ وہاں سے بھاگ کھڑا
ہوا۔" امتیاز نے کہا۔ "لیکن ہم اب اپنے چھوٹے کو تو انشاء اللہ ضرور اسکول بھیجیں
گے۔"

"ضرور' انشاء اللہ....." فریدہ نے کہا۔ "لیکن میں مسعود کے بارے میں کہہ
رہی تھی۔ اس کو کسی کام سے کیوں نہیں لگادیتے؟ آخر بارہ سال کا تو وہ ہورہا ہے۔ کیا
کرے گا آگے چل کر؟ کوئی ہنر اگر اس کے ہاتھ میں آجائے گا تو اس کے بھی کام آئے گا
اور اس میں ہمارا اور اس کے چھوٹے بھائی بہنوں کا بھی فائدہ ہوگا۔"

"ہاں' کہتی تو تم ٹھیک ہو۔" امتیاز نے کہا۔ "میں کل ہی خلیل احمد سے بات کروں
گا۔ اس کی درزی کی دکان ہے۔ اگر مسعود وہاں بیٹھ کر کچھ کام سیکھنا شروع کردے



تو....."

"نہیں۔" فریدہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں اس کے بارے میں کچھ
اور ہی سوچ رہی ہوں۔ درزی کے کام میں اسے ابھی کیا ملے گا؟ ایک عرصہ چاہئے کام
سیکھنے کے لئے۔ جب کچھ سیکھ لے گا تب کہیں جاکر کاریگر بنے گا اور کاریگر بننے کے بعد
بھی کیا ضروری ہے کہ برابر کام ملتا رہے؟ میں نے ایک ایسی بات سوچی ہے جس کے نتیجے
میں ہمیں فوری طور پر دس پندرہ ہزار روپے کی رقم ملے اور ملازمت کا بھی بندوبست
ہوسکتا ہے۔"

"اچھا؟" امتیاز نے حیرت اور دلچسپی کے ساتھ کہا۔ "ایسا کون سا کام ہے جس میں
اس کو فوری طور پر دس پندرہ ہزار روپے کی رقم مل جائے گی؟"

"اینٹوں کے بھٹے والے چھوٹے بچوں کو اور لڑکیوں اور عورتوں کو بھی' ملازم رکھتے
ہیں۔" فریدہ نے کہا۔ "وہ لوگ کافی رقم پیشگی کے طور پر دے دیتے ہیں اور پھر یہ رقم
آہستہ آہستہ' آسان قسطوں میں تنخواہ میں سے کٹتی رہتی ہے۔ غفور چاچا کے رشتے
داروں میں ایک بچے نے ابھی حال ہی میں بھٹے میں کام شروع کیا ہے اور بھٹے والوں نے
اس کے والدین کو دس ہزار روپے دیئے ہیں۔"

"ہاں' سنا تو میں نے بھی ہے کہ بھٹے والے کافی بڑی پیشگی رقم دے دیتے ہیں۔"
امتیاز نے سرہلاتے ہوئے کہا۔ "لیکن ان کی شاید کچھ اور شرائط وغیرہ بھی ہوتی ہیں۔"

"لعنت بھیجو شرائط پر۔" فریدہ نے کہا۔ "ذرا یہ سوچو کہ اگر ہمارے پاس آٹھ دس
پندرہ ہزار روپے آگئے تو یہ کتنی بڑی بات ہوگی ان دس ہزار روپوں سے میں کوئی زیور بنوا
کر ڈال دوں گی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی قیمت بڑھتی ہی جائے گی۔ آخر
ہماری دو دو بیٹیاں ہیں۔ ایک وقت آئے گا ہمیں ان کی شادیاں کرنی ہوں گی اور وقت تو
کتنی تیزی سے گزرتا ہے۔ لڑکیاں تو دیکھتے ہی دیکھتے جوان ہوجاتی ہیں....."

"ہاں۔" امتیاز نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "تمہاری بات تو بڑی حد تک صحیح ہے۔
اکٹھی رقم مل جائے گی تو بہت سارے کام ہوسکتے ہیں۔ زیور بھی بنوائے جاسکتے ہیں۔"

"اب تم یہ دیکھو نا کہ تم اکیلے کمانے والے ہو۔" فریدہ نے کہا۔ "پہلے تو لوگ کم
تھے۔ کام چل جاتا تھا لیکن اب ماشاء اللہ چار چار بچے ہیں۔ خرچے بڑھ رہے ہیں۔ اب
اگر ایک سے دو کمانے والے ہوجائیں گے تو سب کو ہی آسانی ہوجائے گی اور خود مسعود
کے لئے بھی یہ اچھا ہوگا۔ سارا دن اِدھر اُدھر وقت برباد کرنے کے بجائے' کچھ کام دھندا

کرے گا۔ چار پیسے کمائے گا تو خود اس کے اپنے ہی کام آئیں گے۔"

"اچھا' میں کسی بھٹے والے سے بات کروں گا۔" امتیاز نے کہا۔ "شاید اسے کہیں کام مل جائے۔"

"تمہیں کہیں اِدھر اُدھر بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے۔" فریدہ نے کہا۔ "میں غفور چاچا سے بات کروں گی۔ وہ بندوبست کروا دیں گے۔ انہوں نے ہی اپنے اس رشتے دار لڑکے کا بھی بندوبست کروایا ہے۔ مجھے تو بس تمہاری رضامندی چاہئے تھی اگر تم راضی ہو تو میں غفور چاچا سے بات کئے لیتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے' تم ان سے بات کرلو۔" امتیاز نے کہا۔ "مگر مسعود وہاں کام کرنے پر راضی ہوگا؟"

"ارے..... راضی نہیں ہوگا تو پھر کیا کرے گا؟" فریدہ نے قدرے غصے کے ساتھ کہا۔ "آخر کچھ نہ کچھ تو اس کو کرنا ہی ہے۔ کیا ساری زندگی یوں ہی اِدھر اُدھر دھکے کھاتا پھرے گا؟ تم اس سے کہو کہ کچھ کام کرے' اپنے باپ کا ہاتھ بٹائے آخر وہ جوان ہو رہا ہے اور تم آہستہ آہستہ بوڑھے ہوتے جاؤ گے تو ابھی سے اس کا بندوبست کرو۔"

"اری نیک بخت' تُو مجھے ابھی سے بوڑھا کئے دے رہی ہے۔" امتیاز نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بوڑھا تو ایک نہ ایک دن سب کو ہونا ہی ہے....." فریدہ نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "اور عقل مند ہوتے ہیں وہ لوگ جو بوڑھے ہونے سے پہلے ہی اپنے بڑھاپے کا انتظام کرنا شروع کردیتے ہیں۔"

اگلے چند روز میں فریدہ نے اپنے غفور چاچا کے ذریعے حاجی مدد علی قریشی سے مسعود کا معاملہ طے کرادیا۔ فریدہ' غفور چاچا کے ساتھ خود حاجی مدد علی قریشی سے ملاقات کرنے گئی تھی' اس نے غفور چاچا کی موجودگی میں سارے معاملات طے کر لئے تھے پندرہ ہزار روپے کی رقم پیشگی طے پائی تھی اور دیگر بہت سی شرائط' جن کے بارے میں فریدہ نے سوچنا بھی گوارا نہیں کیا۔ اصل بات تو یہ تھی کہ اس کو پندرہ ہزار روپے کی رقم پیشگی مل رہی تھی۔

اگلے روز امتیاز' مسعود کو اپنے ساتھ لے کر بھٹے پر گیا۔ فریدہ بھی ساتھ تھی۔ حاجی مدد علی قریشی نے مسعود کو دیکھا اور اس کا اس طرح سے جائزہ لیا جس طرح قصائی کسی بکرے کو خریدنے سے پہلے اس کے تن و توش کا اور اس کے جسم کے اندر موجود گوشت



کی مقدار کا جائزہ لیتا ہے۔ اس نے اس بارہ سالہ نو عمر لڑکے کو پسند کیا اس کے ہاتھ پیروں میں جان تھی اور وہ کام کر سکتا تھا۔

اگلے روز سے مسعود نے بھٹے پر کام کرنا شروع کردیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی آزادی اور آزاد روی کی زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔ اب وہ مشقت کے ایک ایسے حصار میں جکڑ گیا تھا جس میں سے اپنے آپ کو چھڑانا اس کے لئے بہت مشکل تھا۔ امتیاز کو پندرہ ہزار روپے دے دیئے گئے اور اس سے ایک ایسی دستاویز پر انگوٹھا لگوایا گیا جس کی تحریر کے ایک لفظ کو بھی وہ نہیں پڑھ سکتا تھا۔

پہلے ہی دن جب مسعود نے فخرو کے ایک زور دار تھپڑ کو اپنے گال پر محسوس کیا جس سے اس کا پورا گال جھنجھنا اٹھا تھا' تو اس کو بے ساختہ مولوی مشرف حسین یاد آگئے جن کی قمچیوں کی مار نے اسے مکتب سے بھاگنے پر مجبور کردیا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کو یہ محسوس ہونے لگا کہ فخرو تو مولوی مشرف کے مقابلے میں کہیں زیادہ خراب آدمی ہے۔ وہ لڑکوں کو بلاوجہ اور بے تحاشا مارنے کے ساتھ ساتھ' ان کو بُری بری اور شرمناک گالیاں بھی دیتا ہے کسی بھی لڑکے کو ایک منٹ کے لئے بھی خالی نہیں رہنے دیتا کہ وہ اپنے کان یا ناک کو ہی کھجا سکیں۔ وہ تو بس یہ چاہتا تھا کہ لڑکے مشینوں کی طرح کام کرتے رہیں اور اینٹیں ڈھالتے رہیں جو اس کے مالک حاجی سید مدد علی قریشی کے لئے سونے کی کان بنتی جائیں۔

ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ مسعود کو اس جگہ سے' اس کام سے' ان لوگوں سے جو اس سے کام لیتے تھے' نفرت ہوتی گئی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے والدین بلکہ فی الحقیقت اس کی سوتیلی ماں نے حاجی مدد علی سے پندرہ ہزار روپے لئے ہیں اور اس رقم کے بدلے ایک نامعلوم عرصے کے لئے اس کو حاجی مدد علی قریشی کا غلام بنا کر رکھ دیا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اس غلامی سے نجات آسان نہیں تھی وہ اس جگہ کو اس کام کو اپنی مرضی سے چھوڑ نہیں سکتا تھا کیونکہ اس کے والدین اس کی محنت کے عوض پیشگی رقم لے چکے تھے یہ محنت تو اب اس کو کرتے ہی رہنا تھی۔

گھر سے بھی اس کا دل بالکل اچاٹ ہوگیا تھا اب تک تو وہ گھر میں نوکروں کی سی زندگی گزار رہا تھا اور اب اس کی سوتیلی ماں نے اس کو گھر سے دور کرکے جبری اور اذیت ناک مشقت کے آزار میں مبتلا کردیا تھا۔ اس کا باپ تو اب فریدہ کی کوئی بھی بات ٹال نہیں سکتا تھا وہ تو پورے طور سے جیسے فریدہ کی مٹھی میں تھا اور مسعود کو اب بیل کی طرح

کام کرنا تھا تاکہ اس کے چھوٹے بھائی بہن، نہیں اس کی سوتیلی ماں کے بچے آرام اور فراغت کی زندگی گزار سکیں۔

بھٹے میں جو اور دوسرے لڑکے کام کرتے تھے ان میں سے ناصر کے ساتھ مسعود کی جلد دوستی ہوگئی۔ مسعود کو وہ سیدھا سادہ معصوم اور اللہ میاں کی گائے جیسا ناصر بہت اچھا لگا جو بے چارہ چپ چاپ سر جھکائے کام کرتا رہتا تھا اور فخرو کی گالیاں، تھپڑ اور لاتیں کھاتا رہتا تھا۔ ویسے تو دوسرے لڑکے بھی زبان سے اف نہیں کرتے تھے لیکن ان کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگتی تھیں لیکن ناصر کی تو آنکھیں ہی جھکی رہتی تھیں۔

جلدی ہی ان دونوں میں بات چیت شروع ہوگئی جو دھیرے دھیرے گہری دوستی کی شکل اختیار کرتی گئی دونوں نے ایک دوسرے کو اپنے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ دونوں کے حالات کافی ملتے جلتے تھے غربت، تنگ دستی، مظلومیت اور بے چارگی کی تقریباً ساری ہی داستانیں ایک دوسرے سے بہت ملتی جلتی ہوتی ہیں۔ بس کرداروں اور واقعات کی ترتیب وغیرہ میں کچھ تھوڑا بہت فرق ہوتا ہے۔

بھٹے میں کام کے دوران تو وہ دونوں آپس میں شاذ و نادر ہی باتیں کرپاتے تھے کیونکہ چیل کی سی نگاہ رکھنے والا فخرو ہر وقت کسی بھوت کی طرح ان سب لوگوں پر مسلط رہتا تھا اور اس کے خوف سے تو وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے بھی ڈرتے تھے۔ یہ ایک ایسا خوف تھا جس میں خوف سے زیادہ نفرت شامل تھی۔ البتہ کھانے کے مختصر سے وقفے کے دوران عام طور سے وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوتے تھے اور اس وقت انہیں آپس میں کچھ بات چیت کا موقع مل جاتا تھا۔ اس کے بعد جب کام ختم کرکے سب لوگ گھر جانے لگتے تھے تو اس وقت اکثر مسعود اور ناصر ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے تھے ان کے گھر بھی بھٹے سے ایک ہی سمت میں واقع تھے اور انہیں خاصی دور تک ایک دوسرے کے ساتھ چلنے کا موقع مل جاتا تھا۔

بھٹے کے لئے، بھٹے میں کی جانے والی جبری مشقت کے لئے اور فخرو کے لئے صرف ان دونوں کے دلوں میں ہی نہیں سارے ہی مجبور اور بے بس لڑکوں کے دلوں میں نفرت تھی۔ یہ ان بچوں کے کھیلنے کودنے، لکھنے پڑھنے، اسکول جانے، بھاگنے دوڑنے، ہنسنے کھلکھلانے، تتلیوں کے پیچھے دوڑنے، چیخنے چلانے شور مچانے، فضا میں چھلانگیں مارنے اور ضد کرنے کے دن تھے لیکن ان کی زندگیوں سے ان ساری چیزوں کو خارج کرکے انہیں صبح سے شام تک دہکنے والی جبری مشقت کی بھٹی میں جھونک دیا گیا تھا۔ کھلونے



انہوں نے صرف دکانوں میں سجے ہوئے دیکھے تھے۔ کتابیں، کاپیاں، اور قلم ان کے ہاتھ کی رسائی سے بہت دور تھے۔ اسکول ان کے لئے علاقہ ممنوعہ تھے۔ ان کی زندگی تو مٹی، گارے، آگ، تھپڑ، لات، گالی اور جان توڑ محنت سے عبارت تھی۔ ان کے ننھے منے وجود اس سارے بوجھ سے لدے ہوئے اس کے نیچے دبے ہوئے بری طرح کراہتے رہتے تھے جو ان کی بساط سے کہیں زیادہ تھا ان سارے بچوں کی زندگیوں سے ان کے بچپن کو نوچ کر، الگ کرکے، پھینک دیا گیا تھا اور ان کی شخصیتیں بری طرح شکست و ریخت کا شکار ہو رہی تھیں اور ان کی ذہنی دنیا مسخ ہوتی جا رہی تھی۔

"مجھے تو یہاں کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔" ایک روز مسعود نے بھٹے سے واپس آتے وقت، راستے میں ناصر سے کہا۔ "کتنا کام کرنا پڑتا ہے اس کے باوجود وہ کمینہ فخرو کس بری طرح مارتا ہے کتنی چوٹ لگتی ہے اس کے مارنے سے اور ہر وقت سب کو مارتا رہتا ہے۔"

"مجھے تو فخرو بہت ہی برا لگتا ہے۔" ناصر نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔ دوسرے لڑکوں کے سامنے تو وہ فخرو کے بارے میں زبان کھولتے ہوئے ڈرتا تھا اگر کسی نے اس سے شکایت کر دی تو..... لیکن مسعود پر وہ بھروسہ کر سکتا تھا۔ مسعود تو اس کا اپنا دوست تھا اور مسعود خود بھی تو فخرو کی شکایت کر رہا تھا۔ "میرا تو بس یہ جی چاہتا ہے کہ فخرو مرجائے کسی دن ایسا ہو کہ ہم لوگ بھٹے پر کام کرنے کے لئے صبح کے وقت آئیں اور یہاں آکر معلوم ہو کہ کل رات کو فخرو مرگیا....."

"وہ اتنی آسانی سے مرنے والا نہیں ہے۔" مسعود نے ہنستے ہوئے کہا..... "وہ تو بڑا ڈھیٹ ہے۔ کیوں مرے گا بھلا وہ؟ وہ تو اس صورت میں مرے گا جب ہم سب اس کو اٹھا کر بھٹی میں جھونک دیں یا اینٹیں مار مار کر اس کا سر پھاڑ دیں....."

"پھر تو ہم سب جیل چلے جائیں گے۔" ناصر نے کہا۔ "ایسا کام کرنے والوں کو تو پولیس پکڑ لیتی ہے اور انہیں جیل میں بند کر دیتی ہے۔ پھر انہیں پھانسی پر چڑھا دیا جاتا ہے۔"

"ہاں....." مسعود نے بزرگانہ انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ بہرحال وہ ناصر سے بڑا تھا اور اس کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنے بڑے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی کسی بات کی تصدیق یا تردید کرے۔ "ہم لوگ ایسا نہیں کرسکتے۔ ہمیں تو بس وہیں رہنا اور اس طرح کام کرنا ہوگا جب تک کہ ہم کوئی دوسرا راستہ نہ تلاش کرلیں۔"

"دوسرا راستہ؟" ناصر نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "دوسرا راستہ کون سا ہو سکتا ہے؟ ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

"دیکھو نا' سیدھی سی بات ہے۔" مسعود نے اس کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "ہم لوگوں کے گھر والوں کو تو ہماری فکر ہے ہی نہیں۔ انہوں نے تو ہمارے کام کے بدلے حاجی سے پیسے لے کر ہمیں اس کے ہاتھوں بیچ دیا ہے اور وہ لوگ اب ہمیں اس وقت تک آزاد نہیں کرا سکتے جب تک کہ وہ ساری رقم حاجی کو واپس نہ کر دیں اور وہ ایسا کیوں کریں گے بھلا؟ اس کا طریقہ تو صرف یہی ہے کہ ہم خود یہاں سے چلے جائیں۔"

"چلے جائیں؟" ناصر نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ "مگر کہاں؟ کہاں چلے جائیں؟ حاجی تو ہم کو گردن سے پکڑ کر بلوائے گا۔"

"تو گھر میں بیٹھا کون ہو گا جو حاجی کے بھٹے پر دوبارہ آئے گا؟" مسعود نے کہا۔

"پھر؟" ناصر اب بھی مسعود کی بات نہیں سمجھ رہا تھا۔ "پھر ہم کہاں بیٹھے ہوں گے؟"

"کسی ایسی جگہ' جس کا علم ہم دونوں کے علاوہ اور کسی کو نہیں ہو گا۔" مسعود نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "کسی کو نہیں معلوم ہو گا کہ ہم کہاں ہیں....."

اسی وقت سامنے سے مراد آتا ہوا نظر آ گیا اور وہ بھی ان دونوں کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ مسعود اور ناصر کے درمیان ہونے والی گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ مراد کی موجودگی میں ایسی کوئی بات نہیں کی جا سکتی تھی۔ کچھ دیر کے بعد مسعود اپنے گھر کی طرف مڑ گیا اور مراد ناصر کے ساتھ ساتھ اس کے گھر تک آیا..... پھر گھر کے باہر سے ہی واپس چلا گیا۔ راستے میں وہ ناصر سے مسعود کے بارے میں باتیں کرتا رہا تھا اور ناصر نے اس کو بتایا تھا کہ مسعود بہت اچھا لڑکا ہے اور اس کی مسعود کے ساتھ بہت دوستی ہے مراد نے اس سے پہلے بھی ناصر کو اکثر مسعود کے ساتھ دیکھا تھا۔

اس رات ناصر کے ذہن میں بڑے زور کا خلفشار مچا رہا۔ مسعود نے کچھ ایسی باتیں کہہ دی تھی جس کے بارے میں سوچ سوچ کر ناصر کے دل و دماغ اور سارے بدن میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔ پوری بات تو ہو نہیں سکی تھی معلوم نہیں مسعود اور کیا کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مراد کی آمد کی وجہ سے بات ادھوری رہ گئی تھی لیکن جو کچھ جتنا کچھ مسعود نے کہا تھا وہ ناصر کو حواس باختہ کرنے اور اس کے دل و دماغ میں آگ لگانے کے لئے کافی تھا۔ اس سے پہلے تو اس نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ بھٹے کے کام کو چھوڑ کر بھاگا بھی



جا سکتا ہے۔ بھلا یہ کس طرح ممکن تھا؟ مگر اب اس کے ذہن میں کچھ نئے ان جانے افق روشن ہو رہے تھے۔ زندگی کی کچھ نامعلوم' اجنبی' تحیر انگیز' تجسس خیز شکلیں دور سے اپنی جھلک دکھا رہی تھیں۔

اس کے بعد کئی دن تک ناصر کو مسعود سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ دوپہر میں کھانے کے وقفے کے دوران تو اس قسم کی بات کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ صرف واپسی پر راستے میں بات کی جا سکتی تھی لیکن اگلے ہی دن سے جاوید نامی ایک لڑکا ان دونوں کے ساتھ آنے لگا تھا۔ جاوید کچھ دنوں کے لئے اپنی خالہ کے گھر رہ رہا تھا۔ کیونکہ اس کے والدین دوسرے شہر گئے ہوئے تھے۔ جاوید کی خالہ کا مکان مسعود کے مکان کے قریب ہی تھا۔

ناصر' مسعود سے بات کرنے کے لئے بے قرار تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ مسعود کے دماغ میں کیا ہے اور وہ اسے کس قسم کی زندگی کی نوید دے رہا ہے۔

مسعود سے اس دن کی مختصر اور نامکمل سی بات چیت کا ایک نتیجہ یہ نکلا تھا کہ ناصر کو یہ سب کچھ جو کہ پہلے ہی برا لگتا تھا' اب اور بھی زیادہ برا لگنے لگا تھا۔ بھٹہ اسے ایک دہکتے ہوئے جہنم کی طرح لگنے لگا تھا اور فخرو نے کسی خوف ناک اور دہشت انگیز آسیب کی شکل اختیار کر لی تھی جو اپنے خونی پنجے اور جبڑے کھولے ہوئے ہر وقت اس پر جھپٹنے کے لئے تیار رہتا تھا اور اب تو اس کو اپنا گھر بھی برا لگنے لگا تھا۔ اماں بھی بری لگنے لگی تھیں۔ اماں نے ہی تو اس کو وہاں بھٹے میں کام کرنے کے لئے بھیج دیا تھا جہاں فخرو اس قدر مارتا تھا اور اس نے جب بھی اماں سے فخرو کی شکایت کی تو اماں نے الٹی فخرو کی ہی طرف داری کی تھی اور یہ تک کہا تھا کہ وہ تو استاد ہے سکھانے کے لئے مارتا ہے۔ بھلا سکھانے کے لئے کوئی اس طرح مارتا ہے؟

سب کچھ برا تھا بہت برا تھا اور دور بہت دور کہیں سے کوئی نامعلوم دنیا' کوئی اَن جانی اور اَن دیکھی دنیا' چپکے چپکے اشارے کر کے اس کو اپنی طرف بلا رہی تھی۔ وہ اس دنیا کے بارے میں سوچ سوچ کر کانپ اٹھتا تھا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی اور بھی بہت سی باتیں تھیں جن کے بارے میں سوچ کر وہ کانپ اٹھتا تھا۔ اماں کیا کریں گی؟ حاجی مدد علی قریشی تو اپنے پیسے مانگے گا۔ اماں اس کو پیسے کہاں سے دیں گی؟

لیکن یہ سوالات اس کے ذہن میں اپنی مبہم اور غیر واضح صورت میں نمودار ہوتے

تھے اور کوئی واضح اور حتمی شکل نہیں اختیار کر پاتے تھے۔ اس کا ذہن الجھ کر رہ جاتا تھا۔ وہ روز موقع کی تلاش میں رہتا تھا کہ مسعود سے بات کر سکے۔ مگر اب تک اسے موقع نہیں مل سکا تھا جاوید روزانہ شام کو ان دونوں کے ساتھ چل پڑتا تھا۔

آخر خدا خدا کر کے جاوید کے گھر والے واپس آئے اور جاوید اپنے گھر گیا ان لوگوں کے راستے ایک دوسرے سے مختلف ہو گئے۔ اس روز شام کو وہ دونوں کئی دن کے بعد تنہا جا رہے تھے۔

"تم اس دن کیا کہہ رہے تھے مسعود؟" ناصر نے بھٹے سے باہر نکلنے کے فوراً بعد اس موضوع کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ "تم کیا کہہ رہے تھے؟ ہم یہاں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے کیا کر سکتے ہیں؟"

"ہم یہاں سے بھاگ سکتے ہیں....." مسعود نے بہت دھیمی آواز میں محتاط نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہم چپکے سے یہاں سے جا سکتے ہیں کسی کو بھی ہمارے جانے کی خبر نہیں ہوگی اور ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔"

"مم..... مگر..... یہ کس طرح ممکن ہے....." ناصر نے وضاحت طلب نظروں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہم لوگ یہاں سے کس طرح جا سکتے ہیں؟ ہمارے گھر تو یہیں ہیں۔ کسی دوسری جگہ تو ہمارا کوئی گھر نہیں ہے؟"

"تو کیا ہوا؟" مسعود نے جواب دیا۔ "آدمی کیا ساری زندگی ایک ہی گھر سے چمٹا بیٹھا رہتا ہے؟ کیا وہ گھر بدل نہیں سکتا؟ کیا وہ اپنے لئے کوئی نیا گھر تلاش نہیں کر سکتا؟"

"مگر..... کیسے؟" ناصر کا تجسّس ہر لمحہ بڑھ رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں خوف کی نامعلوم لہریں بھی اٹھ رہی تھیں۔

"اپنی محنت سے' اپنے کام سے۔" مسعود نے جواب دیا۔ "یہاں تو یہ ہو رہا ہے کہ ہم محنت بھی کرتے ہیں اور جوتے اور گالیاں بھی کھاتے ہیں اور ہمیں کتنے تھوڑے سے پیسے ملتے ہیں اور وہ بھی ہمارے ہاتھ میں نہیں آتے۔ دوسری جگہ ہم محنت کریں گے کام کریں گے تو اس کا فائدہ ہم کو ملے گا۔"

"مگر ہم جائیں گے کہاں؟" ناصر نے خوف آمیز تجسّس کے ساتھ پوچھا۔

"کراچی۔" مسعود نے جواب دیا۔

"کراچی؟" ناصر کی زبان سے بے ساختہ نکلا اور اس کے ساتھ ہی اس کے رگ و پے میں سنسنی' سرور' تجسّس' تحیر اور خوف کی ایک ملی جلی لہر اٹھی جو اس کے سارے



وجود پر چھاتی چلی گئی۔ "کراچی!" اس لفظ میں ایک عجیب جادو تھا۔ یہ تو جیسے کوئی طلسماتی شہر تھا جس کو اب تک ناصر صرف خوابوں میں ہی دیکھ سکتا تھا۔ اس نے اس شہر کا کتنا نام سنا تھا اور اس شہر سے وابستہ ایسی ایسی محیر العقول باتیں سنی تھیں جن پر یقین کرنے کو اس کا جی نہیں چاہتا تھا۔ کراچی کی باتیں سن کر تو اسے یہ شہر انسانوں کی نہیں کسی اور ہی مخلوق کی بستی معلوم ہوتی تھی۔

اس کی اپنی بستی میں کئی ایسے لوگ موجود تھے جو کراچی آتے جاتے رہتے تھے اور کچھ تو ایسے تھے جو اب کراچی میں ہی رہتے اور کام کرتے تھے۔ ان لوگوں نے اپنی آبائی بستی اور شہر کو مکمل طور پر تو نہیں چھوڑا تھا لیکن انہوں نے مستقل سکونت کراچی میں اختیار کر رکھی تھی' البتہ کبھی کبھار وہ آبائی علاقے کا بھی چکر لگا لیتے تھے جہاں ان کے قدیم گھر اور عزیز رشتہ دار وغیرہ موجود تھے۔ کس قدر بدل گئے تھے کراچی میں رہنے والے یہ لوگ! ناصر کو وہ لوگ بہت مختلف دکھائی دیتے تھے۔ کراچی جانے کے بعد تو جیسے ان لوگوں کی ہر چیز ہی بدل گئی تھی۔ ان کے عادات و اطوار بدل گئے تھے۔ ان کے رہنے سہنے' چلنے پھرنے' اٹھنے بیٹھنے کا ڈھنگ بدل گیا تھا اور تو اور ان کی زبان بدل گئی تھی۔ زبان کا لب و لہجہ بدل گیا تھا اور یہ لوگ جب باتیں کرتے تو بسا اوقات ان کی زبان سے ایسے نامانوس اور اجنبی الفاظ سننے کو ملتے جن کا ناصر کو مطلب ہی نہیں معلوم تھا۔ ایک بار مقصود چاچا کا بیٹا رئیس جو کراچی میں ہی پیدا ہوا تھا اور اس کے والدین پچھلے دس سال سے کراچی میں ہی بس گئے تھے۔ ناصر سے باتیں کرتے ہوئے اسے بتا رہا تھا کہ وہ کراچی میں کئی بار اسٹیمر میں بیٹھ چکا ہے اور ایک بار تو وہ ایک لانچ میں بھی بیٹھا تھا۔ رئیس ناصر سے کوئی دو سال بڑا تھا اور جب ناصر کے پوچھنے پر رئیس نے بڑے فخر اور ایک خاص بزرگانہ شان کے ساتھ اس کو یہ بتایا کہ اسٹیمر اور لانچ کیا چیزیں ہوتی ہیں اور یہ کس طرح سمندر کے سینے کے اوپر چلتی ہیں' تو ناصر بہت حیران ہوا تھا اور رئیس سے ان چیزوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی کوشش کرتا رہا تھا۔

"وہاں تو بڑی بڑی عمارتوں میں لوگ زینے ہی نہیں چڑھتے۔" رئیس نے مفکرانہ انداز میں اس کو بتایا۔ "اتنی اونچی اونچی عمارتیں ہیں کہ آدمی گھنٹوں زینہ ہی چڑھتا رہے اور تھکن سے اس کی ٹانگیں ٹوٹ جائیں۔"

"زینہ نہیں چڑھتے؟" ناصر نے حیرت سے پوچھا۔ زینہ نہیں چڑھتے تو پھر اوپر کس طرح جاتے ہیں؟"

"لفٹ کے ذریعے۔"

رئیس نے بڑی بے نیازی کے ساتھ جواب دیا اس انداز میں گویا اس نے یہ فرض کرلیا تھا کہ ناصر لفٹ کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔

"لفٹ؟" ناصر نے رک رک کر پوچھا۔ "وہ..... وہ..... کیا ہوتی ہے؟"

"ایک چھوٹا سا کمرہ ہوتا ہے۔" رئیس نے وضاحت کی۔ "بجلی سے چلتا ہے اور جانے والے لوگ اس کے اندر کھڑے ہو جاتے ہیں اور پھر ایک بٹن کو دبا دیتے ہیں اور پورے کا پورا کمرہ مع سارے آدمیوں کے خود بخود اوپر اٹھتا چلا جاتا ہے۔ ہر منزل پر رک جاتا ہے اور پھر سب سے اوپری منزل پر پہنچنے کے بعد دوبارہ نیچے کی طرف واپس آجاتا ہے۔"

ناصر نے لفٹ کبھی نہیں دیکھی تھی' اس کی بستی میں تو پکے مکانات بھی بہت ہی کم تھے' بھلا لفٹ کا وہاں کیا گزر تھا؟ وہ رئیس کی زبانی اس طلسمی کمرے کے بارے میں سن کر بہت حیران ہوا تھا جو اتنے بہت سارے آدمیوں کو لے کر خود بخود اوپر اٹھتا تھا اور پھر واپس نیچے بھی آجاتا تھا۔

رئیس اس کے ساتھ کراچی کے بارے میں بہت سی باتیں کر رہا تھا اور ناصر اس کی باتوں کو تحیر آمیز شدت اور استعجاب کے ساتھ سنتا جا رہا تھا۔ کاش اس کو بھی کبھی ان ساری عجیب و غریب چیزوں کو دیکھنے کا موقع ملے..... کاش وہ بھی کبھی کراچی کی جادو نگری میں جا سکے..... اس کے دل میں اب آرزو مندی کی لہریں گھٹتی بڑھتی رہتیں۔

اور اب..... اب مسعود اس سے کراچی چلنے کے بارے میں کہہ رہا تھا۔ ناصر کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کراچی..... کیا وہ بھی کراچی جا سکتا ہے؟ کراچی جہاں سنا ہے سمندر ہے جس میں پورے شہروں جیسے جہاز چلتے ہیں۔ جہاں اتنی اونچی اونچی عمارتیں ہیں کہ ان کو دیکھنے سے سر سے ٹوپی گر جاتی ہے..... صرف چند لمحوں کے اندر اندر اس کے دل و دماغ میں خیالات کا ایک زبردست ریلا آیا اور اس کو بہاتا ہوا کہاں سے کہاں لے گیا اور پھر جلد ہی وہ اپنی دنیا میں واپس لوٹ آیا۔

"ہم کراچی کیسے جا سکتے ہیں مسعود؟" اس نے اپنے قدموں کی رفتار دھیمی کر دی وہ مسعود سے زیادہ سے زیادہ باتیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ مسعود کے دماغ میں کیا ہے اور کیا واقعی کراچی جانے اور اس عظیم شہر کو دیکھنے کا وہ خواب جو اس نے ہمیشہ بہت



ڈرتے ڈرتے دیکھا تھا' پورا ہو سکتا تھا۔

"آؤ..... وہاں چبوترے پر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔" مسعود نے سامنے والے ایک کھنڈر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ یہ جگہ کسی زمانے میں کوئی پکا مکان ہوا کرتی تھی' لیکن اب وہاں سب کچھ ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کے ڈھیر تھے اور ان کے قریب بس ایک چبوترہ سلامت رہ گیا تھا۔ وہ بھی پورا نہیں تھا۔ چبوترے کا محض ایک حصہ سلامت تھا' باقی سب کچھ ٹوٹ کر ختم ہو گیا تھا۔

وہ دونوں اس ٹوٹے ہوئے چبوترے پر بیٹھ گئے۔

"ہم اگر اسی طرح اس بھٹے میں کام کرتے رہے تو وہ شیطان کا بچہ فخرو مار مار کر ہماری چمڑی ادھیڑتا رہے گا۔" مسعود نے وہاں بیٹھنے کے بعد ٹھہری سنبھلی ہوئی' گہری آواز میں رک رک کر کہنا شروع کیا۔ "وہ ہمیں مارتے مارتے مار ڈالے گا اور کسی کو ہماری فکر نہیں ہوگی۔ کس کو ہماری فکر ہے؟ اور کوئی ہماری فکر کر کے کیا کر سکتا ہے؟ ہمارے گھر والے اگر یہ چاہیں بھی کہ ہمیں وہاں سے ہٹا لیں تو ان کے لئے یہ آسان نہیں ہے۔ انہیں وہ رقم واپس کرنی ہوگی جو انہوں نے حاجی مدد علی قریشی سے لی ہے۔ اس لئے ہمیں اپنا بندوبست خود ہی کرنا ہوگا۔ ہم لوگ کب تک یہاں اپنے آپ کو تباہ و برباد کرواتے رہیں گے؟ یہ بھٹے والے..... یہ تو ہم کو کھا جائیں گے....."

"لیکن ہم..... جا کیسے سکتے ہیں مسعود؟" یکایک ناصر کے دل میں اپنی ماں کے لئے ہمدردی اور محبت کا ایک گہرا جذبہ ابھر آیا۔ "میری ماں نے دس ہزار روپے لے رکھے ہیں حاجی سے اگر میں یہاں سے چلا گیا تو پھر..... پھر کیا ہوگا؟ اماں وہ رقم کہاں سے ادا کریں گی؟ اس میں سے پانچ ہزار روپے تو پہلے ہی ابا لے کر بھاگ گئے تھے اور ان کا آج تک پتہ نہیں چلا۔ اب اگر میں بھی چلا گیا تو پھر کیا ہوگا؟ حاجی مدد علی قریشی تو اماں سے رقم مانگے گا۔ ماں بے چاری کیا کریں گی؟"

"انہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" مسعود نے بڑے اعتماد اور اطمینان کے ساتھ جواب دیا۔ "دیکھو ناصر ہم لوگ اگر ساری زندگی بھی حاجی کے بھٹے میں کام کرتے رہیں گے تو قرض کی وہ رقم کبھی بھی ادا نہیں ہوگی جو ہمارے والدین نے حاجی سے لے رکھی ہے یہ لوگ حساب میں ایسا الٹ پھیر کرتے ہیں کہ آدمی کو پاگل بنا ڈالتے ہیں۔ ہم لوگ اس طرح کام کرتے رہیں گے اور حاجی کی پوری رقم کبھی بھی واپس نہیں کر سکیں گے' اس کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ہم حاجی کے بھٹے پر کام کرنا ہی چھوڑ

دیں، کسی دوسری جگہ کام کریں اور اس طرح حاجی کا قرض اتار دیں۔"

"یعنی؟ کس طرح.....؟" ناصر نے اس کی بات کو پورے طور پر نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"ارے بھئی، دوسری جگہ کام کرکے اور کس طرح؟" مسعود نے کہا۔ "دیکھو نا جب تک سیالکوٹ میں رہیں گے تب تک ہم حاجی مدد علی قریشی کے بھٹے کے علاوہ کہیں کام نہیں کرسکتے۔ حاجی تو ہمیں اس وقت بھٹے سے ہلنے نہیں دے گا، دوسری جگہ کام ہم صرف اس صورت میں کرسکتے ہیں کہ اس شہر سے ہی چلے جائیں اور وہاں جا کر کام کریں۔ نہ حاجی کو ہمارے ٹھکانے کا علم ہوگا اور نہ وہ ہم کو وہاں آکر پکڑ سکے گا اور ہم اطمینان سے کام کرتے رہیں گے، پھر جب ہمارے پاس قرضے کی رقم کے برابر پیسے جمع ہو جائیں گے تو ہم یہ رقم حاجی کو ادا کریں گے، قصہ ختم..... اس کے بعد ہم آزاد..... ہمیشہ کے لئے..... اور ہمارے گھر والوں کو بھی قرض سے چھٹکارا مل جائے گا۔"

تیرہ سالہ مسعود کا ذہن اپنے طور پر بڑی ایمانداری کے ساتھ منصوبہ بندی کر رہا تھا اور وہ ایسی منصوبہ بندی کر رہا تھا جس سے وہ اپنی پوری طرح تسلی کر سکتا تھا، اپنے آپ کو مکمل طور پر مطمئن کر سکتا تھا، وہ بڑی صاف دلی کے ساتھ یہ سب کچھ سوچ رہا تھا اور اس کو یقین تھا کہ اس کے اور ناصر کے مسائل کا حل اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ وہ مہینوں سے اس قسم کی باتیں سوچ رہا تھا اور خیالات کے جو تانے بانے بُن رہا تھا ان میں کہیں بھی یہ بات شامل نہیں تھی کہ وہ اپنے گھر والوں کو دھوکا دینے کی یا انہیں دیدہ و دانستہ آزار پہنچانے کی کوشش کر رہا ہے۔

اب وہ یہی ساری باتیں ناصر کو بھی سمجھا رہا تھا، بالکل اس انداز میں جس میں اس نے خود ان باتوں کو سمجھا تھا..... وہ ناصر کو یہ سمجھا رہا تھا کہ یہاں سے بھاگ کر کہیں اور چلنے کی صورت میں وہ لوگ اپنے گھر والوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔

"ہم کراچی جا کر کام کریں گے پیسہ کمائیں گے اور حاجی کا قرض ادا کردیں گے۔" اس نے کہا۔ "دیکھو نا، جب کام ہی کرنا ٹھہرا تو پھر اس طرح کام کیوں نہ کریں کہ حاجی کے چنگل سے چھٹکارا مل جائے اور فخرو کی گالیوں اور تھپڑوں سے بھی جان چھوٹ جائے۔"

"ہاں..... یہ بات تو ٹھیک ہے مسعود مگر..... کیا ہم کراچی جا کر کام کر سکیں گے؟ میرا مطلب ہے ہمیں وہاں کام ملے گا؟ مقصود چاچا کا بیٹا رئیس ایک بار مجھے یہ بتا رہا تھا کہ کراچی میں اینٹوں کے بھٹے نہیں ہوتے کیونکہ وہاں مکانات اینٹوں سے نہیں بنتے



وہاں کے مکانات ریت اور سیمنٹ کی بنی ہوئی بہت بڑی بڑی اینٹوں سے بنائے جاتے ہیں جنہیں وہاں کے لوگ بلاک کہتے ہیں۔"

"کراچی میں اینٹوں کے بھٹے نہیں ہوتے۔" مسعود نے کہا۔ "مجھے معلوم ہے وہاں بھٹے نہیں ہوتے تو پھر اس سے کیا؟ نہ ہوں، اینٹوں کے بھٹے کے کام کے علاوہ دنیا میں کوئی اور کام ہی نہیں ہے کیا؟"

"مگر..... مجھے تو اور کوئی کام آتا ہی نہیں ہے۔" ناصر نے کہا۔ "اور تم کو بھی کوئی اور کام نہیں آتا ہے، ہم لوگوں نے صرف بھٹے پر ہی کام کیا ہے۔"

"کراچی میں تو اتنے کام ہیں کہ ان کا شمار ہی نہیں ہے۔" مسعود نے جواب میں کہا۔ "اصل بات یہ ہے کہ تم کراچی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے، وہ بہت بڑا شہر ہے اور وہاں ہزاروں طرح کے کام ہیں۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں وہاں کوئی دوسرا کام کرنا پڑے گا اور سیکھنا پڑے گا۔" ناصر نے کہا۔ "ظاہر ہے کہ نیا کام ہوگا تو سیکھنا بھی پڑے گا۔ مگر میں سیکھوں گا۔" اچانک وہ جوش میں آگیا اور اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔ "میں نیا کام بھی سیکھ لوں گا مسعود مگر..... ایک بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ وہاں ہمیں کوئی شخص کام کیوں دے گا؟ وہاں تو ہمیں کوئی بھی نہیں جانتا ہے اور نہ ہم وہاں کسی کو جانتے ہیں تو پھر ہمیں کام کس طرح مل سکے گا؟"

"کراچی میں کام بہت ہے ناصر۔" مسعود نے کہا۔ "اور ویسے تو ہماری بستی کے بھی کئی لوگ کراچی میں رہتے ہیں مگر ہم ان کے پاس نہیں جائیں گے بلکہ ان سے تو ہم ملیں گے بھی نہیں۔ کسی کو بھی ہمارا صحیح پتہ نہیں معلوم ہونا چاہئے ورنہ حاجی ہم کو پکڑوا دے گا اور ہم ایک بار پھر اس کے قبضے میں آجائیں گے۔ میں نے کراچی کے بارے میں بہت سے لوگوں سے بہت کچھ سنا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس شہر میں اتنا کام ہے کہ محنت مزدوری کرنے والا کوئی بھی شخص وہاں بھوکا نہیں سوتا۔ تمام لوگوں کے لئے بہت کام ہے اور لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ کراچی میں فقیر کو اگر خیرات اس کی مرضی کی نہ ملے تو وہ اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے، وہ بہت عجیب و غریب شہر ہے۔"

"مگر..... ہم وہاں بالکل نئے ہوں گے..... اور....."

"نئے ہوں گے تو کیا ہوگیا یار؟" مسعود نے جھلا کر کہا۔ "تم اگر چاہو کہ ہر چیز پکی پکائی تیار مل جائے تو ایسا نہیں ہوتا، دنیا میں۔ آدمی کو کچھ نہ کچھ ہاتھ پاؤں بھی تو ہلانے

پڑتے ہیں۔ کچھ نہ کچھ خطرہ بھی مول لینا پڑتا ہے۔"

"ہاں ہاں۔" ناصر نے جلدی سے کہا۔ وہ مسعود کے غصے سے گھبرا گیا تھا۔ "ہاں ٹھیک ہے' خطرہ تو واقعی مول لینا پڑے گا۔" اس گفتگو کے دوران دونوں جیسے ایک دم بڑے ہو گئے تھے۔ وہ نو اور تیرہ سال کی عمر کے بچے نہیں تھے بلکہ پورے عاقل و بالغ افراد تھے جو مکمل ہوش مندی کے ساتھ شعوری طور پر اپنے بارے میں آنے والے حالات کے بارے میں اور مستقبل کے نشیب و فراز کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

"میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔" مسعود نے کہا۔ "میں بہت جلد اس جگہ سے نکل بھاگوں گا' میں کراچی چلا جاؤں گا اور تم اپنے بارے میں سوچ لو اگر تم بھی ساتھ چلنا چاہو تو چلو۔ بہت اچھا ہو گا اگر ہم دونوں ساتھ ہوں گے۔ وقت پڑنے پر ایک دوسرے کی مدد کر سکیں گے اور ایک دوسرے کو سہارا دے سکیں گے لیکن اگر تمہارا ارادہ نہ ہو تو بھی میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا لیکن میرے بارے میں کسی کو کچھ بتانا مت' اگر کسی کو پتہ چل گیا تو مصیبت اٹھ کھڑی ہو گی۔ میں تو بے موت مارا جاؤں گا۔"

"میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔" ناصر نے کہا۔ "میں کراچی چلوں گا۔"

"اگر تم چلو گے تو یہ بہت اچھی بات ہو گی۔" مسعود نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے اور یہ ہم دونوں کے لئے بہت اچھا ہو گا۔"

"مگر ہمارے گھر والوں کو کس طرح معلوم ہو گا کہ ہم لوگ کراچی میں ہیں اور وہاں سے پیسہ کما کر حاجی کے قرضے کی رقم اتار دیں گے؟" ناصر کے ذہن میں ایک اور نئی الجھن پیدا ہو رہی تھی۔

"اس میں کیا مشکل ہے؟" مسعود نے کہا۔ "ہم کراچی پہنچنے کے بعد وہاں سے ایک خط اپنے گھر والوں کو بھیج دیں گے' اس خط میں ہم یہ لکھوا دیں گے کہ ہم دونوں کراچی میں ہیں اور یہاں..... رقم کما کر بھیجیں گے تاکہ حاجی کا قرضہ اتر جائے۔ گھر والوں کو ہم تاکید کردیں گے کہ ہمارے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتایا جائے۔ بس' گھر والوں کو جب ہمارا خط ملے گا تو وہ خوش اور مطمئن ہو جائیں گے۔"

مسعود نے یہ کہہ کر اور ناصر نے یہ سن کر اطمینان کا سانس لیا۔ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پر پوری طرح مطمئن ہو گئے تھے۔ مسعود نے تو پہلے ہی یہ ساری باتیں سوچ لی تھیں اور اپنے آپ کو مطمئن کرلیا تھا اور اس نے جب ناصر کو یہ سب کچھ بتایا تو وہ دوبارہ سب کچھ سوچ کر مطمئن ہو گیا۔ سب کچھ تو ٹھیک تھا..... اس میں پریشانی کی کیا بات



تھی بھلا؟ اماں کو جب اس کے بارے میں علم ہو جائے گا تو وہ مطمئن ہو جائیں گی۔

"ہم کب تک اتنا پیسہ کما سکیں گے کہ حاجی کا قرضہ اتار دیں؟" ناصر کے ذہن میں ایک اور سوال پیدا ہوا۔

"میں نے کئی لوگوں سے معلوم کیا ہے۔" مسعود نے کہا۔ "کراچی میں تو سبھی کو کام مل جاتا ہے اور بچوں کو بھی فوراً کام مل جاتا ہے۔ وہاں تو کام کی کوئی کمی ہی نہیں ہے۔ اور پیسے بھی اچھے ملتے ہیں۔ اب یہ تو وہاں جا کر ہی معلوم ہو گا کہ ہم لوگوں کو وہاں کیا کام ملتا ہے اور اس کی کیا اجرت ہم کو ملتی ہے لیکن میرا اندازہ ہے کہ بہت زیادہ وقت نہیں لگے گا ایک آدمی مجھے بتا رہا تھا کہ اس کا بھائی کراچی میں مزدوری کرتا ہے اور وہاں اس نے ایک سال میں چھتیس ہزار روپے کمائے..... جن میں سے آدھی سے زیادہ رقم اس نے گھر بھیجی۔"

"چھتیس ہزار روپے!" ناصر نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "چھتیس ہزار!" اسے جیسے مسعود کی بات کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ "یہ..... یہ تو بہت زیادہ ہیں' بہت بڑی رقم ہے۔"

"اس سے بھی کہیں زیادہ لوگ کماتے ہیں وہاں۔" مسعود نے کہا۔ "وہی آدمی مجھے بتا رہا تھا کہ کراچی تو بس سونے کی کان ہے صرف ایک بار وہاں پہنچ کر کام شروع کر دینے کی دیر ہے اس کے بعد تو بس پھر برکت ہی برکت ہے۔"

ناصر ابھی وہاں کچھ مزید بیٹھ کر مسعود کے ساتھ کراچی کے بارے میں باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن مسعود اٹھ کھڑا ہوا۔ بہت دیر ہو چکی تھی چاروں طرف اندھیرا پھیل چکا تھا اور چراغ جلے بھی کافی وقت گزر چکا تھا۔

"چلو..... اب چلتے ہیں۔" مسعود نے ناصر سے کہا۔ "بہت دیر ہو گئی ہے' ایسا نہ ہو کہ تمہاری اماں تمہیں تلاش کرنے کے لئے نکل کھڑی ہوں۔"

"ہاں' چلو۔" ناصر نے کہا اور ساتھ ہی وہ خود بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں وہاں سے چل پڑے اور جہاں تک ان کا ساتھ رہا وہاں تک ناصر مسعود سے کراچی کے بارے میں ہی باتیں کرتا رہا یہاں تک کہ وہ جگہ آ گئی جہاں سے انہیں الگ الگ اپنے اپنے گھروں کی جانب روانہ ہونا تھا۔

"اور دیکھو ایک بات اچھی طرح سے یاد رکھنا۔" مسعود نے جاتے جاتے اس کو تنبیہہ کی۔ "خبردار' غلطی سے بھی کسی سے اس بات کا ذکر مت کرنا۔"

"ارے نہیں۔" ناصر نے کہا۔ "کیا میں بھلا ایسا پاگل ہوں۔"

"یہ جان لو کہ اگر کسی کے کان میں بھنک بھی پڑ گئی تو حاجی ہمیں زنجیروں سے بندھوا کر بھٹے میں قید کردے گا۔" مسعود نے کہا۔ "وہ کچھ لڑکوں کے ساتھ اس سے پہلے ایسا کر چکا ہے' مجھے معلوم ہے۔"

"نہیں نہیں۔" خوف کی ایک سرد لہر ناصر کے سارے جسم میں دوڑ گئی۔ "میں کسی سے نہیں کہوں گا۔ بالکل نہیں کہوں گا۔ بھلا میں ایسی غلطی کیونکر کر سکتا ہوں؟"

"ٹھیک ہے۔" مسعود نے کہا۔ "اب گھر جاؤ۔"

ناصر سر ہلا کر وہاں سے رخصت ہوا اور کچھ دیر کے بعد اپنے گھر جا پہنچا۔ گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور آنگن نیم تاریکی سے بھرا ہوا تھا۔ جب وہ اندر داخل ہوا تو اسے دالان اور باورچی خانے کی طرف نیم تاریک ہیولے حرکت کرتے ہوئے نظر آئے اور پھر دالان کی طرف سے نمودار ہونے والے ہیولے نے زمین کی شکل اختیار کرلی۔

"آج بہت دیر کردی تم نے بیٹے؟" زمین کے لہجے میں تشویش کے ساتھ محبت بھی گھلی ہوئی تھی۔ "کیا کام کچھ زیادہ تھا؟"

"ہاں اماں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کچھ کام بھی زیادہ تھا اور کچھ میں بندر کا تماشا دیکھنے کے لئے رک گیا تھا۔"

"شام کو سیدھے آجایا کرو بیٹے۔" ماں نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔ "تمہیں آنے میں دیر ہو جاتی ہے تو میں پریشان ہونے لگتی ہوں' ابھی کتنی دیر سے میں تمہارا راستہ دیکھ رہی ہوں۔"

"لو میں آ تو گیا اماں۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا اور جلدی سے ہاتھ منہ دھونے کے لئے چلا گیا۔

آج وہ اپنے آپ کو بہت خوش محسوس کر رہا تھا اسے بھٹے میں کام کرتے ہوئے تقریباً ایک سال کا عرصہ ہو چکا تھا اور زندگی میں ایک ایسی دم گھونٹ دینے والی' اکتا دینے والی' اذیت ناک یکسانیت پیدا ہو گئی تھی کہ ہر چیز جیسے بے معنی' بے مقصد اور اپنی جگہ پر جامد و ساکت ہو کر رہ گئی تھی۔ بعض اوقات اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کولہو میں جتے ہوئے بیل کی طرح ہے جو صبح سے لے کر شام تک ایک ہی دائرے میں گھومے جا رہا ہے اور دائرے میں گھومنے کے علاوہ اس کی زندگی میں کچھ بھی نہیں رہ گیا ہے اور اب اچانک زندگی میں گرمی اور سرگرمی کی ایک لہر پیدا ہو گئی تھی۔ جینے کا ایک نیا انداز دکھائی



دے رہا تھا ایک نئی دنیا اپنے آپ کو اس پر منکشف کر رہی تھی اور لطیف اشاروں سے اس کو اپنی جانب بلا رہی تھی۔ اس کے بلاووں سے ناصر کے رگ و پے میں سنسنی دوڑ رہی تھی۔ وہ جلد از جلد اس کے بلاووں کو قبول کرکے اپنے آپ کو اس جہانِ نو کے پُراسرار اور نامعلوم شب و روز میں گم کر دینا چاہتا تھا ایک ان جانے سرور کی لہریں اس کے وجود میں دھیرے دھیرے سرسرا رہی تھیں۔

وہ اس روز گھر میں بہت خوش رہا۔ کافی دیر تک جنت سے باتیں کرتا رہا۔ جنت گھر کے کام کاج میں مصروف تھی اور ناصر سے باتیں بھی کرتی جا رہی تھی۔ ناصر کو آج جنت اور اپنی ماں سے باتیں کرنے میں بہت مزا آ رہا تھا۔ اسے یہ سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ کاش..... وہ ان دونوں سے کراچی کے بارے میں باتیں کر سکتا جہاں وہ عنقریب جانے والا تھا۔ کتنا اچھا لگتا ان لوگوں سے کراچی کے بارے میں گفتگو کرنا' اس کے دل میں خواہش کی لہریں اٹھ اٹھ کر رہ گئیں۔ وہ سوائے مسعود کے اور کسی کے ساتھ یہ باتیں نہیں کر سکتا تھا۔ یہ سب کچھ تو ایک بہت قیمتی راز تھا جس کی اسے پوری طرح احتیاط کے ساتھ حفاظت کرنی تھی۔

بہت عرصے کے بعد اس نے اپنے آپ کو کافی ہلکا پھلکا محسوس کیا تھا۔ ہر چیز اچھی لگ رہی تھی گھر بھی اچھا لگ رہا تھا۔ دل پر ایک اضطراب آمیز مسرت کا غلبہ تھا۔

اگلے دو تین دن کے دوران مسعود کے ساتھ کراچی کے بارے میں کافی باتیں ہوئیں مسعود نے اس سے کہا تھا کہ بہت جلد وہ یہاں سے نکل چلنے کی سبیل کریں گے۔

اس روز وہ کام کے دوران اپنے خیالات میں گم تھا سوچ رہا تھا کہ کراچی میں اسے بھٹے پر کام نہیں کرنا ہو گا پھر وہ وہاں کیا کام کرے گا؟ کون کون سے کام ایسے ہوں گے جو کئے جا سکتے ہوں گے اور وہاں کراچی میں رہنے کا کیا ہو گا؟

اس نے مسعود سے بھی اس بارے میں پوچھا تھا لیکن خود مسعود کے پاس بھی ابھی اس کے سوال کا جواب نہیں تھا بلکہ بہت سارے سوالات ایسے تھے جن کا مسعود کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے ناصر کو بتایا تھا کہ ان سارے سوالوں کے جوابات ان کو کراچی چل کر ہی تلاش کرنے ہوں گے۔ گھر سے باہر قدم نکالے بغیر ہر مسئلے کا حل نہیں تلاش کیا جا سکتا تھا۔

"کتنا کچھ کرنا ہو گا' کیا کیا کرنا ہو گا۔" ناصر سوچ رہا تھا اور اس کا ذہن اِدھر اُدھر بھٹک رہا تھا اسے احساس بھی نہیں ہوا کب اس کے ہاتھوں کی حرکت کم ہو گئی اور اس کے ہاتھ

سُست پڑ گئے۔

اسے تو اس بات کا علم اس وقت ہوا جب اس کی گدی پر اتنے زور کا ہاتھ پڑا کہ وہ ایک دم لڑھک کر آگے کی طرف کو گر پڑا اور اس کی ناک گیلی مٹی کے اندر گھس گئی اور جب تک وہ اٹھتا اس وقت تک مزید دو تین دو ہتڑ اس کی پشت پر پڑ چکے تھے۔ اس کے ساتھ ہی گالیوں کا طوفان..... فخرو قہر و غضب کی تصویر بنا ہوا اس کے سر پر سوار تھا وہ اس کو مار رہا تھا اور ساتھ ہی گالیاں دے رہا تھا برا بھلا کہہ رہا تھا۔

"..... کام کر رہا ہے یا سو رہا ہے؟" فخرو نے کسی زہریلے ناگ کی طرح پھنپھناتے ہوئے کہا۔ "مفت کی کھائے گا؟ کیوں بے حرام خور دماغ خراب ہو گیا ہے؟"

"کام تو کر رہا ہوں۔" اچانک ناصر کے وجود میں نہ جانے کہاں سے ایک اَن جانی قوت نے سر ابھارا اور اس کی آنکھوں سے نفرت کے زہر میں ڈوبے ہوئے شعلے نکل رہے تھے۔

"زبان چلاتا ہے؟" فخرو غیظ و غضب کے عالم میں پاگل ہونے لگا اور پھر وہ پاگلوں ہی کی طرح ناصر پر ٹوٹ پڑا۔ اسے بری طرح مارنے لگا۔ "زبان چلاتا ہے؟ آنکھیں نکالتا ہے؟ زبان درازی کرتا ہے؟ کتے کے پلے تیری تو میں ہڈی پسلی ایک کر دوں گا تو چیز کیا ہے تیری تو میں جان نکال لوں گا۔"

لیکن آج ناصر کی آنکھوں سے آنسو نہیں نکل رہے تھے اس کی آنکھیں نفرت کے شعلے اگل رہی تھیں وہ ایسی وحشی نظروں سے فخرو کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک فخرو رک گیا۔ ان نظروں میں کوئی ایسی بات تھی جس نے فخرو کو رکنے پر مجبور کر دیا تھا یہ کسی زخمی درندے کی سی نظریں تھیں۔ فخرو نے اس کو مارنا بند کر دیا لیکن اس وقت تک وہ اس کو بہت مار چکا تھا۔

"ٹھیک سے کام کر۔" اس نے ناصر کو کڑی نظروں سے گھورا، لیکن ناصر اس کو اس سے بھی زیادہ کڑی نظروں سے گھور رہا تھا۔ فخرو اس کے پاس سے ہٹتے ہوئے بولا۔ "دھیان سے طریقے سے کام کر۔" پھر اس کے بعد وہ اس کے پاس سے چلا گیا۔

کچھ دور سے مسعود نے بھی یہ منظر دیکھا تھا اور اس کی اپنی آنکھوں میں بھی کسی زخمی درندے کی سی چمک اتر آئی تھی۔ کاش وہ ایک اینٹ مار کر فخرو کا سر پھاڑ سکتا۔

اس شام جب ناصر گھر پہنچا تو وہ سخت غصے اور اضطرابی ہذیانی کیفیت کا شکار تھا۔ اس پر ایک جنون کا سا عالم طاری تھا اور اس کی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ آج بھی



میں جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا وہ اگرچہ قطعاً کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن ناصر نے آج اس کو محسوس بہت زیادہ کیا تھا اس کا اثر بہت زیادہ لیا تھا۔ مسعود کے ساتھ تفصیلی گفتگو کے بعد سے اب وہ ہر چیز کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے لگا تھا اس کی سوچ میں وضاحت اور شدت پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے غصے کے عالم میں اپنی ماں سے کہہ دیا کہ وہ کل سے کام پر نہیں جائے گا۔

زبین کے لئے اس کی یہ بات ناقابلِ برداشت اور ناقابلِ قبول تھی۔ اس نے اس کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن جب وہ اپنی ضد پر اڑا رہا تو پھر زبین نے اس کو مارنا شروع کر دیا۔ وہ روتا رہا' ضد کرتا رہا اور پٹتا رہا۔ یہاں تک کہ جنت نے آکر اس کو زبین سے چھڑایا اور ایک طرف کو لے گئی۔

ناصر کو اس بات پر غصہ بھی تھا اور دکھ بھی کہ اس کی ماں اس بات کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھی کہ فخرو ظالم اور کمینہ آدمی تھا۔ وہ الٹا اس کو سمجھانے کی کوشش کرتی تھی کہ فخرو ان لوگوں کو کام سکھانے کے لئے ایسا کرتا ہے۔

تاہم اگلی صبح کو روز کی طرح چپ چاپ کھانے کی پوٹلی ہاتھ میں لئے ہوئے کام پر چلا گیا۔ صبح ہونے تک اس کا غصہ کافی ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ کل کے واقعات کے بعد سے جو شدت پسندانہ جذبات اس کے دل و دماغ میں پیدا ہوئے تھے ان کی تیزی و تندی میں اب کافی کمی آگئی تھی۔

اس روز بھٹے سے واپسی پر راستے میں اس نے مسعود کو بتایا کہ کل شام کو اس کی ماں نے اس کو بہت مارا۔

"میں نے غصے میں ان سے کہہ دیا تھا کہ میں کام پر نہیں جاؤں گا کیونکہ فخرو بہت مارتا ہے۔" ناصر نے مسعود سے کہا۔ "اور اماں اس بات پر بہت ناراض ہو گئیں۔ انہوں نے مجھے بہت مارا۔" وہ اسے تفصیل بتانے لگا۔

"سراسر تمہاری غلطی اور حماقت ہے۔" مسعود نے اس کی پوری بات سننے کے بعد کہا۔ "تمہیں اپنی ماں سے یہ سب کچھ نہیں کہنا چاہئے تھا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ تم کو اس کی اجازت دے دیں گی کہ تم بھٹے پر کام کرنا چھوڑ دو؟ کیا ان کے لئے ایسا کرنا ممکن ہو سکے گا؟ تم جانتے ہو کہ تمہارے بھٹے پر کام چھوڑ دینے کا ان کے لئے کیا مطلب ہو گا؟"

ناصر نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ مسعود اس سے پہلے پوری وضاحت کے ساتھ ساری صورت حال اس کو سمجھا چکا تھا اور اس کی روشنی میں وہ یہ بات اچھی

طرح جانتا تھا کہ مسعود کے گھر والے ہوں یا اس کی ماں' وہ ان دونوں کو بھٹے کے کام سے الگ نہیں کروا سکتے تھے۔

"صرف کچھ دن کی بات ہے۔" مسعود نے بزرگانہ انداز میں اس کو سمجھایا۔ "اس کے بعد یہ سارے قصے ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں گے ہم لوگ اس بھٹے سے اس شہر سے ہی چلے جائیں گے پھر دیکھنا یہ فخرو کیسا ناچا ناچا پھرتا ہے چاروں طرف۔ ارے وہ تو ہماری گرد کو بھی نہیں پہنچ سکے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" ناصر نے کہا۔ "میں اب گھر میں بھی کچھ نہیں کہوں گا اور بھٹے پر جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہوتا ہی رہے گا۔ میں جس طرح پہلے خاموش رہتا تھا اسی طرح آئندہ بھی خاموش رہوں گا۔"

"بس تھوڑے ہی دن کی بات اور ہے۔" مسعود نے کہا۔ "اس کے بعد ہم یہاں سے چل دیں گے پہلی تاریخ تک انتظار کرلو۔"

"پہلی تاریخ تک؟" ناصر نے کہا۔ "پہلی تاریخ تک کیا ہوگا؟"

ناصر کو پہلی تاریخ کی اہمیت کا کوئی احساس نہیں تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ پہلی تاریخ کو اس کو ملنے والی تنخواہ اس کے اپنے ہاتھ میں نہیں دی جاتی تھی۔ زبین نے پہلے ہی حاجی مدد علی قریشی سے یہ بات طے کرلی تھی کہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو وہ ناصر کی تنخواہ خود بھٹے پر آکر لے جایا کرے گی اور تنخواہ ناصر کے ہاتھ میں نہ دی جائے۔ بچہ ہے کہیں اِدھر اُدھر پھینک دے گا..... اور وہ خود ہر پہلی تاریخ کی شام کو بھٹے پر جا کر تنخواہ لے آتی تھی۔ اکثر اس کو چوہدری کے ہاں سے کام ختم کرکے آنے میں دیر بھی ہو جاتی تھی لیکن حاجی مدد علی قریشی کا گھر بھی اس جگہ تھا اس لئے اس کو تنخواہ مل جاتی تھی۔

ناصر کو معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ کب پہلی آئی اور کب گزر گئی۔ پہلی تاریخ کے ساتھ خود اس کی اپنی مالی وابستگی تو نہیں تھی اس لئے وہ مسعود کی بات کو پوری طرح سمجھ نہیں سکا۔

"ارے بھئی پہلی تاریخ آئے گی تو تنخواہ ملے گی۔" مسعود نے اس سے کہا۔ "کم از کم ہم اس مہینے کی تنخواہ تو وصول کرلیں ان لوگوں سے۔ آخر ہم نے اتنے دن تک کام کیا ہے اتنے تھوڑے بہت پیسے بھی کیوں چھوڑیں؟"

"ہاں..... اچھا....." ناصر نے جیسے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا۔ "میری تنخواہ تو اماں لے جاتی ہیں' مجھے تو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ وہ کب آکر لے جاتی ہیں۔"



"میں اپنی تنخواہ خود وصول کرتا ہوں۔" مسعود نے کہا۔ "لیکن گھر جاتے ہی وہ سارے پیسے امی کو دینے پڑتے ہیں۔ وہ تو اس دن خاص طور سے میرے انتظار میں بیٹھی ہوتی ہیں اور ابا کی بھی میرے لئے سخت ہدایت ہے کہ میں اپنی تنخواہ کے سارے پیسے ہر مہینے امی کو ہی دے دیا کروں۔"

"پہلی تاریخ آنے میں تو ابھی کچھ دن باقی ہیں۔" ناصر نے کہا۔

"ہاں....." مسعود نے کہا۔ "پہلی تاریخ کے بعد ہی ہم کو یہاں سے نکل چلنا ہے' ہمارے پاس کچھ نہ کچھ پیسے ضرور ہونے چاہئیں' کراچی جانے تک کا کرایہ..... پھر وہاں کچھ دن رہنے سہنے اور کھانے پینے کے لئے کچھ پیسے..... آخر کچھ تو ہمارے پاس ہونا چاہئے نا۔ کوئی وہاں قدم رکھتے ہی تو نوکری ہمارے انتظار میں نہیں کھڑی ہوگی....."

وہ دونوں اسی شکستہ چبوترے پر بیٹھے ہوئے باتیں کررہے تھے۔

"تمہیں یہ تو ضرور معلوم ہوگا کہ تمہاری اماں پیسے کہاں رکھتی ہیں۔" قدرے توقف کے بعد مسعود نے ناصر سے پوچھا۔

"ہاں..... معلوم ہے۔" ناصر نے فوراً جواب دیا۔ "کمرے میں الماری میں رکھتی ہیں۔"

"تو تمہیں وہاں سے کچھ پیسے نکالنے پڑیں گے۔" مسعود نے اس سے کہا۔ "ہمیں پیسے چاہئیں....."

ناصر کے دل پر ایک گھونسا سا لگا اس نے اپنی زندگی میں آج تک کبھی چوری نہیں کی تھی اس کے ذہن نے کبھی اس بات کو قبول نہیں کیا تھا کہ وہ چوری کرے۔ اس کا باپ چور تھا اور گھر سے بھاری رقم چرا کر لے گیا تھا۔ اس کی ماں نے اور سارے لوگوں نے کتنی لعنت ملامت کی تھی اور اس کے باپ کو کتنا برا بھلا کہا تھا۔ تو کیا اب یہی سب کچھ اس کے ساتھ بھی ہوگا؟ اس کے دل میں خوف اور ناپسندیدگی کی ایک لہر پیدا ہوئی لیکن پھر یہ لہر تقریباً فوراً ہی دب بھی گئی پیسہ تو اس کو چاہئے تھا پیسے کے بغیر کس طرح کام چل سکتا تھا؟

"یہ چوری نہیں ہے۔" ناصر کو خاموش پا کر مسعود اس سے کہنے لگا۔ "اس کو تم چوری مت سمجھو۔ چوری تو وہ ہوتی ہے جب کوئی دوسرے کی چیز لے لے تم کسی دوسرے کی چیز نہیں لے رہے ہو تم تو اپنی ہی چیز لے رہے ہو۔ آخر سال بھر سے تم کام

کررہے ہو اور تمہاری ہر ماہ کی تنخواہ تمہاری اماں لیتی رہی ہیں۔ تو کیا اس میں سے تھوڑے سے پیسے تم نہیں لے سکتے؟ بس تم اپنے کرائے بھر کا بندوبست کرلو اور کچھ تھوڑے سے اوپر سے..... باقی کے پیسوں کا بندوبست میں کرلوں گا۔"

"تم بھی....." ناصر اپنی بات پوری نہ کرسکا۔

"ہاں میں بھی....." مسعود نے مسکراتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔ "ظاہر ہے ابا سے اور امی سے چھپا کر ہی پیسے لوں گا اب تم اسے جو چاہو نام دے لو۔ ان لوگوں سے پوچھ کر تو نہیں لوں گا کیا وہ لوگ مجھ کو اس کی اجازت دیں گے؟"

ناصر خاموش ہوگیا۔ مسعود کی بات سے اختلاف کی بھلا کیا گنجائش ہو سکتی تھی۔

اس دن کے بعد سے ناصر بھٹے میں معمول کے مطابق خاموشی سے کام کرتا اور مار کھاتا رہا۔ اس نے فخرو کو پلٹ کر جواب نہیں دیا اور نہ ہی کام کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی کا مظاہرہ کیا گھر پر بھی اس نے کوئی جھگڑا نہیں کیا اور اس دن کے واقعے کو تو وہ ایسا بھول گیا جیسے وہ کبھی پیش ہی نہیں آیا تھا۔

☆==========☆==========☆



زمین اس صورت حال سے بہت مطمئن تھی۔ اس روز کے واقعے نے اس کو خاصا پریشان کردیا تھا اور اس کے دل میں یہ خدشہ سر ابھارنے لگا تھا کہ کہیں ناصر واقعی کام کرنے سے انکار نہ کردے لیکن پھر اس کو یہ دیکھ کر اطمینان ہوگیا تھا کہ ناصر نے کوئی گڑبڑ نہیں کی اور وہ اگلے دن سے اسی طرح خاموشی سے کام پر جانے لگا تھا جیسے پہلے جاتا تھا۔

پہلی تاریخ کے آنے میں ابھی کئی دن باقی تھے مسعود اور ناصر چپکے چپکے اپنے منصوبے کی تفصیلات طے کررہے تھے اس روز بھی شام کے وقت وہ دونوں اسی شکستہ چبوترے پر بیٹھے ہوئے تھے۔

"ہم ٹرین سے بھی کراچی جاسکتے ہیں اور بس سے بھی جاسکتے ہیں۔" مسعود اس کو بتا رہا تھا۔ "لیکن بس کا کرایہ زیادہ ہے اور ٹرین کا کرایہ اس سے کم ہے۔ اس کے علاوہ بس میں کم لوگ ہوتے ہیں کوئی جاننے والا مل سکتا ہے کوئی ہمیں دیکھ سکتا ہے البتہ ٹرین تو بہت بڑی ہوتی ہے اس میں بہت سارے لوگ ہوتے ہیں اس میں دیکھے جانے کا امکان بہت کم ہوتا ہے ہم لوگ ٹرین سے چلیں گے۔"

"ٹرین سے.....؟" ناصر کی آنکھیں خوشی کے عالم میں چمک اٹھیں اس کے رگ وپے میں سنسنی دوڑنے لگی وہ زندگی میں آج تک ٹرین میں کبھی نہیں بیٹھا تھا اس نے بس دور سے ٹرین کو پٹڑی پر بھاگتے ہوئے دیکھا تھا' اس کی آوازیں سنی تھیں' اس کے ڈبوں کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہرے دیکھے تھے اور یہ سارے مناظر اس کے لئے خصوصی دلکشی کے حامل رہے تھے کتنی ہی بار اس کا جی چاہا تھا کہ وہ خود بھی ان مناظر کا ایک حصہ بن جائے لیکن ایسا بھلا کہاں ممکن تھا؟ وہ تو بس زیادہ سے زیادہ سیالکوٹ شہر تک آسکا تھا اور بس..... اس کے آگے کیا ہے اور اس سے بھی آگے کیا ہے' اس کو کچھ نہیں معلوم تھا۔

"ہاں ٹرین سے....." مسعود نے کہا۔ "میں سب کچھ معلوم کرلوں گا اور بہت کچھ معلوم کرچکا ہوں میرے پڑوس میں شریف نامی ایک شخص رہتا ہے وہ پہلے ریلوے میں

قلی تھا اب بیمار ہو کر گھر پر پڑا رہتا ہے اس سے میں نے باتوں باتوں میں سیالکوٹ ریلوے اسٹیشن پر آنے جانے والی گاڑیوں کے بارے میں کافی معلومات حاصل کرلی ہیں جو چند ایک باتیں رہ گئی ہیں' وہ بھی جلد ہی معلوم کرلوں گا۔"

"ٹرین سے کراچی جانا تو بہت اچھا لگے گا۔" ناصر نے پُر اشتیاق لہجے میں کہا۔

"ہم دونوں گھر سے بالکل اسی طرح نکلیں گے جس طرح روز نکلتے ہیں۔" مس نے کہا۔ "کھانے کی پوٹلی ساتھ لے کر..... لیکن اس سے پہلے رات ہی میں کسی وقت اس سے بھی پہلے ہمیں پیسے نکال کر اپنے بٹوے میں رکھ لینے ہوں گے پھر ہم اپنے گھر سے روز کی طرح نکلیں گے اور بس کے اڈے پر پہنچیں گے وہاں سے بس میں بیٹھ کر ریلوے اسٹیشن پہنچیں گے اور پھر کراچی کیلئے روانہ ہوجائیں گے۔"

ناصر ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اتنے میں سامنے سے مراد آتا ہوا دکھائی دیا۔ دونوں خاموش ہوگئے مراد ان کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ "تم ابھی گھر نہیں ناصر.....؟" اس نے مسکرا کر ناصر سے پوچھا۔

"بس اب جاؤں گا۔" ناصر نے کہا۔ "ہم دونوں یہاں بیٹھے ہوئے ذرا ٹھنڈی ہوا رہے تھے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کررہے تھے۔"

"ہاں' آج تو اچھی خاصی گرمی ہے۔" مراد نے کہا۔ "بھٹے میں تم لوگوں کا کام چل رہا ہے.....؟"

"بس جیسے دوسروں کا چل رہا ہے ویسے ہی ہمارا بھی چل رہا ہے۔" مسعود نے پھیکی ہنسی کے ساتھ کہا۔ "صبح سے شام تک حاجی مدد علی قریشی کے لئے سونے کی اینٹیں تیار کرتے رہتے ہیں۔"

"واقعی سونے کی اینٹیں تیار کرتے ہو۔" مراد نے آہستہ سے کہا۔ "حاجی مدد قریشی اب شہر میں ایک تیسرا مکان خریدنے کی بات کررہا ہے شہر میں اس کے دو مکان سے موجود ہیں جو اس نے کرائے پر دے رکھے ہیں اور ایک اتنا بڑا مکان اور بہت سا زمین تو بھٹے کے ساتھ ہے تم لوگ واقعی اس کے لئے سونا بناتے ہو۔"

"اچھا بھئی اب میں چلتا ہوں۔" مسعود نے اٹھتے ہوئے کہا اور وہ ان دونوں سے رخصت ہوگیا مراد اور ناصر ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

ناصر کو مراد ہمیشہ سے اچھا لگتا تھا اور وہ اس سے ملنا' اس سے باتیں کرنا چاہتا لیکن اس کی ماں نے کچھ ایسی وجوہات کی بناء پر جن سے ناصر ابھی پورے طور سے واقف



نہیں تھا' اس کے گھر بھی آنے جانے پر اور ان لوگوں سے ملنے پر پابندی لگا دی تھی اور اب مراد ان کے گھر بالکل نہیں آتا تھا وہ ناصر کو اکثر راستے میں مل جاتا تھا اس سے باتیں کرلیتا تھا اس کے گھر کے حالات بھی پوچھ لیتا تھا اور اپنے گھر کے حالات کے بارے میں بھی بہت کچھ بتا دیتا تھا یہ سب کچھ وہ اس لئے کرتا تھا تاکہ زیبن کو ناصر کے ذریعے اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلوم ہوتا رہے۔ ظاہر ہے کہ جنت تو اپنی ماں کو مراد کے ساتھ اپنی خفیہ ملاقاتوں کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتی تھی۔

"ابا میرے لئے دکان تلاش کررہے ہیں۔" مراد نے ناصر سے کہا۔ "وہ کہتے ہیں کہ ٹھیلا لگانے کے مقابلے میں دکان کرلینا زیادہ اچھا ہے۔ انہوں نے خود تو ساری عمر سبزی کا ٹھیلا ہی لگایا ہے لیکن میرے لئے وہ دکان تلاش کررہے ہیں جلد ہی کوئی نہ کوئی دکان دیکھ کرلے لیں گے۔"

"یہ تو بہت اچھا ہوگا۔" ناصر نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "پھر تو تم دکان پر بیٹھا کرو گے تمہاری اپنی دکان ہوگی مزے ہوں گے۔"

"میرے ابا کہتے ہیں کہ ذاتی کاروبار بہت اچھی چیز ہے اور ذاتی کاروبار' نوکری سے ہزار درجہ بہتر ہے۔" مراد نے کہا۔ "دیکھو نا' نوکری میں تو مالکوں کے سو طرح کے نخرے برداشت کرنے ہوتے ہیں' ہر وقت ان کی ناراضگی کا خطرہ موجود رہتا ہے مگر اپنا کاروبار تو اپنا کاروبار ہوتا ہے میرے ابا نے تو ساری زندگی اپنا ہی کاروبار کیا' سبزی کا ٹھیلا لگایا..... اپنا ٹھیلا....."

"ہاں....." ناصر نے کہا۔ "انہوں نے بہت اچھا کیا تمہارے ابا تو بہت اچھے آدمی ہیں۔" اس کے آگے جو کچھ وہ کہنا چاہتا تھا' نہ کہہ سکا کیونکہ الفاظ اس کی زبان تک آکر رک گئے تھے وہ کہنا چاہتا تھا کہ "کاش میرے ابا بھی ایسے ہی ہوتے۔"

"تم اپنی امی کو یہ بات ضرور بتانا۔" مراد نے اس سے کہا۔ "ان کو میرے بارے میں بتانا کہ میں عنقریب سبزی کی دکان کرنے والا ہوں۔"

"ضرور بتاؤں گا۔" ناصر نے کہا۔ "مگر امی تمہارے ذکر سے خوش نہیں ہوتیں۔" اس کے لہجے میں سادگی اور معصومیت تھی۔ "وہ کہتی ہیں کہ تمہارا تعلق غیر برادری سے ہے۔"

"سارے انسان اللہ میاں کے بنائے ہوئے ہیں یار.....؟ اللہ میاں ہی بناتے ہیں نا.....؟ کوئی اور تو نہیں بناتا.....؟"

"ہاں' بناتے تو اللہ میاں ہی ہیں۔" ناصر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "کوئی اور تو نہیں بناتا....."

"اللہ میاں خود ہی بناتے ہیں تو سارے انسان آپس میں بھائی بھائی ہوئے تو پھر برادری الگ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"ہاں' برادری الگ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔" ناصر نے فوراً کہا اس کے پاس اس سوال کا اس کے علاوہ اور کوئی جواب نہیں تھا بھٹے میں اس کے ساتھ کئی ایسے لڑکے کام کرتے تھے جن کا تعلق بالکل الگ الگ برادریوں سے تھا وہ سب کے سب ایک ہی طریقے سے گالیاں سنتے تھے اور ایک ہی طریقے سے قرض کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے' سب کے سب یکساں طور پر غریب خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔

"پرویز تو اب تم کو تنگ نہیں کرتا....." مراد نے موضوع بدلتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"نہیں۔" ناصر نے جواب دیا۔ "پرویز اب مجھے بالکل تنگ نہیں کرتا بلکہ وہ تو اب مجھ سے بات ہی نہیں کرتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جب فخرو مجھے مار رہا ہوتا ہے' یا گالیاں دے رہا ہوتا ہے تو وہ دور سے دیکھ کر چپکے چپکے ہنستا اور خوش ہوتا رہتا ہے۔"

"ہنسنے دو۔" مراد نے کہا۔ "تمہارا کیا لیتا ہے' جہنم میں جائے اگر تم سے کبھی کچھ کہے تو بتانا میں اس کو ٹھیک کردوں گا۔"

"وہ تم سے ڈرتا ہے۔" ناصر نے کہا۔ "اس دن کے بعد سے پھر اس نے مجھ کو کبھی تنگ نہیں کیا۔"

ناصر کا گھر قریب آگیا تھا۔ "میں چلتا ہوں۔" مراد نے کہا۔ "تم اب گھر جاؤ۔"

ناصر نے گھر آنے کے کچھ دیر کے بعد اپنی ماں کو بتایا۔ "مجھے واپسی میں مراد ملا تھا۔ اس کا باپ اس کے لئے سبزی کی دکان تلاش کر رہا ہے اور جلد ہی وہ دکان پر بیٹھنا شروع کردے گا۔"

"تو پھر ہم کیا کریں.....؟" زمین نے تنگ کر کہا۔ "دکان میں بیٹھے یا مکان میں بیٹھے..... ہمیں اس سے کیا۔"

"اماں وہ دکاندار بن جائے گا۔" ناصر نے اپنی ماں کی بات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "کتنے مزے کی بات ہوگی اپنی دکان پر بیٹھ کر اطمینان سے سودا بیچا کرے گا۔"

"تو تجھے کون سے لڈو مل جائیں گے؟" زمین نے آنکھیں نکال کر کہا۔ "وہ تیری



دکان تو نہیں ہوگی اپنے کام سے کام رکھا کر کوئی کیا کرتا ہے تجھ کو کیا مطلب....."

"اماں مراد کہتا ہے کہ اپنا کاروبار کرنا بہت اچھی بات ہے۔" ناصر' مراد کی ساری بات اپنی ماں تک پہنچانے پر تلا ہوا تھا۔ "وہ کہہ رہا تھا کہ اس کے ابا نے ساری زندگی اپنا ذاتی کاروبار کیا۔"

"اس کے ابا کو چولھے میں ڈال' تیرے ابا نے کیا' کیا ساری زندگی؟" زمین ایک دم بھڑکی۔ "کبھی اپنے ابا کے کرتوتوں کے بارے میں بھی سوچ وہ کم بخت ہمیں کیسی کیسی مصیبتوں میں مبتلا کر گیا' جاتے جاتے بھی ہمارے لئے کیسے کیسے عذاب نازل کر گیا اور تو زیادہ مراد کی دُم میں نہ گھسا کر۔" اس نے کڑی نظروں سے ناصر کو گھورتے ہوئے کہا۔ "کوئی ضرورت نہیں اس سے زیادہ چپڑ چپڑ باتیں کرنے کی..... خبردار....."

"میں کوئی اس کے گھر تھوڑی گیا تھا اماں۔" ناصر نے جلدی سے اپنی صفائی پیش کی۔ "وہ تو مجھے راستے میں مل گیا تھا جب میں بھٹے سے واپس آرہا تھا ہم لوگ ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور وہ مجھ سے باتیں کرنے لگا۔"

جنت قریب ہی موجود تھی۔ بڑی خاموشی سے سر جھکائے ہوئے ساری بات سن رہی تھی ناصر جو کچھ کہہ رہا تھا' وہ جنت کو پہلے سے معلوم تھا بلکہ کچھ زیادہ ہی تفصیل کے ساتھ معلوم تھا۔

"اس کو زیادہ منہ مت لگایا کرو۔" زمین نے قدرے نرمی سے اپنے بیٹے سے کہا اور کن انکھیوں سے جنت کی طرف دیکھا۔ جنت کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا وہ خاموشی سے باورچی خانے کے کام کرنے میں مصروف ہونے کا اظہار کر رہی تھی' اس کو یہ نہیں معلوم تھا کہ صرف چند ہی دنوں کے بعد وہ بے چینی سے اپنے گھر میں مراد کا انتظار کر رہی ہوگی۔

اس رات ناصر بہت دیر تک جاگتا رہا وہ سونے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کا دماغ بار بار بھٹک جاتا تھا آج مسعود کے ساتھ بہت ساری باتیں ہوئی تھیں اور تقریباً سارا منصوبہ طے پا گیا تھا اب تو بس وقت آنے پر اس پر عمل کرنا تھا اس کے ذہن کے پردے پر بار بار کراچی کی تصویر ابھرتی تھی جسے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا وہ وقت قریب آرہا تھا جب وہ اس عجائبات دنیا کی سیر کرنے والا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں خوف کی لہر بھی رہ رہ کر اٹھتی تھی۔

آخر خدا خدا کر کے مہینے کی آخری تاریخ آگئی اگلے دن پہلی تھی' تنخواہ ملنے کی

تاریخ..... اس شام کو مسعود اور ناصر شکستہ چبوترے پر بیٹھے ہوئے کافی دیر تک باتیں کرتے رہے اور انہوں نے پرسوں کے لئے اپنے منصوبے کی ساری تفصیلات طے کر لیں۔

"کل تنخواہ مل جائے گی۔" مسعود نے ناصر سے کہا۔ "بس تم رات کو' شام کو جس وقت بھی موقع ملے' کچھ رقم اپنے نیفے میں رکھ لینا یہ سب سے زیادہ ضروری کام ہے اس کے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکیں گے۔ رقم نیفے میں رکھ لو بس یہ سمجھو کہ اصل کام ہو گیا اس کے بعد گھر سے نکل کر بڑے چوک کی طرف چل دینا جس طرح روز جاتے ہو میں تم کو بڑے چوک پر ہی مل جاؤں گا وہاں سے ہم بسوں کے اڈے کی طرف چلیں گے اور پھر بس میں بیٹھ کر اسٹیشن جائیں گے۔ میں تے ٹرین وغیرہ کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کر لی ہیں اب مجھے مزید کچھ نہیں معلوم کرنا ہے بس ہم دونوں کو گاڑی میں بیٹھنا ہے اور وہاں سے روانہ ہو جانا ہے۔ ایک بار یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جائیں تو بیڑا پار ہے پھر تو انشاء اللہ سیدھے کراچی جا کر دم لیں گے۔"

ناصر کے دل کی دھڑکنیں ایک دم سے تیز ہو گئیں وقت قریب آ گیا تھا بھٹے کے عذاب سے نجات پانے کا وقت..... فخرو کی مار اور گالیوں سے نجات پانے کا وقت..... کراچی جانے کا وقت.....

اگلے روز پہلی تاریخ تھی ناصر صبح کو گھر سے نکلا اور معمول کے مطابق بھٹے پہنچ گیا اس کے ذہن میں ایک زبردست خلفشار مچا ہوا تھا بھٹے میں آج اس کا آخری دن تھا آج تنخواہ ملنے والی تھی اور اس کے بعد..... اس کے بعد وہ باقی زندگی کا ایک ایسا سفر شروع کرنے والا تھا جس کے بارے میں اسے کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔

سارا دن وہ اپنے خیالات میں گم اپنے ذہنی خلفشار میں مبتلا سر جھکائے کام کرتا رہا آج وہ یہاں کی ہر چیز کو اجنبیوں کی طرح دیکھ رہا تھا گویا ان سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو کوئی دم جاتا تھا کہ وہ اس فضا کے لئے بے گانہ ہو جانے والا تھا اور یہ فضا اس کے لئے بے گانہ ہو جانے والی تھی۔

شام کو جب کام ختم ہونے کا وقت آیا تو منشی امیر علی نے سب کام کرنے والوں کو تنخواہیں دینی شروع کر دیں آج سے پہلے تو ناصر نے کبھی اس بات پر دھیان ہی نہیں دیا تھا کہ تنخواہ کس وقت تقسیم ہوتی ہے اور کس طرح تقسیم ہوتی ہے اس کا تو تنخواہ سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا وہ تو پہلی تاریخ کو بھی کام ختم کر کے سیدھا گھر آ جاتا تھا اکثر یہ ہوتا



تنخواہ لینے کے لئے بھٹے پر اس وقت پہنچ پاتی تھی جب ناصر وہاں سے جا چکا ہوتا تھا اور اماں جب ناصر واپس گھر آ جاتا تو اس کے بعد ہی ماں گھر پہنچتی ناصر کو علم تو ہوتا کہ وہ تنخواہ لے کر آئی ہو گی لیکن وہ اس سے اس بارے میں کچھ نہیں پوچھتا تھا اور نہ ہی وہ خود ناصر کو اس کے متعلق کچھ بتاتی تھی۔

لیکن آج ناصر کی نگاہیں بھٹے کے دروازے پر لگی ہوئی تھیں کام تو ختم ہو چکا تھا اور وہ چاہتا تو روز کی طرح پہلے کی طرح گھر کے لئے روانہ ہو سکتا تھا لیکن آج اسے جانے کی اتنی جلدی نہیں تھی۔ بھٹے میں آج اس کا آخری دن تھا کل تو اس وقت اس کو نہ جانے کہاں ہونا تھا' وہ خود بھی نہیں جانتا تھا مگر اتنا ضرور جانتا تھا کہ وہ یہاں اس بستی میں' اس شہر میں نہیں ہو گا۔

اس نے مسعود کو تنخواہ کے لئے لائن میں لگے ہوئے دیکھا مسعود خاموشی سے اپنی باری آنے کا انتظار کر رہا تھا اور پھر مسعود کی باری آ گئی اس کو تنخواہ مل گئی مسعود تنخواہ لے کر وہاں سے جانے لگا۔ وہ نہ تو ناصر کے پاس رکا اور نہ اس نے ناصر سے کوئی بات کی اب بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی جو بھی بات چیت ہونی تھی' وہ ہو چکی تھی اب تو صرف عمل کی ضرورت تھی۔

تنخواہ لینے والے دو آخری آدمی باقی رہ گئے تھے جب ناصر نے وہاں سے نکلنے کا فیصلہ کیا وہ کام ختم کرنے کے بعد کبھی بھی وہاں اتنی دیر نہیں رکتا تھا اور اسے یہ عجیب سا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ وہاں رکا رہے ماں تو ابھی تک نہیں آئی تھی اور ناصر اب مزید انتظار نہیں کر سکتا تھا۔

وہ بھٹے سے نکلا اور ابھی چند قدم ہی چلا ہو گا کہ اس کو سامنے سے زیبن آتی ہوئی نظر آئی ماں تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی بھٹے کی طرف آ رہی تھی۔ ناصر نے اس کو دیکھ لیا تھا لیکن زیبن اس کو نہیں دیکھ سکی تھی وہ اپنی دھن میں مگن جلدی جلدی چلتی ہوئی بھٹے کی طرف چلی آ رہی تھی۔

ناصر خود بھی ایک طرف کو ہو گیا زیبن بھٹے کے اندر داخل ہو گئی ناصر مطمئن ہو گیا ماں تنخواہ لینے کے لئے آ گئی تھی اس کا مطلب تھا کہ تنخواہ مل جائے گی' پیسے آ جائیں گے اس نے کن انکھیوں سے ماں کو بھٹے کے دروازے کے اندر غائب ہوتے ہوئے دیکھا اور پھر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا وہاں سے روانہ ہو گیا۔

وہ زیبن کی واپسی سے کافی پہلے ہی گھر پہنچ گیا تھا جنت اور چھوٹی بچیاں گھر پر ہی

تھیں جنت معمول کے مطابق گھر کے کام کاج میں مصروف تھی ناصر ہاتھ منہ دھونے
مصروف ہوگیا۔

"امی نہیں آئیں ابھی تک.....؟" اس نے جنت سے پوچھا۔

"آتی ہی ہوں گی۔" جنت نے کہا۔ "آج تو پہلی تاریخ ہے وہ چوہدریوں کے
سے کام ختم کرکے پہلے بھٹے پر جائیں گی' وہاں سے تمہاری تنخواہ لیں گی اور پھر گھر آئیں
گی۔"

ناصر کو تو سب کچھ معلوم تھا وہ تو بس یوں ہی پوچھ رہا تھا ہاتھ منہ دھونے کے بعد
خاموشی سے چارپائی پر لیٹ گیا مکان کا کچا آنگن نیم تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور شکلیں صاف
نظر نہیں آتی تھیں۔ دالان میں ایک لالٹین جل رہی تھی لیکن اس کی زرد اور پھیکی
روشنی رات کی بڑھتی ہوئی اور گہری ہوتی ہوئی سیاہی کے آگے بے بس معلوم ہوتی تھی
باورچی خانے میں جنت کا ہیولہ دھندلا دھندلا سا نظر آرہا تھا ناصر نے اپنی آنکھیں بند کرلیں
اور اس کے ساتھ ہی ہر طرف مکمل اندھیرا ہوگیا۔ باورچی خانے کی طرف سے برتنوں کے
کھڑکنے کی اور چھوٹی بچیوں کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

پھر کسی کے آنے کی آہٹ سنائی دی تو اس نے آنکھیں کھول دیں زمین کی
پرچھائیں کی طرح نیم تاریک آنگن میں داخل ہورہی تھی وہ چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

زمین گھر میں داخل ہونے کے بعد سیدھی کمرے کی طرف چلی گئی۔ ناصر بڑی
خاموشی سے اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا اس سے پہلے تو اس نے کبھی بھی
اس بات پر توجہ نہیں دی تھی کہ ماں کام پر سے آنے کے بعد کیا کیا کرتی ہے لیکن اس بار
تو یہ سب کچھ جاننا اس کے لئے بہت ضروری ہوگیا تھا مسعود نے اس کو ہر بات بہت اچھی
طرح سمجھا دی تھی۔

اس رات سونے سے پہلے وہ بہت دیر تک زمین سے اور جنت سے باتیں کرتا رہا
اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ان لوگوں سے بہت ساری باتیں کرے۔ نصرت اور صغرا بھی کافی
دیر تک جاگتی رہی تھیں اور وہ ان سے بھی بہت سی باتیں کرتا رہا تھا' کلثوم البتہ سوگئی
تھی۔

"خدا جانے' اب کتنے عرصے کے بعد ان لوگوں سے ملاقات ہوسکے گی۔" اس کے
دل میں بار بار ایک تڑپ سی پیدا ہورہی تھی اور وہ ایک ایسی درد انگیز بے چینی محسوس
کررہا تھا جس میں خوف' تجسس اور اشتیاق کا ملا جلا تاثر شامل تھا۔



رات گہری ہوتی گئی' سب لوگ سوگئے' زمین تو جلد ہی سوگئی تھی البتہ جنت زیادہ
دیر تک جاگتی رہی تھی پھر وہ بھی سوگئی صرف ناصر جاگ رہا تھا اور وہ اس وقت کے انتظار
میں تھا کہ باقی لوگوں کی نیند خوب گہری ہوجائے تاکہ پھر وہ بے خوفی اور اطمینان کے ساتھ
اپنا کام کرسکے۔

زمین کے خراٹے تو کافی دیر سے گونج رہے تھے کچھ دیر کے بعد ان میں جنت کے
خراٹے بھی شامل ہوگئے اور ان دونوں کے ملے جلے خراٹے دالان کی بوجھل فضا کو اور
زیادہ بوجھل بنانے لگے۔ اندر کمرے میں گرمی تھی اب ان لوگوں نے چارپائیاں دالان
میں ڈال لی تھیں۔

ناصر کو جب یقین ہوگیا کہ وہ دونوں پوری طرح بے خبر سوچکی ہیں تو پھر وہ بہت
آہستگی اور احتیاط کے ساتھ اٹھا اور دبے پاؤں چلتا ہوا کمرے کے اندر چلا گیا' کمرے کی ہر
چیز اس کی جانی پہچانی تھی' مکمل تاریکی میں اس کو الماری تک پہنچنے میں اور اس کے
دروازے کو کھول کر رقم نکالنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی لیکن اس کو ساری رقم نہیں
لے جانی تھی رقم نکالنے کے بعد اس نے محض ذرا سی دیر کے لئے کمرے کے اندر ایک
کونے میں چراغ روشن کیا' اپنی ضرورت بھر کی رقم الگ کی اور پھر فوراً ہی چراغ کو گل
کردیا' اس نے اپنی رقم اپنے پاس رکھ لی اور باقی رقم اس جگہ واپس رکھ دی جہاں سے
اس نے اس کو اٹھایا تھا۔ اس کے بعد وہ کمرے میں سے باہر نکل آیا دالان میں اسی طرح
خراٹوں کی آوازیں گونج رہی تھیں' سب لوگ گہری نیند میں ڈوبے ہوئے تھے تینوں
چھوٹی بچیاں بھی سوئی ہوئی تھیں۔ ناصر خاموشی سے اپنے بستر پر لیٹ گیا۔

اس سے اس نے محسوس کیا کہ اس کا دل بہت بری طرح دھڑک رہا ہے اس نے
زندگی میں آج تک کبھی چوری نہیں کی تھی' ایک پیسہ بھی ماں سے پوچھے بغیر نہیں لیا تھا
اور اب اس نے اتنے بہت سارے روپے اکٹھے چرائے تھے لیکن مسعود نے تو اس کو یہ
اطمینان دلا دیا تھا کہ یہ چوری نہیں تھی یہ تو اس کے اپنے پیسے تھے اس نے قدرے سکون
محسوس کیا۔

اس کے بعد بھی اس کو کافی دیر تک نیند نہیں آئی۔ بار بار اس کے دل میں یہ خیال
آرہا تھا کہ آج کی رات کے بعد نہ جانے کب دوبارہ اسے اس گھر میں رات گزارنے کا
موقع ملے گا تاہم اس کے ساتھ ہی یہ سکون آور خیال بھی دماغ میں ابھرتا تھا کہ جب وہ
دوبارہ یہاں واپس آئے گا تو خالی ہاتھ نہیں ہوگا' اس کے پاس بہت ساری رقم ہوگی جس

میں سے وہ حاجی مدد علی قریشی کی قرض کی رقم فوری طور پر ادا کردے گا اور پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔

پھر نہ جانے کس وقت اسے نیند آگئی اور صبح کو وہ کسی کے بھی اٹھنے سے پہلے اٹھ گیا بڑی کچی نیند آئی تھی اس کو..... اس نے سب سے پہلے تو کمرے کے اندر الماری وغیرہ کا جائزہ لیا اور اس امر کا اطمینان کر لیا کہ وہاں سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا رات کے اندھیرے میں اس سے کوئی غلطی نہیں ہوئی تھی۔

باقی سب کچھ معمول کے مطابق ہوا' وہ مقررہ وقت پر گھر سے نکلا' کھانے کی پوٹلی اس کے ہاتھ میں تھی اور دل میں ایک خاموش طوفان..... اس نے چپکے چپکے اپنی ماں اور بڑی اور چھوٹی بہنوں کو گہری نظروں سے دیکھا اور پھر گھر سے باہر نکل گیا گھر کی دہلیز کرتے وقت اس کا دل ایک بار پھر بڑے زور سے دھڑکا اور اس کے ہاتھ پیروں میں سنسنی پیدا ہوئی مگر اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

بڑے چوک تک کا راستہ اس نے معمول کے قدموں سے چلتے ہوئے طے کیا روزانہ اسی راستے سے ہو کر بھٹے تک جاتا تھا بڑے چوک تک آنے کے بعد بھٹے کو جانے کے لئے دائیں جانب مڑنا پڑتا تھا اور بائیں جانب والا راستہ بسوں کے اڈے کی طرف جاتا تھا بسوں کے اڈے کے بعد آگے آبادی بہت کم تھی۔

بڑے چوک پر پہنچتے ہی اسے ایک جانب سے مسعود آتا ہوا نظر آگیا مسعود کو دیکھ کر اس کی جان میں جان آگئی اور اس نے سکون و اطمینان کی ایسی گہری سانس لی جیسے ساری ہوا کو اپنے سینے میں بھر لینا چاہتا ہو۔

"سب ٹھیک ہے نا.....؟" مسعود نے جلدی سے اس کے قریب آکر پوچھا اور ناصر نے فوراً گردن ہلا دی۔

"پیسے رکھ لئے ہیں.....؟" مسعود نے سرگوشی میں پوچھا اور ناصر نے آہستہ سے اثبات میں جواب دیا۔

"بس پھر چلو....." مسعود نے کہا اور دنوں تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے بسوں کے اڈے کی طرف روانہ ہوگئے ناصر اس وقت خود کو مکمل طور پر مسعود کے رحم و کرم پر محسوس کر رہا تھا' مسعود ہی اس وقت اس کا بزرگ تھا' رہنما تھا۔

ان دونوں نے بھٹے کو جانے والا راستہ نہیں اپنایا تھا بلکہ وہ بسوں کے اڈے کی طرف جا رہے تھے پھر کچھ دیر کے بعد وہ دونوں وہاں پہنچ گئے ناصر' مسعود کے ساتھ



بس میں سوار ہو گیا جو وہاں آکر رکی تھی اور ذرا ہی دیر وہاں رک کر چل پڑی تھوڑی ہی دیر میں وہ سیالکوٹ کے ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے۔

ناصر' مسعود کے ساتھ ہی بس سے نیچے اترا اور اسٹیشن کی عمارت کو اور وہاں کی زبردست گہما گہمی کو غور سے دیکھنے لگا اس سے پہلے وہ چند بار ادھر سے گزرا ضرور تھا لیکن اس نے اسٹیشن کی عمارت کے اندر کبھی قدم نہیں رکھا تھا۔

سارے کام مسعود نے ہی کئے اس کو پہلے سے ساری معلومات تھیں اس نے ٹکٹ وغیرہ کا بندوبست کیا اور پھر جس وقت چیختی' چنگھاڑتی گھڑ گھڑاتی' دھاڑتی' شور مچاتی ہوئی ٹرین کسی آہنی عفریت کی طرح پلیٹ فارم پر آکر رکی تو ناصر کو چکر آنے لگا اس نے اس قدر قریب سے ٹرین کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔

ٹرین کے پلیٹ فارم پر آنے سے پہلے بھی وہاں جیسے ایک شور برپا ہو گیا تھا' لوگوں میں ہلچل مچ گئی تھی اور ایک وحشیانہ قسم کی بھاگ دوڑ شروع ہو گئی تھی اس قدر شور مچ رہا تھا کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔

مسعود نے ناصر کا ہاتھ مضبوطی کے ساتھ پکڑ رکھا تھا' دونوں کے ہاتھوں میں کھانے کی پوٹلیوں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا بس یہی ان کا زادِ راہ تھا۔ مسعود' ناصر کا ہاتھ پکڑے پکڑے جلدی سے ایک ڈبے کے اندر گھسنے میں کامیاب ہو گیا جہاں پہلے ہی بہت سارے لوگ بھرے ہوئے تھے۔

ڈبے میں اس قدر رش تھا کہ سانس لینا مشکل ہو رہا تھا اور شور اس قدر کہ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کون کیا کہہ رہا ہے۔ ہر شخص زور زور سے بول رہا تھا ناصر آنکھیں پھاڑے ہوئے ہر طرف دیکھ رہا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس موقع پر اس کو کیا کرنا چاہیے یہ ایک ایسی صورتِ حال تھی جس کا اس سے پہلے اس کو کوئی تجربہ نہیں تھا ڈبے میں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں تھی ساری سیٹیں پہلے ہی بھری ہوئی تھیں اور بہت سارے لوگ کھڑے ہوئے تھے جو ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہوئے اِدھر سے اُدھر آجا رہے تھے۔ ناصر کے لئے اپنے چھوٹے سے وجود کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا وہ بمشکل اپنے آپ کو گرنے سے بچائے ہوئے تھا۔

مسعود نے اس کا ہاتھ بڑی مضبوطی کے ساتھ پکڑ رکھا تھا اور خود اس نے بھی مسعود کے ہاتھ کو سختی سے پکڑا ہوا تھا اس وقت مسعود ہی تو اس کا واحد اور بڑا سہارا تھا۔

وہ دونوں مضبوطی کے ساتھ ایک دوسرے کے ہاتھوں کو تھامے ہوئے اس صبر آزما

اور مشکل صورت حال کا مقابلہ کرنے میں مصروف تھے اِدھر اُدھر سے دھکے کھاتے ہو
انہوں نے ایک کونے میں اپنے لئے جگہ بنالی تھی اور وہاں ڈبے کی دیوار کے پاس چپک
کھڑے ہوگئے تھے۔

ناصر کو ایسے لگ رہا تھا جیسے اگر یہ کشمکش کچھ دیر اور جاری رہی تو وہ بے ہو
ہوجائے گا لیکن اچانک ٹرین نے سیٹی دی اور اس کے ساتھ ہی ڈبے میں موجود کچھ لوگ
نے نیچے اترنا شروع کردیا۔ ان لوگوں کے نیچے اترنے سے ڈبے کی فضا میں گھٹن ا
کثافت کسی حد تک کم ہوگئی اور قدرے کشادگی کا احساس ہونے لگا۔ ناصر نے ایک
اور گہری سانس لی اور تازہ ہوا کو اپنے پھیپھڑوں کے اندر سمیٹنے کی کوشش کی۔

گاڑی کے سیٹی دینے کے ساتھ ہی ڈبے کے اندر کے علاوہ پلیٹ فارم پر بھی ایک
دم ہلچل مچنے لگی تھی، بہت سارے لوگ تیزی سے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے، خوا
والے، ٹھیلے والے اچانک زور زور سے صدائیں لگانے لگے تھے، ان کی آوازوں م
یکبارگی کراراپن اور ایک قسم کی وحشت ابھر آئی تھی، بکری کا وقت ختم ہورہا تھا، جلدی
جلدی آواز لگا کر گاہکوں کو اپنی طرف متوجہ کرکے زیادہ سے زیادہ سامان فروخت کرلینے ک
ضرورت تھی اور پھر ٹرین نے رینگنا شروع کردیا۔ اب وہ پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے، زور
زور سے چلا چلا کر ان لوگوں سے باتیں کررہے تھے جو ڈبے کے اندر موجود تھے۔

"رمضان چاچا سے کہہ دینا کہ بھوری بھینس بوڑھی ہو رہی ہے۔" پلیٹ فارم پر موجود
ایک آدمی گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختے ہوئے کہہ رہا تھا اور رینگتی ہوئی گاڑی کے ساتھ ساتھ چلتا
ہوا اندر کھڑکی میں کھڑے ہوئے ایک دوسرے آدمی سے مخاطب تھا۔ "ان سے کہہ دینا
کہ اس کے بعد اس کو بیچ دیں کیونکہ اب وہ بوڑھی ہوگئی ہے۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔" اندر کھڑکی میں موجود آدمی نے چلا کر جواب دیا۔ "میں کہہ دوں
گا اور تم رجو کا بہت خیال رکھنا ہر جمعرات کی رات کو تعویذ پانی میں گھول کر اس کو پلانا
ہے، ایک بھی جمعرات کا ناغہ نہیں ہونا چاہئے ورنہ سارا کام خراب ہوجائے گا۔"

"ہاں ہاں، میں پورا خیال رکھوں گا۔" دوسرا آدمی ٹرین کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے
چلا رہا تھا۔ ٹرین کی رفتار میں ایک خاص آہنگ اور شرح سے اضافہ ہوتا جارہا تھا اور اسی
آہنگ اور شرح کے ساتھ اس شخص کی رفتار میں بھی اضافہ ہوتا جارہا تھا جو ٹرین کے
ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔

ناصر کی وحشت اب بڑی حد تک دور ہوچکی تھی اور صورت حال میں تبدیلی کے



ساتھ ہی اس نے اپنے گرد و پیش سے کسی حد تک محظوظ ہونا شروع کردیا تھا۔ ڈبے کے
اندر گھٹن بہت کم ہوگئی ٹرین کے حرکت میں آنے کے ساتھ ہی ہوا کے جھونکے آنے لگے
تھے۔ چھت میں لگے ہوئے پنکھے بھی ٹرین کے چلنے کے ساتھ ہی چل پڑے تھے گرمی کم
ہوگئی تھی۔

ٹرین کی رفتار میں تیزی آتی گئی اور ٹرین کے ساتھ ساتھ بھاگنے والے لوگوں نے
بالآخر بھاگنا بند کردیا اب وہ اپنی اپنی جگہوں پر رک گئے تھے ان میں سے کوئی رومال ہلانے
لگا تھا اور کوئی صرف ہاتھ ہلا رہا تھا۔ ڈبوں کے اندر موجود ان کے دوست احباب یا عزیز
و اقارب کھڑکیوں میں کھڑے ہوئے جواباً ہاتھ ہلا رہے تھے ٹرین باقاعدہ چل پڑی تھی باہر
کے مناظر نے بھاگنا شروع کردیا تھا ان کے بھاگنے کی رفتار بڑھتی جارہی تھی۔

مسعود نے ناصر کو بہت سی باتیں پہلے ہی سمجھا دی تھیں اور اب ناصر کو ٹرین کے سفر
کے دوران ان کا پوری طرح خیال رکھنا تھا۔

"ہم دونوں ہی ابھی چھوٹے ہیں۔" مسعود نے اس کو سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔ "اور
عام طور سے ہماری جیسی عمروں کے لڑکے تنہا ٹرین کا سفر نہیں کرتے۔ کوئی نہ کوئی بڑا ان
کے ساتھ ہوتا ہے ہم دونوں گھر سے بھاگے ہوئے ہیں سفر بھی کوئی چھوٹا سا نہیں ہے لمبا
سفر ہے لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ راستے میں ایک دوسرے سے بہت باتیں کرتے ہیں
ایک دوسرے کے بارے میں معلوم کرتے ہیں کہ وہ کہاں جارہے ہیں، کیوں جارہے ہیں،
کہاں سے آرہے ہیں، کہاں کے رہنے والے ہیں، کیا کرتے ہیں.....؟ مطلب یہ کہ بہت
سی باتیں کرتے ہیں۔ ہم دونوں سے بھی راستے میں ڈبے کے دوسرے لوگ پوچھ سکتے ہیں
کہ ہم کون ہیں اور اکیلے کہاں جارہے ہیں تو اس بارے میں پہلے سے سوچ لینا ہے کہ ہم
دونوں کو کیا کہنا ہے اور ہم دونوں کی بات میں فرق نہیں ہونا چاہئے۔"

تیرہ سالہ مسعود کا ذہن بہت باریک بینی کے ساتھ معاملات کا جائزہ لے رہا تھا وہ اپنی
عمر سے کہیں زیادہ بڑھ کر قوتِ جزرسی کا مظاہرہ کررہا تھا اور اس سے کام لے رہا تھا
حالات نے اسے بہت کچھ سکھایا تھا اور وہ حالات سے بہت کچھ سیکھتا جارہا تھا۔

"اگر کسی کو ذرا سا بھی شبہ ہوگیا کہ ہم دونوں چھپ کر اپنے گھروں سے بھاگے ہیں
تو ہم کو پکڑ کر پولیس کے حوالے کردیا جائے گا اور ہم واپس وہیں پہنچ جائیں گے جہاں سے
ہم چلے تھے۔" اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے ناصر کو سمجھایا تھا۔ "اس لئے سب
سے پہلی کوشش تو یہ ہوگی کہ ہم لوگ خود کسی سے بات ہی نہ کریں اور اگر کوئی شخص

خود ہی ہم سے بات کرنے پر اصرار کرتا ہے تو ہم اس کو اپنے بارے میں یہ بتائیں کہ
اپنے رشتے داروں کے پاس کراچی جارہے ہیں جو ہمیں لینے کے لئے کراچی کے ریل
اسٹیشن پر آئیں گے اور ہاں..... کوئی پوچھے کہ کون سے اسٹیشن پر تو کہنا کہ کینٹ
اسٹیشن پر..... ہم لوگوں کو کینٹ کے اسٹیشن پر ہی اترنا ہے میرے پڑوس میں رہ
والے قلی نے مجھ کو بتایا ہے کہ کراچی جانے والی گاڑیاں کینٹ اسٹیشن پر تقریباً خالی ہو
ہیں۔ سٹی اسٹیشن تک پہنچتے پہنچتے ان میں مسافروں کی بہت تھوڑی سی تعداد باقی رہ
ہے اور کئی گاڑیاں تو ایسی ہیں جو کینٹ اسٹیشن پر جاکر ختم ہی ہو جاتی ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" ناصر نے بڑی سعادت کے ساتھ کہا تھا۔ "میں یہی کہوں گا۔"

مسعود نے ایک ڈھیلی ڈھالی سی کہانی تیار کرلی تھی اور وہ ناصر کو اچھی طرح یاد
دی تھی۔ ٹرین میں مسافروں کے سوالوں کے جواب میں ان دونوں کو ایک ہی کہانی
تھی۔ وہ چچازاد بھائی ہیں' ان کے والدین پہلے سے کراچی میں موجود ہیں اور اب وہ
کے پاس کراچی جارہے ہیں وہ اسٹیشن پر جائیں گے' انہیں اطلاع دے دی گئی ہے وغ
وغیرہ۔

گاڑی کی رفتار اب بہت تیز ہوگئی تھی اور ناصر اپنی زندگی کے اس پہلے اور
نوعیت کے تجربے سے پوری طرح لطف اندوز ہورہا تھا۔ ڈبے میں اب ایک قسم
پُرسکون فضا طاری تھی وہ اور مسعود دونوں کھڑکی کے قریب کھڑے ہوئے تھے بیٹھنے کی
تو نہیں ملی تھی تاہم وہ فرش پر بیٹھ سکتے تھے لیکن ان کو ابھی بیٹھنے کی جلدی نہیں تھی۔

ناصر کے لئے یہ سب کچھ بہت ہی عجیب وغریب' مسحور کن اور دل آویز تھا
کے چلنے سے جو ایک مخصوص قسم کی یکساں آواز پیدا ہورہی تھی' وہ اس وقت اس
لئے دنیا کی سب سے زیادہ سریلی اور شیریں موسیقی کی حیثیت رکھتی تھی۔ ٹرین تیزی
بھاگ رہی تھی اور ایسا لگتا تھا جیسے ٹرین کے باہر کی ساری دنیا بھاگ رہی ہے' مناظر کو
قدر تیزی سے بھاگ اور بدل رہے تھے' درخت مکان' کھیت' باغات' ٹیلے' جھاڑیاں
راستے' پگڈنڈیاں سب بھاگ رہے تھے۔ ناصر نے آج تک چیزوں کو اس طرح سے بھاگ
نہیں دیکھا تھا' اس نے ٹرین کو اور سڑک پر چلنے والی گاڑیوں کو تو بھاگتے ہوئے ضرور دیکھا
تھا لیکن اپنی جگہ پر قائم اور منجمد چیزوں کو بھاگتے ہوئے دیکھنا' اس کا پہلا تجربہ تھا اس
آنکھیں اس تجربے کی دید میں جیسے ڈوب کر رہ گئی تھیں۔ باہر ہر چیز بھاگ رہی تھی ایک
زناٹے کے ساتھ شور مچاتی ہوئی' گھڑگھڑاتی ہوئی' تیزی سے جھپٹتی ہوئی' ایک جھلک



کر غائب ہوتی ہوئی۔

مسعود بھی ناصر کے پاس ہی کھڑا ہوا تھا اور ناصر کا بیساختہ جی چاہ رہا تھا کہ وہ مسعود
سے پوچھے کہ ٹرین سے باہر کی چیزیں اس طرح تیزی سے بھاگتی ہوئی کیوں دکھائی دیتی ہیں
لیکن وہ مسعود سے کوئی فالتو بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مسعود نے پہلے ہی اس کو اچھی طرح
سے سمجھا دیا تھا کہ وہ ٹرین میں خود اس سے بھی کوئی فالتو بات نہ کرے اور خاموش
رہے۔ یہی بہتر ہوگا۔ اس نے ناصر کو سمجھایا تھا۔ "کیا معلوم کسی وقت کون سی ایسی بات
زبان سے نکل جائے جس کے باعث ہمیں کسی دشواری کا سامنا کرنا پڑ جائے۔" مسعود خود
بھی خوف کی گرفت میں تھا اور وہ ہر ہر بات کو اچھی طرح سے سوچ سوچ کر بچاؤ اور تحفظ
کی راہیں تلاش کررہا تھا اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی فطری خواہش کا دباؤ اسے خود بھی
طرح طرح کی راہیں دکھا رہا تھا۔

دور کہیں کہیں گرد کے بگولے اٹھ رہے تھے جو تیزی کے ساتھ چکر کھاتے ہوئے
فضا میں بلند ہوتے جیسے' کسی غیر مرئی ہاتھ نے اچانک فضا میں گردوغبار سے ایک نظر نہ
آنے والا مینار بنا دیا ہو اور پھر آن کی آن میں وہ مینار فضا میں تحلیل ہوکر دوبارہ گرد اور
مٹی کی شکل اختیار کرجاتا ہو۔ بڑا عجیب اور پُراسرار قسم کا کھیل تھا ناصر کی آنکھیں اس
کھیل کو دیکھنے میں محو تھیں۔

سفید' چمکیلی' براق ایسی' اجلی اجلی' دھلی دھلائی دھوپ کی لامتناہی چادر دور دور تک
پھیلی ہوئی تھی۔ جہاں تک نظر کام کرتی تھی' دھوپ کی اجلی اور سفید چادر بچھی ہوئی نظر
آتی تھی۔ ناصر کو دھوپ کبھی اتنی اچھی نہیں لگی جتنی اچھی وہ اس وقت لگ رہی تھی ہر
چیز کس قدر اجلی' کس قدر صاف ستھری تھی۔ دھوپ میں موجود حرارت آمیز سفیدی ناصر
کو کبھی بھی اتنی زیادہ دلکش نہیں لگی تھی کس قدر اجالا تھا دور دور تک کی چیزیں صاف
نظر آرہی تھیں۔

"اتنا زیادہ باہر مت دیکھو بیٹا۔" اچانک ایک نامانوس اور اجنبی آواز سن کر ناصر اور
مسعود دونوں ہی چونک پڑے سیٹ پر بیٹھا ہوا ایک عمر رسیدہ آدمی جس کے چہرے پر ایک
چھوٹی سی کھچڑی داڑھی بھی تھی' ان سے مخاطب تھا۔ اس کے لہجے میں نرمی اور شفقت
تھی۔ "زیادہ دیر ٹرین کے باہر دیکھنے سے آنکھوں میں گردوغبار بھر جاتا ہے اور تکلیف
ہونے لگتی ہے۔" عمر رسیدہ شخص نے کہا۔ "تھوڑی دیر کے لئے اندر بیٹھ جاؤ۔ اس کے
بعد دوبارہ جھانکنا۔"

ناصر اور مسعود دونوں نے اس کے مشورے بلکہ ہدایت پر فوری طور پر عمل کیا۔ دونوں نے اپنے اپنے سر اندر کر لئے عمر رسیدہ آدمی غور سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔" اس نے ان دونوں سے کہا۔ "کھڑے کھڑے تھک جاؤ گے اگلے اسٹیشن پر کچھ لوگ اتریں گے' جگہ خالی ہوگی تم لوگ بیٹھ جانا ابھی نیچے فرش پر ہی بیٹھ جاؤ۔"

وہ دونوں خاموشی سے نیچے فرش پر بیٹھ گئے۔ ان میں سے کسی نے بھی اس آدمی کی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا ناصر کو مسعود کی دی ہوئی ساری ہدایات اچھی طرح یاد تھیں اسے زیادہ سے زیادہ وقت خاموش رہنا تھا' کسی سے بھی بات نہیں کرنی تھی' سخت ضرورت کے تحت بات چیت کرنے کی ذمہ داری صرف مسعود کی تھی ناصر کی نہیں۔

مسرت' حیرت اور تجسس کے ساتھ ساتھ خوف کا جذبہ بھی دامن گیر تھا بلکہ اس وقت جبکہ نامعلوم شخص نے ان سے بات چیت کا سلسلہ شروع کر دیا تھا' ان دونوں کی ہی قلبی کیفیت میں خوف کا عنصر زیادہ غالب آگیا تھا' دونوں اپنی اپنی جگہ پر فوراً اور زیادہ محتاط ہوگئے تھے انہوں نے اس شخص کی طرف صرف ایک لمحے کے لئے دیکھا جس نے ان کو بیٹھنے کا مشورہ دیا تھا اور پھر نظریں گھمالیں وہ دونوں فرش کو دیکھنے لگے اس شخص کی طرف دیکھنے سے اس بات کا خدشہ تھا کہ وہ کوئی سوال کر بیٹھے گا اور بات چیت کا سلسلہ شروع کرنے کی کوشش کرے گا وہ شخص اگر چاہتا تو تھوڑا سا ایک طرف کو سرک کر ان دونوں میں سے کم از کم ایک کے بیٹھنے کے لئے تو تھوڑی سی جگہ نکال سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اس نے ان دونوں کو نیچے بیٹھ جانے کا مشورہ دیا۔

گاڑی تیز رفتاری کے ساتھ بھاگی چلی جارہی تھی اور ناصر کا ذہن اب دوسری بہت سی باتوں میں الجھنے لگا تھا ٹرین میں بیٹھنے اور ٹرین کے چلنے کی ابتدائی سنسنی اب کسی حد تک کم ہو چکی تھی اور سرشاری کے وہ ابتدائی لمحات گزر گئے تھے اب سرشاری کی جو کیفیت تھی' اس میں ایک دھیماپن تھا' ایک آہستہ روی تھی' دھیرے دھیرے بہنے والا ایک منظم انداز تھا ذہن اب دوسری باتوں کی طرف بھی جاسکتا تھا۔

"بھٹے میں ہم دونوں کا انتظار کیا گیا ہو گا بلکہ اب بھی کیا جارہا ہو گا۔" ناصر سوچ رہا تھا۔ "فخرو حرامزادہ کتنے غصے میں ہو گا' اس نے حاجی کو اطلاع دے دی ہوگی اور حاجی نے فوراً ہی منشی امیر علی کو ہدایت دے دی ہوگی کہ ہم دونوں کی ایک ایک دن کی تنخواہ کاٹ لی جائے' خبیث کہیں کے' سب کے سب اور پھر..... پھر شام کو کیا ہو گا؟"



جو کچھ شام کو ہونے والا تھا' اس کا تصور کر کے اس کا دل لرز اٹھا اماں چوہدریوں کے ہاں کام پر سے واپس آئیں گی اور اس کا انتظار کریں گی وہ نہیں آئے گا' اماں پریشان ہوں گی۔ آپا بھی پریشان ہونے لگیں گی پھر کافی دیر گزر جائے گی تو اماں بہت زیادہ پریشان ہو جائیں گی وہ شاید ماسی خیراں کو اپنے ساتھ لے کر بھٹے پر جائیں تو وہاں ان کو معلوم ہو گا تو وہ بھی رونے لگیں گی وہ دونوں ہی روئیں گی اور جنت کے ساتھ نصرت بھی روئے گی اور صغرا بھی اور کلثوم بھی..... وہ سب روئیں گی اماں مجھے کہاں تلاش کریں گی؟ اور خبیث..... حاجی مدد علی..... وہ منشی امیر..... وہ اماں سے کیا کہیں گے؟ اماں ان سے کیا کہیں گی؟ یکبارگی اس پر رقت سی طاری ہونے لگی چند لمحوں کے لئے اس کا جی چاہا کہ ٹرین رک جائے اور واپس چل پڑے وہ ایک بار پھر واپس سیالکوٹ کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ جائے اور وہاں سے بس میں بیٹھ کر سیدھا اپنے گھر پہنچے اور بھاگتا ہوا جاکر اپنی ماں سے لپٹ جائے۔ "ماں..... میں کہیں نہیں گیا ہوں میں تو یہیں ہوں اماں..... یہیں' تم لوگوں کے پاس میں بھلا کہاں گیا ہوں۔" لیکن اماں تو ابھی گھر پر ہوں گی ہی نہیں وہ تو چوہدریوں کے ہاں کام کرنے گئی ہوئی ہوں گی گھر میں تو بس آپا ہوں گی اور چھوٹی بہنیں..... یہ صرف ایک جذباتی رو تھی جو بڑی شدت کے ساتھ اس کے دماغ میں ابھری اور اس کے وجود کو لرزاتی ہوئی' اس کی آنکھوں کو نم کرتی ہوئی گزرتی چلی گئی وہ جانتا تھا کہ جس راہ پر وہ قدم رکھ چکا تھا' فی الحال اس سے پلٹ کر آنا ناممکن تھا تاہم یہ سب کچھ سوچ کر اس پر رقت طاری ہوگئی اور اس کی آنکھوں میں نمی بھر گئی وہ اپنے آپ کو رونے سے روکنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

اس نے اپنے سر کو دونوں گھٹنوں میں دبا لیا اور کچھوے کی طرح دبک کر خود کو فرش پر اچھی طرح سے جمایا۔ اس طرح وہ خود کو اپنے گرد و پیش سے الگ کر لینا چاہتا تھا۔ ٹرین کی آواز ایک مسلسل آہنگ کے ساتھ جاری تھی اس آہنگ میں کسی وقت سر مو فرق نہیں محسوس ہوتا تھا بس بالکل یکساں آواز تھی جو اپنے یکساں زیر و بم کے ساتھ سنائی دے رہی تھی اس نے کن انکھیوں سے مسعود کی طرف دیکھا وہ بھی اس کے برابر فرش پر خاموش بیٹھا ہوا تھا لیکن اس نے اپنے سر کو دونوں گھٹنوں کے درمیان نہیں چھپایا تھا وہ اپنی گردن سیدھی کئے بیٹھا تھا البتہ وہ اِدھر اُدھر دیکھ نہیں رہا تھا۔

ڈبے میں موجود کچھ لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے' کچھ خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور کچھ اونگھ رہے تھے۔ بڑی اجنبی اور بوجھل سی فضا تھی اور ناصر اپنے آپ کو اچانک

کسی قیدی کی طرح بے بس محسوس کرنے لگا تھا وہ کوشش کر رہا تھا کہ خوف کے جذبے کو اپنے دل سے نکال پھینکے یا اس کی شدت کو کم کردے لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس وقت جس جذبے کا اس پر سب سے زیادہ شدت کے ساتھ غلبہ تھا' وہ خوف کا ہی جذبہ تھا اور اس اجنبی اور نامعلوم شخص کے بات کرنے کے بعد سے بس یہی ایک جذبہ اس پر پوری طرح غالب تھا۔

وقت گزرتا جارہا تھا' ٹرین اپنی یکساں رفتار سے گھڑگھڑاتی' شور مچاتی چلی جارہی تھی ناصر کی آنکھیں اب بھاگتے ہوئے مناظر کو نہیں دیکھ پارہی تھیں لیکن اس کو اس بات کا بخوبی علم تھا کہ مناظر کی بھاگ دوڑ کا سلسلہ جاری ہے اور ہر گزرتا ہوا لمحہ اسے اس کے گھر سے' گھر والوں سے دور تر کرتا جارہا ہے۔

☆==========☆==========☆

بہت دیر گزر گئی اور بیٹھے بیٹھے ناصر کے گھٹنے دکھنے لگے اچانک اسے خیال آیا کتنا زمانہ گزر گیا ایک سال سے کچھ زیادہ کا وقت کہ وہ اس طرح سے خالی نہیں بیٹھا تھا اور یوں خالی بیٹھنے کی عادت ہی نہیں رہی تھی۔

سارا دن کام کرتے ہوئے جان توڑ مشقت میں گزر جاتا تھا اور پھر شام کو جب وہ تھکا ہارا گھر پہنچتا تھا تو اس کی ہڈی ہڈی درد کر رہی ہوتی تھی۔

کھانا وغیرہ کھانے کے کچھ دیر کے بعد سو ہی جانا ہوتا تھا نیند کے مارے آنکھیں بند ہونے لگتی تھیں اگلے دن علی الصبح منہ اندھیرے اٹھنا ہوتا تھا کام پر ذرا سی دیر ہو جانے سے ایک قیامت برپا ہو جاتی۔ فخرو کی گالیاں اور تھپڑ..... اف خدا..... خدا جانے وہ منحوس لعنتی آدمی کس وقت بھٹے میں آجاتا تھا کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ بھٹے پر پہنچا ہو اور اس نے وہاں فخرو کو موجود نہ پایا ہو حالانکہ وہ بھٹے میں نہیں رہتا تھا اس کا گھر تو کہیں دور تھا۔

ناصر خالی بیٹھنے کی مہلت کے بارے میں سوچ رہا تھا یہ تو ایک ایسی عیاشی تھی جس کا تصور ہی اس کے دماغ سے نکل چکا تھا۔ خالی بیٹھنا کیا ہوتا ہے؟ خالی کس طرح بیٹھا جاتا ہے.....؟ وہ سب بھول چکا تھا اور آج اتنے دنوں کے بعد اچانک اسے یہ احساس ہوا کہ وہ خالی بیٹھا ہوا ہے خالی بیٹھنے کی عیاشی..... اس نے کب سے یہ عیاشی نہیں کی تھی۔

رات بڑی کشمکش اور ذہنی دباؤ کے عالم میں گزر رہی تھی اور اسے ٹھیک سے نیند بھی نہیں آسکی تھی اور پھر صبح سے ہی ایک اور بالکل نئی قسم کی جدوجہد شروع ہو گئی تھی



جس کے بعد یہ خالی بیٹھنے کا مرحلہ آگیا تھا اور خالی بیٹھے بیٹھے ناصر کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اسے وقت کا کوئی اندازہ نہیں تھا اگر وہ اس وقت بھٹے میں ہوتا تو اس کو بخوبی علم ہوتا کہ اب کیا وقت ہوا ہے اگرچہ بھٹے میں کام کرنے والے کسی بھی لڑکے پاس گھڑی نہیں تھی لیکن پھر بھی وہ لوگ کسی نہ کسی طرح وقت معلوم کر لیتے تھے۔ گھڑی فخرو کے ہاتھ میں ہوتی تھی یا منشی امیر علی کے ہاتھ میں ہوتی تھی اور حاجی مدد علی قریشی کے ہاتھ میں بھی..... لیکن کسی لڑکے میں اتنی جرأت نہ تھی کہ ان میں سے کسی سے وقت پوچھے..... ان لوگوں سے تو بات کرتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ دھوپ کے اتار چڑھاؤ سے اذانوں کی آواز سے وہ لوگ وقت کا بالکل صحیح صحیح اندازہ لگا لیتے تھے لیکن اب وہ ساری علامتیں اس سے چھن گئی تھیں وہ بھٹے میں نہیں تھا' وہاں کے مانوس در و دیوار اس کی نظروں کے سامنے نہیں تھے اور وہ یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ دھوپ اب سامنے والی دیوار کے جس حصے تک پہنچی ہے' اس کا کیا مطلب ہے اور اس کے لحاظ سے چھٹی کے وقت میں اب کتنی دیر ہے اب ایسا کچھ نہیں تھا خالی وقت میں خالی بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔ آنکھوں میں نیند بھر گئی تھی اور کچھ دیر کے لئے وہ بے خبر سو گیا۔

یکایک گھبرا کر اس کی آنکھ کھل گئی ڈبے میں ایک دم سے شور مچنے لگا کچھ لوگ اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے وہ اپنا اِدھر اُدھر رکھا ہوا سامان گھسیٹ رہے تھے اور زور زور سے باتیں کر رہے تھے اس کے ساتھ ہی ٹرین کی رفتار میں کمی ہو رہی تھی اس کی گھڑگھڑاہٹ کی آواز بھی بدل گئی تھی ناصر نے سر اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا ڈبے میں موجود تقریباً سارے ہی لوگ مستعد اور چوکس نظر آرہے تھے۔

مسعود اس کے پاس ہی فرش پر بیٹھا ہوا تھا گاڑی کی رفتار کم ہو رہی تھی اور کوئی اسٹیشن آنے والا تھا یہاں کچھ لوگوں کو اترنا تھا جیسا کہ اس اجنبی مسافر نے بتایا تھا اور وہ لوگ اترنے کی تیاری کر رہے تھے مسعود نے ناصر کی طرف دیکھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا ناصر بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا اترنے کی تیاریاں کرنے والے مسافر جلدی جلدی اپنا سامان سنبھال رہے تھے۔ انہوں نے اپنی نشستیں خالی کر دی تھیں مسعود نے ناصر کو اشارہ کیا اور ان دونوں نے جلدی جلدی خالی نشستوں پر قبضہ کر لیا کچھ اور مسافر بھی کھڑے ہوئے تھے انہیں بھی بیٹھنے کی جگہ مل گئی۔

ناصر کو ایک بار پھر باہر کی طرف دیکھنے کا موقع مل گیا تھا اسے بیٹھنے کے لئے جو جگہ

ملی تھی' وہ کھڑکی کے برابر تھی اور اب ایک بار پھر وہ باہر کا منظر دیکھ سکتا تھا بھاگتے ہوئے مناظر ایک بار پھر نظر آنے لگے تھے لیکن اس بار ان کے بھاگنے کی رفتار سست تھی اور برابر سست ہوتی جا رہی تھی پھر ایک دم سے ریل کی پٹڑیوں کی تعداد بڑھنے لگی ٹرین کے برابر دوسری پٹڑی نمودار ہو گئی اور اس کے برابر ایک اور پٹڑی.....

اسٹیشن آ رہا تھا اب ناصر دور سے اسٹیشن کی عمارت کو اور اس کے پلیٹ فارم پر موجود بہت سے لوگوں کو بہ آسانی دیکھ سکتا تھا۔ شروع شروع میں منظر دھندلا اور چھوٹا تھا لیکن پھر وہ صاف اور بڑا ہوتا گیا یہاں تک کہ گاڑی پلیٹ فارم پر پہنچ کر رک گئی اور اس کے ساتھ ہی زبردست شوروغل کی آوازیں ہر طرف سے گونجنے لگیں ناصر ایک بار پھر اس پُرکشش اور دل آویز منظر کے سحر میں گم ہو گیا۔

پلیٹ فارم پر ایک ہلچل مچی ہوئی تھی' قلی سامان اپنے کندھوں اور سروں پر لادے ہوئے تھے۔ بڑی تیزی کے ساتھ اِدھر سے اُدھر لوگ بھاگ رہے تھے لوگ چلا چلا کر ایک دوسرے کو آوازیں دے رہے اور ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے' خوانچے والے اور ٹھیلے والے زور زور سے صدائیں لگا رہے تھے' ایک آدمی بڑا سا سماوار اور مٹی کے کلھڑ ہاتھ میں لئے "گرم چائے..... گرم چائے" کی صدا لگا رہا تھا کچھ لوگ ڈبوں سے اتر رہے تھے' کچھ اندر داخل ہو رہے تھے' ناصر ان سارے مناظر کی دلفریبی میں گم ہو کر رہ گیا۔ اس کے لئے یہ سب کچھ نیا تھا اسے یوں لگ رہا تھا جیسے ایک نئی دنیا اپنے آپ کو اس پر منکشف کر رہی ہے یہ سب کچھ بالکل نیا حیرت انگیز اور پُرتحیر تھا اسے بار بار احساس بھی ہو رہا تھا کہ دنیا میں کتنا کچھ موجود ہے جس سے وہ بالکل بھی واقف نہیں ہے جس کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتا۔

کچھ نئے مسافر اس ڈبے میں بھی داخل ہو گئے جو پہلے ہی بھرا ہوا تھا اور جس میں بالکل جگہ نہیں تھی مسافروں سے زیادہ ان کے سامان کو جگہ کی ضرورت تھی انہوں نے کسی نہ کسی طرح ٹھونس ٹھانس کر اپنا سامان ڈبے میں بھر دیا اور پھر خود کو بھی ڈبے کے اندر بھر لیا بہت سارے لوگ تھے۔ اور اب تو اس میں اِدھر سے اُدھر چلنے کی بھی جگہ نہیں رہی تھی ناصر کو ایک بار پھر اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

تاہم گاڑی اس اسٹیشن پر زیادہ نہیں رکی ذرا ہی دیر بعد اس نے زور سے سیٹی بجائی ریل کی سیٹی کی آواز اتنی تیز تھی کہ وہ شوروغل کی باقی تمام آوازوں کی طرح طرح کے پیوند لگی موٹی چادر کو چیرتی پھاڑتی چلی گئی اس کی گونج سے ساری فضا جیسے لبالب بھر گئی



اور اس کے ساتھ ہی پلیٹ فارم پر اور ٹرین کے اندر ڈبوں میں سرگرمی کے ایک نئے مرحلے کا آغاز ہو گیا۔

ناصر نے دیکھا کہ اس ڈبے میں جو لوگ ابھی ذرا دیر پہلے اس اسٹیشن سے داخل ہوئے تھے ان میں سے کچھ جلدی جلدی ڈبے میں سے اتر کر پلیٹ فارم پر جا رہے تھے تاہم ڈبے میں موجود لوگوں کے ساتھ ان کی باتوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا بلکہ ریل کے سیٹی دینے کے بعد سے اس میں یکبارگی تیزی و تندی پیدا ہو گئی تھی۔

ٹرین اس اسٹیشن سے روانہ ہو گئی آہستہ آہستہ پھر تیز تیز اور پھر خوب تیز..... وہی سب کچھ تھا جو اس سے پہلے تھا مناظر ایک بار پھر تیزی سے بھاگ رہے تھے لیکن اب فرق محسوس ہوتا تھا دھوپ کی بے حد باریک اور سفید چادر میں اب کچھ مٹیالا پن نمودار ہونا شروع ہو گیا تھا دن ڈھل رہا تھا سورج نصف النہار پر پہنچنے کے بعد اب تیزی سے اپنی آخری منزل کی طرف روانہ تھا ڈبے کے اندر قدرے خاموشی تھی۔

کھانے کا وقت تو نہ جانے کب کا گزر چکا تھا نہ تو مسعود کو اس کا خیال آیا تھا اور نہ ناصر کو..... دونوں اپنے اپنے خیالات میں اتنے زیادہ محو تھے کہ انہیں بھوک کا بھی احساس نہیں ہوا۔ پھر اچانک ناصر کو ہی یہ خیال آیا کہ کھانے کی پوٹلیاں تو ان دونوں کے پاس موجود ہیں جنہیں وہ صبح اپنے اپنے گھروں سے لے کر چلے تھے اور اس خیال کے ساتھ ہی اسے بھوک کا بھی احساس ہوا۔

"اب کھانا کھا لینا چاہئے۔" اس نے مسعود کی طرف دیکھ کر بہت آہستہ سے کہا جب سے وہ دونوں ٹرین میں سوار ہوئے تھے' ان کے درمیان یہ پہلی گفتگو ہوئی تھی مسعود کی سخت ہدایت کے تحت اس نے مسعود سے کوئی بات نہیں کی تھی اور خود مسعود نے بھی اس سے کوئی بات نہیں کی تھی دونوں تقریباً اجنبیوں کی طرح خاموش تھے۔

"ہاں۔" مسعود اس کی بات سن کر جیسے چونک پڑا۔ "میں تو بھول ہی گیا تھا..... ہاں اب کھانا کھا لینا چاہئے۔"

ان دونوں نے اپنی اپنی پوٹلیاں کھول لیں اور وہیں سیٹ پر بیٹھے بیٹھے خاموشی سے کھانا کھانے لگے ان کے پاس ان پوٹلیوں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا تاہم مسعود نے ایک کام یہ کیا تھا کہ سیالکوٹ کے ریلوے اسٹیشن پر سے المونیم کا ایک گلاس خرید لیا تھا جو اسے ایک اسٹال پر مل گیا تھا یہ گلاس اب ان دونوں کے لئے بڑے ہی کام کی چیز ثابت ہو رہا تھا۔

انہوں نے ذرا دیر میں کھانا ختم کر لیا اور پھر مسعود گلاس ہاتھ میں لے کر پانی
لیے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس کے پاس کوئی لوٹا یا صراحی وغیرہ نہیں تھی جس میں
موجود ہوتا۔

"سیٹ کے نیچے صراحی رکھی ہے اس میں سے پانی لے لو۔" اس اجنبی مسافر نے
جس نے ان سے کافی پہلے بات کی تھی مسعود نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا
خاموشی سے سیٹ کے نیچے رکھی ہوئی صراحی میں سے پانی نکال کر گلاس میں بھر لیا پہلے خود
پیا اور پھر دوسرا گلاس بھر کر ناصر کو دے دیا۔

"تم دونوں کے ساتھ اور کون ہے؟" اجنبی مسافر نے ان سے پوچھا جواب دینے کی
ذمہ داری ناصر کی نہیں مسعود کی تھی لیکن ناصر کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا سوال کا انداز
ہی ایسا تھا گویا اس شخص نے یہ بات فرض کر لی تھی کہ ان دونوں کے ساتھ کسی اور کو بھی
ہونا چاہئے تھا۔

"ہم اکیلے ہی ہیں۔" مسعود نے آہستگی سے جواب دیا اور پھر اپنا منہ دوسری طرف
کر لیا اس مختصر سے جواب کے بعد وہ اور کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا۔

لیکن اجنبی مسافر بھی آسانی سے ان کا پیچھا چھوڑنے والا نہیں تھا۔ "آپ کے
ہو.....؟" اس نے غور سے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کہاں جا
رہے ہو.....؟ اکیلے کیوں جا رہے ہو۔"

"ہمارے والدین ہمیں لینے کے لئے اسٹیشن پر آجائیں گے۔" مسعود نے ادھورا
جواب دیا وہ اپنے آپ کو پوری طرح سے سنبھالے ہوئے تھا اور اس کی کوشش تھی کہ
اس کے چہرے اور انداز گفتگو سے کسی قسم کی گھبراہٹ کا اظہار نہ ہونے پائے۔ ناصر اس
کے قریب ہی بیٹھا ہوا دل ہی دل میں سہم رہا تھا۔

"اچھا.....؟" اجنبی مسافر نے کہا۔ "مگر جا کہاں رہے ہو.....؟"

"کراچی۔" مسعود نے کہا اور پھر وہ جلدی سے ناصر سے مخاطب ہو کر بولا۔ "اور
پانی تو نہیں چاہئے۔" یہ ایک بالکل فاضل سوال تھا اور محض اجنبی مسافر سے بات چیت کا
سلسلہ منقطع کرنے کے لئے کیا گیا تھا ناصر فوراً ہی مسعود کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

"نہیں....." اس نے کہا۔ "اتنا کافی تھا۔" اور اس کے ساتھ ہی وہ کھڑکی کے باہر
دیکھنے لگا مسعود بھی دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اجنبی مسافر خاموش ہو گیا شاید اور زیادہ باتیں
کرنا چاہتا تھا لیکن دونوں لڑکوں میں سے کوئی بھی اس سے باتیں کرنے اور اس کے



سوالوں کے جوابات دینے کا خواہشمند نظر نہیں آتا تھا اس لئے اس نے بھی فی الحال
خاموشی اختیار کی اور پھر کچھ دیر کے بعد وہ ڈبے میں پچھلے اسٹیشن سے سوار ہونے والے
نئے مسافروں سے باتوں میں مصروف ہو گیا۔ ناصر نے قدرے اطمینان کا سانس لیا تاہم وہ
پوری طرح سے مطمئن نہیں تھا اجنبی مسافر کسی وقت بھی دوبارہ سلسلہ گفتگو شروع کر
سکتا تھا۔

ٹرین اپنی یکساں رفتار سے چلی جا رہی تھی اور اب باہر دھوپ کا رنگ زیادہ میلا ہوتا
جا رہا تھا اس کی سفیدی اور چمک بہت دیر ہوئی رخصت ہو چکی تھی اور اب اس کے ملگجے
پن میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا دن ڈھل رہا تھا۔

ہر وہ لمحہ جو گزر رہا تھا۔ وہ ناصر کو اس کے گھر سے اور اس کے گھر والوں سے اس
کے شہر سے زیادہ سے زیادہ دور کر رہا تھا اور ناصر کے ذہن میں رہ رہ کر بہت سی باتیں ابھر
رہی تھیں یکایک یہ کیا ہو گیا تھا۔ باتیں یادیں بنتی جا رہی تھیں' حال ماضی میں ڈھلتا جا رہا
تھا سب کچھ بدل رہا تھا بڑی تیزی سے بدل رہا تھا اس کے اردگرد کی دنیا بدل رہی تھی۔
اس نے تو کبھی بھی اپنے علاقے سے باہر قدم نہیں نکالا تھا۔ اس کی دنیا زیادہ سے زیادہ اپنی
بستی سے لے کر شہر سیالکوٹ تک محدود تھی اور اب وہ نہ جانے کون کون سے اجنبی اور
نامانوس علاقوں سے گزر رہا تھا یہ سارے علاقے اس کے لئے نئے تھے یہ سارے مناظر
نئے تھے وہ کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا بڑی توجہ انہماک اور استغراق کے عالم میں باہر دیکھ رہا
تھا۔ ٹرین کبھی کسی ویران علاقے سے گزرتی اور کبھی کسی آبادی سے..... ناصر کو گاؤں
کے کچے پکے مکانات نظر آتے۔ کھیت اور کھلیان نظر آتے ان کے آس پاس چلتے پھرتے
انسان دکھائی دیتے آدمی' عورتیں اور بچے اور مویشی بھی..... اور وہ ان لوگوں کے
بارے میں سوچنے لگتا جو یہاں رہ رہے تھے۔ شاید یہاں بھی کچھ لوگ چوہدریوں کی طرح
مالدار اور کچھ اس کی ماں کی طرح غریب ہوں گے اور وہ چوہدریوں جیسے لوگوں کے گھروں
میں کام کرتے ہوں گے۔ شاید یہاں بھی حاجی مدد علی قریشی جیسے اینٹوں کے بھٹے کے مالک
ہوں گے اور اس جیسے اور مسعود جیسے لڑکے ان بھٹوں میں کام کرتے ہوں گے اور فخرو
جیسے خبیثوں سے مار کھاتے ہوں گے۔ ان لوگوں کے درمیان بھی شاید اس کے ابا جیسے نکمے
بھروچی موجود ہوں گے جو گھر میں سے رقم چرا کر بھاگ جاتے ہوں گے اور سارے گھر
والوں کو عذاب میں مبتلا کر جاتے ہوں گے' یہ لوگ نہ جانے کس طرح رہتے بستے ہوں
گے۔

وہ لوگوں کو دیکھتا بالکل اجنبی انجان لوگوں کو جن کے چہرے بھی اس کو صاف طور سے نظر نہیں آتے تھے اور ان کے بارے میں ان کی زندگیوں کے بارے میں سوچتا اور ٹرین بھاگتی رہی۔ اجنبی مسافر نئے مسافروں کے ساتھ باتیں کر کے تھک گیا تھا اب اپنی سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا اس کی یہ حالت ناصر کے لئے بہت زیادہ اطمینان بخش تھی اگر وہ ایسا ہی رہے اسی طرح تو پھر کتنا اچھا ہو۔

اچانک اس نے محسوس کیا کہ گاڑی کی رفتار ایک بار پھر کم ہونے لگی ہے اس بار واضح طور پر کمی ہو رہی تھی اور اب ناصر جان چکا تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے کوئی اور اسٹیشن آنے والا تھا۔

اسٹیشن آیا اور اس کے ساتھ ہی ہنگاموں کا طوفان بھی' لیکن اس بار اسٹیشن کا پلیٹ فارم اس طرف نہیں آیا تھا جدھر ناصر بیٹھا ہوا تھا بلکہ مخالف سمت میں آیا تھا ادھر کئی متوازی پٹڑیوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا نظر آ رہا تھا جبکہ مخالف سمت لوگوں کا ہجوم تھا اور شور و شغب تھا۔ اس اسٹیشن پر ناصر کے ڈبے میں سے کوئی مسافر نہیں اترا البتہ ایک دو نئے مسافر ڈبے کے اندر داخل ہوئے۔ وہی مناظر تھے جو پچھلے اسٹیشن پر نظر آئے تھے مسافر' خوانچے والے' ٹھیلے والے' چائے والے طرح طرح کی آوازیں لگا کر طرح طرح کی چیزیں فروخت کرنے والے ڈبوں میں گھستے ہوئے اور ڈبوں سے نکلتے ہوئے مسافر..... ناصر اب ان مناظر سے بخوبی واقف ہو چکا تھا۔

کچھ دیر کے بعد ٹرین نے سیٹی دی اور پھر وہ چل پڑی۔ سفر ایک بار پھر شروع ہو گیا تھا اور اس کے بعد کئی اسٹیشن آتے اور جاتے رہے۔ ناصر اور مسعود اپنی اپنی جگہ پر خاموش بیٹھے رہے ڈبے کے اکثر مسافر ایک دوسرے سے باتوں میں مصروف تھے لیکن ان دونوں نے کسی سے بات نہیں کی۔ صرف اجنبی مسافر نے ان سے سلسلہ گفتگو شروع کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ان دونوں کی جانب سے کم گوئی' خشکی اور سرد مہری کے رویے کو دیکھ کر وہ بھی خاموش ہو گیا تھا۔

اب اندھیرا پھیل رہا تھا۔ سورج بڑی تیزی کے ساتھ مغرب کی طرف بھاگ رہا تھا وہ اپنی حرارت' تمازت اور سفید چمک سے محروم ہو چکا تھا اس کی شکل بدل گئی تھی وہ ایک ہلکے چمکدار نارنجی گولے کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔

کتنے دن ہو گئے تھے کہ ناصر نے غروب آفتاب کا منظر ہی نہیں دیکھا تھا اور اس کو یہ احساس بھی نہیں تھا کہ غروب آفتاب کا آتشیں اور رنگین منظر بھی اپنے اندر حسن و



دلکشی کا کوئی پہلو رکھتا ہے۔ سورج تو روز ہی غروب ہوتا تھا لیکن ناصر کی نظر اس طرف اٹھتی ہی نہیں تھی جب سورج غروب ہو رہا ہوتا تھا تو اس وقت بھٹے میں کام کرنے والے تھکے ماندے لڑکے اس عقوبت گاہ کی چار دیواری سے نکل کر اپنے اپنے گھروں کی طرف جانے کے لئے بے چین ہوتے تھے۔ اس وقت ناصر کے لئے اپنے شکستہ گھر کے آنگن کے نیم روشن منظر کے علاوہ اور کوئی بھی دوسرا منظر کوئی معنی نہیں رکھتا تھا سب سے زیادہ خوبصورت پرکشش اور بامعنی گھر کے باورچی خانے کا یا گھر کے آنگن میں پڑی ہوئی اس چارپائی کا منظر ہوتا تھا جہاں ہاتھ منہ دھونے کے بعد بیٹھ کر سکون و اطمینان کے ساتھ کھانا کھایا جا سکتا تھا اور پانی پیا جا سکتا تھا آسمان کے منظر میں کچھ نہیں رکھا تھا آسمان کی طرف تو نظر اٹھتی ہی نہیں تھی جو کچھ چاہئے تھا وہ زمین پر تھا۔

اب اتنے طویل عرصے کے بعد ناصر غروب آفتاب کا منظر دیکھ رہا تھا تو اس منظر کا حیران کن اور ناقابل یقین حسن اسے جیسے مبہوت کئے دے رہا تھا اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی ایسی دنیا میں نکل آیا جو اس کے لئے بالکل اجنبی ہے اور غروب آفتاب کا یہ طلائی سے نارنجی اور نارنجی سے گہرا آتشیں ہو جانے والا منظر اس کے لئے ایک بالکل نئی چیز ہے وہ اس نئی چیز کو گہری محویت کے ساتھ دیکھ رہا تھا اور اس کے سحر میں ڈوب کر رہ گیا تھا۔ سورج کا گولہ اب گہرے آتشیں رنگ کا ہو چکا تھا اور دور افق کے اس کنارے پر جہاں زمین اور آسمان آپس میں ملتے ہوئے نظر آتے ہیں جیسے آگ لگی ہوئی تھی' ٹھنڈی میٹھی نرم اور مہربان آگ..... جس میں بے حد خوبصورت رنگ کھلے ہوئے تھے سورج کا گولہ کبھی اس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتا تھا اور کبھی درختوں ٹیلوں اونچی جھاڑیوں' پہاڑیوں' مکانوں اور عمارتوں کے پیچھے غائب ہو جاتا تھا ایک آنکھ مچولی کا سا کھیل تھا جس میں وہ ایک خاص قسم کا لطف محسوس کر رہا تھا گولے کا رنگ زیادہ سے زیادہ گہرا ہوتا جا رہا تھا اور وہ زیادہ سے زیادہ نیچا بھی ہوتا جا رہا تھا۔

یہ منظر زیادہ دیر تک قائم نہیں رہا اور دیکھتے ہی دیکھتے آسمان کا آتشیں حصہ سیاہ ہو گیا اور سورج کا گولہ غائب ہو گیا اب باہر اندھیرا تھا۔ یکبارگی ناصر کے دل پر وحشت کا حملہ ہوا شام ہو چکی تھی' سورج غروب ہو چکا تھا ہر طرف اندھیرا پھیل گیا تھا بھٹے میں اب چھٹی ہو چکی ہو گی لڑکے اپنے اپنے گھروں کو جانے کے لئے روانہ ہو چکے ہوں گے اور اماں بھی کچھ دیر کے بعد گھر پہنچنے والی ہوں گی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ باہر اندھیرا بہت گہرا ہو گیا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے باہر

کی فضا میں کسی نے توے کی کالک گھول دی ہو' ہر طرف گھور تاریکی تھی اس قدر
اندھیرا ..... ایسی خوفناک تاریکی ناصر نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی یوں لگ
جیسے ٹرین کے باہر کی دنیا سے روشنی کا وجود ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا ہے تاحدِ نظر روشنی
ایک ننھی سی کرن بھی نظر نہیں آتی تھی۔ ناصر کا دل ہولنے لگا اول شب کی یہ فضا
ہی بوجھل' یاس انگیز اور المناک تھی۔ ناصر کا دل بیٹھا جا رہا تھا اسے کچھ نہیں معلوم تھا
وہ اس وقت کہاں ہے اور اپنے گھر سے اور گھر والوں سے کتنی دور ہے وہ تو صرف یہ جان
تھا کہ وہ ان سب کو بہت پیچھے چھوڑ آیا ہے اور فاصلہ دم بدم بڑھ رہا ہے بڑھتا جا رہا ہے
اور اس وقت تک بڑھتا رہے گا جب تک یہ ٹرین کراچی نہ پہنچ جائے۔

ڈبے کے اندر روشنی تھی شام ہوتے ہی چھت میں لگے ہوئے بلب خود بخود روشن
ہو گئے تھے اس کا بہت جی چاہا تھا کہ وہ مسعود سے پوچھے کہ یہ بلب خود بخود کس طرح
روشن ہو گئے لیکن اس نے اپنی زبان کو بند رکھا۔ مسعود خود بھی خاموش تھا۔ اب تک
کے کئی گھنٹوں پر مشتمل سفر کے دوران ان کے درمیان محض چند جملوں کا تبادلہ ہوا
دونوں کے وجود نامعلوم خوف کی اس گہری دھند میں لپٹے ہوئے تھے جسے وہ سیالکوٹ سے
اپنے ساتھ لے کر چلے تھے اس خوف نے ان کی زبانوں کو زیادہ بولنے سے روک رکھا
تھا۔

ڈبے میں روشنی اگرچہ بہت کمزور' زرد' پھیکی اور مریل تھی لیکن پھر بھی یہ کیا
غنیمت تھا کہ وہاں روشنی موجود تھی باہر کا منظر تو اب اس قدر بھیانک تھا کہ کھڑکی سے باہر
دیکھتے ہوئے ڈر لگتا تھا غضب کا خوفناک اندھیرا تھا ناصر کا دل بیٹھا جا رہا تھا اس کا ذہن ایک
بار پھر میلوں کا سفر لمحے کے ہزارویں حصے میں طے کرتا ہوا اپنے گھر کے آنگن میں پہنچ
تھا اور وہ اپنی چشم تصور سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا جس کو دیکھنے کی اس کے اندر تاب
نہیں تھی۔ اماں حیران و پریشان رو رہی تھی ماسی خیراں ان کے ساتھ تھی اماں ابھی ابا
بھٹے سے واپس آئی تھی۔ وہاں جا کر انہیں معلوم ہوا تھا ناصر تو آج کام پر آیا ہی نہیں
روتی پیٹتی گرتی پڑتی اِدھر اُدھر دھکے کھاتی ہوئی گھر واپس آگئی تھیں آپا بھی رو رہی تھی
چھوٹی بہنیں بھی رو رہی تھیں گھر کا چولہا ٹھنڈا پڑا تھا سارے گھر پر سوگواری طاری تھی
اس کی آنکھیں ایک بار پھر بھیگنے لگیں۔ ٹرین کی یکساں آہنگ والی گھڑگھڑاہٹ میں اس
اپنی ماں اور بہنوں کی سسکیوں کی آوازیں گھلی ہوئی محسوس ہوتیں اور اندھیرا اور زیادہ
گہرا ہوتا گیا۔



"اب کوئی اسٹیشن آئے تو کھانا خرید لیں گے۔"

مسعود نے بہت آہستہ سے ناصر سے کہا اور مسعود کے الفاظ جیسے ناصر کے لئے زندگی کی نوید بن گئے۔ بہت دیر کے بعد مسعود نے کچھ کہا تھا اور ناصر کو یکبارگی اپنے زندہ ہونے کا احساس ہوا۔

کچھ دیر کے بعد اسٹیشن آگیا۔ رات ہونے کے بعد یہ پہلا اسٹیشن آیا تھا اور اس کا پلیٹ فارم اس طرف تھا جدھر ناصر بیٹھا ہوا تھا رات کے وقت اسٹیشن کا منظر ہی کچھ اور تھا اسٹیشن کی عمارت میں روشنی ناکافی تھی اور پلیٹ فارم پر کچھ فاصلے پر آتے جاتے بھاگتے دوڑتے چلتے پھرتے لوگ سایوں کی طرح لہراتے ہوئے لگ رہے تھے' مسافروں قلیوں اور خوانچہ فروشوں کی شکلیں صاف نظر نہیں آرہی تھیں۔

جس وقت سے وہ لوگ ٹرین میں سوار ہوئے تھے' اس وقت سے لے کر اب تک گاڑی بہت سارے اسٹیشنوں پر رک چکی تھی کہیں کم دیر کے لئے اور کہیں زیادہ دیر کے لئے اور ان کے ڈبے سے لوگ اتر اتر کر نیچے پلیٹ فارم پر جاتے رہے تھے لیکن وہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر ایسے جم کر بیٹھے تھے کہ ایک بار بھی نیچے نہیں اترے تھے۔ مسعود نے ناصر کو پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ وہ کسی بھی اسٹیشن پر ڈبے سے نیچے نہ اترے کیا معلوم ٹرین اچانک چل پڑے اور وہ پلیٹ فارم پر ہی رہ جائے اس نے مسعود کی ہدایت پر پوری طرح عمل کیا تھا۔

مسعود خود بھی گاڑی سے نیچے نہیں اترا تھا ناصر کی طرح مسعود کا بھی یہ ٹرین کا پہلا سفر تھا۔

اس بار اسٹیشن بہت دیر کے بعد آیا اس دوران ڈبے کے اندر اکثر لوگ اپنے ساتھ موجود کھانا نکال کر کھا رہے تھے۔ اجنبی مسافر نے ایک بار پھر ان دونوں سے بات چیت کی کوشش کرتے ہوئے انہیں اپنے کھانے میں سے کچھ دینے کی کوشش کی لیکن مسعود نے کرلا کر منع کر دیا اس کے بعد اجنبی مسافر تنہا خود ہی کھانے میں مصروف ہو گیا۔

اسٹیشن آیا تو ذرا دیر کے لئے باہر کا منظر روشن ہو گیا۔ دور تک پھیلے ہوئے اندھیرے کے وسیع و عریض سمندر میں روشنی کا ایک جزیرہ نمودار ہوا اور ذرا دیر کے لئے فضا روشنی اور زندگی سے جگمگا اٹھی۔ مسعود نے ایک خوانچہ فروش کو آواز دے کر جو روٹیاں اور کباب بیچ رہا تھا کچھ روٹیاں اور کباب خرید لئے۔ اسٹیشن پر چائے والے بھی تھے لیکن مسعود اور ناصر دونوں میں سے کسی کو بھی زیادہ چائے پینے کی عادت نہیں

تھی۔ انہوں نے ٹرین میں سوار ہونے کے بعد ایک بار بھی چائے نہیں پی تھی۔

ان دونوں نے کھانا کھانا شروع کر دیا ان کا خیال تھا کہ کباب قیمے کے ہوں گے پہلا لقمہ کھاتے ہی انہیں معلوم ہو گیا کہ ایسا نہیں تھا کباب قیمے کے نہیں تھے ان پر صرف دال بھری ہوئی تھی اور وہ بھی باسی اور بدمزہ..... انہوں نے صبر شکر کر کے کھالیا اس کے علاوہ اور کچھ تو ان کے پاس کھانے کو تھا بھی نہیں۔

ڈبے میں بیٹھے ہوئے زیادہ تر لوگ اپنی اپنی نشستوں پر اونگھ رہے تھے' کچھ اپنے لئے اتنی جگہ حاصل کر لی تھی کہ وہ لیٹ گئے تھے کئی لوگ خراٹے لے کر سو رہے تھے۔ ٹرین گھڑگھڑاتی ہوئی اندھیرے کے سینے کو چیرتی ہوئی تیزی سے بھاگی چلی جا رہی تھی اور جس وقت وہ زور سے سیٹی بجاتی تو جیسے تاریک پُراسرار اور خاموش رات کا دل دہل جاتا اور اس کے ساتھ ہی ناصر کا بھی دل دہل جاتا..... نہ جانے کون سی جگہ ہے' لوگ کہاں سے گزر رہے ہیں' گھور اندھیرا اپنے سینے کے اندر نہ جانے کون کون سی بستیوں اور آبادیوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔

ناصر نے اپنی آنکھیں بند کر لیں پیٹ میں کھانا پڑ جانے کے بعد خود بخود غنودگی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی اس کی آنکھوں میں بھاری پن پیدا ہو رہا تھا اور پھر رفتہ رفتہ بے خبر ہو گیا۔ ٹرین کی سمع خراش گھڑگھڑاہٹ جیسے رات کے سناٹے میں شامل ہو کر اس کا ایک حصہ بن گئی تھی اور اب اس کا کوئی علیحدہ وجود باقی نہیں رہا تھا اور اس گھڑگھڑاہٹ کے ساتھ سونا ممکن تھا۔ ناصر اور مسعود دونوں ایک دوسرے کے کندھوں پر سر رکھے ہوئے سو رہے تھے۔

رات کا وہ نہ جانے کون سا وقت تھا جب ناصر کی آنکھ کھل گئی۔ اس کی آنکھ نیند میں ہونے والی کسی غیر معمولی سرگرمی کی وجہ سے کھلی تھی۔ اس نے مسعود کو دیکھا اس کے قریب بیٹھا ہوا پوری طرح ہوشیار تھا' ڈبے میں سفید وردی میں کھڑا ہوا ایک شخص جس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پلاس تھا مسافروں سے ان کے ٹکٹ مانگ رہا تھا چیک کر رہا تھا۔

ان دونوں نے پہلے ہی یہ بات طے کر لی تھی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ مسعود نے طے کر لی تھی کہ وہ بلا ٹکٹ سفر کرنے کی حماقت ہرگز نہیں کریں گے اور ساتھ ہی یہ بھی کیا تھا کہ مسعود اپنے لئے پورا اور ناصر کے لئے آدھا ٹکٹ خریدے گا گو کہ مسعود کے لئے بھی آدھا ٹکٹ خرید سکتا تھا اور یہ کہہ سکتا تھا کہ اس کی عمر ابھی بارہ سال ہے



جبکہ فی الحقیقت وہ تیرہ سال کا تھا لیکن وہ جان بوجھ کر کوئی تنازع نہیں کھڑا کرنا چاہتا تھا تھوڑا سا خرچہ زیادہ سہی لیکن اس نے اپنے لئے پورا ٹکٹ خریدا۔ ٹکٹ چیکر سب کے ٹکٹ چیک کرتا ہوا ان دونوں کے پاس آیا وہ پہلے مسعود کے پاس پہنچا۔ "کس کے ساتھ ہو تم.....؟" اس نے مسعود سے سوال کیا۔ "مسعود نے فوراً ناصر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا اور اپنی جیب میں سے ٹکٹ نکال کر ٹکٹ چیکر کو دکھائے۔ "بھائی.....؟" ٹکٹ چیکر نے قدرے تعجب سے کہا۔ "یہ چھوٹا بھائی ہے تمہارے ساتھ.....؟"

"جی ہاں....." مسعود نے مختصر سا جواب دیا۔

"کوئی اور بڑا نہیں ہے تمہارے ساتھ.....؟" ٹکٹ چیکر نے دونوں ٹکٹوں کا بغور جائزہ لینے اور انہیں پنچ کرنے کے بعد مسعود کو واپس دیتے ہوئے پوچھا۔

"جی نہیں....." مسعود نے جواب دیا۔ "کراچی اسٹیشن پر لوگ ہمیں لینے کے لئے آجائیں گے ان کو معلوم ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" ٹکٹ چیکر نے اس کے بعد اس سے کوئی اور سوال نہیں پوچھا اس مختصر سے عرصے کے دوران جو اس کارروائی اور گفتگو میں صرف ہوا ناصر کا دل نہ جانے کس قدر تیز رفتاری کے ساتھ دھڑکتا رہا ٹکٹ چیکر..... سوالات..... خدا جانے کیا انجام ہو..... لیکن سب کچھ ٹھیک ہو گیا ٹکٹ چیکر ٹکٹ چیک کر کے دوسرے مسافروں کے پاس چلا گیا لیکن ناصر نے اس وقت تک اپنی آنکھیں دوبارہ بند نہیں کیں جب تک کہ وہ اس ڈبے کے تمام مسافروں کے ٹکٹ چیک کر کے یہاں سے چلا نہیں گیا۔

باہر رات کا سناٹا اور اندھیرا بہت گہرا تھا کھڑکی سے باہر دیکھنے سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دنیا ختم ہو گئی ہے اور اگر کوئی تھوڑی بہت بچی کھچی دنیا ہے تو اس کا وجود صرف اس ڈبے تک محدود ہے جہاں روشنی ہے لوگ ہیں اور زندگی ہے۔

اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ پھر بند ہونے لگیں اور پھر دوبارہ جب اس کی آنکھ کھلی تو باہر کا منظر یکسر تبدیل ہو چکا تھا۔ رات کا پُراسرار خوفناک اور گاڑھا اندھیرا فضا میں تحلیل ہو کر کسی نامعلوم اور گم گشتہ دنیا کا حصہ بن چکا تھا اور ایک ہلکا سرمئی رنگ کا دھیما دھیما' نرم نرم اجالا سارے گرد و پیش کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھا۔ ٹرین تیزی سے بھاگتی ہوئی اس وقت کسی بستی کے پاس سے گزر رہی تھی جہاں درختوں کے اوپر پرواز کرتے ہوئے چڑیوں کے غول کے غول آرہے تھے اور اِدھر اُدھر چلتے پھرتے کچھ لوگ اور ان

کے ساتھ مویشی بھی۔

رات کا الم انگیز' یاس آفریں اور اضمحلال پرور سحر ٹوٹ چکا تھا نیا دن طلوع ہو
تھا اپنے دامن میں نئی امیدوں اور آرزوؤں کو سمیٹے ہوئے نئی امنگوں' نئے جذبوں ا
نئے ولولوں سے بھرپور..... طلوع سحر کا وقت..... ابتدا اور خوشی کا وقت..... ہا
کے ہونٹوں پر خود بخود مسکراہٹ نمودار ہو گئی وہ اپنی سیٹ پر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا ا
کھڑکی کے پاس آکر باہر کے منظر کو اشتیاق اور مسرت بھری نظروں سے دیکھنے لگا اس
آنکھوں کے سامنے ایک نئی دنیا ابھر رہی تھی۔

مسعود ابھی تک سو رہا تھا' اس نے اسے سونے دیا اور خود خاموشی سے اس
سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اجالے کا ملگجا پن آہستہ آہستہ دور ہوتا جا رہا تھا اور اس
سفیدی اور نکھار پیدا ہوتا جا رہا تھا۔

گاڑی کی رفتار میں کمی آگئی۔ ناصر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی کوئی اسٹیشن
آنے والا تھا اور پھر کچھ دیر کے بعد اسٹیشن آگیا صبح کا اجالا پھیلنے کے بعد آنے والا
اسٹیشن..... رات کے اندھیرے میں تو نہ جانے کتنے اسٹیشن آئے تھے اور گزر گئے
اور وہ سوتا رہا تھا اسے کوئی خبر ہی نہیں ہوئی تھی اور اب ایک اور اسٹیشن آرہا تھا۔

گاڑی ایک دھچکے کے ساتھ رک گئی اور اس کے ساتھ ہی زبردست شور و غل
ساری فضا گونج اٹھی مسعود ہڑبڑا کر اٹھ گیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے
اس نے ناصر کو کھڑکی میں کھڑے ہوئے پایا اور وہ خود بھی اٹھ کر اس کے پاس آکھڑا
ان کے خیال میں سفر کا مشکل ترین مرحلہ گزر چکا تھا اور اب وہ دونوں اپنے آپ کو
حد تک محفوظ اور مطمئن محسوس کر رہے تھے۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کی طر
دیکھا اور ایک امید بھری مسکراہٹ ان دونوں کے چہروں پر ایک ساتھ نمودار ہوئی۔

"گرم چائے..... چائے گرم۔" ایک آدمی زور زور سے آواز لگا رہا تھا۔ مسعو
آنکھوں میں خود بخود ایک چمک پیدا ہو گئی اس نے جلدی سے چائے کے دو کلھڑ خری
اور وہ دونوں وہیں کھڑے کھڑے چائے پینے لگے۔ دونوں کے چہروں سے رونق اور خو
اظہار ہو رہا تھا ان کی آنکھیں ایک دوسرے کو اس متوقع بے نام کامرانی کی نوید د
تھیں جس کی تلاش میں وہ اتنا لمبا سفر طے کر کے کراچی جا رہے تھے۔

کراچی..... سفر جاری تھا اور اب کراچی دور نہیں رہ گیا تھا ٹرین اب
جنکشن پر پہنچ چکی تھی۔



مسعود نے پڑوس میں رہنے والے قلی سے ساری ضروری معلومات حاصل کر لی
تھیں وہ قلی ایک زمانے میں کراچی بھی رہ چکا تھا۔

پیپری' پورٹ قاسم' لانڈھی..... کراچی قریب آرہا تھا دور دور تک پھیلے ہوئے
کارخانوں اور فیکٹریوں کی چمنیاں فضا میں سر اٹھائے کھڑی تھیں اور ان میں سے دھواں
نکل رہا تھا۔ ناصر کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں وہ سڑک کے دونوں طرف کے
مناظر کو بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ مسعود نے اسے چپکے سے بتایا تھا کہ کراچی شروع ہو
چکا ہے۔

لانڈھی' کراچی کا ہی ایک حصہ ہے ٹرین لانڈھی کے ریلوے اسٹیشن پر بھی رکی تھی
اور بہت سارے مسافر وہاں اتر گئے تھے۔

کراچی کینٹ ریلوے اسٹیشن..... ٹرین وہاں پہنچی تو ایک حشر برپا تھا۔ ناصر حواس
باختہ ہوا جا رہا تھا مسعود نے ایک بار پھر اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا تھا اور وہ دونوں
گاڑی سے نیچے اتر آئے۔

سب سے پہلی چیز جس کا ناصر کو فوراً ہی احساس ہوا وہ فضا میں گھلتی ہوئی ناگوار نمی
تھی۔ کراچی آتے ہی اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کا سارا بدن چپک رہا ہے'
کپڑے جسم سے یوں چپکے جا رہے تھے جیسے کسی نے ان میں گوند لگا دیا ہو' یہاں وہ جس
چیز کو بھی ہاتھ لگا رہا تھا فوراً ہی چپکن اور گیلے پن کا احساس ہوتا تھا۔ ٹرین کے ڈبے بھی
ہاتھ لگانے سے اب گیلے گیلے اور چپکتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ ناصر کو اس سے بڑی
الجھن ہو رہی تھی جسم سے ایک دم پسینے کی دھاریں بہہ نکلی تھیں اور کپڑے چپکے جا رہے
تھے۔

مسعود اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا اور وہ دونوں انسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے
سمندر میں سے بمشکل اپنے لئے جگہ بناتے ہوئے گیٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

چاروں طرف بڑا شور و غل مچا ہوا تھا اور ناصر ایک اور نئی بات بھی محسوس کر رہا تھا
اس کے چاروں طرف موجود لوگ زور زور سے بول رہے تھے لیکن وہ مختلف زبانیں بول
رہے تھے۔

ناصر نے اب تک صرف ایک ہی زبان بولی تھی اور وہ تھی پنجابی..... جو کہ اس
کی مادری زبان اور اس کے علاقے میں بولی جانے والی زبان تھی۔ جتنے لوگوں سے بھی
اس کا واسطہ پڑتا تھا وہ سب پنجابی بولنے والے تھے ناصر کو کوئی دوسری زبان بولنے کی

ضرورت بھی کبھی نہیں محسوس ہوئی تھی۔ اس کی بستی میں دو خاندان ایسے بھی آباد
جو پٹھان تھے اور پشتو بولتے تھے لیکن گھروں کے باہر یہ لوگ بھی پنجابی بولتے تھے اور
کے بچے بھی پنجابی بولتے تھے یہ لوگ عرصہ دراز سے یہاں آباد تھے اردو ناصر کے لئے
اجنبی یا نامانوس زبان نہیں تھی وہ کافی حد تک اردو سمجھ لیتا تھا لیکن اس نے کبھی اردو
نہیں تھی۔

اور اب اس کے چاروں طرف جو زبان بولی جا رہی تھی وہ اردو ہی تھی لوگ چلتے
کر ایک دوسرے سے اردو میں باتیں کر رہے تھے اس کے پاس سے گزرنے والی ایک
موٹی سی بھاری بھرکم عورت قلی پر اردو میں چلا رہی تھی۔ "ارے سنبھال کے وہ بیگ
رہا ہے۔"

"نہیں گرے گا بی بی جی....." قلی اردو میں جواب دے رہا تھا۔ "آپ بے
رہیں۔"

ناصر کو سخت پریشانی لاحق ہو رہی تھی اسے تو اردو آتی ہی نہیں تھی اس نے
کبھی اردو بولی تھی اور نہ بولنے کی کوشش کی تھی اگر وہ کبھی ایک دن کے لئے
اسکول گیا تھا تو شاید اس کو اردو سے اس قدر اجنبیت کا احساس نہ ہوتا لیکن اس نے
کبھی اسکول یا مدرسے کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔

دو آدمی اس کے پاس سے ایک ایسی عجیب و غریب اور قطعی نامانوس زبان میں
زور سے باتیں کرتے ہوئے گزرے جو اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ ناصر
اس زبان کا تو ایک لفظ بھی نہیں سمجھ سکا اور حیرت سے ان لوگوں کو دیکھتا رہا۔

اسے اپنے اردگرد جو بھی لوگ نظر آرہے تھے وہ اپنے لباس اور وضع قطع کے
اعتبار سے اس کے علاقے کے لوگوں سے مختلف نظر نہیں آئے تھے زیادہ تر مرد شلوار
قمیض یا شلوار کرتے وغیرہ میں ملبوس تھے۔ البتہ بہت سوں نے پتلونیں، بش شرٹیں اور
قمیض وغیرہ بھی پہن رکھی تھیں ان میں سے کوئی بھی لباس ناصر کے لئے نیا نہیں تھا
سارے لباس اس کے علاقے میں پہنے جاتے تھے۔

البتہ ایک سن رسیدہ آدمی پر اس کی نظریں جم کر رہ گئیں۔ اس نے سفید بارہ
کرتے کے ساتھ پتلے پائینچوں کا پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک نوعمر لڑکا بھی تھا
اس نے شلوار قمیض پہنی ہوئی تھی۔ مجمع میں عورتوں کی بھی بہت بڑی تعداد شامل تھی
اور یہ عورتیں بھی اپنے لباس کے لحاظ سے اس کے اپنے علاقے کی عورتوں سے



نہیں تھیں۔

ناصر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھ رہا تھا بلکہ اس کو چاروں طرف دیکھنے کا
موقع بھی ٹھیک سے نہیں مل پا رہا تھا۔ کیونکہ کوئی نہ کوئی شخص ان کے پاس سے گزرتے
ہوئے انہیں دھکا دیتا ہوا آگے بڑھ جاتا اور ناصر کو جلدی سے سنبھلنا پڑتا تھا۔ مسعود نے
س کا ہاتھ بڑی سختی کے ساتھ تھام رکھا تھا اور ساتھ ہی اس کو ہدایت بھی کرتا جا رہا تھا کہ
وہ اس کے ساتھ ہی رہے اگر ہاتھ چھوٹ جائے تو اِدھر اُدھر بھاگنے کی بجائے گیٹ کے
س پہنچ کر وہاں رک کر اس کا انتظار کرے اس نے ناصر کو سمجھا دیا تھا۔

وہ دونوں زبردست ہجوم میں سے اپنا راستہ بناتے ہوئے گیٹ کی طرف بڑھ رہے
تھے کہ مسعود نے پولیس والوں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔ پولیس والے ان دونوں کو کڑی
نظروں سے گھور رہے تھے۔

مسعود نے ناصر کا ہاتھ اور بھی سختی کے ساتھ پکڑا اور تیزی سے آگے جانے کی
کوشش کی لیکن اس وقت تک پولیس والے ان کے بالکل قریب آچکے تھے۔

ناصر نے بھی پولیس والوں کو دیکھ لیا تھا اور اس کے دل کی دھڑکنیں اس قدر تیز ہو
گئی تھیں کہ سینے کے اندر ایک حشر برپا ہو گیا تھا۔ پولیس والے انہی دونوں کی طرف بڑھ
رہے تھے اور اب بچنا تقریباً ناممکن معلوم ہوتا تھا۔

"اب تک تو وہاں سارے لوگوں کو ہمارے فرار کا علم ہو گیا ہو گا۔" ناصر دل میں
بے بسی کے ساتھ سوچ رہا تھا۔ "بلکہ شام کو ہی سب کو پتہ چل گیا ہو گا۔ اماں نے شاید
پولیس میں اطلاع دے دی ہو گی یا بھٹے والوں نے خود ہی پولیس میں رپورٹ لکھوا دی ہو
گی، میری بھی اور مسعود کی بھی..... اور وہاں کی پولیس نے کراچی کی پولیس کو ہم
لوگوں کے بارے میں اطلاع دے دی ہو گی اور اب کراچی کی پولیس ہمیں پکڑنے کے لئے
آرہی ہے۔ یا خدا..... ہے ربا..... ہمارے اوپر رحم کرنا....."

انہی صبر آزما اور خوف ناک لمحوں کے دوران اس نے ایک لمحے کے لئے مسعود
کے چہرے کی طرف دیکھا۔ مسعود کا چہرہ دھواں دھار ہو رہا تھا۔ اس کی رنگت مٹی جیسی
ہو رہی تھی اور اس کی آنکھیں کسی زخمی پرندے کی آنکھوں کی طرح خوف میں ڈوبی ہوئی
تھیں۔ اس نے ناصر کے ہاتھ کو اور بھی زیادہ کس کے پکڑ لیا اور اسے گھسیٹ کر دوسری
طرف لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔

لیکن ہوا یوں کہ وہ دونوں پولیس والے ان کے بالکل قریب سے گزرتے چلے

گئے۔ انہوں نے تو ان سے کوئی تعرض نہیں کیا نہ انہیں روکا نہ ان سے کوئی سوال کیا۔ مسعود اور ناصر دونوں کی سہمی ہوئی خوفزدہ نظریں ان کا تعاقب کر رہی تھیں۔ انہوں نے ان کو ایک اور آدمی کے پاس جا کر رکتے ہوئے دیکھا جو چائے کے ایک اسٹال کے پاس کھڑا ہوا سگریٹ کے لمبے لمبے کش لے رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ آدمی ان دونوں کے انتظار میں ہو کیونکہ ان کے آتے ہی وہ ان کے ساتھ چل پڑا۔ وہ تینوں ایک طرف روانہ ہو گئے۔

ناصر کو ایسا لگا جیسے خوف و دہشت کے یہ چند لمحات کئی صدیوں پر محیط ہوں اور وہ نہ جانے کب سے یہاں کھڑا ہوا تھر تھر کانپ رہا ہو اور اپنے بری طرح سے منتشر اور ریزہ ریزہ وجود کو مجتمع کرنے کی کوشش میں مصروف ہو۔ ان پولیس والوں کے جانے کے کچھ دیر بعد تک وہ اپنے حواس پر قابو نہیں پا سکا۔ اسے اپنے آپ کو سنبھالنے میں کچھ وقت لگا۔ یہی حال مسعود کا تھا۔

مسعود نے ایک بہت لمبی اور گہری سانس لے کر اپنے سینے سے بہت ساری ہوا خارج کی' اُس کی آنکھوں کی کھوئی ہوئی چمک دوبارہ واپس آگئی۔ اس نے ناصر کے ہاتھ کو آہستہ سے دبایا اور لوگوں کے بے پناہ ہجوم کا حصہ بن کر گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ باہر جانے کا راستہ کدھر ہے کیونکہ اس سے پہلے تو اس نے کراچی کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ یہاں کسی بھی شے سے واقف نہیں تھا لیکن ابھی ابھی آنے والی ٹرین سے اترنے والے مسافروں کا ہجوم اپنے ساز و سامان کے ساتھ جس طرف جا رہا تھا گیٹ اسی طرف ہونا چاہئے تھا۔ وہ بھی اس طرف چل پڑے یہاں تک کہ وہ لوگ ایک پل پر سے گزرنے کے بعد گیٹ تک پہنچ گئے جہاں سفید وردی میں کھڑا ہوا ایک آدمی مسافروں سے ٹکٹ لے کر ان کو باہر جانے دے رہا تھا۔ وہ دونوں بھی گیٹ سے نکل کر باہر آگئے۔

ناصر تو اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر موجود ہجوم کو ہی دیکھ کر حیران ہو رہا تھا لیکن وہاں سے آنے کے بعد جب اس نے باہر کا منظر دیکھا تو اس پر ہیبت سی طاری ہونے لگی۔ کس قدر لوگ تھے یہاں اور سامنے کس قدر گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ طرح طرح کی گاڑیاں..... ناصر نے اپنی زندگی میں جو سب سے بڑا شہر دیکھا تھا وہ سیالکوٹ تھا۔ اس نے تو لاہور بھی نہیں دیکھا تھا اور اب وہ اچانک ایک دم سیالکوٹ سے اٹھ کر سیدھا کراچی آن پہنچا تھا۔



کراچی..... پورٹ قاسم سے لے کر منوڑہ کے ساحل تک اور کورنگی سے لے کر اورنگی تک میل ہا میل کے وسیع و عریض علاقے میں پھیلا ہوا شہر کراچی جس کی سرزمین اس مہربان اور پُر شفقت آغوشِ مادر کی طرح ہر اس شخص کے لئے وا رہتی ہے جو رزق کی تلاش میں یہاں آتا ہے۔ کراچی' جو ان سب غریبوں ناداروں' مفلسوں اور محنت کشوں کو رزق سے مالا مال کرتا ہے جو اپنے واحد اثاثے یعنی اپنی قوت محنت کے ساتھ یہاں آتے ہیں اور اپنے حصے کا رزق تلاش کرتے ہیں۔ روزگار کی تلاش میں ملک کے مختلف حصوں سے ہر ماہ کراچی آنے والے تقریباً چھ ہزار افراد کی تعداد میں آج دو افراد کا اور اضافہ ہو گیا تھا..... اور وہ دونوں افراد تیرہ سالہ مسعود اور نو سالہ ناصر کینٹ اسٹیشن کی عمارت کے بیرونی چبوترے پر کھڑے ہوئے ایک عالم حیرت میں اپنی نظروں کے سامنے پھیلے ہوئے انسانوں اور گاڑیوں کے ہجوم کو دیکھ رہے تھے۔ ناصر نے اپنی زندگی میں کبھی اتنی بہت سی گاڑیاں اور اتنے بہت سے لوگ نہیں دیکھے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اتنی بڑی تعداد میں گاڑیاں یہاں کہاں سے آگئی ہیں اور کیوں آگئی ہیں دور تک خالی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں اور بہت سی گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ لوگوں کے ہجوم تھے کہ ہر طرف سے امڈے پڑ رہے تھے۔ ہر شخص جلدی میں تھا' جلدی جلدی چلتا ہوا اپنے ساتھ والوں سے اردو بولتا ہوا دوسرے سے بے نیاز اپنے آپ میں گم.....

ناصر گم صم کھڑا ہوا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ اور مسعود ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے۔ ان کے آس پاس سے سینکڑوں افراد گزر رہے تھے لیکن کسی نے ان کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ سب لوگ تو ان کے وجود سے ہی بے خبر اور بے نیاز معلوم ہوتے تھے۔

"او میاں..... او بھائی!" ان کے قریب سے ہی ایک عمر رسیدہ آدمی نے ایک نوجوان کو ٹوکتے ہوئے قدرے درشت اور تلخ لہجے میں کہا۔ "ذرا دیکھ بھال کر چلا کرو تمہیں نظر نہیں آتا کیا؟"

"اوہ..... معاف کرنا چچا میاں!" نوجوان نے جلدی سے کہا۔ "میں نے دیکھا نہیں تھا۔" اور وہ بڑے میاں کے جواب کا انتظار کئے بغیر تیز تیز قدموں سے وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ ناصر ان لوگوں کی گفتگو پر ان کے انداز اور لب و لہجے پر غور کر رہا تھا۔ تو اب اس کو بھی کیا یہی زبان بولنا ہو گی؟ اس طرح بولنا پڑے گا؟ یہ کیسے ممکن ہو سکے گا؟

مسعود آنکھیں گھما گھما کر اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اب تک جو کچھ ہوا تھا وہ اسی کی

ہدایت کے مطابق اور اس کی رہبری میں ہوا تھا۔ وہ رہ نما تھا اور ناصر راہرو تھا اور اب بھی جو کچھ کرنا تھا جو فیصلہ کرنا تھا وہ مسعود ہی کو کرنا تھا۔ ناصر کو تو اس کی ہدایت کے مطابق عمل کرنا تھا..... لیکن یہاں پہنچنے کے بعد تو خود مسعود کی قوت فیصلہ بھی جواب دے رہی تھی۔ فی الحال وہ یہ واحد فیصلہ کر سکا کہ ناصر کا ہاتھ پکڑے ہوئے کینٹ اسٹیشن کے بیرونی چبوترے کی سیڑھیاں اتر کر نیچے سڑک پر آجائے اور وہ ناصر کے ساتھ نیچے آگیا۔

"اب ہم کہاں جائیں گے مسعود؟" ناصر نے نیچے آنے کے بعد اس سے پوچھا۔ وہ دونوں سڑک سے دور دیوار کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ سڑک پر سے گزرنے والا ٹریفک انہیں خوفزدہ کر رہا تھا۔ اتنی بہت سی گاڑیاں اس قدر تیز رفتاری کے ساتھ ان کے سامنے سے گزر رہی تھیں کہ وہ ان کے قریب جاتے ہوئے ڈر رہے تھے۔

ناصر کے سوال کا مسعود کے پاس فی الحال کوئی جواب نہیں تھا۔

اس نے جب ناصر کے ساتھ مل کر گھر سے بھاگنے اور کراچی آنے کا فیصلہ کیا تھا تو اس وقت اس کے ذہن میں کراچی میں کوئی ایسا ٹھکانہ موجود نہیں تھا جہاں وہ ناصر کے ساتھ قیام کر سکتا اور جہاں ان دونوں کو پناہ مل سکتی۔ کراچی میں کئی ایسے لوگ موجود تھے جن کا تعلق اس کی بستی سے تھا لیکن ان لوگوں کی مدد لینے کا تو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ اسے تو ناصر کے ساتھ چھپ کر وہاں سے آنا تھا۔ اگر کسی طرح دوسرے لوگوں کو اس بات کی خبر ہو جاتی تو سارا کام بگڑ جاتا۔ اس نے تو یہاں تک احتیاط سے کام لیا تھا کہ ان لوگوں میں سے کسی کا کراچی کا پتہ تک نہیں معلوم کیا تھا۔ وہ تو یہ سوچ کر کراچی آیا تھا کہ یہاں آنے کے بعد وہ اور ناصر اپنے لئے کوئی کام تلاش کر لیں گے کام کریں گے اور پیسہ کمائیں گے۔ جس طرح کراچی آنے والے تمام لوگ کرتے ہیں لیکن کراچی پہنچنے کے بعد اس سارے معاملے کا آغاز کس طرح ہو گا۔ اس بارے میں اس کے ذہن میں کوئی واضح تصویر پہلے سے موجود نہیں تھی۔ "ہر چیز یہیں بیٹھ کر تو طے نہیں کی جا سکتی۔" اس نے ناصر کے سوالوں کے جواب میں کہا تھا۔ "ایک بار کراچی پہنچ تو جائیں پھر دیکھیں گے کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ کوئی نہ کوئی ٹھکانہ بھی تلاش کر لیں گے۔"

اب وہ کراچی کینٹ کے اسٹیشن پر پہنچ چکے تھے اور وقت آگیا تھا کہ وہ اپنے لئے کوئی ٹھکانہ تلاش کریں..... اور یہ کام مسعود کو ہی کرنا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اب کیا کرے۔ یہاں تک پہنچ جانے کے بعد اس کو اپنا سرمایہ عقل و دانش



ختم ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے دل و دماغ پر پریشانی کا عالم طاری تھا لیکن وہ اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھا۔ اس وقت اس کے اندر ایک غیر معمولی قسم کا بزرگی اور ذمہ داری کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔ ناصر اس سے چھوٹا تھا۔ وہ ناصر کو اپنے ساتھ لے کر یہاں آیا تھا اور اب یہ اس کی ذمہ داری تھی کہ وہ اپنے اور ناصر کے لئے کوئی ٹھکانہ تلاش کر لے۔ یہ کام اس کو کرنا تھا۔

"بس، شاید چند دن کی تکلیف ہو گی۔" اس نے ناصر سے مخاطب ہو کر آہستہ سے کہا۔ "پھر کچھ نہ کچھ تو ہو ہی جائے گا۔ آخر ہزاروں لاکھوں لوگ کراچی آتے ہیں۔ ان سب کو رہنے کی جگہیں بھی مل جاتی ہیں۔ کام بھی مل جاتا ہے۔ تو ہم کو کیوں نہیں ملے گا؟ آخر ہم بھی تو ہر قسم کی محنت مزدوری کر سکتے ہیں۔"

"ہاں ہاں..... کیوں نہیں۔" ناصر کے دل میں فوراً ہی یقین و اعتماد کی ایک تازہ لہر دوڑ گئی۔ ابھی ابھی اس کے دل پر جو مایوسی اور گھبراہٹ کا غلبہ ہوا تھا اس میں فوری طور پر کمی واقع ہو گئی۔ مسعود کی زبان سے نکلنے والے تسلی آمیز الفاظ نے اس کی ہمت بندھائی تھی۔

"اب یہاں تک تو ہم آہی گئے ہیں۔" مسعود نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اللہ نے چاہا تو اب آگے کی بھی کوئی نہ کوئی صورت ضرور نکل آئے گی۔ میں نے اپنے ابا کو اکثر کہتے سنا ہے کہ خدا ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔"

"ہاں۔" ناصر نے قدرے مطمئن انداز میں کہا۔ "میں نے بھی مولوی قدرت اللہ کو ایک بار یہ کہتے ہوئے سنا تھا۔ اس دن ابا مجھے اپنے ساتھ جمعہ کی نماز کے لئے لے گئے تھے۔ اماں نے ان کو زبردستی نماز کے لئے بھیجا تھا۔"

"تو پھر اب کیا کرنا چاہئے؟" مسعود دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ "یہاں سے کس طرف کا رخ اختیار کرنا چاہئے؟ کوئی ایسا آدمی مل جائے جس سے بات چیت کی جا سکے۔ اس سے کہوں کہ ہم لوگ پردیسی ہیں اور کام کی تلاش میں کراچی آئے ہیں۔ کوئی نہ کوئی خدا کا بندہ تو مدد کرے گا ہی۔ دنیا میں سب لوگ حاجی مدد علی قریشی اور فخرو ہی تو نہیں ہوتے۔"

وہ دونوں چبوترے کے نیچے سیڑھیوں کے پاس کھڑے ہوئے اِدھر اُدھر بے تحاشا بھاگتی دوڑتی ناقابل گرفت زندگی کو دیکھ رہے تھے اور اس کی تیز رفتاری، سرعت اور چکا چوند پر سخت حیران تھے۔ دوپہر ڈھل رہی تھی دن کا بیشتر حصہ تمام ہو چکا تھا۔ چند گھنٹے مزید

گزرنے کے بعد رات بسر کرنے کا مسئلہ بھی درپیش ہو جاتا۔ کوئی نہ کوئی جگہ تو چاہئے تھی۔

☆==========☆==========☆

اچانک مسعود کے ذہن میں ایک خیال آیا اور اس خیال کے آتے ہی اس کے جسم کے تنے ہوئے اعصاب ایک دم ڈھیلے پڑ گئے۔ افوہ.... اس نے اس چیز کے بارے میں اب تک کیوں نہیں سوچا تھا؟ کس قدر حیرت کی بات تھی۔ کراچی آنے کا فیصلہ کرنے کے وقت سے لے کر' کراچی کی سرزمین پر قدم رکھتے وقت تک' یہ خیال ایک بار بھی اس کے دماغ میں نہیں آیا تھا۔

اس کی مرحومہ ماں آمنہ کے ایک رشتے کے بھائی تھے' جن کا نام یوسف علی خان تھا۔ وہ کراچی میں ناظم آباد میں کہیں رہتے تھے۔ ان کی اپنی کوئی بہن نہیں تھی وہ اماں کو بہت چاہتے تھے۔ وہ اکثر سیالکوٹ کے قریب واقع اس نواحی بستی میں ان لوگوں کے گھر آتے جاتے تھے۔ یوسف ماما کراچی میں بلدیہ کے دفتر میں کام کرتے تھے۔ اماں مرحومہ ان کے بارے میں بتایا کرتی تھیں کہ وہ وہاں کوئی بڑے افسر ہیں' ان کے پاس اپنی موٹر سائیکل ہے اور وہ ناظم آباد میں اپنے ذاتی مکان میں رہتے ہیں۔ جب تک اماں مرحومہ زندہ رہیں' یوسف ماما اکثر سیالکوٹ آتے رہے۔ اماں کو بیماری سے کچھ عرصے پہلے انہوں نے سب لوگوں کو کراچی میں اپنے گھر آنے کی دعوت دی تھی ابا اور اماں تیار بھی ہو گئے تھے لیکن پھر اماں بیمار ہو گئیں اور یہ لوگ یوسف ماما کے گھر کراچی نہیں جا سکے تھے۔ پھر اماں کی قبر پر جا کر بہت روئے تھے۔ مسعود خود اور ابا ان کے ساتھ تھے یوسف ماما کو اس طرح زار و قطار روتے دیکھ کر ابا بھی رونے لگ گئے تھے اور وہ خود تو بہت رویا تھا۔ یوسف ماما چند دن قیام کرنے کے بعد واپس چلے گئے تھے اور پھر کچھ دنوں کے بعد ابا نے دوسری شادی کر لی۔ اس کے بعد سے یوسف ماما کبھی سیالکوٹ نہیں آئے۔ وقت گزرتا گیا اور مسعود یوسف ماما کو تقریباً بھول گیا۔

اور آج' اس وقت اسے اچانک یوسف ماما یاد آ گئے۔ ان کے یاد آتے ہی مسعود کا سارا تردد و تفکر چند لمحوں کے اندر اندر ختم ہو گیا..... یوسف ماما تو اس کے ماموں تھے' اس کی مرحوم ماں کے بھائی۔ وہ ان کو بلا خوف اپنے بارے میں سب کچھ بتا سکتا تھا۔ وہ انہیں بتا سکتا تھا کہ وہ وہاں رہ کر بھٹے میں جان توڑ مشقت کرنے اور گالیاں اور مار کھانے کے بجائے کراچی میں رہ کر محنت مزدوری کر کے قرضہ اتارنا چاہتا ہے جو اس کے باپ اور



سوتیلی اماں نے بھٹے کے مالک حاجی مدد علی قریشی سے لیا ہے اور وہ انہیں اپنے ساتھی ناصر کے بارے میں بھی سب کچھ بتا سکتا ہے۔ یوسف ماما تو بہت اچھے تھے۔ وہ اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ اسے کچھ کچھ یاد تھا کہ وہ جب بھی کراچی سے آتے تھے تو اس کے لئے کچھ نہ کچھ لے کر آتے تھے۔ اسے انگریزی بسکٹوں کا وہ پیکٹ تو آج تک یاد تھا جو یوسف ماما اس کی ماں کے انتقال پر آتے وقت اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ وہ ان کا آخری تحفہ تھا۔ اس کے بعد وہ خود بھی کبھی نہیں آئے۔

تو اب تو مسئلہ بالکل حل ہو گیا تھا۔ بس ناظم آباد پہنچنے کی دیر تھی۔ یہاں ان کو تلاش کرنا کیا مشکل تھا؟ آخر وہ بلدیہ کراچی کے ایک بڑے افسر تھے' ان کے پاس اپنی موٹر سائیکل تھی اور ناظم آباد میں تو سبھی لوگ ان کو جانتے ہوں گے۔

اس نے فوراً ہی ناصر کو اپنی اس خوشی میں شریک کرنے کا فیصلہ کیا..... "لو یار ناصر..... ہم لوگ تو خواہ مخواہ ہی پریشان ہو رہے ہیں۔ ہمارا مسئلہ تو حل ہی سمجھو۔ حیرت ہے' مجھے اس سے پہلے اس بات کا خیال کیوں نہیں آیا۔"

"کون سی بات کا؟" ناصر ایک دم چونک پڑا۔ اس کے چہرے پر خوشی کا رنگ نکھر آیا تھا۔

مسعود نے اس کو یوسف ماما کے بارے میں تفصیل کے ساتھ بتایا۔ ناصر تحیر و خوشی کے عالم میں یہ سب کچھ سنتا رہا اس کو اپنے کانوں پر جیسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

"تم نے بھی کمال کر دیا یار....." اس نے مسعود کی پوری بات سننے کے بعد کہا۔ "اتنی اہم بات کو تم ایک دم بھول گئے؟ کراچی پہنچ بھی گئے اور تم کو یوسف ماما کا خیال نہیں آیا۔"

"مجھے خود اس بات پر حیرت ہے کہ ایسا کیوں ہوا۔" مسعود نے کہا۔ "میں تو اصل میں یوسف ماما کو بالکل بھول گیا تھا۔ اماں کی موت پر آنے کے بعد سے وہ پھر کبھی بھی ہمارے ہاں سیالکوٹ نہیں آئے تھے اور ان کا کوئی خط یا پیغام وغیرہ بھی نہیں آیا تھا۔ خیر' چلو خدا کا شکر ہے کہ مجھے ان کی یاد آ گئی اور ان کے بارے میں ساری ضروری باتیں بھی یاد آ گئیں۔ اب ہم انہی کی تلاش میں چلتے ہیں۔"

"لیکن..... ایک بات تو بتاؤ مسعود۔ فرض کرو اگر وہ اپنے گھر میں نہیں ملے؟" ناصر نے پُر تشویش انداز میں کہا۔ "پھر..... پھر ہم کیا کریں گے؟"

"ارے بھئی! اگر وہ نہیں ملیں گے تو مامی تو ملیں گی۔" مسعود نے بڑے وثوق کے

ساتھ کہا۔ "وہ بھی مجھے جانتی ہیں۔ ایک بار ہمارے گھر آچکی ہیں۔ میں اس وقت
چھوٹا تھا۔ مجھے بس ہلکا ہلکا سا یاد ہے۔ وہ مجھے ویسے تو نہیں پہچانیں گی لیکن جب میں ا
اپنے بارے میں بتاؤں گا تو پھر وہ مجھ کو ضرور پہچان لیں گی۔ ان کا اپنا ذاتی مکان
آدمی کوئی بار بار گھر تو نہیں بدلتا۔ گھر میں کوئی نہ کوئی فرد تو ملے گا۔"

"ہاں! کوئی نہ کوئی تو ضرور ملے گا۔" ناصر نے اس کی بات سے فوراً اتفاق کیا۔ "
اگر ایک لمحے کے لئے مان لو کہ انہوں نے گھر بدل لیا ہوگا' تو بھی وہاں ان کو تلاش
زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ کوئی نہ کوئی ان کا پتہ ضرور بتا دے گا۔ آخر وہ ایک بڑے افسر
اور ان کے پاس موٹر سائیکل ہے۔"

"بالکل....." مسعود نے پُرجوش انداز میں کہا۔ "تو پھر اب ہم کو یہاں سے سیدھا
ناظم آباد چلنا چاہئے اور..... اس کے لئے..... ہمیں کسی کی مدد چاہئے ہوگی۔ ہم
کسی سے پوچھنا ہوگا کہ ناظم آباد کو کون سا راستہ جاتا ہے۔ ابھی تو شام ہونے میں کافی
ہے۔ اگر تو وہ دور نہیں ہے تو ہم تھوڑی دیر میں پہنچ جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ پوچھو کسی سے....." ناصر نے کہا اور مسعود نے اسی وقت قریب
سے گزرنے والے ایک شخص کو روکا۔ وہ شخص شلوار قمیض اور سفید بنی ہوئی گول ٹو
پہنے ہوئے تھا جو اس کے سر پر پوری طرح منڈھی ہوئی تھی۔

"بھائی جان! یہ بتائیں کہ ناظم آباد کو کون سا راستہ جاتا ہے؟"

مسعود نے بڑی مشکل سے کہا۔ اردو کے الفاظ زبان سے نکالنے میں اسے خاصی
دقت ہو رہی تھی۔ اس نے کچھ دنوں تک اردو صرف اس وقت بولی تھی جب وہ مولوی
مشرف حسین کے مکتب میں پڑھنے کے لئے جاتا تھا۔ مکتب چھوٹا تو مولوی صاحب کی
اور اردو دونوں سے ہی رابطہ ختم ہوگیا تھا۔

وہ آدمی چلتے چلتے رک گیا اور گھور کر مسعود کو دیکھنے لگا۔ "تم کو ناظم آباد جانا ہے؟"
اس نے صاف ستھری' کھری اور کراری اردو میں کہا۔ "مگر اس کے لئے تو تم کو بس میں
بیٹھنا ہوگا۔ ناظم آباد کوئی یہاں رکھا ہے؟"

"بس میں؟" مسعود نے جلدی سے کہا۔ "تو کیا ناظم آباد یہاں سے بہت دور ہے؟
ہم پیدل نہیں جاسکتے؟" مسعود نے پوچھا۔

"کیا تم لوگ پہلی بار کراچی آئے ہو؟" اس شخص نے کوئی جواب دینے کے بجائے
سوال کردیا۔



"جی..... جی ہاں!" مسعود نے سنبھل کر جواب دیا۔ "ہمیں اپنے رشتے دار کے گھر
جانا ہے۔ ماموں ہیں ہمارے۔ وہ بڑے افسر ہیں۔ ناظم آباد میں رہتے ہیں۔"

"تو ایسا کرو' یہاں سے بس میں بیٹھ کر ایمپریس مارکیٹ چلے جاؤ۔" اس شخص نے
جی سے کہا اور سامنے اشارہ کیا۔ "وہاں سے تمہیں بس مل جائے گی۔ کنڈیکٹر سے کہہ
دینا وہ تم کو ایمپریس مارکیٹ پر اتار دے گا۔ پھر وہاں سے دوسری بس لینا وہاں بہت ساری
بسیں ہوں گی۔ بیٹھنے سے پہلے پوچھ لینا کہ کون سی بس ناظم آباد جائے گی۔ پھر اس میں بیٹھ
کر ناظم آباد چلے جانا..... مگر..... ناظم آباد میں تمہیں جانا کس جگہ ہے؟" وہ شخص گفتگو
کے دوران ان دونوں کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

ناصر اس کی زبان سے نکلنے والے ایک ایک لفظ کو بڑے غور سے سن رہا تھا اور اس
سمجھنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ اتنی بہت ساری اردو ایک ساتھ سننے کی اس کو بالکل
عادت نہیں تھی۔ اس شخص کی بات کو پوری طرح سے سمجھنے کے لئے اسے بہت غور اور
توجہ کے ساتھ سب کچھ سننا اور سمجھنا پڑ رہا تھا۔

"کون سی جگہ؟" مسعود نے کہا۔ "بس جی! سیدھا ناظم آباد جانا ہے' وہاں ماما رہتے
ہیں میرے' ہم وہاں جا کر ان کا گھر تلاش کرلیں گے۔ وہ بڑے سرکاری افسر....."

"ٹھیک ہے!" اس آدمی نے مسعود کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "پھر بس میں بیٹھ کر
چلے جاؤ۔" اور اس کے ساتھ ہی وہ شخص تیز تیز قدموں سے وہاں سے چلا گیا۔

"معلوم نہیں ناظم آباد یہاں سے کتنی دور ہے' جو ہم پیدل نہیں جاسکتے۔" اس
شخص کے جانے کے بعد مسعود نے ناصر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "شاید زیادہ ہی دور
ہوگا' تب ہی تو وہ کہہ رہا تھا کہ بس سے جانا ہوگا۔"

"اس نے راستہ تو بتایا ہی نہیں۔" ناصر نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔ "بس یہ کہا
کہ بس سے چلے جاؤ' اگر وہ راستہ بتا دیتا تو ہم پیدل جانے کی کوشش کرتے۔"

"چلو پھر بسوں کے اڈے کی طرف ہی چلتے ہیں۔"

مسعود نے کہا اور وہ دونوں اس طرف چل پڑے جدھر بہت ساری بسیں کھڑی ہوئی
تھیں۔ وہاں سے بسیں جا رہی تھیں اور آ بھی رہی تھیں۔ بسوں کا ایک مجمع لگا ہوا تھا
یہاں..... انہیں فوراً ہی اندازہ ہوگیا کہ اس جگہ تک پہنچنا ان کے لئے آسان نہیں تھا۔
سڑک اور بسوں کے اڈے کے درمیان جو خوفناک اور تیز رفتار ٹریفک حائل تھا' وہ ان
کے لئے بڑی حد تک ایک بالکل نئی چیز تھا اور وہ اس سے بری طرح خائف تھے تاہم کسی

نہ کسی طرح بچتے بچاتے وہ وہاں تک پہنچ ہی گئے اور پھر ایمپریس مارکیٹ جانے و
بس میں سوار ہوگئے۔ مسعود نے کنڈیکٹر سے پوچھ لیا تھا۔ ویسے بھی کنڈیکٹر
مارکیٹ کی آواز لگا رہا تھا۔

ناصر کے دل سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔ جب تک اس بات کا فیصلہ نہیں ہو
وہ کہاں جائیں گے' وہ مسعود کی تشفی آمیز باتوں کے باوجود فکر مند تھا لیکن جب م
اسے اپنے ماموں یوسف علی خان کے بارے میں بتایا تو اس کی ساری پریشانی دور ہو
اب وہ بس میں بیٹھ کر ناظم آباد جانے کے خیال سے خوش تھا۔ کتنا مزہ آئے گا بس
کر..... آس پاس کے سارے مناظر دکھائی دیں گے' شہر دکھائی دے
کراچی..... شہروں کا شہر.....

بس کینٹ اسٹیشن سے روانہ ہوئی اور پہلے ہلکی رفتار سے اور پھر تیز رفتار
چلتی ہوئی ایمپریس مارکیٹ کی جانب سفر کرنے لگی۔ ناصر اور مسعود دونوں کو بیٹھنے
مل گئی تھی اور وہ برابر برابر بیٹھے ہوئے تھے۔

کچھ دیر کے بعد جب بس ایمپریس مارکیٹ پر جا کر رکی اور یہ دونوں اترے
وقت وہ دونوں ہی اپنی زندگی کے سب سے زیادہ منفرد' حیران کن اور ناقابل یقین
سے دوچار تھے۔

انسانوں کا ایک وسیع و عریض سمندر تھا جو صدر اور ایمپریس مارکیٹ کے علا
چاروں طرف ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اس قدر خلقت تھی کہ تاحدِ نظر انسانی سر ہی سر
دے رہے تھے۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے کراچی میں رہنے والا ہر شخص اپنے ا
سے نکل کر سڑکوں پر آگیا ہے اور کسی نامعلوم سمت میں بھاگا چلا جا رہا ہے۔ اس کے
ہی سینکڑوں بسیں تھیں۔ چھوٹی بڑی اور درمیانہ' جو آس پاس کی سڑکوں پر چیونٹی کی
سے رینگ رہی تھیں کیونکہ ان کے چلنے کی جگہ ہی نہیں تھی۔ کئی سڑکوں پر بسیں
گاڑی کے ڈبوں کی طرح ایک دوسرے کے آگے پیچھے' ایک دوسرے سے تقریباً
ہوئی کھڑی تھیں ان کے کنڈیکٹر چلا چلا کر آوازیں لگا رہے تھے نہ معلوم وہ کیا کیا کہہ
تھے۔

ناصر کا دل دہلا جا رہا تھا اس کو چکر آ رہے تھے۔ اس نے مسعود کا ہاتھ سختی
رکھا تھا۔ اس کے اعصاب پر یکبارگی خوف طاری ہوگیا تھا۔ اس نے کراچی کے بار
بہت کچھ سنا تھا کہ وہ بہت بڑا شہر ہے اور وہاں کی سڑکوں پر بہت سے انسان اور بہ



گاڑیاں ہوتی ہیں لیکن یہ جو کچھ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا' یہ تو اس کے وہم و گمان
میں بھی نہیں تھا یہ اس سے کہیں زیادہ تھا جو کہ اس نے سنا تھا' یا جس کا اس نے تصور کیا
تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ اتنے بہت سارے لوگ بیک وقت سڑکوں پر موجود ہوں۔

"مسعود!" اس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ "کیا آج یہاں کوئی میلہ وغیرہ ہے؟ یہ
اتنے بہت سارے لوگ؟ اتنی بہت ساری بسیں؟"

"م م..... معلوم نہیں....." مسعود نے رک رک کر جواب دیا۔ خود اس کی
حالت بھی ناصر سے مختلف نہیں تھی۔ وہ لوگوں اور گاڑیوں کی اس بھیڑ کو دیکھ کر دیوانہ
ہوا جا رہا تھا۔ "دیکھو..... میرے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑے رہنا۔ ایک منٹ کے لئے
بھی ہاتھ نہ چھوڑنا۔ اس بھیڑ میں اگر ہم ایک دوسرے سے بچھڑ گئے تو پھر مل نہیں سکیں
گے۔"

"ہاں!" ناصر نے کہا اور اس کے ہاتھ کو کس کے پکڑ لیا۔ اس خیال کے ساتھ ہی
اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا کہ اگر وہ اور مسعود ایک دوسرے سے بچھڑ گئے تو پھر کیا ہوگا۔
انسانوں کے اس بحرِ بے کراں میں دو حقیر سے قطرے۔ پھر وہ ایک دوسرے کو کہاں تلاش
کر سکیں گے؟ کوئی ایسی جگہ بھی تو نہیں تھی جہاں وہ مل سکتے۔ اس شہر میں تو ان کا کوئی
بھی جاننے والا نہیں تھا' سوائے مسعود کے یوسف ماما کے..... اور یوسف ماما کا خیال آتے
ہی اس کے دل میں تقویت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ اگر خدانخواستہ وہ
دونوں ایک دوسرے سے بچھڑ جائیں تو پھر ناظم آباد میں واقع یوسف ماما کے گھر پہنچیں۔
یہی ٹھیک رہے گا۔

شور اس قدر زیادہ تھا کہ ایک دوسرے سے بات کرنا اور ایک دوسرے کی آواز سننا
بےحد مشکل ہو رہا تھا۔ پھر بھی دونوں کوشش کر کے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔

"مسعود!" ناصر نے کہا۔ "اگر اتفاق سے ہم دونوں ایک دوسرے سے بچھڑ جائیں تو
پھر ادھر اُدھر بھاگنے کے بجائے بہتر ہوگا کہ ہم ناظم آباد میں یوسف ماما کے گھر پہنچ
جائیں۔"

"ہاں!" مسعود نے کہا۔ "تمہاری یہ بات تو بڑی حد تک ٹھیک ہے لیکن ہم نے ابھی
یوسف ماما کا گھر تلاش نہیں کیا ہے۔ اس لیے ہم وہاں ملنے کے بارے میں طے نہیں
کر سکتے۔ یوں کریں گے کہ اگر خدانخواستہ ہم دونوں ایک دوسرے سے بچھڑ جائیں تو ہم
اسی جگہ پہنچ کر ایک دوسرے کا انتظار کریں گے جہاں سے ہم نے ایمپریس مارکیٹ کے

لئے بس لی تھی۔ کینٹ اسٹیشن کا بسوں کا اڈہ..... ظاہر ہے کہ وہ مشہور جگہ ہے اور وہاں آسانی سے پہنچ سکتے ہیں۔ کوئی بھی ہمیں وہاں کا راستہ بتا سکتا ہے۔ تم اس جگہ پہچان تو لو گے ناں؟"

"کیوں نہیں بھلا؟" ناصر نے جلدی سے کہا۔ "میں اس جگہ کو کیوں نہیں پہچانوں گا؟ میں اسے پہچان بھی سکتا ہوں اور اس کو تلاش بھی کر سکتا ہوں۔ وہاں تک جا سکتا ہوں میں بس میں بیٹھ کر۔ کینٹ اسٹیشن جانے والی بس کا پتہ تو کسی سے بھی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس میں کوئی مشکل تو نہیں ہے۔"

"بس تو پھر ہم کو ایسا ہی کرنا ہے۔" مسعود نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"ہاں' ٹھیک ہے۔" ناصر نے کہا۔ "تو اب ہم کو ناظم آباد جانے والی بس میں بیٹھنا چاہئے' مگر وہ کہاں سے ملے گی؟ یہاں تو سینکڑوں بسیں آجا رہی ہیں' کسی سے پوچھنا ہو گا۔"

"ہاں کسی سے پوچھتے ہیں۔" مسعود نے کہا اور قریب سے گزرنے والے ایک آدمی سے پوچھا کہ ناظم آباد جانے والی بس کہاں سے ملے گی۔ اس آدمی نے سامنے کی طرف اشارہ کر دیا۔ "وہاں سے ملے گی۔"

بڑی سڑک پر دو اطراف سے بسیں آجا رہی تھیں اور ان دونوں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ ناظم آباد کس سمت میں واقع ہے اور وہاں جانے کے لئے بس کس طرف سے ملے گی۔ اس شخص کے بتا دینے کے بعد یہ دونوں اس طرف جانے کی کوشش کرنے لگے جہاں سے ان کو بس لینی تھی اور یہ مرحلہ ان کے لئے بڑا قیامت خیز بلکہ ہلاکت انگیز تھا۔ اس جگہ تک پہنچنے کے لئے ان کو سڑک پار کرنے کی ضرورت تھی اور یہاں سڑک پار کرنا ایسا تھا جیسے موت کے جبڑوں میں سے گزر کر جانا۔ چیختی چنگھاڑتی' بڑی بھیانک اور خوفناک آواز میں ہارن بجاتی ہوئی بسوں نے ساری سڑک کو گھیر رکھا تھا پیدل چلنے کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی سڑک پر۔ انہوں نے کئی بار سڑک پار کرنے کی کوشش کی لیکن ہر بار وہ سہم کر ڈر کر پیچھے ہٹ گئے۔ ان کے چہروں سے سخت اضطراب و تشویش کا اظہار ہو رہا تھا۔ آخر وہ سڑک کے دوسری طرف کس طرح پہنچیں؟ پھر ان کی سمجھ میں ایک بات آئی۔ انہوں نے تنہا سڑک پار کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس کے بجائے وہ لوگوں کے ایک جم غفیر سے گروہ میں شامل ہو گئے جو ایک جگہ سے سڑک پار کرنے کے انتظار میں کھڑا ہوا تھا۔ یہ دونوں بھی ایسے ہی ایک گروہ میں شامل ہو گئے اور پھر جب ان لوگوں نے سڑک پار کی



ان کے ساتھ ہی ساتھ مسعود اور ناصر نے بھی سڑک پار کر لی اور اس کے ساتھ ہی انہیں ایسا لگا جیسے انہوں نے بھری برسات میں ایک سیلاب زدہ طوفانی ندی کو تیز کر عبور کر لیا ہو۔؟ اب وہ بسوں کی ایک بہت لمبی قطار کے سامنے تھے دوسری طرف آکر انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب وہ بسوں کی ایک بہت لمبی قطار کے سامنے تھے۔ طرح طرح کی بسیں تھیں' طرح طرح کے رنگوں اور شکلوں کی اور ان کے کنڈیکٹر نہ جانے کن کن جگہوں کی آوازیں لگا رہے تھے۔

اور پھر ایک بس کے کنڈیکٹر کی زبان سے انہوں نے "ناظم آباد" کے الفاظ سنے۔ وہ کنڈیکٹر جلدی جلدی بہت ساری جگہوں کے نام لے رہا تھا انہی میں اس نے ناظم آباد کا نام بھی لیا۔ "ناظم آباد..... نارتھ ناظم آباد....." وہ چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔

"یہ بس ناظم آباد جائے گی۔" ناصر نے جلدی سے مسعود سے کہا۔ مسعود نے خود بھی اس کنڈیکٹر کی آواز سن لی تھی۔ اس نے جلدی سے سر ہلایا اور ناصر کا ہاتھ پکڑ کر اس بس کی طرف بڑھا جو آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی۔ بس کے کنڈیکٹر نے جو بس کے پائیدان پر کھڑا تھا زور سے بس پر ہاتھ مارا بس تقریباً رک گئی۔ مسعود نے پہلے تو ناصر کو بس میں چڑھنے میں مدد دی اور اس کے بعد وہ خود بھی تیزی سے لیکن سنبھل کر بس میں چڑھ گیا۔ بس آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی۔ کنڈیکٹر دروازے پر کھڑا ہوا زور زور سے آواز لگا رہا تھا۔

بس بھری ہوئی تھی اور بہت لوگ کھڑے ہوئے بھی تھے۔ مسعود اور ناصر بھی سیٹوں کی پشت پکڑ کر کھڑے ہو گئے۔ بس کے آگے بھی بس تھی' پیچھے بھی بس تھی اور سائیڈ میں بھی بس تھی۔ ناصر حیران ہو کر ان چیزوں کو دیکھ رہا تھا۔

بس کے باہر اسی طرح لوگوں کے ہجوم رواں دواں تھے اور ایک خلقت نہ جانے کہاں سے کہاں جا رہی تھی۔ ناصر جھانک جھانک کر باہر دیکھ رہا تھا اور اس کی حیرت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ یہاں بھی' وہاں بھی' اِدھر بھی' اُدھر بھی' ہر طرف لوگ ہی لوگ تھے۔ لوگوں کا سیلاب تھا کہ چہار جانب سے امڈا چلا آ رہا تھا۔ لوگ' گاڑیاں' اونچی اونچی عمارتیں' جن کی آخری منزل تک پہنچتے پہنچتے نظریں ہانپنے لگتی تھیں۔

ایمپریس مارکیٹ کے علاقے سے نکلتے نکلتے بس کو کافی وقت لگ گیا اور آخر وہ ایمپریس مارکیٹ سے نکل کر بندر روڈ پر آگئی' جہاں اس وقت دونوں طرف ٹریفک کا زبردست ہجوم تھا' کیونکہ اب شام ہونے کو تھی۔ ناصر بس میں سے جھانک جھانک کر باہر

کے منظر دیکھ رہا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف گاڑیوں کی اس قدر لمبی لمبی لائنیں تھیں
ختم ہونے میں ہی نہیں آتی تھیں۔ یا خدا..... یہ اس قدر گاڑیاں کہاں سے آرہی
کہاں جارہی ہیں اور کیوں جارہی ہیں؟ ناصر کے دل میں بار بار یہ سوال پیدا ہوتا تھا۔
آج اس شہر میں کوئی بہت بڑا میلہ ہے۔ مگر میلہ کہاں ہے گاڑیاں تو سڑک کے دو
طرف آجارہی ہیں۔ ناصر کا دماغ سوچتے سوچتے تھکا جارہا تھا۔

گرومندر پر کچھ مسافر بس میں سے اترے تو ناصر اور مسعود کو بیٹھنے کی جگہ مل گ
دونوں جلدی سے سیٹ پر ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ گئے اور ناصر کے چہرے سے خ
پھوٹنے لگی۔ اب وہ اچھی طرح سے باہر کے منظر کو دیکھ سکتا تھا لیکن اچانک وہ ایک
کے ساتھ ایک جانب کو ہٹا۔ ایک بھاری بھرکم بس بری طرح چیختی چنگھاڑتی کھڑکی کے
سے اس طرح گزری تھی کہ ناصر کو یوں لگا جیسے وہ اس بس کو ٹکر مار دے گی اور وہ
ہوجائے گا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ وہ بس طوفانی رفتار سے بھاگتی ہوئی ناصر والی بس
پاس سے گزرتی ہوئی آگے نکل گئی۔ ناصر کے دل کی ایک دم تیز ہوجانے والی دھڑکنوں
اپنی اصلی حالت پر واپس آنے میں کچھ وقت لگا۔

بس اگرچہ کھچا کھچ بھری ہوئی تھی' اب اس میں تل دھرنے کو بھی جگہ نہیں تھ
اس کے پائیدان تک پر لوگ کھڑے ہوئے تھے لیکن پھر بھی وہ ہر اسٹاپ پر رک رہی
اور کنڈیکٹر زور زور سے آوازیں لگا رہا تھا۔ مسعود نے بس میں سوار ہونے کے
کنڈیکٹر' سے کہا تھا کہ وہ انہیں ناظم آباد میں اتار دے۔ کنڈیکٹر' جو اس وقت ایک م
سے پیسوں پر جھگڑا کر رہا تھا۔ اس کی بات سن کر آہستہ سے گردن ہلا دی تھی اور پھر
ہی اس مسافر سے الجھنے لگا۔ ناصر ان کی باتوں کو بڑے غور سے سن رہا تھا اور سمجھنے
کوشش کر رہا تھا۔ جھگڑا کرائے پر ہو رہا تھا۔ کنڈیکٹر کسی جگہ کا کرایہ زیادہ مانگ رہا تھا
مسافر وہاں کا کرایہ کم دے رہا تھا۔ دونوں میں نُو تُو مَیں مَیں ہو رہی تھی۔

اور اب بس چوڑی سڑک پر دوسری بے شمار گاڑیوں کے ساتھ بھاگی چلی جا
تھی۔ کتنی ہی بار بڑی بڑی بسیں' ٹرک اور ٹینکر وغیرہ بس کے اتنے قریب سے گزرے
ناصر ان کو ہاتھ بڑھا کر چھو سکتا تھا لیکن ان کے قریب سے گزرنے پر وہ خوف و دہ
کے عالم میں جیسے نیم جاں ہو جاتا تھا اور جلدی سے سمٹ کر ایک طرف ہو جاتا تھا۔

پھر ایک جگہ پہنچ کر بس رک گئی۔ اب وہ نہ تو آگے جا رہی تھی' نہ پیچھے جا
تھی۔ صرف یہ بس ہی نہیں رکی تھی بلکہ اس سڑک پر چلنے والا تمام ٹریفک رک گیا



پیچھے سے آنے والی تمام گاڑیاں رک رہی تھیں۔ بس کے ساتھ ساتھ دوسری گاڑیوں کی
لائن لگ گئی تھی۔ ساری سڑک گاڑیوں سے بھر گئی تھی۔ ان ساری گاڑیوں میں لوگ
تھے۔ سب کے انجن چل رہے تھے۔ فضا میں اس قدر دھواں بھر گیا تھا کہ ناصر کو اپنا دم
گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک عجیب سی بو فضا میں بس کر رہ گئی تھی جیسے کوئی چیز جل
رہی ہو' جلنے کی بو..... اور یہ بو اتنی تیز تھی کہ حلق میں گھسی جا رہی تھی۔ بس گاڑیوں
کے جنگل میں پھنسی کھڑی تھی۔ ناصر کو نہیں معلوم تھا کہ کیا ہوا ہے اور بس کے ساتھ
ساتھ باقی دوسری تمام گاڑیاں بھی کیوں کھڑی ہیں۔ مسعود بھی پریشان ہو کر اِدھر اُدھر دیکھ
رہا تھا۔ ان دونوں کے لئے کراچی میں ٹریفک جام کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ لوگوں سے کھچا کھچ
بھری ہوئی بس میں سخت گرمی ہو رہی تھی اور ان کے پسینے میں بھیگ جانے والے لباس
ان کے جسموں سے چپکے جا رہے تھے۔ یہ بڑی ہی اذیت ناک صورت حال تھی۔ انہیں
ایسے مرطوب موسم کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔

"کیا ہو گیا ہے؟" ناصر نے آہستہ سے مسعود سے کہا۔ "یہ بس چلتی کیوں نہیں؟
یہاں کیوں کھڑی ہے؟"

"معلوم نہیں۔" مسعود نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ "خدا جانے کیا
بات ہو گئی ہے؟"

اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا ایک آدمی اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے دوسرے آدمی سے کہہ رہا
تھا۔ "مر گیا سالا پولیس والا کہیں جا کر..... ٹریفک کو کنٹرول کرنے کے بجائے کسی سے
سوئے بازی کر رہا ہو گا۔ سب سالے حرام کی کھا رہے ہیں۔"

وقت تیزی کے ساتھ گزر رہا تھا۔ شام قریب تھی۔ آدھے گھنٹے سے زیادہ گزر گیا۔
تب کہیں جا کر ٹریفک دوبارہ چلنا شروع ہوا۔ ناصر نے سکون کی ایک لمبی اور گہری سانس
لی۔ بس نے اپنی جگہ سے حرکت کی تو ہوا کے جھونکے اندر آنے لگے اور اس انوکھی قسم
کی پریشان کن گرمی سے اسے نجات ملی۔

پھر ایک لمبا سفر شروع ہو گیا' جس کا کوئی اختتام ہی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ بس نہ
جانے کن کن راستوں اور سڑکوں سے گزرتی ہوئی' نہ جانے کہاں جا رہی تھی۔ کس قدر
چوڑی چوڑی سڑکیں تھیں اور ان پر کس قدر لوگ..... کراچی تو ناصر کے تصور سے
کہیں زیادہ بڑا شہر تھا۔ اسے بس میں بیٹھ کر سفر کرتے ہوئے کتنی دیر ہو گئی تھی۔ کینٹ
اسٹیشن سے ایمپریس مارکیٹ تک اور پھر ایمپریس مارکیٹ سے یہاں تک' اس نامعلوم جگہ

تک' ہر طرف کراچی ہی کراچی..... عمارتیں ہی عمارتیں..... کراچی تو ختم ہو
ہی نہیں آتا تھا اور ناظم آباد جانے کب آئے گا۔ کنڈیکٹر نے ابھی تک تو بتایا بھی نہیں
بس رکتی ہوئی جارہی تھی لوگ اس میں سے اتر رہے تھے اور سوار بھی ہو
تھے۔ بس اسٹاپوں پر عجیب قسم کی بھاگ دوڑ کا عالم تھا۔ ان دونوں کو بس کا یہ سفر بھی
کے سفر کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔

کنڈیکٹر دروازے میں کھڑا ہو کر بار بار آوازیں لگا رہا تھا۔ ان میں "نارتھ
آباد" کے الفاظ بھی شامل تھے۔ ناظم آباد اور نارتھ ناظم آباد میں بھلا کیا فرق تھا؟ کنڈ
نے "ناظم آباد" کے ساتھ یہ الفاظ معلوم نہیں کیوں بڑھا دیئے تھے۔

ٹوکے (2K) کی بس شہر کے بہت بڑے علاقے کا چکر لگانے کے بعد بالآخر نارتھ
آباد کے بلاک این میں اپنے آخری اسٹاپ پر جاکر رک گئی اور خالی ہو گئی۔ سارے مسا
اتر گئے۔ ڈرائیور نے گاڑی بند کردی اور کنڈیکٹر اور ڈرائیور دونوں گاڑی میں سے
گئے۔ صرف مسعود اور ناصر وہاں بیٹھے رہ گئے تھے یہاں اور بھی کئی خالی بسیں پہلے
کھڑی ہوئی تھیں۔

"بس تو خالی ہو گئی۔" مسعود نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "شاید ناظم آباد
ہے۔ آؤ..... اترو۔"

اور وہ دونوں بس سے نیچے اتر آئے۔ کنڈیکٹر اور ڈرائیور نہ جانے کدھر نکل
تھے۔ ایک خالی بس کے پاس کچھ لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ دونوں ان کے پاس جا پہنچے
"کیا ناظم آباد یہی ہے؟" مسعود نے ان میں سے ایک سے سوال کیا جس کے ہا
میں ایک اخبار تھا۔

"نہیں!" اس نے نظریں اٹھا کر ان دونوں لڑکوں کو دیکھا' جن کے چہروں
تھکن اور پریشانی کا اظہار ہو رہا تھا۔ "یہ نارتھ ناظم آباد ہے' ناظم آباد تو یہاں سے
دور ہے۔ تمہیں جانا کہاں ہے؟"

"ہمیں..... ناظم آباد جانا ہے۔" مسعود نے سنبھل سنبھل کر کہا۔ "وہاں
ایک عزیز رہتے ہیں' ناظم آباد یہاں سے کتنی دور ہے؟ ہمیں راستہ بتا دو۔ ہم چلے جائیں
گے۔"

"پیدل؟ ابے پاگل ہو گئے ہو کیا؟" اس شخص نے مسعود کو گھورتے ہوئے
"یہاں رکھا ہے ناظم آباد؟ جان نکل جائے گی چلتے چلتے۔ چلو میں تم کو بس میں



ہوں۔ کرائے کے پیسے ہیں جیب میں؟"

"ہاں وہ تو ہیں۔" مسعود نے جلدی سے کہا۔ "لیکن کیا یہ جگہ ناظم آباد نہیں ہے؟
یہ کوئی اور جگہ ہے؟"

"میں نے تم کو بتایا نا بیٹا' یہ نارتھ ناظم آباد ہے' ناظم آباد نہیں ہے۔" اس مہربان
شخص نے نرمی سے کہا۔ "ناظم آباد یہاں سے کافی دور ہے۔ تم کو بس سے جانا ہو گا۔ چلو'
میں تم کو بس میں بٹھا دیتا ہوں۔ کنڈیکٹر سے کہہ دیتا ہوں۔ وہ تم کو ناظم آباد کے پٹرول
پمپ پر اتار دے گا۔"

وہ شخص انہیں اپنے ساتھ لے کر آیا اور اس نے انہیں ایک دوسری بس میں بٹھا
دیا۔ اس نے اس بس کے کنڈیکٹر سے خاص طور سے کہہ دیا کہ انہیں ناظم آباد کے پٹرول
پمپ پر اتار دے۔

دونوں کافی دیر کے بعد ناظم آباد کے پٹرول پمپ پر اترے تو ان کے دلوں پر کراچی
کی ہیبت بُری طرح طاری ہو چکی تھی۔ یہ کس قسم کا شہر تھا؟ آخر یہ کہاں سے شروع ہوتا
تھا اور کہاں ختم ہوتا تھا؟ اس کا تو کہیں کوئی سرا ہی نہیں تھا۔ کراچی کی سرزمین پر قدم
رکھتے ہی انہوں نے کینٹ اسٹیشن سے لے کر نارتھ ناظم آباد تک کا سفر کر ڈالا اور وہ بھی
(ٹوکے) کی بس میں' جو نہ جانے کہاں کہاں کا چکر لگا کر نارتھ ناظم آباد کے بلاک این پر آکر
ختم ہوتی تھی اور پھر وہاں سے انہوں نے دوبارہ بس میں سفر کیا۔ اف خدایا..... کس قدر
چوڑی سڑک تھی نارتھ ناظم آباد سے ناظم آباد تک جانے والی..... اور کتنی بے شمار
سڑکیں اس کے اطراف میں جارہی تھیں۔ ہر طرف سڑکیں ہی سڑکیں تھیں اور کوئی بھی
سڑک انسانوں اور گاڑیوں سے خالی نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے انسان اس شہر کے اندر
زمین سے ابل رہے تھے۔ انسان اور گاڑیاں۔

اب وہ دونوں ناظم آباد کے پٹرول پمپ کے بس اسٹاپ پر کھڑے ہوئے تھے۔

"اس کم بخت کنڈیکٹر نے ہمیں ناظم آباد میں اتارا ہی نہیں اور نہ جانے کہاں پہنچا
دیا۔" مسعود نے بیزاری اور برہمی کے ساتھ کہا۔ "یہ نارتھ ناظم آباد معلوم نہیں کیا چیز
ہے..... ناظم آباد سے اتنی دور....."

سورج غروب ہونے والا تھا۔ ناظم آباد کی مین روڈ پر ٹریفک کا سیلاب رواں تھا۔ وہ
دونوں بس اسٹاپ پر کھڑے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ ان کے قریب کوئی مکان
نہیں تھا۔ سارے مکانات ان سے دور تھے اور سامنے ٹریفک سے بھری ہوئی خوفزدہ

کردینے والی سڑک تھی، جس پر ایک طرف سے دوسری طرف جانا ناممکن معلوم ہوتا تھا۔

"تو یہ ہے ناظم آباد!" مسعود نے اپنے چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے سے الجھن اور پریشانی کا اظہار ہو رہا تھا۔ "تو اب ہم یہاں کس سے یوسف ماما کے مکان کا پتہ پوچھیں..... مگر..... یہاں ہمارے آس پاس تو کوئی مکان بھی نہیں نظر آرہا ہے۔ ہم یہاں کس سے پوچھیں؟" ان کے پیچھے میدان تھا۔

"مکانات تو ہمارے سامنے سڑک کے اس پار ہیں یا پھر ہمارے پیچھے، ان عمارتوں کے پیچھے ہوں گے۔" ناصر نے کہا۔ "سڑک پار کرکے ادھر جانا تو بہت مشکل ہے۔ میرے خیال میں پیچھے کی طرف چلتے ہیں وہاں پوچھتے ہیں۔ وہاں بھی کسی نہ کسی کو یوسف ماما کا گھر ضرور معلوم ہوگا۔ آخر وہ اتنے بڑے افسر ہیں۔"

"چلو، دیکھتے ہیں۔" مسعود نے کہا۔ لیکن اس کی آواز میں اب حوصلے اور اعتماد کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ اس نے کراچی شہر کے ہیبت ناک پھیلاؤ کے جو مناظر اب تک دیکھے تھے، ان کے بعد اس کا یہ یقین خاصا متزلزل ہوگیا تھا کہ وہ ناظم آباد میں یوسف ماما کے مکان کو آسانی سے تلاش کرلے گا تاہم کئی اہم نشانیاں موجود تھیں، ان سے کافی مدد مل سکتی تھی۔

وہ دونوں بس اسٹاپ سے پیچھے کی طرف چل پڑے اور گورنمنٹ کالج کے پاس سے گزرتے ہوئے، جب اس کے عقب میں پہنچے تو انہیں وہاں دور تک مکانوں اور دکانوں وغیرہ کا سلسلہ دکھائی دیا، جسے دیکھ کر وہ خاصے مطمئن ہوئے۔ "انہی مکانوں میں کہیں یوسف ماما کا مکان بھی ہوگا۔" مسعود نے دل میں سوچا۔

سامنے ہی کچھ نوجوان لڑکے کھڑے ہوئے آپس میں باتیں کررہے تھے۔ مسعود اور ناصر ان کے پاس جا پہنچے۔

"بھائی جان!" مسعود نے کہا۔ "کیا آپ کو یوسف علی خاں کا گھر معلوم ہے؟ وہ بلدیہ کراچی میں افسر ہیں اور ان کے پاس....."

"بلدیہ کراچی میں؟" ان میں سے ایک نے مسعود کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "وہ سامنے لال رنگ والا مکان دیکھ رہے ہو؟ وہاں چلے جاؤ۔ وہاں جلیل صاحب رہتے ہیں۔ وہ بھی بلدیہ میں کام کرتے ہیں۔ ان سے معلوم کرو۔"

"بڑی مہربانی جناب کی!" مسعود نے خوشی سے سرشار لہجے میں کہا۔ آخر وہ یوسف ماما کا گھر تلاش کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ وہ دونوں تیزی سے چلتے ہوئے اس لال رنگ



کے مکان تک جا پہنچے اور مسعود نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔ فوراً ہی دروازہ کھل گیا اور ایک ناٹے قد کا، گہری سانولی رنگت کا آدمی باہر نکل کر آیا جس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک نظر آرہی تھی۔

"جناب! جلیل صاحب کا مکان یہی ہے؟" مسعود بہت سنبھل کر محتاط اور مؤدبانہ انداز میں بول رہا تھا۔

"ہاں یہی ہے۔" اس شخص نے ان دونوں کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "میں ہوں جلیل۔ کہو، کیا بات ہے؟"

"جناب! ہمیں یوسف علی خاں کے مکان کی تلاش ہے۔" مسعود نے کہا۔ "وہ بلدیہ کراچی میں بڑے افسر ہیں۔ ان کے پاس اپنی موٹر سائیکل ہے اور ان کا اپنا ذاتی مکان ہے۔"

جلیل، مسعود کو یوں دیکھنے لگا جیسے اسے اس کے دماغ میں کچھ فتور نظر آرہا ہو۔ "پتہ چاہیے ان کا؟" اس نے بیزاری کے ساتھ مسعود سے پوچھا۔ "کون سے بلاک میں رہتے ہیں؟ مکان نمبر کیا ہے؟"

"یہ..... یہ سب کچھ تو مجھے نہیں معلوم....." مسعود نے گھبرا کر کہا۔ "مجھے تو ان کے بارے میں بس اتنا معلوم ہے کہ وہ بلدیہ کراچی میں بڑے افسر ہیں، ان کے پاس اپنی موٹر سائیکل ہے اور ان کا اپنا ذاتی مکان ہے۔"

"تم کچھ باؤلے تو نہیں ہو؟" جلیل نے برہمی کے ساتھ کہا۔ "ایسے کسی کا مکان ملے گا؟ پہلے پورا پتہ پوچھ کر آؤ۔ پھر مکان تلاش کرنا۔" اور اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے گھر کا دروازہ بند کرلیا۔

مسعود اور ناصر نے بے بسی کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ابھی ان لڑکوں سے بات چیت کرنے کے بعد جو خوشی ان کو حاصل ہوئی تھی، وہ یکسر کافور ہوگئی۔ وہ بلدیہ میں کام کرنے والا آدمی یوسف ماما جیسے بڑے افسر کے گھر کا پتہ نہیں بتا سکا تھا۔

"اور کسی سے پوچھتے ہیں۔" مسعود نے کمزور آواز میں کہا۔ "کسی نہ کسی کو تو یوسف ماما کا گھر ضرور معلوم ہوگا۔" اور اس کے ساتھ ہی وہ دونوں وہاں سے آگے بڑھ گئے۔ کچھ فاصلے پر ایک عمر رسیدہ آدمی، جو سفید کرتہ اور تنگ پائنچوں کا پاجامہ پہنے ہوئے تھا، ایک چھوٹے سے بچے کی انگلی پکڑے ہوئے آہستہ آہستہ جارہا تھا۔ وہ بچے سے کچھ باتیں بھی کرتا جارہا تھا۔ بچہ سر ہلا ہلا کر اس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ دونوں جب اس کے

قریب پہنچے تو اس نے سر اٹھا کر سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ مسعود نے
سے اسے سلام کیا۔ اس نے غور سے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے اس کے سلام کا
دیا۔

"چاچا جی! یہاں ناظم آباد میں بلدیہ کراچی کے ایک بڑے افسر رہتے ہیں۔" م
نے طوطے کی طرح رٹا رٹایا سبق دہرانا شروع کیا۔ "ان کے پاس اپنی موٹر
ہے..... اور ان کا اپنا ذاتی مکان ہے۔ ہم ان کا مکان تلاش کر رہے ہیں....."

"بڑے افسروں کے پاس موٹر سائیکل نہیں ہوتی۔" بڑے میاں نے اس کی
پوری ہونے سے پہلے ہی مسکرا کر کہا۔ "بڑے افسروں کے پاس تو گاڑیاں ہوتی
بیٹا..... بڑی بڑی کاریں..... جتنا بڑا افسر اتنی بڑی کار..... موٹر سائیکل تو چھوٹے
ملازموں کے پاس ہوتی ہے۔"

"جی..... جی..... ان کا نام یوسف علی خاں ہے۔" مسعود نے جلدی سے
"اور ناظم آباد میں ان کا اپنا ذاتی مکان ہے۔ وہ میرے ماموں ہیں۔ ہم ان کا گھر
کر رہے ہیں۔"

"ناظم آباد کے کون سے بلاک میں مکان ہے ان کا؟" بڑے میاں نے پوچھا۔
پتہ کیا ہے؟"

"وہ..... جی..... وہ تو مجھے نہیں معلوم....." مسعود نے بے بسی سے جواب

"بس اتنا معلوم ہے کہ وہ بلدیہ کراچی کے بڑے افسر....."

"پہلے ان کے مکان کا پورا پتہ معلوم کرو۔" بڑے میاں نے اس کی بات
ہوئے کہا اور بچے کی انگلی پکڑتے ہوئے کہا۔ "پورا پتہ معلوم کر کے آؤ' پھر ان کا
تلاش کرو۔ ایسے نہیں ملے گا۔ ناظم آباد کوئی گاؤں تو نہیں ہے بیٹا۔"

ان دونوں کے دلوں پر شدید مایوسی اور ناامیدی کا غلبہ طاری ہو گیا۔ یہاں تو
یوسف ماما جیسے بڑے افسر کو جانتا ہی نہیں تھا۔ وہ لوگ کیا کیا جتن کر کے ناظم آباد تک
میں کامیاب ہوئے تھے اور اب یہاں..... یہاں تو لوگ عجیب عجیب باتیں کر رہے
کسی کو یوسف ماما کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا اور وہ بوڑھا چاچا تو کہہ رہا تھا کہ
افسروں کے پاس گاڑیاں ہوتی ہیں' موٹر سائیکلیں نہیں۔

"اب کیا کریں گے مسعود؟" ناصر نے بڑی بے بسی اور پریشانی کے ساتھ
"یوسف ماما کا گھر تو مل ہی نہیں رہا ہے۔"



"کسی اور سے پوچھ کر دیکھتے ہیں۔" مسعود نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ "شاید کوئی
اور شخص بتا دے۔" اور اس کے بعد انہوں نے اِدھر اُدھر گھوم کر اور بھی کئی لوگوں سے
بلدیہ کراچی میں کام کرنے والے "بڑے افسر" یوسف علی خاں کا پتہ پوچھنا چاہا لیکن کوئی
بھی انہیں کچھ نہ بتا سکا۔

چراغ جلے دیر ہو چکی تھی۔ آس پاس کے مکانوں اور دکانوں میں روشنیاں جگمگا رہی
تھیں۔ سڑکوں پر اندھیرا تھا اور وہ دونوں ناظم آباد کے اس علاقے میں حیران و پریشان'
سراسیمگی کے عالم میں اِدھر سے اُدھر بھٹک رہے تھے۔ عجیب بے بسی کا عالم تھا۔ اتنا بڑا'
شیطان کی آنت کی طرح' دور دور تک پھیلا ہوا شہر اور کوئی بھی جاننے والا نہیں..... کوئی
بھی اپنا نہیں۔ ناصر کی آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے لیکن وہ اپنے آپ کو روکے ہوئے
تھا..... نہیں..... اس کو حوصلہ رکھنے کی ضرورت تھی۔

"رات ہو رہی ہے۔" مسعود نے آہستہ سے اس سے کہا۔ "پہلے کہیں سے کچھ
کھانے پینے کا بندوبست کریں گے۔ پھر سوچیں گے کہ رات گزارنے کا کیا بندوبست
کریں۔ میرے خیال میں کسی دروازے پر دستک دے کر مالک مکان سے درخواست کریں
گے کہ ہمیں ایک رات گزارنے کی اجازت دے دے۔ ہم اسے بتائیں گے کہ ہم اپنے
رشتے دار کا گھر تلاش کر رہے ہیں جو ہمیں نہیں مل رہا ہے۔ تم کچھ مت بولنا۔ صرف مجھ
کو ہی بات کرنے دینا۔ دو آدمیوں کی باتیں الگ الگ ہو جاتی ہیں۔"

ناصر نے کہا۔ "تم ہی بات کرنا۔ شاید کوئی ہمیں ایک رات رہنے کی اجازت دے
دے۔"

"چلو' پھر پہلے کہیں سے کچھ کھانے کا بندوبست کر لیں۔" مسعود نے کہا۔ "ابھی کچھ
پیسے تو ہمارے پاس ہیں۔ ہم چند دن گزارہ کر سکتے ہیں۔ بس رات کو سونے کی جگہ مل
جائے' آگے اللہ مالک ہے۔"

وہ دونوں اس وقت ایک دودھ دہی اور مٹھائی کی چھوٹی سی دکان کے پاس سے گزر
رہے تھے۔ ایک لڑکا کڑھائے میں بھرے ہوئے دودھ میں بڑا سا چمچہ چلا رہا تھا اور ایک
بھاری بدن کا آدمی ایک طرف گدی پر بیٹھا ہوا تھا۔ "گیس ہلکی کر دے' چولھا بہت تیز
جل رہا ہے۔" اچانک آدمی نے لڑکے سے کہا۔ اس نے یہ الفاظ پنجابی میں کہے تھے۔ مسعود
اور ناصر نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگی تھیں۔

"ارے..... یہ آدمی تو پنجابی بول رہا ہے....." مسعود نے مضطربانہ انداز میں ناصر

سے کہا۔ "یہ تو کوئی اپنی طرف کا لگتا ہے"

"ہاں....." ناصر نے سرگوشی کے عالم میں کہا..... "اپنی ہی طرف کا ہے..... اس سے بات کر کے دیکھو..... شاید یہ ہمیں یوسف ماما کے گھر کا پتہ بتا سکے تو بہت ہی اچھا ہوا کہ ہمیں اپنی طرف کا ایک آدمی مل گیا۔"

"دیکھو..... میں خود ہی اس سے بات کروں گا....." مسعود نے کہا۔ "وہ ہم سے ہمارے بارے میں پوچھے گا۔ فی الحال تو ہم اس سے صرف یہی کہیں گے کہ سیالکوٹ کے رہنے والے ہیں اور اپنے ماموں کے پاس کراچی آئے ہیں....."

"مگر..... وہ بھی دوسرے تمام لوگوں کی طرح پورا پتہ پوچھے گا۔" ناصر نے سے کہا۔

"ہم کہہ دیں گے کہ ہمارے پاس پورا پتہ تھا لکھا ہوا لیکن وہ کھو گیا....." نے کہا اور اپنے اس خیال کے ساتھ ہی وہ مسکرا اٹھا۔ بہت اچھا خیال تھا..... چاہئے تھا۔

"ہاں..... ہاں....." ناصر نے جلدی سے کہا۔ "یہی کہہ دینا ماما کا کھو گیا..... اور باقی....."

"باقی باتیں میں اس سے کرلوں گا....." مسعود نے بے صبری کے ساتھ کہا۔ اس کی فکر مت کرو۔ خدا کرے اس کو یوسف ماما کا پتہ معلوم ہو۔ شاید وہ ان کے بارے میں کچھ بتا سکے۔"

ذرا دیر کے بعد وہ دونوں اس دکان پر پہنچ گئے۔ دکان دار اس وقت لڑکے کو کے کونڈوں کے بارے میں کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ وہ دونوں دکان کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ مسعود نے دکاندار کو سلام کیا۔

"وعلیکم اسلام!" دکاندار نے ان دونوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا چاہئے"

"وہ..... چاچا جی..... ہمیں اپنے ایک رشتے دار کے مکان کی تلاش ہے" مسعود نے کہا۔ کراچی میں پہلی بار ناصر کے علاوہ کسی اور شخص کے ساتھ اپنی مادری زبان میں گفتگو کر کے وہ بہت اطمینان اور سکون محسوس کر رہا تھا۔

اس کو سوچ کر جملے نہیں بنانے پڑ رہے تھے۔ الفاظ کے پیچھے بھاگنا نہیں پڑ رہا تھا اب وہ بڑی آسانی اور روانی کے ساتھ گفتگو کر سکتا تھا۔ "میرے ماما ہیں۔" اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "یوسف علی خان نام ہے ان کا وہ بلدیہ کراچی میں ایک بڑے



افسر ہیں اور ان کے پاس موٹر سائیکل ہے۔ ناظم آباد میں ان کا ذاتی مکان ہے۔ ہم ان کا مکان تلاش کر رہے ہیں۔ آپ ہماری مدد کیجئے۔"

دکان دار نے ان دونوں لڑکوں کی طرف غور سے دیکھا' جن کے چہروں اور وضع قطع پر غریبی اور پسماندگی کی چھاپ بالکل صاف طور پر نظر آ رہی تھی اور اس لڑکے کی گفتگو میں کراچی سے ناواقفیت کے عنصر کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا تھا۔

"تمہارے ماما کا پورا پتہ کیا ہے؟" اس نے مسعود سے سوال کیا۔ "وہ ناظم آباد کے کس نمبر میں رہتے ہیں؟" دکان دار نے پوچھا۔

"ہمارے پاس ان کا پورا پتہ لکھا ہوا تھا....." مسعود نے فوراً کہا۔ "لیکن وہ ہمارے پاس سے گم ہو گیا۔ ہمیں صرف اتنا یاد ہے کہ وہ ناظم آباد میں رہتے ہیں جہاں ان کا اپنا ذاتی مکان ہے اور ان کے پاس موٹر سائیکل ہے۔"

"اس طرح تو تم قیامت تک ان کا گھر تلاش نہیں کر سکو گے....." دکان دار نے کہا۔ "کراچی میں کہاں رہتے ہو تم؟" اس کی متجسس آنکھیں ان کا گہرائی کے ساتھ جائزہ لے رہی تھیں۔

"ہم..... ہم کراچی میں نہیں رہتے....." مسعود نے سنبھل کر جواب دیا۔ دکان دار کے پاس آنے سے پہلے ہی وہ اس قسم کے سوال جواب کے لئے اور اس قسم کی صورت حال کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ اس نے بہت ساری باتیں سوچ لی تھیں۔ اپنی حفاظت کرنے کا اپنے آپ کو بچانے کا جذبہ پورے عروج پر تھا اور اسے نئے حالات سے نبرد آزما ہونے کی نئی نئی راہیں دکھا رہا تھا۔ "ہم پنجاب سے آئے ہیں یوسف ماما کا پتہ ہمارے پاس تھا۔ جو ہم سے گم ہو گیا....."

"پنجاب کے کس شہر سے آئے ہو؟" دکاندار نے پوچھا۔ "اور تمہارے ساتھ کون ہے؟"

"ہم لوگ سیالکوٹ سے آئے ہیں۔" مسعود نے کہا۔ "اور ہم دونوں تنہا ہیں ہمارے ساتھ اور کوئی نہیں۔ یہ میرا چاچا زاد بھائی ہے۔" اس نے ناصر کی طرف اشارہ کیا۔

"اور یہاں کہاں ٹھہرے ہو؟" دکاندار نے پوچھا۔ وہ ٹٹولتی ہوئی نظروں سے ان کو دیکھ رہا تھا۔

"ہم..... ہم..... کہیں نہیں ٹھہرے ہوئے ہیں۔" مسعود نے جلدی سے

بات کو سنبھالا۔ ”ہم کو تو یوسف ماما کے گھر جانا تھا اور ہم گاڑی سے اترنے کے بعد
یوسف ماما کا گھر تلاش کر رہے ہیں جو ہم کو اب تک نہیں ملا۔“

دکاندار ان کے چہرے پر پھیلی ہوئی بے بسی اور بے چارگی کو دیکھ رہا تھا۔ دوسرا
تو بالکل خاموش کھڑا ہوا تھا۔ یاس اور ناامیدی کی تصویر بنا ہوا۔

”اوئے پاگلا' تم کو کس نے کراچی بھیج دیا؟“ دکان دار نے ماتھے پر بہت سے
ڈالتے ہوئے کہا۔ ”تم بغیر کسی پتے کے ناظم آباد میں اپنے ماما کا گھر تلاش کر رہے ہو
تمہیں معلوم ہے ناظم آباد کتنا بڑا ہے؟ تمہارے کئی سیالکوٹ سما جائیں گے ناظم آباد
میں۔“

مسعود اس کی بات سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے نارتھ ناظم
آباد سے ناظم آباد تک کا جو سفر بس کے ذریعے کیا تھا اس سے اس کو کچھ نہ کچھ اندازہ
ہو ہی گیا تھا۔ ناظم آباد' نارتھ ناظم آباد..... ناظم آباد سب ایک ہی ہوگا۔ اس وقت
ایک گاہک مٹھائی خریدنے کے لئے آگیا اور اس کے فوراً ہی بعد تین گاہک اور آگئے۔ دو
گاہک دہی خریدنے آئے تھے۔ ایک دودھ لینے آیا تھا۔ دکان دار گاہکوں کے ساتھ مصروف
ہوگیا۔ کڑھاؤ میں چمچہ چلانے والا لڑکا' جو عمر میں مسعود سے بڑا معلوم ہوتا تھا' غور سے ان
دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ مسعود کے اور دکاندار کے درمیان ہونے والی اب تک کی
گفتگو کو خاموشی سے سنتا رہا تھا۔

دونوں امید و بیم کے عالم میں خاموش کھڑے ہوئے تھے۔ مسعود جلدی جلدی سوچ
رہا تھا کہ اس کو آگے کیا کہنا ہے۔ کس طرح بات بنانی ہے کہ اپنے آپ کو اور ناصر کو
بچائے رکھے اور کچھ بات بھی بن جائے بس ایک دو راتوں کی ہی تو بات تھی۔ اس کے بعد
تو کہیں نہ کہیں کام مل ہی جانا تھا۔ کئی لوگوں نے جو کراچی میں رہتے اور یہاں کام کرتے
تھے ان کو پورے وثوق اور یقین کے ساتھ یہ بات بتائی تھی اور اس وثوق اور یقین کو اپنا
سہارا بنا کر ناصر کو اپنے ساتھ لے کر اپنی اور ناصر کی قوت محنت کے واحد اثاثے کے
ساتھ' وہ کراچی آن پہنچا تھا۔ بس' کسی کی تھوڑی سی مدد کی ضرورت تھی۔ کاش یوسف ماما
مل جاتے..... اگر وہ مل جاتے تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ آن کی آن میں سارے درد
دور ہو جاتے اور سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جاتا لیکن اب ان کا ملنا آسان نہیں معلوم ہوتا
تھا۔

ذرا دیر میں دکان دار گاہکوں سے فارغ ہوگیا اور دوبارہ ان دونوں کی طرف متوجہ



مسکین صورت بنائے ہوئے' ابھی تک اس کی دکان پر کھڑے ہوئے تھے۔
”ہاں تو پھر؟“ دکان دار نے ان کی طرف دیکھ کر سوالیہ انداز میں کہا۔ ”تمہارے ماما
اپنے تو اس طرح نہیں چلے گا۔ کراچی میں اور کسی کا گھر جانتے ہو؟ کوئی اور عزیز رشتے
ار تمہارا ہے یہاں؟“

”نہیں.....“ مسعود نے جواب دیا۔ ”یہاں ہمارا اور کوئی عزیز رشتے دار موجود
یں ہے اور ہم پہلی بار کراچی آئے ہیں ہمارے پاس رہنے کا کوئی ٹھکانہ بھی نہیں ہے۔
ر آپ اتنی مہربانی کریں کہ ہمیں رات بھر کے لئے کہیں ٹھہرنے کی جگہ دلوادیں تو آپ
ہت احسان ہوگا۔ صبح کو ہم چلے جائیں گے۔ اپنے لئے کوئی کام دھندا تلاش کریں
ے.....“

”تمہارے والدین نے تم کو تنہا کراچی کیوں بھیج دیا؟“ دکاندار نے ان سے پوچھا۔
کیوں آئے ہو تم یہاں؟“

”ہم جی..... چاچا جی..... بہت غریب لوگ ہیں.....“ مسعود نے بھرائی
وئی آواز میں اور عاجزانہ لہجے میں کہا۔ ”ہمارے گھروں میں کھانے کو نہیں ہے۔ ہم یہاں
راچی میں محنت مزدوری کرنے اور پیسہ کما کر اپنے گھر بھیجنے کے لئے آئے ہیں۔ اگر آپ
ارے اوپر مہربانی کریں اور ہمیں کوئی کام دھندہ دلوا دیں تو ہم آپ کا یہ احسان ہمیشہ یاد
کھیں گے۔“ مسعود نے ایک ہی بار ہمت کر کے ساری بات کہہ دی تھی۔ جو کچھ وہ کہنا
اہتا تھا اس نے ایک دم کہہ دیا ان ساری باتوں کو جو اس کے سینے کے اندر ابل پڑنے کو
بے تاب تھیں' اس نے ایک ہی بار اس دکان دار کے سامنے اگل دیا جس کے بارے میں
س کو تھوڑی بہت امید تھی کہ شاید وہ ان کی مدد کرے۔ اپنے والدین کے بارے میں
کان دار کے سوال کو وہ جان بوجھ کر نظر انداز کر گیا تھا۔

دکاندار نے اس کی بات کا فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔

دکاندار' خواجہ صابر علی' ایک جہاں دیدہ اور تجربہ کار آدمی تھا اس نے پہلی ہی نظر
میں بھانپ لیا تھا کہ یہ دونوں لڑکے اپنے گھروں سے بھاگ کر آئے ہیں۔ سیالکوٹ سے
آنے والے ان لڑکوں کے پاس کپڑوں کے سوا اور کوئی سامان نہیں تھا جو ان کے جسم پر
تھے۔ ان کے ہاتھوں میں تو کپڑے کا ایک تھیلا تک نہیں تھا اور یہ ناظم آباد کے وسیع
وعریض علاقے میں ایک گھر ڈھونڈتے پھر رہے تھے جس کا پتہ بھی انہیں مکمل طور سے
نہیں معلوم تھا۔

اس گھر کے علاوہ ان لوگوں کا کراچی میں کوئی ٹھکانہ نہیں تھا اور یہ لوگ کہیں ٹھہرے ہوئے نہیں تھے۔ ٹرین سے اترنے کے بعد اب تک وہ سڑکوں پر بھٹک رہے تھے۔ تاہم' محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ یہ دونوں خطرناک گروہ کے رکن بھی ہو چکے تھے۔ آج کل لوٹ مار کرنے والے چوروں اور ڈاکوؤں نے طرح طرح کے انوکھے ناقابل یقین طریقے اختیار کرنے شروع کر دیئے تھے ..... کام اور نوکری کے بہانے بچوں اور عورتوں کو گھروں دکانوں اور کارخانوں وغیرہ میں داخل کرنا اور پھر چوری یا ڈکیتی کرنا' یا کسی اور طریقے سے رقم اینٹھ لینا۔ وہ فوری طور پر ان بچوں کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اگر یہ بچے واقعی کراچی میں نووارد ہیں تو کہیں غلط قسم کے لوگوں کے ہاتھوں میں جا پڑیں اور نقصان اٹھائیں۔ یہاں اس شہر میں تو کیسے کیسے خطرناک اور سفاک جرائم پیشہ افراد اور گروہ موجود تھے۔ جو انسانوں کو گوشت پوست کی تجارت سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ خواجہ صابر علی ایک شریف النفس انسان تھا۔ اسے ان دونوں لڑکوں سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ وہ انہیں انسانوں کے اس جنگل میں بے نام اور نامعلوم وحشیوں کے رحم و کرم پر چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ تاہم اپنے مفادات کا مکمل تحفظ کرتے ہوئے مناسب حکمت عملی سے کام لینا چاہتا تھا۔

فی الحال اس نے ان کے گھروں اور والدین کے بارے میں سوالات کو ملتوی کر اور ان سے دوسری باتیں کرنے لگا۔ "تو کیا کیا کام کر سکتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ہر قسم کی محنت مزدوری کرنے کا کام چاچا جی۔" مسعود نے فوراً مستعدی کے ساتھ جواب دیا۔ "ہم محنت مزدوری کرنے والے غریب لوگ ہیں' کسی بھی کام سے انکار نہیں ہے۔ جو کام بھی ملے گا کر لیں گے۔"

خواجہ صابر علی نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا وہ اس کم سن لڑکے کے چہرے پر معصومیت اور مظلومیت کے پردے میں چھپی ہوئی ریاکاری' منافقت اور فریب کو تلاش کر رہا تھا لیکن ان چیزوں کی کوئی علامت اس کو اس سادگی سے بھرپور معصوم چہرے پر نظر نہیں آ رہی تھی اور دوسرا لڑکا ابھی بہت چھوٹا تھا اس سے کسی منصوبہ بند ریاکاری کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔

"تمہارے ساتھ کوئی سامان وغیرہ نہیں ہے؟" خواجہ صابر علی نے مسعود سے پوچھا۔

"جی نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "ہم لوگ..... ہم تو بس جی خالی ہاتھ ہیں۔"



"ادھر بیٹھ جاؤ۔" اس نے اپنے قریب واقع ایک چھوٹے سے نیم پختہ چبوترے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ مسعود اور ناصر دونوں خاموشی سے وہاں اس چبوترے پر جا کر بیٹھ گئے۔ خواجہ صابر علی اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس کے پاس کئی گاہک آ گئے تھے۔ انہیں نمٹانا تھا۔ لڑکا دودھ کے کڑھاؤ میں چمچہ چلا رہا تھا۔

"مجھے لگتا ہے یہ آدمی ہماری مدد کرے گا۔" ناصر نے چپکے سے مسعود سے کہا۔ دونوں کافی دیر تک خاموش بیٹھے رہے اور پھر ناصر نے بات چیت کا دوبارہ آغاز کیا۔ "شاید یہ ہماری مدد کرے۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" مسعود نے آہستہ سے دکاندار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا' وہ گتے کے ایک ڈبے میں گلاب جامن تولنے میں مصروف تھا۔ "یہ ہمیں کہیں کام دلوا دے تو پھر مزا آ جائے اور مجھے امید ہے کہ دلوا دے گا۔ اس کو شاید ہمارے حال پر رحم آ گیا ہے۔"

"یہ ہمیں کہیں پکڑوا تو نہیں دے گا مسعود؟" ناصر نے بہت ہلکی سرگوشی میں اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"ہم اس کو اپنے بارے میں سب کچھ صحیح صحیح نہیں بتائیں گے۔" مسعود نے محتاط انداز میں کہا۔ "اور اپنے گھروں کے صحیح پتے بھی نہیں بتائیں گے۔ ہمیں تو بس یہی کہنا ہے کہ ہم غریب لوگ سیالکوٹ سے آئے ہیں اور محنت مزدوری کر کے پیسہ کمانا چاہتے ہیں اور اب جبکہ ہم یہاں آ گئے ہیں تو کسی نہ کسی سے تو کام کے لئے کہنا ہی ہو گا۔ کسی نہ کسی کی مدد تو لینی ہی ہو گی۔"

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔" ناصر نے کہا۔ "کسی نہ کسی کی مدد تو لینی ہی ہو گی۔ ہم تو یہاں کسی کو بھی نہیں جانتے۔ اگر تمہارے یوسف ماما مل جاتے تو کتنا اچھا ہوتا لیکن اب تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان کو شاید ہی تلاش کر سکیں۔"

"ایک صورت ہو سکتی ہے یوسف ماما کو تلاش کرنے کی۔" اچانک مسعود کے دل میں ایک بالکل نیا خیال آیا۔ "اگر ان کو ان کے دفتر میں تلاش کیا جائے؟" اس نے فخریہ اور سوالیہ نظروں سے ناصر کی طرف دیکھا۔ یہ اچھوتا خیال ابھی ابھی اس کے دماغ میں آیا تھا اور وہ ناصر سے اس کی داد چاہتا تھا۔

"ہاں..... ہاں....." ناصر اس کی بات سن کر جیسے اچھل پڑا۔ "یہ تو بہت اچھی بات سوچی ہے تم نے..... یوسف ماما بلدیہ کراچی میں کام کرتے ہیں تو بلدیہ کے

دفتر سے ان کے بارے میں ضرور معلوم ہو سکے گا۔ تم اس آدمی سے کہنا کہ ہمیں بلدیہ کے دفتر کا پتہ بتا دے۔ ہم کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچ جائیں گے اور یوسف ماما کو تلاش کر لیں گے۔"

"ہاں..... یہ ٹھیک ہے۔" مسعود نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "ہم بلدیہ کے دفتر جاکر یوسف ماما کو تلاش کر لیں گے۔ پھر کتنا اچھا ہو گا۔ اپنے دفتر میں تو یوسف ماما ہی مل جائیں گے۔"

وہ دونوں اسی طرح چبوترے پر بیٹھے رہے۔ دکاندار نے ان کو اپنے پاس بلایا اور ان سے کچھ اور کہا۔ وہ اپنے کام میں مصروف رہا۔ اس کے پاس گاہک آتے رہے اور وہ ان کو نمٹاتا رہا۔

رات ڈھل رہی تھی اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ تاہم سڑک پر لوگوں کی آمدورفت میں اور چہل پہل میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ آس پاس کے تمام مکانوں میں روشنی ہو اسی طرح تھی۔ ساری دکانیں بھی کھلی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں چبوترے پر بیٹھے ہوئے آس پاس کے منظر کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ کراچی کے مکانات کو غور سے دیکھنے کا انہیں پہلی بار موقع ملا تھا۔ چبوترے پر بیٹھے بیٹھے وہ آس پاس کے ان تمام مکانوں کو دیکھ رہے تھے انہیں آسانی کے ساتھ نظر آسکتے تھے۔ یہ مکانات اپنی ساخت اور اپنی شکل وصورت کے اعتبار سے ان کے اپنے علاقے کے مکانوں سے بہت مختلف دکھائی دیتے تھے۔

کافی دیر سے دکان پر کوئی گاہک نہیں آیا تھا اور دکان دار خالی بیٹھا ہوا لڑکے کو مختلف کاموں کے بارے میں ہدائتیں دے رہا تھا۔ مسعود نے یہ موقع غنیمت جانا اور چبوترے سے اٹھ کر اس کے پاس چلا گیا۔ وہ یوسف ماما کے بارے میں اس سے نئی بات کہنے کے لئے بے چین ہو رہا تھا۔

"چاچا جی....." اس نے اس کے پاس جاکر بڑی لجاجت سے کہا۔ "میرے یوسف ماما بلدیہ کراچی میں افسر ہیں۔ یہ بات تو مجھ کو بہت اچھی طرح معلوم ہے تو میں چاہتا ہوں کہ میں بلدیہ کے دفتر میں جاکر ان کو تلاش کر لوں۔ یہ بلدیہ کا دفتر کہاں ہو گا؟ اگر میں کل دن میں وہاں چلا جاؤں تو....."

خواجہ صابر علی نے کڑی نظروں سے اسے گھور کر دیکھا۔ مسعود سہم گیا۔ اس سے شاید کوئی غلطی ہو گئی تھی۔

"بلدیہ کے دفتر؟" اس نے کڑے تیوروں سے مسعود کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم بلدیہ



کے دفتر جاکر اپنے ماما جی کو تلاش کرو گے؟ اوے پاگل..... اوئے پاگلا..... ارے بلدیہ کے دفتر میں دس بیس نہیں' ہزاروں آدمی کام کرتے ہیں ہزاروں..... اور بلدیہ کا سب سے بڑا دفتر تو بندر روڈ پر ہے لیکن اس کے علاوہ شہر بھر میں بلدیہ کے بیسیوں دفتر ہیں بیسیوں..... تم مہینوں بھی دھکے کھاتے رہو تو اپنے ماما جی کو اس طرح تلاش نہیں کر سکو گے۔ یہ کراچی ہے کراچی....."

مسعود کا منہ اتر گیا۔ وہ خاموش ہو گیا اور آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ یوسف ماما کو تلاش کرنے کی یہ کوشش بھی ناکام ہو گئی۔

"ابھی جاؤ اور وہیں چبوترے پر بیٹھ جاؤ۔" خواجہ صابر علی نے نرمی سے اس سے کہا۔ مسعود چپ چاپ دوبارہ وہاں آکر بیٹھ گیا۔ ناصر نے اس سے کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ناصر اس وقت اس کے قریب ہی موجود تھا جب خواجہ صابر علی نے اس سے یہ بات کہی تھی۔

"اس کی اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ واقعی اس کا کوئی ماموں کراچی میں موجود ہے جو بلدیہ کے کسی دفتر میں کام کرتا اور ناظم آباد میں رہتا ہے۔" خواجہ صابر علی نے تجزیہ کرتے ہوئے سوچا۔ اس کے دل میں ان دونوں کی طرف سے موجود شبہات میں کمی واقع ہو گئی۔

آس پاس کی دکانیں اب بند ہونا شروع ہو گئی تھیں اور سڑکوں پر آمدورفت میں بھی کمی واقع ہو گئی تھی۔ دکان دار نے لڑکے کے ساتھ مل کر سامان سمیٹنا شروع کیا۔

"نہ جانے کیا بجا ہو گا۔" ناصر نے دل ہی دل میں سوچا۔ "اماں اس وقت نہ جانے کیا کر رہی ہوں گی۔ آپا کیا کر رہی ہوں گی۔" وہ رات کے اس بڑھتے ہوئے اجنبی سناٹے میں ایک اجنبی دیار میں اجنبیوں کے درمیان اپنے گم گشتہ گھر کو اور گھر والوں کو بڑی شدت کے ساتھ یاد کرنے لگا۔ ویسے تو یاد کی لہریں برابر گھٹتی بڑھتی رہتی تھیں اور شاید ہی کوئی وقت ایسا ہوتا ہو جب کسی نہ کسی عنوان سے اپنا گھر اور خاص طور سے ماں اور آپا یاد نہ آتی ہوں لیکن جب ذہنی خلجان زیادہ ہوتا تھا اعصاب پر دباؤ زیادہ ہوتا تھا تو یاد کی لہروں کا دباؤ بھی زیادہ بڑھ جاتا تھا۔

"یہ دکاندار اب ہمارے ساتھ کیا کرے گا؟" دکان دار اور لڑکے کو دکان بند کرنے کی تیاریاں کرتے ہوئے دیکھ کر اس کے دل میں خیال کی ایک نئی رو نے کروٹ لی اور اس کے ساتھ ہی خوف اور بے یقینی کی ایک لہر بھی دل میں ابھری۔ خدا جانے اب آگے کیا

ہونے والا تھا۔

دکان دار نے ان دونوں سے ابھی تک کچھ نہیں کہا تھا۔ بہت سارا سامان ایسا تھا جو انہوں نے باہر نکال لیا تھا۔

دکاندار نیچے اترا اور قریب ہی کھڑی ہوئی ایک خالی سوزوکی کی طرف بڑھا۔ دوائی کو اسٹارٹ کرکے دکان کے عین سامنے لے آیا اور اس کے ساتھ ہی لڑکا دکان کا کچھ سامان جو باہر تھا اٹھا اٹھا کر اس میں رکھنے لگا۔

مسعود نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کی مدد کرنا شروع کردی اور خود بھی سامان اٹھانے لگا۔ ناصر بھی فوراً اس کام میں شامل ہوگیا۔ سامان زیادہ نہیں تھا۔ دکاندار نے دونوں کو کام کرنے سے منع نہیں کیا اور ذرا ہی دیر میں وہ سارا سامان سوزوکی میں رکھ دیا گیا۔ مسعود اور ناصر مسکینوں' عاجزوں اور خادموں کی طرح وہاں کھڑے ہوئے تھے۔

"نام کیا ہیں تم لوگوں کے؟" خواجہ صابر علی نے پہلی بار ان سے ان کے نام پوچھے اور انہوں نے اپنے اپنے نام بتا دیئے۔

تو..... تمہارے ماں باپ نے تم کو محنت مزدوری کرنے کے لئے کراچی بھیجا ہے؟" اس نے بڑا چبھتا ہوا سوال کیا۔ لیکن مسعود اس قسم کے سوالوں کے لئے ذہنی طور پر پہلے سے تیار تھا۔ اسے اصل حقائق کو چھپانا تھا۔

"جی ہاں چاچاجی۔" اس نے کہا۔ "ہم محنت مزدوری کرنے کے لئے کراچی آئے ہیں۔ اگر آپ ہماری مدد کریں۔"

"آج کی رات تو تم میرے ساتھ میرے گھر میں گزار لو۔" دکان دار نے اس سے کہا۔ "تم کہتے ہو کہ کراچی میں تمہارا کوئی اور ٹھکانہ نہیں ہے کل کچھ دیکھیں گے لیکن ایک بات اچھی طرح جان لو اور دونوں کان کھول کر سن لو۔ میں چوروں بدمعاشوں کے حق میں بہت برا آدمی ہوں۔ ہاتھ پیر توڑ کر اپاہج کر دیتا ہوں' زندگی بھر کے لئے روگی۔ اگر تم کسی چوری بدمعاشی کی نیت سے میرے پاس آئے ہو تو بہتر یہی ہوگا ابھی چلے جاؤ ورنہ تمہارے لئے بہت برا ہوگا۔"

"نہیں نہیں چاچاجی۔" مسعود نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "خدا کی قسم ہم چور بدمعاش نہیں ہیں۔ ہم کسی کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ خدا کی قسم ہم یہاں محنت مزدوری کرنے کے لئے آئے ہیں خدا کی قسم میرے ماما یوسف علی خان کراچی میں موجود ہیں۔ وہ بلدیہ میں کام کرتے ہیں اور ان کے پاس....."



"اچھا اور زیادہ قسمیں کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔" دکاندار نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ "میرا نام خواجہ صابر علی ہے اور یہ میرا بیٹا خواجہ طاہر علی ہے۔ ہمارے بارے میں پہلے سے جان لو کہ ہم چوروں بدمعاشوں اور دھوکے بازوں کے سخت دشمن ہیں ہم تو اللہ سے ڈر کھا کر اس وقت تمہاری مدد کر رہے ہیں لیکن اگر تم نے....."

"نہیں چاچاجی۔" اچانک مسعود جلدی سے اس کے قدموں میں زمین پر بیٹھ گیا اور اس نے اس کے پاؤں پکڑ لئے۔ "ہمارے بارے میں ایسا مت سوچئے چاچاجی۔ ہم ایسے لوگ نہیں ہیں۔ ہم تو اپنے گھر والوں کی مدد کرنے کے لئے یہاں آئے ہیں۔ ہم تو بہت ہی غریب لوگ ہیں چاچاجی۔"

بات چیت کرنے کی ساری ذمہ داری مسعود کی تھی اور وہ اس کو بڑی عمدگی کے ساتھ نبھا رہا تھا۔ ناصر خاموش تھا۔

"گاڑی میں بیٹھو۔" خواجہ صابر علی خان نے ان دونوں سے کہا اور گاڑی کے پچھلے حصے کی طرف اشارہ کیا۔ جس میں سامان رکھا تھا۔ اس سامان میں مٹھائیاں رکھنے کے بڑے بڑے خالی تھال اور کشتیاں وغیرہ شامل تھیں اور کچھ اور چیزیں بھی تھیں۔

خواجہ صابر علی کا حکم پاتے ہی وہ دونوں بڑی تیزی سے اچھل اچھل کر سوزوکی کے پچھلے حصے میں سوار ہوگئے اور گاڑی کے بینچ پر بیٹھ گئے۔ خواجہ صابر علی اور اس کا بیٹا آگے بیٹھ گئے۔ وہ لوگ اب ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے تھے خواجہ صابر علی نے سوزوکی اسٹارٹ کی۔ سوزوکی وہاں سے روانہ ہوئی تو ان دونوں کے دل میں مسرت سکون اور اطمینان کی ایک گہری اور بھرپور لہر اٹھی۔ انہوں نے مسکرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں خوشی کی چمک تھی۔

"خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم کو رات گزارنے کی جگہ مل گئی۔" مسعود نے سکون انداز میں ناصر سے کہا۔ "ورنہ اس وقت تو بڑی مشکل ہوجاتی۔ ہم کہاں جاتے؟ سوائے اس کے کہ کہیں کسی کونے کھدرے میں پڑ کر سو جاتے۔"

"خدا اس چاچا کو خوش رکھے۔" ناصر نے کہا۔ "یہ اس وقت ہمارے کام آگیا۔ ویسے ہم پر شبہ کر رہا تھا....."

"بھئی دیکھو نا وہ تو ہم کو نہیں جانتا ہے۔" مسعود نے کہا۔ "اب اس کو کیا معلوم کہ ہم واقعی کوئی ضرورت مند ہیں یا کوئی چور اچکے ہیں' آخر ہمیں اپنے گھر لے جا رہا ہے تو اس کو سوچ سمجھ کر ایسا کرنا ہوگا۔"

"ہاں۔" ناصر نے آہستہ سے کہا۔ وہ دونوں آپس میں بہت ہلکی سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے اور اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ ان کی آواز گاڑی کے اگلے حصے پر پہنچے۔ "یہ بھی ٹھیک ہے۔ وہ تو ہم دونوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔"

سوزوکی ناظم آباد کی چوڑی سڑک پر چلی جا رہی تھی اور پھر وہ بالکل سیدھی جاتی ہوئی نارتھ ناظم آباد کی طرف جانے لگی۔ ان دونوں کو اس بات کا اندازہ بھی نہیں ہو رہا کہ وہ اس سڑک پر واپس جا رہے ہیں جدھر سے وہ آئے تھے۔ وہ دونوں' دونوں جانب دور دور تک پھیلے ہوئے روشن مکانوں کو دیکھ رہے تھے۔ کس قدر مکانات تھے! کتنے بڑے سے لوگ رہتے ہوں گے ان مکانوں میں۔ ناصر کی نظریں دور تک روشنی کا تعاقب کر رہی تھیں۔

سوزوکی نارتھ ناظم آباد میں ایک کچی بستی کے قریب ایک بڑے احاطے کے آہنی پھاٹک کے قریب جاکر رک گئی۔ اس نے زور سے ہارن بجایا اسی اثناء میں طاہر علی سوزوکی سے نیچے اتر چکا تھا۔ ذرا دیر میں کسی نے گیٹ کھول دیا اور سوزوکی اندر داخل ہوگئی۔

احاطے میں نیم تاریکی تھی اور اس نیم تاریکی میں ایک جانب سے کسی جانور کے ڈکرانے کی آواز سنائی دی۔ مسعود نے فوراً پہچان لیا۔ یہ بھینس کے ڈکرانے کی آواز ہے۔ مسعود کے ہونٹوں پر خود بخود مسکراہٹ نمودار ہوگئی تو اس گھر میں بھینس بھی موجود ہے۔

وہ سب لوگ سوزوکی سے نیچے اتر آئے اور تب مسعود اور ناصر نے ایک اور آدمی کو دیکھا جو گیٹ بند کرنے کے بعد سوزوکی میں سے سامان اتروانے میں طاہر علی کی مدد کر رہا تھا۔ وہ ایک عمر رسیدہ آدمی تھا اور ان دونوں کو بڑے غور اور تعجب سے دیکھ رہا تھا۔ مسعود اور ناصر جلدی جلدی سوزوکی میں سے سامان اتروا رہے تھے۔

"یہ دونوں کون ہیں خواجہ صاحب؟" آخر اس شخص سے رہا نہ گیا اور اس نے خواجہ صابر سے پوچھ ہی لیا۔

"پنجاب سے کام کی تلاش میں کراچی آئے ہیں۔" خواجہ صابر علی نے کہا۔ "آج رات ان کو ادھر باڑے میں ہی سلا لینا۔ کل پھر دیکھیں گے کچھ۔"

اس شخص نے آہستہ سے سر ہلایا اور کچھ کہا نہیں۔ خواجہ صابر علی ان دونوں کو ساتھ لے کر گھر کے اندر داخل ہوا۔ طاہر علی بھی اس کے ساتھ تھا۔ گھر کے پہلے کمرے میں مٹھائیاں بنانے کا سازوسامان پھیلا ہوا تھا اور بہت سی بنی ہوئی مٹھائیاں



رکھی ہوئی تھیں۔ دکان سے لائے جانے والے تھال وغیرہ یہیں رکھ دیئے گئے۔ اس کمرے میں کئی چولہے بھی موجود تھے اور بڑے بڑے کڑھاؤ بھی۔

وہ لوگ وہاں سے گزر کر ایک اندرونی کمرے کی طرف بڑھ ہی رہے تھے کہ سامنے سے ایک سن رسیدہ عورت آگئی اور ان دونوں کو دیکھتے ہی ٹھٹک کر رک گئی۔ وہ انہیں غور سے دیکھنے لگی۔

"یہ کون ہیں؟" اس نے خواجہ صابر علی سے پوچھا اور خواجہ صابر علی نے اسے وہی جواب دیا جو ابھی اس نے اس آدمی کو دیا تھا۔ "ان کا ایک ماموں ہے کراچی میں۔" اس نے مزید اضافہ کر دیا۔ "شاید کبھی کہیں مل جائے۔ فی الحال ان کے لئے کوئی کام کاج کا بندوبست کردیں گے کہیں۔"

مسعود اور ناصر بظاہر سہمے ہوئے لیکن دل ہی دل میں بہت خوش' مٹھائیوں کی طرح طرح کی مہک سے بھرے ہوئے کمرے میں خاموش کھڑے تھے۔ وہ عورت ان کو بغور دیکھ رہی تھی۔ پھر اس عورت نے ان سے براہ راست مخاطب ہو کر ان کے نام پوچھے انہوں نے اپنے نام بتائے۔

"ان کو باہر باڑے میں لے جاؤ۔" خواجہ صابر علی نے اپنے بیٹے طاہر علی سے کہا۔ "ان کو نلکا دکھا دو' اور ان سے کہو کہ وہاں سے ہاتھ منہ دھولیں۔ پھر اندر لے آؤ تو کھانا کھالیں۔"

"جی اچھا۔" طاہر علی نے کہا' اور ان دونوں کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ وہ انہیں باہر باڑے میں لے گیا جہاں دو بھینسیں بندھی ہوئی تھیں۔ باڑے کے ایک کنارے پر باہر کی طرف ایک نل لگا ہوا تھا۔ یہاں بجلی کا بلب جل رہا تھا۔ اچھی خاصی روشنی ہو رہی تھی۔ طاہر علی نے ان دونوں کو اس طرف بھیج دیا۔ وہ آدمی بھی وہاں موجود تھا جس سے ابھی کچھ دیر پہلے ان کی ملاقات ہوئی تھی۔

"حامد چاچا۔" طاہر علی نے اس کو دیکھ کر کہا۔ "چارے والا چارہ دے کر گیا یا نہیں؟ صبح کو تو چارہ بالکل ختم ہوگیا تھا۔"

"دے گیا ہے۔" اس شخص نے کہا۔ "اس کا بچہ بیمار تھا اس لئے نہیں آسکا تھا۔"

مسعود اور ناصر جلدی جلدی نل پر ہاتھ منہ دھو رہے تھے۔ وہاں ایک پرانی سی صابن دانی میں ایک صابن بھی رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے فوراً ہی استعمال کیا۔ صابن میں سے خوشبو آرہی تھی۔

وہ دونوں کچھ دیر تک باہر رہے اور پھر طاہر علی انہیں اپنے ساتھ دوبارہ اندر آیا۔ وہ مٹھائیوں والے کمرے میں سے گزر کر اندر ایک دوسرے کمرے میں گئے، جہاں انہوں نے کھانے کی میز دیکھی اور اس کے گرد کرسیاں، میز پر کھانا رکھا ہوا تھا۔ خواجہ صابر علی اور وہ عورت کمرے میں موجود تھے۔

مسعود اور ناصر کا بھوک کے مارے برا حال تھا۔ نہ جانے کتنی رات ہوگئی تھی اور انہوں نے اب تک کھانا ہی نہیں کھایا تھا۔ میز پر رکھا ہوا کھانا دیکھ کر ان کی بھوک اور بھی زیادہ چمک اٹھی۔

"بیٹھو۔" خواجہ صابر علی نے ان سے کہا۔ اور وہ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں اس سے پہلے کبھی بھی میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا نہیں کھایا تھا اور یہ ان کے لئے پہلا اور بڑا ہی پُر لطف اور سنسنی خیز تجربہ تھا۔ خواجہ صابر علی عورت اور طاہر علی بھی میز کے گرد بیٹھ گئے تھے۔

"یہ طاہر علی کی ماں ہیں۔" صابر علی نے پہلی بار اپنی بیوی کا ان لوگوں سے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "چاچی ہیں تمہاری۔"

"جی..... جی ہاں چاچا جی۔" مسعود نے جلدی سے کہا وہ پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ عورت خواجہ صابر علی کی بیوی ہی ہوگی۔

"اچھی طرح کھانا کھالو۔" چاچی نے ان سے کہا اور پھر وہ قدرے رک کر بولی۔ "تم لوگوں کے اور کتنے بہن بھائی ہیں؟"

اس کے اس سوال کا ان دونوں نے بالکل صحیح صحیح جواب دیا۔ سوائے اس کے کہ مسعود نے یہ نہیں بتایا کہ اس کے باقی سب بھائی بہن سوتیلے ہیں۔ خواجہ صابر علی نے اب تک ان سے ان کے خاندان کے بارے میں بھی کچھ نہیں پوچھا تھا۔

ان دونوں کو میز کرسی پر کھانا کھاتے ہوئے بہت عجیب لگ رہا تھا اور لطف بھی آرہا تھا۔ انہوں نے اپنے علاقے میں لوگوں کو صرف ہوٹلوں میں میز کرسی پر کھانا کھاتے دیکھا تھا۔ ان گھروں تک ان کی رسائی نہیں تھی جہاں لوگ میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ ناصر اپنی ماں کے ساتھ دو ایک بار چوہدریوں کے ہاں گیا تھا وہاں اس نے کھانے کی میز دیکھی تھی۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ پیسے کتنے ہیں تم لوگوں کے پاس؟" کھانا کھانے کے بعد خواجہ صابر علی نے اچانک ان سے سوال کیا۔ اور اس کے جواب میں انہوں نے جھوٹ نہیں بولا۔ سچ بتا دیا کہ ان کے پاس اتنے پیسے ہیں لیکن ساتھ ہی، خواجہ صابر علی کے اس سوال پر وہ دونوں سہم گئے تھے کہیں وہ ان کے پیسے چھین نہ لے..... مانگ نہ لے۔



"ٹھیک ہے۔" خواجہ صابر علی نے کہا۔ "سنبھال کر رکھنا۔ جب تک تم لوگ کوئی کام دھندہ شروع نہیں کردیتے تم کو خرچے کی ضرورت رہے گی۔ مگر پیسے برباد نہیں کرنا۔"

"جی ہاں چاچا جی....." مسعود نے فوراً مطمئن انداز میں کہا۔ "ہم تو پیسے بہت سنبھال کر خرچ کررہے ہیں۔ اتنے تھوڑے سے تو پیسے ہیں۔ اگر یہ بھی خرچ ہوگئے تو پھر ہم کیا کریں گے۔"

اس کے بعد خواجہ صابر علی ان کو باہر باڑے میں لے گیا۔ جہاں حامد موجود تھا۔ وہ اس وقت بھی وہاں کسی کام میں مصروف تھا۔ خواجہ صابر علی نے اس کو آواز دے کر کہا۔ "باڑے میں ہی ایک چارپائی ڈال دو اور رات کو ذرا ہوشیار رہنا گیٹ میں اندر سے تالہ لگا کر چابی سنبھال کر رکھنا۔ دونوں لڑکے اجنبی ہیں اور ہم ابھی ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ ویسے تو مصیبت زدہ لگتے ہیں لیکن دلوں کا حال تو خدا کو معلوم ہے۔"

"میں ہوشیار ہوں خواجہ صاحب۔" حامد نے کہا۔ "پوری طرح سے ہوشیار ہوں۔ آپ بے فکر رہیں۔" اور خواجہ صابر علی وہاں سے چلا آیا۔ آنے سے پہلے اس نے ان دونوں سے کہا کہ اب وہ آرام کریں۔ اب کل صبح ان سے بات ہوگی۔

خواجہ صابر علی اندر آیا تو اس کی بیوی حنیفہ کھانے کی میز صاف کررہی تھی۔ کچھ دیر پہلے ان دونوں لڑکوں کی عدم موجودگی میں جبکہ وہ دونوں باہر نل پر ہاتھ منہ دھونے گئے تھے اس نے اپنے شوہر سے ان بچوں کے بارے میں تفصیل جاننی چاہی تھی لیکن جو کچھ وہ اپنی بیوی کو بتا چکا تھا اس سے زیادہ تو وہ خود بھی نہیں جانتا تھا، اور نہ جاننا چاہتا تھا۔ وہ کھانے کے کمرے سے گزرتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا جہاں اس کا بستر لگا ہوا تھا۔ دن بھر کے کام کاج اور تھکن کے بعد اب بالآخر آرام کا وقت آگیا تھا۔

کچھ دیر کے بعد اس کی بیوی حنیفہ بھی کمرے میں آگئی اور اس نے ایک بار پھر ان بچوں کے بارے میں گفتگو چھیڑ دی۔

"تمہارا کیا خیال ہے، یہ دونوں اپنے گھر سے بھاگ کر آئے ہیں۔" حنیفہ نے کہا۔ "تم نے ان سے یہ بات پوچھی نہیں۔"

"مجھے یقین ہے کہ وہ دونوں اپنے گھر سے بھاگ کر آئے ہیں۔" خواجہ نے کہا۔

لیکن میں نے ان سے یہ بات پوچھی نہیں۔"

"تمہیں پوچھنی چاہئے تھی۔" حنیفہ نے کہا۔ "ہمیں ان کے بارے میں سچ سچ معلوم ہونا چاہئے۔ کیوں نہیں پوچھا تم نے؟"

"میں نے اس لئے نہیں پوچھا کہ مجھے معلوم ہے کہ وہ ابھی سچ نہیں بولیں گے اور ان کے طرح طرح کے جھوٹ میں سے سچ کو الگ کرنا ہمارے لئے خاصا مشکل ہو جائے گا۔ وہ ابھی خوفزدہ ہیں۔ ہم ان کے لئے بالکل اجنبی ہیں۔ وہ ابھی ہمیں اپنے بارے میں سب کچھ سچ نہیں بتائیں گے..... خود میں نے بھی تو نہیں بتایا تھا.....؟" اور اس کے چہرے پر ایک زخمی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ اس کا ذہن بہت پیچھے ماضی کی طرف لوٹ گیا تھا۔

آج سے تقریباً پچیس سال پہلے جب وہ کراچی آیا تھا تو اس وقت اس کی عمر پندرہ سال کی تھی اور اس وقت وہ خواجہ صابر علی نہیں تھا وہ صرف صابر علی تھا' صابر علی ولد واجد علی۔

واجد علی ضلع ساہیوال کے ایک چھوٹے سے گاؤں مراد پور کا رہنے والا تھا۔ اس کے آباؤ اجداد صدیوں سے اس گاؤں میں آباد تھے واجد علی کے پاس یہاں زمین کا ایک بہت چھوٹا سا ٹکڑا تھا جو اس کا ذریعہ معاش تھا۔ سنتا آیا تھا کہ کسی زمانے میں اس کے بزرگوں کے پاس کافی زیادہ زمین تھی لیکن پھر وہ ٹکڑوں میں بٹتے بٹتے اور بکتے بکتے بہت کم رہ گئی تھی جس کے برابر علی خان نامی ایک بڑے زمیندار کی زمین تھی جو بہت دور تک پھیلی ہوئی تھی۔

صابر علی نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے گھر میں اپنے علاوہ تین افراد کو اور پایا۔ اس کا باپ واجد علی' ماں سکینہ اور چھوٹی بہن تاجی اس سے ایک سال چھوٹی تھی۔ دونوں بھائی بہن ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔

زمین کا وہ چھوٹا سا ٹکڑا بمشکل اس خاندان کی کفالت کا بوجھ سہار پاتا تھا وہ تو کھانے والے کم تھے تو کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر گزارہ ہو جاتا تھا اگر افراد زیادہ ہوتے تو انہیں فاقہ کشی کا سامنا کرنا پڑتا۔

صابر علی کچھ بڑا ہوا تو اس نے اپنے باپ کے ساتھ زمین پر جانا اور کام کرنا شروع کر دیا۔ گاؤں کے سارے لڑکے یہی کرتے تھے سوائے زمیندار گھرانوں کے لڑکوں کے۔ ان میں سے کچھ تو اسکول جاتے تھے اور دوسرے عام لڑکے ہوش سنبھالتے ہی اپنے بزرگوں



کے ساتھ کھیتوں میں کام شروع کر دیتے تھے۔ صابر علی نے بھی کام شروع کر دیا مٹی کی خوشبو سونگھتا ہوا مٹی کے ریزوں سے اپنے اور اپنے گھر والوں کے لئے رزق تلاش کرتا ہوا اپنے محنتی بدن کے پسینے کو مٹی میں جذب کرتا ہوا وہ بڑا ہوتا گیا اور اس کے ساتھ ہی وہ سب کچھ بڑا ہو گیا جو اس کے ارد گرد موجود تھا۔ اس کی بہن تاجی بڑی ہوتی گئی' سکندر بڑا ہوتا گیا جو انہی جیسے غریب خاندان کا ایک لڑکا تھا اور اس کے باپ کے پاس تو اور بھی کم زمین تھی اور پٹواری کرم علی بڑا ہوتا گیا اس کی اولادیں بڑی ہوتی گئیں۔ وقت گزرتا جاتا ہے اور ہر شے کی عمر بڑھتی جاتی ہے۔

صابر علی کی عمر اس وقت تقریباً چودہ سال کی تھی جب پہلی بار اس کو یہ احساس ہوا کہ اس کی چھوٹی تیرہ سالہ بہن تاجی اور سکندر ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ صابر علی اس وقت تک محبت کے مفہوم سے پوری طرح آشنا نہیں تھا اور شاید تاجی بھی آشنا نہیں تھی لیکن تاجی یہ ضرور جانتی تھی کہ سکندر اس کو بہت اچھا لگتا ہے اور وہ بھی سکندر کو بہت اچھی لگتی ہے۔

لیکن وہ صرف سکندر کو اچھی نہیں لگتی تھی وہ پٹواری کرم علی کو بھی بہت اچھی لگتی تھی جس کی پہلی بیوی آٹھ بچوں کی پیدائش کے بعد اب ڈھیلے ڈھالے اور پلپلے گوشت کے ایک ڈھیر میں تبدیل ہو گئی تھی۔ انہی دنوں سکندر کے والدین نے تاجی کے لئے اپنے بیٹے کا پیغام دے دیا۔ سکندر کو تاجی پسند تھی ہی' اس کے والدین بھی اس کو اپنی بہو بنانے کے خواہش مند تھے۔

کرم علی تک یہ اطلاع پہنچی تو اس نے فوراً ہی ایک ذریعے سے تاجی کے لئے اپنا پیغام بھجوا دیا۔ اس نے کہلوایا کہ وہ دوسری شادی کرنا چاہتا ہے اور تاجی کو ایک علیحدہ مکان میں رکھے گا الگ سے خرچہ دے گا تاجی کا اس کی پہلی بیوی اور اس کے بچوں سے کوئی تعلق نہیں ہو گا۔

اپنا پیغام بھجوانے کے اگلے ہی دن وہ واجد علی کے پاس اس کی زمین پر پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بستہ تھا۔ "ارے بھئی واجد علی' تمہاری زمین کا معاملہ تو بہت گڑبڑ ہے۔" اس نے واجد علی سے کہنا شروع کیا۔ "تم نے تو زمین دار علی خان کی خاصی زمین دبا رکھی ہے۔"

"زمیندار علی خان کی زمین....." واجد علی نے سخت حیرت کے عالم میں کہا۔ "تم کیا کہہ رہے ہو پٹواری؟ میں نے زمیندار علی خان کی زمین دبا رکھی ہے؟ ہرگز نہیں۔

ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے تو کسی کی ایک انچ زمین بھی نہیں دبائی ہے یہ جو بھی زمین ہے میری ہے۔"

"پہلے میرا بھی یہی خیال تھا۔" پٹواری کرم علی نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ "لیکن ابھی چند روز پہلے جب میں کاغذات کی جانچ پڑتال کر رہا تھا تو مجھ کو معلوم ہوا کہ زمیندار علی خان کی زمین کے کچھ حصے کو تم نے اپنی زمین کے ساتھ ملا رکھا ہے۔ یہ دیکھو۔" اس نے اپنا بستہ کھول کر اس میں سے کچھ کاغذات نکال کر اس کو دکھانے شروع کئے' یہ جاننے کے باوجود کہ واجد علی مطلق ان پڑھ ہے اور وہ ان کاغذات کی تحریروں کو بالکل نہیں سمجھ سکتا۔ "اس کو دیکھو..... یہ نقشہ ہے' یہ تمہاری زمین ہے' اور اس کے برابر علی خان کی زمین ہے۔" اور وہ اسے بہت کچھ سمجھاتا اور بتاتا رہا۔

"میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے پٹواری۔" واجد علی نے زچ ہو کر کہا۔ "یہ ایک دم سے میری زمین' علی خان کی زمین کیسے ہوگئی' علی خان کی زمین میری زمین میں کیسے شامل ہوگئی؟ نہیں نہیں پٹواری جی..... یہ سب کچھ بالکل غلط ہے میری زمین میری زمین ہے' میری اپنی آبائی زمین۔ اور میں نے کسی بھی دوسرے کی زمین نہیں دبائی ہے۔"

"بات یہ ہے واجد علی کہ ابھی میرے علاوہ اور کسی کو اس بات کا علم نہیں ہے۔" پٹواری کرم علی نے پُراسرار انداز میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ "کسی کو بھی نہیں معلوم خود زمیندار علی خان کو بھی نہیں معلوم ہے اور جس وقت اسے معلوم ہو گا تو لیکن اس کو معلوم تو تب ہی ہو گا جب میں اس کو بتاؤں گا۔"

"یہ..... یہ تم..... تم کیسی بات کر رہے ہو پٹواری؟" واجد علی نے سخت پریشانی کے ساتھ کہا۔ "کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"میں کچھ نہیں کہہ رہا ہوں بھائی واجد علی" ..... پٹواری نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا جو کچھ کہہ رہے ہیں کاغذات کہہ رہے ہیں اور آئندہ بھی جو کچھ کہیں گے کاغذات ہی کہیں گے ابھی تو بات صرف میرے اور تمہارے درمیان ہے کل کو جب علی خان کو بھی اس کا علم ہو جائے گا تو پھر معاملہ میرے بس سے باہر ہو جائے گا اور میں تمہاری زمین کے ایک بڑے حصے کو اس کے قبضے میں جانے سے نہیں روک سکوں گا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں بہت سارے کام ہیں ادھر سے گزر رہا تھا سوچا تم کو یہ بات بتاتا چلوں۔"

واجد علی اور پٹواری کے درمیان ہونے والی اس تمام گفتگو کے دوران صابر علی



وہاں موجود تھا صابر علی کو یہ بات معلوم تھی کہ پٹواری کرم علی نے تاجی کے لئے اپنا رشتہ بھیجا ہے جبکہ اس کی اپنی اولادیں عمر میں تاجی سے بڑی ہیں۔ صابر علی کو پٹواری کرم علی کی شکل سے نفرت تھی خاص طور سے اس کی طوطے کی چونچ جیسی مڑی ہوئی ناک اور اس کی الو جیسی گول گول آنکھیں تو اس کو بہت ہی بری لگتی تھیں اور وہ اس تصور سے ایک لمحے کے لئے بھی مفاہمت نہیں کر سکتا تھا کہ تاجی کی شادی پٹواری کرم علی کے ساتھ ہو۔ بھلا کہاں تاجی اور کہاں پٹواری کرم علی۔

"ابا....." پٹواری کرم علی کے جانے کے بعد صابر علی نے اپنے باپ سے کہا۔ "پٹواری کیا گڑبڑ کر رہا ہے؟ یہ ہماری زمین کے ساتھ کیا کرنا چاہتا ہے؟ ہماری زمین کو علی خان کے قبضے میں دے دینا چاہتا ہے کیا؟"

"وہ ہمیں پریشان کرنا چاہتا ہے....." واجد علی نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "اس نے تاجی کے لے اپنا رشتہ بھیجا ہے اور اس کے لئے وہ ہم پر دباؤ ڈالنا چاہتا ہے۔"

"مگر تاجی کی شادی تو سکندر سے ہوگی ابا؟" صابر علی نے تشویش کے ساتھ کہا "ہوگی نا' پٹواری سے تو نہیں ہوگی؟"

"جس کے ساتھ قسمت میں لکھی ہوگی اسی کے ساتھ ہوگی۔" واجد علی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "ہر کام اوپر والے کے حکم سے اور اس کی مصلحت سے ہوتا ہے وہ جیسا چاہے گا ویسا ہی ہو گا۔"

"مگر ابا' تم تاجی کی شادی پٹواری سے ساتھ مت کرنا....." صابر علی نے اپنے باپ سے کہا۔ "پٹواری تو پہلے ہی بیوی بچوں والا ہے اور وہ تو عمر میں تم سے بھی بڑا ہے سکندر تو بہت اچھا ہے ابا....."

لیکن تاجی کی شادی سکندر سے نہیں ہو سکی۔ پٹواری کرم علی نے زمین کا ایسا چکر ڈالا کہ واجد علی اور اس کی بیوی سکینہ اپنی دلی خواہش کے باوجود تاجی کی شادی سکندر سے نہیں کر سکے۔ کیونکہ انہیں اپنی زمین بچانی تھی جو ان کے لئے حصول رزق کا واحد ذریعہ تھی۔ اگر زمین ان سے چھن جاتی تو ان کے پاس کچھ بھی نہ رہتا اور پھر پٹواری کرم علی تاجی کو ایک علیحدہ مکان دے رہا زیور اور قیمتی کپڑے دے رہا تھا۔ اور اس کے والدین کو ایک اچھی خاصی معقول رقم بھی الگ سے دے رہا تھا۔ شادی کے سارے اخراجات بھی خود ہی اٹھا رہا تھا چنانچہ تاجی کے لئے پٹواری کرم علی کا پیغام منظور کر لیا گیا اور تاجی کی شادی اس کے ساتھ ہوگئی۔

☆==========☆==========☆

تاجی کی شادی سے ایک دن پہلے سکندر گاؤں سے غائب ہو گیا اور پھر اس کا کوئی
نہیں چلا۔ اس کے گھر والے سخت پریشانی کے عالم میں گاؤں کے دوسرے بہت سار
لوگوں کے ساتھ مل کر اس کو تلاش کرنے میں لگے رہے لیکن اس کا کوئی پتہ نہیں
سکا۔

تاجی کی شادی تو پٹواری کرم علی کے ساتھ ہو گئی لیکن تاجی نے پٹواری کرم علی
وجود پر تھوک دیا اور اس سے بھرپور نفرت کے اظہار کے طور پر شادی کے اگلے ہی
خودکشی کر لی۔ اس نئے مکان کے کمرے میں جس کا بندوبست پٹواری نے اس کے لئے
تھا۔ دیوار کے کنڈے میں رسی سے لٹک کر اپنے آپ کو پھانسی پر چڑھا دیا..... لوگ
نے جب کمرے کا دروازہ توڑ کر اندر دیکھا تو تاجی کی لاش رسی سے لٹکی ہوئی تھی اور
مرے ہوئے بہت دیر ہو چکی تھی۔

صابر علی کے دل میں پٹواری کرم علی کے لئے نفرت کا جو دریا موجزن تھا اس
طغیانی میں اور بھی زیادہ اضافہ ہو گیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ ایک بھاری پتھر لے
پٹواری کے سر پر دے مارے اور اس کو ختم کر دے۔

تاجی کی موت کا اس کی ماں سکینہ پر بہت زیادہ اثر ہوا۔ وہ بار بار رو رو کر کہتی
کہ اس نے اپنی بیٹی کے ساتھ بڑا ظلم کیا جو اس کی شادی اس منحوس بڈھے پٹواری سے
دی۔ اور پھر سکینہ تاجی کی موت کے صرف چھ ماہ کے بعد مر گئی۔ وہ تاجی کی موت کے
مستقل بیمار رہنے لگی تھی اور پھر ایک دن وہ چپکے سے اس دنیا سے سدھار گئی۔ سکینہ
موت کے بعد دونوں باپ بیٹے اکیلے رہ گئے۔

نو عمر صابر علی کو صدمے برداشت کرنے پڑ رہے تھے۔ چھوٹی بہن کی موت کے
اب ماں بھی چلی گئی تھی اور وہ اس ساری تباہی کا ذمہ دار پٹواری کرم علی کو سمجھتا
صابر علی کو گھر میں گاؤں میں کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا اسے یہاں کی ہر چیز بری لگنے لگی
وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا کہیں دور بہت دور چلا جانا چاہتا تھا جہاں پٹواری کرم علی
منحوس چہرہ موجود نہ ہو' لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کا یہ بھی جی چاہتا تھا کہ ایک بھاری پتھر
مار کر اس منحوس چہرے کی ہڈیاں کچل دے۔ سکندر لاپتہ ہو گیا تھا۔ تاجی نے خودکشی کر
تھی ماں مر گئی تھی اور ان ساری باتوں کا ذمہ دار صرف پٹواری کرم علی تھا۔ پٹواری کر
علی کے بارے میں سوچتے سوچتے اس کا سانس تیز ہو جاتا اور ایک بھاری پتھر کی تلاش



کی انگلیوں میں جیسے تشنج ہونے لگتا اور پھر جب سکینہ کے انتقال کے صرف پانچ ماہ کے
ی اس کے باپ کا بھی انتقال ہو گیا تو اس کے دل و دماغ میں جیسے لاوا ابلنے لگا۔ پے در
صدموں نے اس کے باپ کو بالکل نڈھال اور مضمحل کر کے رکھ دیا تھا وہ بہت کمزور
تھا اور کئی کئی دن تک کام پر نہیں جاتا تھا۔ اس سے کام کیا ہی نہیں جاتا تھا۔ اس کی
ی طاقت بڑی تیزی کے ساتھ زائل ہو رہی تھی۔ صابر علی اکیلا زمین پر جاتا تھا اور جو
کام اس سے ہو سکتا تھا وہ کر دیتا تھا واپس آ کر وہ اپنے بیمار باپ کو اس کے بارے میں
تا تھا اور واجد علی اسے اگلے دن کے لئے ضروری ہدایات دے دیتا تھا اور پھر ایک
، واجد علی کی زبان ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی صابر علی کے دل میں
ی کرم علی کے لئے نفرت کا جذبہ اور بھی زیادہ شدید ہو گیا۔ اس نے اپنے باپ کی
، کو بھی پٹواری کے کھاتے میں ڈال دیا۔ اس نے اب تک ہونے والی ان تمام
ت کو پٹواری کرم علی کے ہی کھاتے میں ڈالا تھا۔

گاؤں کی ہر چیز اب اس کو کاٹنے کو دوڑتی تھی۔ اسے تو جیسے پورے گاؤں سے
ہو گئی تھی۔ اور آخر ایک دن اسے موقع مل گیا اور اس نے اپنی تمام تر نفرت کو
بھاری پتھر کی شکل میں پٹواری کرم علی کے سر پر دے مارا۔ پٹواری کرم علی اس وقت
اونچے ٹیلے کے پاس سے گزر رہا تھا جبکہ صابر علی اس ٹیلے کے اوپر موجود تھا اس نے
ی کو دیکھا اور اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے فوراً ہی ایک بھاری پتھر اٹھایا
شانہ لے کر اسے نیچے اچھال دیا پتھر سیدھا پٹواری کرم علی کے سر پر جا کر گرا اور اس
ساتھ ہی پٹواری بھی نیچے گرا اس کے سر سے خون کی دھاریں بہنے لگیں۔ اس کا بستہ
ں کی بغل میں موجود تھا نکل کر زمین پر گر گیا اور فوراً ہی اس کے خون میں بھیگنے لگا۔

نو عمر و ناتجربہ کار صابر علی کے لئے یہ منظر بڑا بھیانک اور لرزہ خیز تھا۔ اس پر
ت اور سراسیمگی کی کیفیت طاری ہو گئی' اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ اس کو کیا
چاہئے۔ اسی وقت اس کو فضلو چاچا کی آواز سنائی دی۔ وہ اسے زور زور سے پکارتے
ئے اس طرف آ رہا تھا اس کی آنکھوں کے سامنے پٹواری کا خون آلود جسم پڑا تھا اور
نہ ہی اس کا بستہ پڑا ہوا تھا اور قریب ہی وہ پتھر پڑا ہوا تھا جو اس نے اس کے سر پر مارا
وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

کہاں جانا ہے؟ اس کے ذہن میں کچھ نہیں تھا وہ خوف وحشت اور دہشت کا شکار
کسی بھی پیشگی منصوبہ بندی کے بغیر وہ ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا اس کی جیب میں

تھوڑے سے پیسے تھے لیکن اس نے کوئی ٹکٹ نہیں خریدا اور بلا ٹکٹ سفر کرتا ہوا کسی طرح کراچی آن پہنچا جس کے بارے میں اس نے اپنے گاؤں میں لوگوں سے کچھ سنا تھا۔

کراچی میں تین دن اس نے فٹ پاتھوں پر سو کر اور اِدھر اُدھر سے کھانا مانگ گزارے۔ اس دوران وہ کام بھی تلاش کرتا رہا اور چوتھے دن اس کو ایک شیر فروش اپنے پاس نوکر رکھ لیا۔ اس شیر فروش کا نام رحمت علی تھا اس کے پاس ایک بھینس کچھ بکریاں تھیں جن کا دودھ وہ بیچتا تھا اس کا تعلق بھی پنجاب سے تھا اور پچھلے کئی سے کراچی میں گولی مار کے علاقے میں ایک کچی آبادی میں اپنی بیوی بیٹی اور مویشیوں ساتھ رہ رہا تھا۔ رحمت علی کی بیوی کا نام ہاجرہ اور بیٹی کا نام حنیفہ تھا۔ رحمت علی دھیمے مزاج والا اور نرم دل آدمی تھا۔ صابر علی نے اس کو اپنے بارے میں بتایا کہ اس والدین فوت ہو چکے ہیں اور وہ روزگار کی تلاش میں کراچی آیا ہے اس نے اصل حقیقت کسی کو نہیں بتائی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ پٹواری کرم علی زندہ رہا یا مر گیا۔

کچھ دنوں کے بعد جب وہ اور رحمت علی ایک دوسرے پر پورا بھروسہ کرنے لگے تو ایک روز رحمت علی کے کریدنے پر اس نے اس کو اپنے اور اپنے خاندان کے بارے میں سب کچھ صاف صاف بتا دیا تھا اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ پٹواری کے سر پر پتھر مار بھاگا ہے۔

"ہر انسان کے اپنے اپنے دکھ ہوتے ہیں۔" رحمت علی نے ایک لمبی اور ٹھنڈی سانس بھر کر کہا تھا اور اس کی زبان سے نکلے ہوئے یہ الفاظ صابر علی کے دل پر جیسے نقش ہو گئے تھے۔ "ہر انسان کے اپنے اپنے دکھ ہوتے ہیں۔"

پھر وہ اس چھوٹے سے خاندان کا ایک فرد بن گیا رحمت علی کا کوئی بیٹا نہیں تھا نے صابر علی کو اپنا بیٹا بنا لیا اور اپنی بیٹی حنیفہ کی اس کے ساتھ شادی کر دی۔ صابر علی اپنے سسر کے کاروبار میں شامل ہو چکا تھا اب زیادہ تر کام کے بارے میں فیصلے وہ خود کرتا تھا اور کاروبار کو وسیع کرنے کے راستے بھی تلاش کرتا تھا کچھ ہی عرصے کے بعد اس ناظم آباد میں ایک دکان لے لی اور وہاں دودھ کے علاوہ مٹھائیاں بھی رکھنی شروع کر دیں۔ سلیم نامی ایک آدمی کو مٹھائیاں بنانے کے لئے گھر میں ملازم رکھ لیا جس نے اور حنیفہ کو بھی مٹھائیاں بنانی سکھا دیں۔ زیادہ تر تو ہاجرہ ہی سلیم کے ساتھ مل کر مٹھائیاں بناتی تھی۔



حالات بدلتے گئے اور کاروبار کافی بڑھ گیا۔ ساس سسر دونوں اللہ کو پیارے ہو صابر علی جو بہت عرصہ پہلے ہی خواجہ صابر علی بن چکا تھا اب ایک بیٹے کا باپ تھا اس بیٹے کا نام خواجہ طاہر علی تھا۔ کراچی آنے کے بعد وہ بس کراچی کا ہی ہو کر رہ گیا تھا وہ اپنے گاؤں واپس نہیں گیا۔ گولی مار مختصر سی جگہ اب کام کے لئے تنگ پڑ رہی تھی صابر علی نے کوشش کر کے نارتھ ناظم آباد میں ایک کچی آبادی میں ایک بڑا سا پلاٹ لے دے کر حاصل کر لیا۔ وہ اپنے خاندان اور مویشیوں کے ساتھ وہاں منتقل ہو گیا ناظم آباد میں رہی۔ بھینسوں کی تعداد اس نے بڑھا لی کیونکہ اب اس کے پاس کافی تھی اور حامد نامی ایک شخص کو بھینسوں کے کام کے لئے ملازم رکھ لیا۔ سلیم مٹھائیاں کے لئے اب یہاں نئی جگہ آنے لگا اور وہ اور حنیفہ مل کر مٹھائیاں بناتے جو دکان فروخت ہوتی تھیں۔ سارا کاروبار خوب اچھی طرح جم گیا تھا۔ خواجہ صابر علی نے ایک سوزوکی خرید لی تھی اور وہ اس سے بہت کام لیتا تھا روز صبح کو دودھ کے بڑے بڑے اور مٹھائیوں کے تھال سوزوکی میں رکھ کر دکان پہنچائے جاتے اور پھر رات کو خالی اور خالی تھال وغیرہ واپس گھر لائے جاتے جہاں سے اگلی صبح کو انہیں دوبارہ بھر کر پر لے جایا جاتا۔ خواجہ صابر علی کا بیٹا اسکول جاتا تھا اور سہ پہر کو وہ بھی دکان پر آجاتا جہاں وہ دکان کے بند ہونے تک رہتا تھا پھر باپ کے ساتھ ہی واپس گھر آتا تھا۔ خواجہ علی نہیں چاہتا تھا کہ طاہر علی دکان پر زیادہ بیٹھے وہ اس کو پڑھانا چاہتا تھا اعلیٰ تعلیم دلوانا تا تھا اور اس نے دکان پر کام کرنے کے لئے یکے بعد دیگرے کئی لڑکوں کو رکھا تھا لیکن سب کے سب کچھ دن کے بعد بھاگ گئے تھے مجبوراً خواجہ طاہر علی کو دکان پر بٹھانا پڑ رہا

ان دونوں لڑکوں سے ابتدائی بات چیت کر کے ہی خواجہ صابر علی کو اندازہ ہو گیا تھا وہ دونوں گھر سے بھاگ کر آئے ہیں اور سخت پریشانی اور بے بسی کے عالم میں ہیں۔ ہر انسان کے اپنے اپنے دکھ ہوتے ہیں۔" اس نے دل میں اپنے مرحوم سسر کے الفاظ رائے اور ان لڑکوں سے ان کے اصلی دکھ کے بارے میں نہیں پوچھا کیونکہ اس کو علم تھا کہ وہ فوراً ہی اس کو اپنا اصلی دکھ نہیں بتائیں گے۔ اس نے بھی تو رحمت علی رحوم کو فوراً ہی اپنا اصلی دکھ نہیں بتا دیا تھا۔

اگلے دن صبح کو خواجہ صابر علی حسب معمول باہر نکل آیا تو اس نے حامد کو حیران پریشان احاطے میں کھڑے ہوئے پایا۔

"وہ دونوں لڑکے....." حامد نے رک رک کر کہا۔ "یہاں موجود نہیں ہیں۔ بھاگ گئے ہیں۔"

"کیا؟" خواجہ صابر علی نے سخت حیرت کے عالم میں کہا۔ "بھاگ گئے ہیں مگر گیٹ میں تو اندر سے تالا اسی طرح لگا ہوا ہے۔" اس نے بھاری بھرکم اونچے آہنی میں اندر سے لگے ہوئے بھاری تالے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"شاید..... کسی طرح دیوار پھاند کر نکل گئے....." حامد نے کہا۔

"دیوار پھلانگ کر؟" خواجہ صابر علی نے ناگواری کے ساتھ ماتھے پر بل ڈالتے کہا۔ "یہ اتنی اونچی دیوار ہے اسے پھلانگنا کوئی آسان کام تو نہیں ہے۔"

"معلوم نہیں کون تھے خواجہ صاحب!" حامد نے کہا۔ "خدا جانے کیسی کیسی جانتے ہوں گے اور کس کے سکھائے پڑھائے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے گیٹ کے اوپر وہاں سے پھلانگ گئے ہوں۔"

"اوہ..... چیزیں تو تم نے سب دیکھ لیں؟" خواجہ صابر علی نے سخت پریشان عالم میں کہا۔

"یہاں سے جو چیزیں لے جائی جاسکتی ہیں وہ یا تو مویشی ہیں اور یا پھر دودھ کے بڑے خالی برتن۔" حامد نے کہا۔ "اور وہ میں نے سب دیکھ لئے ہیں۔ سب چیزیں جگہ پر موجود ہیں۔ اس کے علاوہ وہ یہاں سے اور کیا لے جاسکتے ہیں؟"

"تو..... پھر..... شاید اندر سے..... مگر دروازہ تو اندر سے بند تھا۔" صابر علی نے گھبراہٹ کے عالم میں کہا۔ "پھر بھی دیکھ لینا ضروری ہے..... شاید طرح سے اندر گھسنے میں کامیاب ہو گئے ہوں۔" اور اس کے ساتھ ہی وہ واپس جانے کے لئے پلٹا۔ اسی وقت کھلے ہوئے اندرونی دروازے سے حنیفہ باہر نکل کر آئی

"ذرا جلدی سے ساری چیزوں کو دیکھ لو۔" خواجہ صابر علی نے تیزی سے حنیفہ کہا۔ "وہ دونوں لڑکے رات کو کسی وقت غائب ہو گئے ہیں۔ خدا جانے کس طرح ذرا دیکھ لو اپنی ساری چیزیں..... کچھ لے تو نہیں گئے کم بخت"

"دروازہ اندر سے بند تھا۔" حنیفہ نے جلدی سے کہا۔ "میں نے اپنے ہاتھ سے کیا تھا اور صبح کو خود کھولا ہے وہ اندر نہیں آسکتے تھے۔ پھر بھی میں ابھی دیکھتی ہوں" فوراً اندر جانے کے لئے پلٹی۔

"چوک ہو گئی۔" خواجہ صابر علی دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ "وہ ویسے نہیں



جیسا کہ میں ان کو سمجھ رہا تھا لیکن..... پھر اس طرح یہاں آنے کا مقصد کیا ہو سکتا تھا؟ وہ یہاں سے کیا لے جاسکتے تھے؟"

اچانک باڑے کے سائبان والے حصے کے اندر سے چارے کے گٹھوں کے ڈھیر کے پیچھے سے مسعود نمودار ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے ناصر تھا۔ دونوں کی آنکھوں میں نیند کا خمار جو اس بات کا پتہ دے رہا تھا کہ وہ دونوں ابھی ابھی بیدار ہوئے ہیں۔

"ارے..... ارے تم.....؟" خواجہ صابر علی عالم حیرت میں چلایا اور اس کی تیز آواز سن کر اندر کی طرف جاتی ہوئی حنیفہ رک گئی اس نے جلدی سے پلٹ کر دیکھا..... دونوں لڑکوں کو دیکھ کر وہ فوراً ہی واپس آگئی۔ اس کے چہرے سے حیرت آمیز خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔ "تم دونوں..... کہاں تھے؟" خواجہ صابر علی نے حیرت سے پوچھا۔

"ہم دونوں وہاں چارے کے گٹھوں کے پیچھے سو رہے تھے۔" مسعود نے کہا۔

"کیوں؟" خواجہ صابر علی نے کہا۔ "تم چارپائی چھوڑ کر وہاں فرش پر سونے کے لئے وہاں چلے گئے؟"

"وہ۔ چاچا جی۔ بات یہ ہے کہ چارپائی میں کھٹمل بہت تھے۔" مسعود نے ذرا جھجکتے ہوئے کہا۔ "بستر میں بھی بہت کھٹمل تھے' وہ ہم کو بہت کاٹ رہے تھے۔ ان کے کاٹنے کی وجہ سے ہمیں نیند نہیں آرہی تھی۔ اس لئے ہم رات جاکر فرش پر سو گئے۔"

خواجہ صابر علی ایک دم زور سے ہنس پڑا۔ ابھی ابھی اس نے اپنی عقل پر جو تھوڑا ماتم کیا تھا' اس کو اس نے فوراً ہی واپس لے لیا۔ اس کی ہنسی میں حنیفہ بھی شریک ہو گئی۔ حامد کے چہرے پر البتہ کوئی خاص خوش گوار تاثر نمودار نہیں ہوا۔

"حامد۔ تمہاری چارپائی میں کھٹمل نہیں ہیں کیا؟" خواجہ صابر علی نے فوراً ہی حامد سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ "کیا تم کو رات میں کھٹمل نہیں کاٹتے؟"

"بہت کاٹتے ہیں جی....." حامد نے کہا۔ "ابھی دو دن پہلے بھی میں نے چارپائی پر گرم کھولتا ہوا پانی ڈالا تھا۔"

"اچھا تو پھر ان دونوں کی چارپائی پر بھی گرم کھولتا ہوا پانی ڈال دینا....." اس نے حامد سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اور اس کے بعد بستر بچھانے سے پہلے اس کے اوپر خوب بہت سا کھٹمل مار پاؤڈر بھی ڈال دینا۔"

"ڈال دوں گا۔" حامد نے کہا اور پھر وہ گیٹ کا تالہ کھولنے چلا گیا۔

"تم دونوں ہاتھ منہ دھو لو....." خواجہ صابر علی نے مسعود اور ناصر سے مخاطب ہو

کر کہا۔ "اس کے بعد اندر آجانا۔" اس کے ساتھ ہی وہ اور حنیفہ اندر چلے گئے۔

مسعود اور ناصر جیسے ہواؤں میں اڑ رہے تھے' خاص طور سے مسعود کی خوشی اطمینان کے ساتھ ساتھ اعتماد کا عنصر بھی شامل تھا۔ اس کا منصوبہ کامیاب رہا تھا۔ اس جیسا سوچا تھا جیسا چاہتا تھا' ویسا ہی ہوا' جو توقعات اس نے قائم کی تھیں وہ اب پورا رہی تھیں۔ وہ اس یقین کے ساتھ کراچی کے لئے عازم سفر ہوا تھا کہ اس مہربان غریب پرور شہر میں اس کو کوئی نہ کوئی ٹھکانہ مل جائے گا اور اس کو ملتا نظر آرہا تھا۔ زندگی ایک نئی کروٹ لے رہی تھی۔

ناصر نے پہلی بار ایک غم انگیز تاثر کے ساتھ نہیں بلکہ ایک حسرت آمیز اور مطمئن تاثر کے ساتھ اپنی ماں اور اپنی بہنوں کو یاد کیا۔ "اماں..... میں یہاں کراچی میں ہوں" اس نے دل ہی دل میں کہا۔ "میرے لئے پریشان مت ہونا۔ چاچا صابر علی نے ہمیں اپنے گھر میں جگہ دے دی ہے۔ کام بھی ہو جائے گا۔ پھر میں حاجی مدد علی قریشی کا سارا قرضہ ادا کر دوں گا۔ تم قرضے کے لئے پریشان مت ہونا اماں۔ میں ایک ایک پائی ادا کر دوں گا۔"

اس کے ساتھ ہی تحقیر اور نفرت کے ساتھ فخرو کو یاد کیا۔ "اب تو تُو مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا حرام زادے۔ تُو مجھے گالی بھی نہیں دے سکتا۔ میں تجھ سے بہت دور ہوں اور اگر تیری مار کھاؤں گا بھی نہیں۔ اب اگر تُو مجھ پر ہاتھ اٹھائے گا تو میں اینٹ مار کر تیرا سر پھوڑ دوں گا۔"

چند روز کے اندر ہی اندر اتنا کچھ بدل گیا تھا کہ وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ سیالکوٹ کی ایک چھوٹی سی پسماندہ غربت زدہ نواحی بستی سے اٹھ کر وہ لوگ سیدھے کراچی آن پہنچے تھے۔ اس لق و دق شہر کی پنہائیوں نے انہیں پیوست کر دیا تھا۔ لیکن کراچی صرف حیران کن پنہائیوں کا ہی شہر نہیں تھا۔ یہ زندگی بخش امکانات کا بھی شہر تھا اور وہ دونوں ان خوش نصیبوں میں شامل تھے جنہیں کراچی کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی ایک قابل اعتماد سہارا مل گیا تھا اور انہیں اِدھر اُدھر دھکے کھانے اور بھٹکنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔

گزشتہ رات یہاں آنے تک وہ خوف اور بے یقینی کی کیفیت کا شکار تھے۔ خواجہ صابر علی نے دکان پر ان کو کچھ نہیں بتایا تھا کہ وہ ان کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرے گا۔ دونوں خواجہ صابر علی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ وہ ان کے لئے اجنبی تھے۔



حاجی مدد علی قریشی بھی ہو سکتا تھا۔ فخرو بھی ہو سکتا تھا۔ وہ انہیں پولیس کے ہاتھوں پکڑوا سکتا تھا۔ وہ ان کے پیسے چھین کر انہیں دھکے بھی دے سکتا تھا۔ ہزاروں قسم کے خدشات تھے جو ان دونوں کے ذہنوں میں آرہے تھے اور وہ ایک دوسرے کے سامنے ان کا برملا اظہار سے گریز بھی کر رہے تھے۔

لیکن جب وہ رات کو یہاں پہنچے اور انہوں نے اپنے آپ کو ایک گھر میں پایا' جہاں چاچی بھی تھیں تو انہوں نے خود کو کافی حد تک مطمئن' محفوظ اور مسرور پایا۔ یہ گھریلو ماحول کی خوشبو سے بھرا ہوا گھر۔ یہاں صابر چاچا تھے' حنیفہ چاچی تھیں' ان کا بیٹا طاہر تھا جو چاچا تھے۔ جو مویشیوں کو سنبھالتے اور باڑے میں کام کرتے تھے۔ گھر کے لوگ تھے۔ یہ تھا۔ ایک گھر کی ہی تو تلاش تھی۔ ان دونوں کو یقین تھا کہ ان کی مصیبت کے دن ختم ہو گئے ہیں اور کراچی کے مشفق دامن میں ایک نئی زندگی ان کی منتظر ہے۔

رات کو بستر پر لیٹنے کے بعد وہ دونوں چپکے چپکے کافی دیر تک اس نئی صورت حال کے بارے میں آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ ان کی آواز حامد چاچا تک نہ جانے پائے جن کی چارپائی ان دونوں کے چارپائی سے بہت زیادہ دور نہیں تھی۔

"صابر چاچا ہمیں جو بھی کام دلوائیں گے ہم کر لیں گے۔" مسعود نے چپکے سے ناصر سے کہا۔ "جو بھی پیسے ہم کو ملیں گے ہم لے لیں گے' انکار نہیں کریں گے۔ ہم ابھی ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ ایک بار ہم کو یہاں قدم جمانے کا موقع مل جائے پھر اس کے بعد تو انشاء اللہ ہم اپنی جگہ بنا لیں گے۔"

مسعود کی ذات پر ناصر کے اعتماد میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ اب تک حاصل ہونے والی اس ساری کامیابی کا سہرا مسعود کے ہی سر تو تھا۔ مسعود نے جیسا کہا تھا جیسا چاہا تھا ویسا ہی ہوا۔ مسعود اس کا سرپرست اس کا رہنما تھا اور وہ خود مسعود کا پیروکار اور اس کی قائدانہ صلاحیتوں کا معترف۔

"ہاں مسعود....." ناصر نے خوشی سے سرشار لہجے میں کہا۔ "ایک بار ہم کہیں جم کر کام شروع کر دیں' ہمیں پیسے ملنے لگیں تو پھر تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ شاید صابر چاچا ہی ہمیں رہنے کی جگہ دے دیں۔ جگہ تو ان کے پاس بہت ہے۔ یہ باڑا بھی بہت بڑا ہے اور ہم دونوں کو کتنی جگہ چاہئے ایک چارپائی بھر جگہ بھی بہت ہے۔"

"اب یہ تو ان کی مرضی ہے۔" مسعود نے کہا۔ "لیکن وہ اگر چاہیں تو ہم کو یہاں

باڑے کے کام میں، مٹھائیاں بنانے کے کام میں یا دکان کے کام میں لگا سکتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی کام مشکل نہیں ہے۔ جو کچھ ہمیں نہیں آتا ہے اس کو ہم جلد ہی سیکھ لیں گے۔ کام تو کوئی بھی مشکل نہیں ہوتا بس آدمی میں سیکھنے کی خواہش ہونی چاہئے۔ ہم لوگ تو پیدا ہی کام کرنے کے لئے ہوئے ہیں۔"

بستر پر لیٹنے کے کچھ ہی دیر کے بعد وہ دونوں کافی بے چینی محسوس کرنے لگے تھے۔ ان کے جسم میں جگہ جگہ خارش شروع ہو گئی تھی۔ کوئی چٹکیاں لے رہا تھا۔ سوئیاں سی چبھو رہا تھا۔ دونوں ہی اس کیفیت کو محسوس کر رہے تھے اور ایک دوسرے پر اس کا اظہار بھی کر رہے تھے لیکن ان کو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے، اور پھر جب مسعود نے ایک موٹے سے کھٹمل کو اپنی گردن پر سرسراتے ہوئے پکڑا تب ان دونوں کو اس بات کا علم ہوا کہ انہیں کھٹمل کاٹ رہے ہیں۔ ہلکی روشنی میں انہوں نے اپنے بستر کا جائزہ لیا تو اس پر انہیں جا بجا بہت سارے کھٹمل رینگتے ہوئے نظر آئے۔ وہ اتنے بہت سارے کھٹملوں کو مار نہیں سکتے تھے لیکن اس بستر پر سو بھی نہیں سکتے تھے جہاں کھٹمل ان کا گوشت ادھیڑ رہے تھے۔

"یہاں تو نیند نہیں آئے گی....." مسعود نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "چلو کہیں اور چل کر سو جاتے ہیں۔"

"اور کہاں لیٹیں گے۔" ناصر نے کہا۔ "کوئی دوسری چارپائی بھی تو نہیں نظر آرہی ہے۔"

"چارپائی کی ضرورت ہی نہیں ہے۔" مسعود نے کہا۔ "ہم نیچے زمین پر سو جائیں گے ایک رات تو گزارنی ہے۔ کسی نہ کسی طرح گزار لیں گے۔ آؤ۔ حامد چاچا تو سو رہے ہیں۔ ان کو سونے دو۔"

حامد واقعی بے خبر سو رہا تھا۔ خاموش فضا میں اس کے خراٹے زور زور سے گونج رہے تھے۔ وہ دونوں اٹھے اور مویشیوں کے چارے کے گٹھوں کے پیچھے چلے گئے۔ انہیں اس بات کا احساس بھی نہیں ہوا کہ اب باڑے کے دروازے سے ان کو نہیں دیکھا جا سکتا اور اندر داخل ہونے کے بعد بھی، انہیں اس وقت تک نہیں دیکھا جا سکتا کہ جب تک چارے کے گٹھوں کے پیچھے نہ جایا جائے۔ وہاں جا کر وہ دونوں زمین پر لیٹ کر سو گئے اور انہیں ہوش نہیں رہا۔ صبح کو ذرا دیر سے ان کی آنکھ کھلی اور اب وہ ہاتھ منہ دھونے کے بعد اندر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ کل کی صبح میں آج کی صبح میں کتنا فرق تھا۔ ذرا دیر



بعد وہ دونوں ہاتھ منہ دھو کر اندر آئے۔ اس بار ان کو مٹھائی والے کمرے سے نہیں گزرنا پڑا۔ اس وقت ایک دوسرا دروازہ کھلا ہوا تھا جس سے وہ اندر داخل ہوئے۔ سامنے ہی انہیں طاہر علی نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ کتابیں اور کاپیاں وغیرہ تھیں وہ ان کو الٹ پلٹ کر رہا تھا۔

"تم دونوں کہاں غائب ہو گئے تھے؟" اس نے ان دونوں کو آتے ہوئے دیکھ کر سرسری انداز میں پوچھا۔

"غائب!" مسعود نے ہنستے ہوئے کہا۔ "نہیں طاہر بھائی ہم لوگ غائب کہیں نہیں ہوئے تھے۔ ہم تو باڑے کے اندر جا کر فرش پر سو گئے تھے۔ وہاں چارپائی میں کھٹمل بہت تھے رہے تھے۔" ایک بار پھر وہ لوگ کھانے کی میز پر تھے۔ انہوں نے ناشتہ کیا۔ مسعود اور ناصر نے پہلی بار ناشتے میں چائے پی۔ ان کے گھروں میں ناشتے میں چائے کا رواج نہیں تھا۔ ناصر تو بہت ہی خوش تھا۔ آج اس کو ناشتے میں باسی روٹی اور باسی دال ترکاری کے بجائے چائے اور مکھن لگے ہوئے توس کھانے کو ملے تھے اور ساتھ میں ایک ابلا ہوا انڈا بھی۔ ایسی نعمتیں بھلا اس کے مقدر میں کہاں تھیں۔ ناشتہ کرنے کے بعد اس کو بھٹے پر نہیں جانا تھا۔ کوئی نہ کوئی کام تو کرنا تھا لیکن بھٹے کا کام نہیں کرنا تھا۔

طاہر علی کو جلدی تھی وہ اسکول کی یونیفارم پہن کر ناشتے کی میز پر آیا۔ ناصر نے اس کو تحسین آمیز نظروں سے دیکھا۔ اسکول کی یونیفارم میں وہ کتنا اچھا اور اسمارٹ لگ رہا تھا۔ وہ جلدی جلدی ناشتہ کر کے اسکول کے لئے روانہ ہونے لگا۔

"آج تمہارے دکان پر آنے کی ضرورت نہیں۔" خواجہ صابر علی نے اپنے بیٹے سے کہا۔ "یہ دونوں لڑکے موجود ہیں یہ کام سنبھال لیں گے۔"

"مگر ابو ان کو تو ابھی یہ سارا کام آتا ہی نہیں۔" طاہر علی نے کہا۔ "کیسے کر لیں گے۔"

"سب کر لیں گے بیٹا۔" خواجہ صابر علی نے کہا۔ "میں سکھاتا جاؤں گا اور یہ سیکھتے جائیں گے۔ دو چار دن کی بات ہے۔ آدمی جب سیکھنا چاہے تو کیا کچھ نہیں سیکھ سکتا اور یہ کون سے مشکل کام ہیں۔"

خواجہ صابر علی کو پچیس سال پہلے کا اپنا وقت یاد آرہا تھا کس طرح اس نے اپنے والد رحمت علی کے پاس آنے کے بعد صرف چند دن کے اندر اندر سارا کام سیکھ لیا تھا اور آدھے سے زیادہ کام خود سنبھال لیا تھا۔ رحمت علی کس قدر خوش ہوا تھا اس

سے!

"ہاں چاچا جی۔" مسعود نے جلدی سے کہا۔ "ہم۔ ہم سارا کام کرلیں گے۔
آپ ہمیں بتاتے جائیں گے ہم کرتے جائیں گے۔ ہم جلدی جلدی کام سیکھ لیں گے
"اچھا پھر میں چلتا ہوں' ابو۔" طاہر علی نے کہا۔ "دیر ہو رہی ہے۔" اور وہ
سے چلا گیا۔

طاہر کے چلے جانے کے تھوڑی دیر بعد کاموں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔
اور ناصر دونوں ان کاموں میں گہری دلچسپی اور سرگرمی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ بھاگ
کر وہ سب کچھ کر رہے تھے جس کی ان کو ہدایات دی جا رہی تھیں۔ مٹھائیوں سے
ہوئے تھال اور کشتیاں دودھ کے بڑے بڑے ڈبے اور دہی کے کونڈے سوزوکی
لادے جا رہے تھے مٹھائیاں تو گھر پر ہی تیار ہوتی تھیں اور دہی کے کونڈے بھی
جمائے جاتے تھے۔ دودھ بھی یہاں دوہا جاتا تھا پھر دکان میں لے جا کر ابالا جاتا تھا۔

وہ دونوں اس طرح دوڑ دوڑ کر خوشی خوشی سارا کام کر رہے تھے جیسے وہ اس
کے لئے پیدا کئے گئے ہوں۔ دونوں کے دلوں پر خوشی اور سرمستی کا عالم طاری تھا۔
کام مل رہا تھا۔ انہیں کام دیا جا رہا تھا۔ جس کے لئے وہ اپنے گھروں سے بھاگ کر
آگئے تھے۔ کام ہی کے لئے تو انہوں نے اتنا زبردست خطرہ مول لیا تھا۔

ابھی وہ کام میں مصروف ہی تھے کہ وہاں ایک اور آدمی آگیا۔ وہ اتنا عمر رسیدہ
خواجہ صابر علی اور اس کی بیوی حنیفہ بھی اس کو "سلیم چاچا" کہہ کر مخاطب کر رہے
سلیم ایک طویل عرصے سے خواجہ صابر علی کے ہاں کام کر رہا تھا وہ مٹھائیاں بناتا تھا۔
علی مرحوم کے زمانے سے اس گھرانے سے وابستہ تھا اس نے رحمت علی کی بیوی ہاجرہ
بیٹی حنیفہ کو مٹھائیاں بنانا سکھایا تھا۔ وہ آج بھی اسی گھرانے سے وابستہ تھا اور مٹھائیاں
بنانے کے لئے یہاں آیا کرتا تھا۔ وہ صبح کو آجاتا اور پھر سہ پہر تک اپنے کام میں مصروف
رہتا تھا۔ حنیفہ اس کی مدد کرتی تھی۔ دونوں مل کر دکان کی اگلے دن کی ضروریات
مطابق مٹھائیاں تیار کر لیتے تھے اور سہ پہر کو سلیم اپنا کام ختم کر کے واپس چلا جاتا تھا۔

خواجہ صابر علی نے ان دونوں کو "سلیم چاچا" کے بارے میں بتایا اور سلیم سے
دونوں کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ "یہ دونوں روزگار کی تلاش میں پنجاب سے
آئے ہیں۔ میں نے فی الحال ان کو اپنے پاس رکھ لیا ہے۔"

"بہت اچھا کیا ہے خواجہ صاحب....." سلیم نے ہنس کر کہا۔ "اب ایسا کرو



ے حوالے کر دو۔ میں ان کو مٹھائیاں بنانا سکھا دوں گا۔ پھر یہ جلد ہی میری جگہ
لیں گے اور میں ریٹائر ہو جاؤں گا۔ اب اتنی عمر ہو گئی کام نہیں ہوتا۔"

"ارے تم ابھی کہاں سے ریٹائر ہو جاؤ گے سلیم چاچا۔" "خواجہ صابر علی نے ہنستے
ے کہا۔ "ابھی تو تم کو بہت کام کرنا ہے اور جب تک میری دکان قائم ہے تم ہی اس
لئے مٹھائیاں بناتے رہو گے۔"

"پھر بھی ایک دن تو ریٹائر ہونا ہے۔ تو پھر اس کا بندوبست تو کر لینا چاہئے پہلے سے۔
کے ہیں۔ کچھ ہیں ابھی جو کچھ انہیں سکھایا جائے گا سیکھ لیں گے۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں
تم ایک دکان اور لے لو اس محلے میں۔ کسی بھروسے کے آدمی کو وہاں بٹھا دینا۔"

"یہی تو رونا ہے سلیم چاچا۔" خواجہ صابر علی نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے
۔ "بھروسے کا آدمی کہاں ملتا ہے' ساری دنیا تو چور اچکوں سے بھری ہوئی ہے آدمی
پر بھروسہ کرے؟"

سلیم کا تعلق بھی پنجاب سے تھا اور یہ ساری گفتگو پنجابی زبان میں ہو رہی تھی یعنی
د اور ناصر کے لئے کسی قسم کی کوئی مشکل نہیں تھی۔ اجنبی دیار میں انہیں خوش
ا سے اپنے علاقے جیسا ماحول میسر آگیا تھا۔

خواجہ صابر علی نے وہاں سے روانہ ہونے سے پہلے سلیم کو مٹھائیوں کے سلسلے میں
ہدایات دیں۔ حامد سے مویشیوں اور دودھ وغیرہ کے بارے میں بھی گفتگو کی اور اس
بعد وہ سوزوکی میں بیٹھ گیا۔ سارا سامان پیچھے رکھ دیا گیا تھا اور اس نے دونوں لڑکوں کو
ے اپنے ساتھ بٹھا لیا تھا۔ اس نے سوزوکی اسٹارٹ کی اور وہاں سے باہر نکل آیا۔ حامد
گیٹ بند کر لیا۔

سوزوکی سڑک پر تیزی سے چلی جا رہی تھی' ناصر اور مسعود اس سفر سے پوری طرح
اندوز ہو رہے تھے۔ چوڑی اور کشادہ سڑک پر بہت ٹریفک تھا اور لاتعداد گاڑیاں
لیکن ان دونوں کو حیرت نہیں ہو رہی تھی کل انہوں نے شہر کے کافی بڑے حصے کا
لگایا تھا اور وہ اس شہر کی سڑکوں اور ٹریفک کے مزاج سے کافی حد تک واقف ہو گئے
تھے۔

ناصر کی آنکھیں خواجہ صابر علی کے ہاتھوں اور پیروں کی حرکات کا بڑے غور اور
کے ساتھ جائزہ لے رہی تھیں وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ ہاتھوں اور پیروں کے استعمال
سے کس طرح گاڑی چلائی جاتی ہے۔ فی الحال اس پیچیدہ عمل کو سمجھنا اس کی سمجھ سے باہر

تھا تاہم وہ بڑی دلچسپی کے ساتھ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

"تم لوگ گھر سے کوئی چوری وری کر کے تو نہیں بھاگے ہو؟" اچانک خواجہ
علی نے ان سے بڑے نرم لہجے میں اور بڑے ہی سرسری انداز میں پوچھا' جس میں تو
یا دھمکی کا کوئی عنصر موجود نہیں تھا۔

"نہیں چاچا نہیں۔" مسعود نے جلدی سے جواب دیا۔ "ایسی کوئی بات نہیں۔
نے آپ کو بتایا نا کہ ہم تو یہاں محنت مزدوری کرنے کے لئے آئے ہیں۔ میرے
کراچی میں ہیں اور....."

"اپنے والدین کو اپنے خیریت سے کراچی پہنچنے کی اطلاع کس طرح دو گے۔"
صابر علی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"ہم انہیں خط لکھیں گے۔" مسعود نے جلدی سے کہا۔ اس کے لہجہ میں خوش
سچائی کی جھلک تھی۔ اس میں کسی منافقانہ رنگ کا احساس نہیں ہوا تھا۔ "ہم انہیں خط
کر مطلع کر دیں گے کہ ہم کراچی میں ہیں اور خیریت سے ہیں۔"

"لکھنا آتا ہے تم لوگوں کو۔ اس نے پوچھا۔ "کتنی جماعتیں پڑھے ہوئے ہو۔"

"ہم کو لکھنا نہیں آتا چاچا جی۔" مسعود نے افسردگی کے ساتھ کہا۔ "ہم کسی
لکھوا لیں گے خود تو نہیں لکھ سکتے۔"

"ٹھیک ہے۔" خواجہ صابر علی نے کہا۔ "طاہر سے لکھوا لینا۔ یا اپنی چاچی سے
لینا۔ وہ بھی اردو اچھی طرح لکھ پڑھ سکتی ہے۔ جب خط لکھوانا ہو تو بتا دینا۔"

"جی۔ جی ہاں۔" مسعود نے جلدی سے کہا اس بار اس کی آواز میں مکمل سچائی
تو موجود نہیں تھا۔ وہ اپنی یا ناصر کی طرف سے بھیجنے کے لئے خط طاہر سے یا حنیفہ
سے نہیں لکھوانا چاہتا تھا۔ یہ خط تو بڑی رازداری کے ساتھ بھیجا جانا تھا۔ کیونکہ اس
وہ باتیں لکھی جانی تھیں جو ان لوگوں نے یہاں کسی کو نہیں بتائی تھیں اور ساتھ ہی
کا پتہ نہیں لکھوانا چاہتا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد خواجہ صابر علی نے ان دونوں سے ان کے والدین کے بار
میں پوچھا اور دونوں کی طرف سے مسعود نے جواب دیا اور وہ تقریباً سچ ہی بولا۔ اپنے
کے بارے میں اس نے بتایا کہ وہ ایک ہوٹل میں کام کرتا ہے اور ناصر کے بارے میں
کہ اس کی ماں ایک گھر میں کام کرتی ہے اس کا باپ گھر چھوڑ کر کہیں چلا گیا ہے۔ اس
یہ نہیں بتایا کہ وہ نشے باز ہے اور گھر سے پیسے چرا کر بھاگا ہے۔ اس نے اس کو اپنے



ہمر کے بھٹے کے کام کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا اہم بات یہی تھی جس کا چھپانا تھا۔
ان کے والدین نے حاجی مدد علی قریشی سے ان کے کام کے عوض رقوم قرض لی تھیں اور
اب وہ دونوں وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ قرض کی رقم تو واجب الادا تھی خواجہ
صابر علی نے ان سے مزید سوالات نہیں کئے۔

وہ انہیں اپنے ساتھ دکان پر لے آیا۔ ان دونوں نے بجلی کی طرح لپک لپک کر
جلدی جلدی سارے کام کئے۔ خواجہ صابر علی ان کی چستی پھرتی اور دلچسپی اور اشتیاق کو
دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا اس نے ان کے بارے میں غلط اندازہ نہیں لگایا تھا۔
وہ واقعی کام کرنا چاہتے تھے۔ چور اور بدمعاشوں کے کسی گروہ سے تو تعلق نہیں رکھتے تھے
لیکن تھے گھر سے بھاگے ہوئے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں تھا اور چونکہ آج سے تقریباً
پچیس سال پہلے وہ خود بھی اس نوعیت کے تجربے سے گزر چکا تھا اس لئے اسے ان کے
بارے میں سب کچھ جان لینے کی جلدی نہیں تھی۔ وہ انہیں خوفزدہ کر کے کھونا نہیں چاہتا
تھا وہ ان کی مدد بھی کرنا چاہتا تھا اور ان سے فائدہ بھی اٹھانا چاہتا تھا۔

ان دونوں نے سارا دن دکان پر بڑی دل جمعی اور اشتیاق کے ساتھ کام کیا۔ خواجہ
صابر علی ان کو جو کچھ بتاتا وہ وہی کرتے گئے' طاہر علی اس دن دکان پر نہیں آیا اور اس کی
کمی ان دونوں نے پوری کی۔

مسعود اور ناصر سارا دن بہت خوش رہے۔ انہوں نے ایک نئی دنیا میں ایک نئی
زندگی میں قدم رکھ لیا اور اب وہ اس دنیا کو کھونا نہیں چاہتے تھے۔ وہ خواجہ صابر علی کے
چشم ابرو کے اشاروں کے منتظر تھے اور جیسے ہی اس کی زبان سے کوئی بات نکلتی وہ فوراً
اس کو پورا کرنے کے لئے مستعد ہو جاتے۔

"تم دونوں کے پاس اس ایک جوڑے کے علاوہ جو کہ تم پہنے ہوئے ہو اور کچھ
کپڑے بھی نہیں ہیں۔" خواجہ صابر علی نے دکان پر دوپہر کے کھانے کے دوران ان سے
پوچھا۔ "یہ ایک ہی جوڑا کب تک پہنے رہو گے؟ اس میں سے تو بو آنے لگے گی بلکہ
آ رہی ہے۔"

"ہمارے پاس جب پیسے ہوں گے۔" مسعود نے ذرا رک کر کہا۔ "میرا مطلب ہے
چاچا جی ہمیں جب پیسے ملیں گے کام کے تو پھر ہم سب سے پہلے ایک ایک جوڑا کپڑے
خرید لیں گے۔"

"میں تمہیں کپڑے دلوا دوں گا۔" خواجہ صابر علی نے کہا۔ "اس قدر میلے کپڑے

پہن کر دکان پر بیٹھنا ٹھیک نہیں ہے' گاہک اس بات کو پسند نہیں کرتے۔ دکاندار کو صاف ستھرا ہونا چاہئے۔"

ان دونوں کے دل خوشی سے کھل اٹھے۔ صابر چاچا نے ان کو دکان دار قرار دیا تھا یہ کتنی بڑی اور خوشی کی بات تھی۔

رات کو معمول کے مطابق دکان بند ہوئی اور وہ لوگ خالی سامان سوزوکی میں لاد کر گھر کے لئے روانہ ہو گئے۔ ان دونوں کا سارا دن آج بہت مصروف گزرا تھا۔ انہوں نے ترازو پر چیزوں کو تولنا سیکھ لیا تھا پیمانوں سے دودھ ناپنا سیکھ لیا تھا کڑھائی میں چمچہ چلانا سیکھ لیا تھا' اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سے کام ایک ہی دن میں سیکھ لئے تھے۔

آج کی رات ان کی چارپائی میں کھٹمل نہیں تھے۔ حامد نے اس پر گرم کھولتا ہوا پانی ڈال دیا تھا اور بستر کو بھی اچھی طرح دھوپ دکھا دی تھی۔ چارپائی پر بستر بچھانے سے پہلے اس پر پاؤڈر بھی ڈال دیا تھا۔

اگلے دن خواجہ صابر علی نے ان دونوں کو طاہر علی کے ساتھ کچھ دیر کے لئے چورنگی بھیج دیا تاکہ طاہر علی ان کو وہاں سے کپڑے دلوا سکے۔ مسعود اور ناصر کے لئے کراچی کی کسی مارکیٹ میں جانے اور کسی دکان میں داخل ہونے کا یہ پہلا موقع تھا۔ چورنگی کے بازاروں اور دکانوں کی رونق دیکھ کر ان کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ کیسی کیسی شاندار دکانیں تھیں اور ایک ایک دکان کے اندر کس قدر سامان بھرا ہوا تھا اور کتنی رونق تھی دکانوں میں۔ مرد و عورتیں اور بچے۔ چمکتے دمکتے چہرے' روشن آنکھیں ہنستے ہوئے ہونٹ صاف ستھرے عمدہ اور قیمتی لباس' لباسوں سے اٹھتی ہوئی خوشبو۔ یہ سب کچھ کس قدر پرکشش اور کس قدر دلفریب تھا۔ انہیں اب اس شہر سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اس کی خوبیوں سے لطف اندوز ہو سکتے تھے اور ہو رہے تھے۔

طاہر علی نے اپنے باپ کی ہدایت کے مطابق ان دونوں کے لئے شلوار قمیض کے دو دو سوٹ خرید لئے۔ صابر علی نے اس سے کہا تھا کہ سستے واش اینڈ ویئر کپڑے کے سوٹ خریدنا تاکہ ان کو دھونے میں آسانی ہو۔ طاہر نے ایسا ہی کیا اور وہ دونوں نئے کپڑے پا کر بہت خوشی محسوس کر رہے تھے۔ ان کے لئے کبھی بھی دکان سے نئے کپڑے نہیں خریدے گئے تھے۔ کپڑے گھر میں ہی سل جاتے تھے بازار سے سلے سلائے کپڑے خریدنے کا ان کے پاس کوئی تصور نہیں تھا۔ سلے سلائے کپڑوں کے لئے اکٹھا اتنے بہت سارے پیسے کہاں سے آتے۔



جب وہ دونوں کپڑے لے کر طاہر کے ساتھ دوبارہ دکان پر آئے تو ان کے چمکتے ہوئے چہرے خوشی سے کھلے ہوئے تھے انہوں نے بازار کی سیر کی تھی۔ دکانیں دیکھی تھیں کپڑے خریدے تھے اور یہ سب کچھ ان کے لئے کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں تھا۔

آنے والے چند دنوں کے دوران کم و بیش یہی معمول رہا۔ خواجہ صابر علی صبح کو دونوں کو اپنے ساتھ دکان پر لے جاتا جہاں وہ سارا دن دکان کا کام کرتے اور اب تو وہ دونوں ہی تقریباً سارا کام سیکھ گئے تھے۔ وہ غلطی کئے بغیر مٹھائیوں کو تول بھی سکتے تھے بچے پیسوں کی وصولی کا کام خواجہ صابر علی خود ہی کرتا تھا' تاہم ان کو اب دکان کی مختلف چیزوں کے نرخ بخوبی معلوم ہو گئے تھے۔

خواجہ صابر علی ابھی تک ان دونوں کی اصلیت سے واقف نہیں تھا تاہم اس کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ دونوں لڑکے کام کے ہیں اور وہ ان سے کافی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

☆======☆======☆

خواجہ صابر علی کا بس ایک ہی بیٹا تھا۔ طاہر علی۔ خواجہ صابر علی تو اَن پڑھ تھا اس کی قسمت میں اسکول کی شکل دیکھنے کا موقع ہی نہیں آیا تھا لیکن تب کے اور آج کے حالات میں بڑا فرق تھا۔ آج وہ شہر کا ایک کاروباری آدمی تھا۔ دیہی معاشرے کے بجائے شہری معاشرے سے تعلق رکھتا تھا جہاں تعلیم کو بنیادی ضروریات زندگی میں شامل کیا جاتا تھا۔ اس کا ارادہ اپنے بیٹے کو پڑھانے کا تھا۔ چنانچہ اس نے طاہر علی کو بچپن میں ہی اسکول میں داخل کروا دیا تھا۔

جب طاہر علی کچھ بڑا ہوا تو وہ اکثر اس کے ساتھ دکان پر آنے لگا۔ دوپہر کو اسکول سے آنے کے بعد وہ اکثر دکان پر آجاتا اور کام کاج میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ خواجہ صابر علی کی اس دکان پر کبھی کوئی ملازم ہوتا تھا' کبھی نہیں ہوتا تھا' زیادہ تر لڑکے کچھ دن کام کرنے کے بعد اِدھر اُدھر چلے جاتے تھے کیونکہ ان کو محنت مزدوری کے دوسرے کاموں میں اس سے کہیں زیادہ اجرت مل جاتی تھی جتنی ان کو صابر علی دیتا تھا۔ صابر علی کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ جس لڑکے کو بھی دکان پر ملازم رکھتا اس کے بارے میں اچھی طرح تحقیق و تشفی کرلے کہ وہ قابلِ اعتماد ہے کیونکہ یہاں کیش کا معاملہ تھا۔

چنانچہ ملازم کبھی ہوتا تھا کبھی نہیں ہوتا تھا اور جب ملازم نہیں ہوتا تو طاہر علی اپنے باپ کی مدد کرنے کے لئے دکان پر جاتا تھا۔ وہ دکان کے سارے کاموں سے بخوبی واقف تھا۔

طاہر علی اب میٹرک میں تھا۔ خواجہ صابر علی یہ چاہتا تھا کہ وہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت پڑھائی میں صرف کرے تاکہ امتحان میں زیادہ اچھے نمبروں سے کامیابی حاصل کرے لیکن مشکل یہ تھی کہ ان دنوں دکان میں کوئی ملازم نہیں تھا۔ وہ تو حامد اور سلیم چاچا کی غنیمت تھا کہ وہ لوگ باڑے کا اور مٹھائیاں بنانے کا کام سنبھالے ہوئے تھے ورنہ ایسے قابل اعتماد لوگ بھلا کہاں ملتے تھے۔ خواجہ صابر علی کافی دنوں سے تلاش میں تھا کہ دکان کے کام کرنے کے لئے کوئی ایسا قابل اعتماد لڑکا مل جائے جو اس کے ساتھ مل کر کام سنبھالے



لیکن ابھی تک اس کو کوئی ایسا مستقل ملازم نہیں مل سکا تھا۔ چند ماہ پہلے ایک لڑکا آیا تھا' لیکن وہ صرف پندرہ دن نوکری کر کے بھاگ گیا اس کو ہوٹل میں کام مل گیا تھا جہاں اس کو کھانے اور چائے کی سہولت کے علاوہ تنخواہ بھی زیادہ مل رہی تھی۔ کراچی سے باہر سے آئے ہوئے ان غیر ہنر مند نوجوان محنت کشوں کا یہی معاملہ تھا فوری طور پر یہ کوئی بھی چھوٹا موٹا کم پیسوں کا کام ہی قبول کرلیتے تھے لیکن جیسے ہی ان کو زیادہ پیسوں کا کام ملتا تھا' وہ فوراً وہاں چلے جاتے تھے۔ خواہ وہ زیادہ محنت طلب کام ہی کیوں نہ ہو۔

خواجہ صابر علی کا اپنا اچھا خاصا جما جمایا کاروبار تھا۔ دو ملازم اس کے پاس کام کرتے تھے اور ان کے علاوہ وہ خود بھی کام کرتا تھا' اس کی بیوی حنیفہ اور بیٹا طاہر علی بھی کام کرتا تھا ان سب پر کام کا بوجھ تھا اور وہ اس بوجھ کو کم کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایسا کر سکتا تھا کیونکہ وہ مزید ملازم رکھنے کا متحمل تھا۔ تاہم وہ اس مد میں بہت زیادہ رقم خرچ کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ علاوہ ازیں اسے ایسا ملازم چاہئے تھا جس پر وہ پورا اعتماد کرسکے اور وہ ایمانداری کے ساتھ اس کی مدد کرسکے۔ سلیم چاچا اور حامد تو پرانے آدمی تھے اب کم از کم ایک نئے آدمی کی ضرورت تھی جو دکان پر بیٹھ سکے۔ خواجہ صابر علی طاہر علی کو دکان کے کام سے بالکل الگ کردینا چاہتا تھا تاکہ وہ یکسوئی کے ساتھ اپنی پڑھائی پر توجہ دے سکے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد پھر اس کو کالج میں جانا تھا اور پھر "بڑے" کالج میں۔

متوسط طبقے کے لاکھوں والدین کی طرح وہ اور اس کی بیوی اپنے بیٹے کو ڈاکٹر یا انجینئر بنانے کے خواہش مند تھے۔

ان دونوں لڑکوں کی آمد کے بعد خواجہ صابر علی ان کے بارے میں بڑی سنجیدگی کے ساتھ غور کر رہا تھا اگر سارے حالات ٹھیک رہیں تو یہ دونوں لڑکے اس کے کام کے ثابت ہوسکتے ہیں لیکن ان پر مکمل اعتماد کرنے اور ان کے بارے میں کوئی آخری فیصلہ کرنے سے پہلے ان کے بارے سب کچھ سچ سچ جان لینا ضروری تھا اور اس کے لئے اسے کچھ وقت چاہئے تھا۔ وہ حکمت عملی سے کام لینا چاہتا تھا۔ اس نے ان دونوں لڑکوں کو اپنی دکان میں کام پر لگا دیا وہ دونوں بہت خوش' بہت مطمئن تھے انہیں گھر میں رہنے کی اور کھانے کی سہولت حاصل تھی۔ نئے کپڑے بھی فراہم کر دیئے گئے تھے البتہ ایک فرق ضرور تھا اور وہ یہ کہ پہلے دن تو انہوں نے رات کا کھانا گھر والوں کے ساتھ بیٹھ کر کھایا تھا اگلی صبح کو ناشتہ بھی وہیں کیا تھا لیکن اس کے بعد سے ان کا ناشتہ اور کھانا باہر حامد کے ذمے ہوتا تھا۔ اس پر بھی وہ دونوں بہت خوش تھے۔ دوپہر کا کھانا وہ تینوں دکان میں ایک

ساتھ کھاتے تھے۔ خواجہ صابر علی نے ابھی تک ان سے پیسوں کے متعلق کوئی بات نہ
کی تھی۔

"صابر چاچا نے ابھی تک ہمیں کوئی تنخواہ وغیرہ تو بتائی نہیں۔" ایک رات ناصر
چپکے چپکے باتیں کرتے ہوئے مسعود سے کہا۔ "خدا معلوم' وہ ہماری کیا تنخواہ مقرر کر
گے ویسے انہوں نے ہمیں کام پر تو رکھ لیا ہے نا۔"

"ہاں۔ کام پر تو رکھ لیا ہے....." مسعود نے کہا۔ اس کی آواز میں قدر
تذبذب تھا۔ "معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے کہ انہوں نے ہم کو کام پر رکھ لیا ہے اور ہم دو
کو اپنے ساتھ دکان پر لے جاتے ہیں ہم دونوں سارا دن دکان پر کام کرکے رات کو
آتے ہیں۔ تو بھئی اور کام پر رکھنا کس کو کہتے ہیں؟ اور جہاں تک تنخواہ کا تعلق
انہیں خود ہی بتانے دو۔ وہ خود ہی بتائیں گے کھانا کپڑا تو وہ اہم کو دے رہے ہیں۔ رہنے
جگہ بھی دے رکھی ہے۔ یہ ساری سہولتیں تو مل گئی ہیں اب صرف تنخواہ کی بات رہ
ہے۔ تو دیکھو۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ ابھی تو ہم کو جو کچھ بھی دیں ہمیں لے لینا چاہئے۔"

اب وقت آگیا تھا کہ وہ اس معاملے پر ان سے کھل کر بات کرلے۔ اس نے
بیوی سے پہلے ہی اس بارے میں ضروری مشورہ کرلیا تھا اور حنیفہ کا کہنا بھی یہی
جب تک ان دونوں کے بارے میں اصل حقائق معلوم نہ ہو جائیں۔ اس وقت تک
کے ساتھ معاملے کو حتمی شکل نہ دی جائے۔ "میں نہیں چاہتی کہ کسی وقت پولیس
ہمارے گھر کا دروازہ کھٹکھٹائے اور تم بھاگے بھاگے پھرو۔ پولیس والے ہمارے پیسوں
اپنی جیبیں بھرتے رہیں۔"

"میں جب اپنے گاؤں سے بھاگ کر کراچی میں تمہارے ابا کے گھر آیا تھا تو
وقت پولیس میرے پیچھے آئی تھی۔" خواجہ صابر علی نے مسکراتے ہوئے اپنی بیوی
کہا۔ "کیا اس کے بعد کبھی پولیس آئی۔"

"اُفوہ۔ کیا پرانا ذکر لے بیٹھے۔" حنیفہ نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے تادیبی انداز
کہا۔ حنیفہ کے والدین کے انتقال کے بعد سے تو یہ کہانی ہمیشہ ختم ہوگئی تھی۔ اب
اور صابر علی کے علاوہ اس واقعے کے بارے میں اور کوئی نہیں جانتا تھا انہوں نے
بیٹے کو اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔ "گڑے مردے اکھاڑنے سے کیا فائدہ؟
بات کرو۔ ہم ان لڑکوں کے بارے میں کچھ بھی تو نہیں جانتے۔"

"جان لیں گے۔" خواجہ صابر علی نے کہا۔ "وہ اب ہم سے خوفزدہ نہیں ہیں



یہاں سے بھاگیں گے نہیں۔ اب ان سے ان کے متعلق بات کر سکتا ہوں۔ ہر کام کا ایک
طریقہ ہوتا ہے۔"

اگلے روز رات کے کھانے کے بعد صابر علی نے ان دونوں کو اپنے پاس اندر کمرے
میں بلایا۔ اس نے حنیفہ کو وہاں آنے سے منع کردیا تھا۔ "جو بھی بات ہوگی وہ میں تم کو بعد
میں بتاؤں گا۔" اس نے کہا۔ "میں ان سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

خواجہ صابر علی نے ان دونوں کو اپنے سامنے بٹھایا اور پھر باقاعدہ بات چیت کا آغاز
کیا۔

"ہاں بھئی لڑکو تو اب ہم کچھ معاملے کی بات کرلیں....." اس نے بڑی نرمی کے
ساتھ مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ تم یہاں خوش تو ہو تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں؟"

"بالکل نہیں چاچا جی۔" مسعود نے فوراً دونوں کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں
یہاں کوئی تکلیف نہیں ہے۔ ہم خوش ہیں۔"

"تو اب کیا ارادہ ہے؟ یہاں رہو گے اور کام کروگے یا کہیں اور جانا چاہتے ہو؟"
خواجہ صابر علی نے گہری نظروں سے ان کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ وہ ان کے چہروں پر
اپنے اس سوال کے ردعمل کو دیکھنا چاہتا تھا۔

"نہیں۔ نہیں چاچا جی۔" مسعود نے کہا۔ "ہم لوگ بھلا کہاں جائیں گے؟ ہم تو
یہاں کسی کو بھی نہیں جانتے اور ہم تو یہاں کام کرنے کے لئے آئے ہیں چاچا جی۔ آپ
نے ہمیں کام دیا ہے۔"

"ہاں۔ کام تو میں نے تم کو دیا ہے' اور میں چاہوں گا کہ تم دونوں میرے پاس رہو
اور کام کرو۔" اس نے کہا۔ "کام تو میرے پاس بہت ہے اور جگہ بھی بہت ہے' تم یہاں
رہ سکتے ہو۔ کھانا کپڑے میرے ذمے اور اب ہم تنخواہ کی بات کرتے ہیں۔"

ان دونوں کے دل بڑی تیزی سے دھڑکنے لگے۔ آخر وہ لمحہ آن پہنچا تھا۔ جس کا
انہیں انتظار تھا' ناصر کو تو اس بات کی کچھ زیادہ ہی فکر تھی کہ صابر چاچا نے ابھی تک
تنخواہ کی بات تو کی ہی نہیں تھی' جبکہ وہ دونوں اپنا کام برابر کئے جارہے تھے۔ ان کی تنخواہ
کی بات ہونے والی تھی' خوابوں کی تکمیل کا ایک اور مرحلہ طے ہونے والا تھا۔

وہ دونوں خاموش تھے اور ان کے چہروں سے صبر آزما شدید انتظار کی کیفیت کا اظہار
ہو رہا تھا۔

"ایک ایک ہزار روپے مہینہ ٹھیک رہیں گے؟" خواجہ صابر علی نے ان سے کہا۔

"ایک ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ اور کھانا' کپڑا اور رہائش مفت۔ تم لوگوں کا اپنا تو کوئی خرچہ نہیں ہوگا..... فی الحال یہاں سے شروع کرتے ہیں پھر آگے دیکھیں گے۔"

ان دونوں کے لئے یہ پیشکش غیر متوقع تھی۔ ایک ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ۔ ایک ایک ہزار روپیہ ماہانہ ایسا تو انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ بھٹے میں ان کو ملنے والے بہت کم تھے۔ ان میں سے قرض کی رقم بھی تو کٹ جاتی تھی۔

"ہاں' ہاں چاچا جی۔" مسعود نے فوراً بڑی بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے "ٹھیک رہیں گے۔ بالکل ٹھیک رہیں گے....."

خواجہ صابر علی کو پورا یقین تھا کہ ان کا جواب یہی ہوگا۔ اس کو تو یہ ملازم اس تنخواہ کے ساتھ بھی بہت سستے تھے۔ یہ تو اس کے کل وقتی ملازم تھے اور وہ ان سے جو وقت' جو کام بھی چاہے لے سکتا تھا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔" اس نے کہا۔ "یہ بات طے ہوگئی کہ تم دونوں کو فی الحال ایک ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ ملے گی اور کھانا' کپڑا اور رہائش کی سہولت مفت لیکن باقاعدہ طور پر کام شروع کرنے سے پہلے ایمان داری کے ساتھ مجھے اپنے بارے میں کچھ صاف صاف بتا دو۔ گھر والوں سے چھپ کر بھاگے ہو نا؟ کیوں بھاگے ہو؟ اگر سچ بتا دوگے تو تمہارے حق میں اچھا ہوگا۔ میں تمہیں تمہارے والدین کے پاس واپس نہیں بھیجوں گا کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں رہو' میرے پاس کام کرو لیکن یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے جب مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ اگر کبھی پولیس تمہاری تلاش میں میرے دروازے تک آئے تو میں تم کو بچانے کے لئے کچھ نہ کر سکوں۔"

"ہاں صابر چاچا۔" مسعود نے نظریں جھکا کر زمین کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "ہم اپنے گھر والوں کو بتائے بغیر کراچی چلے آئے ہیں لیکن ہم نے کوئی چوری نہیں کی ہے اور نہ ہم اپنے گھروں سے کچھ لے کر بھاگے ہیں ہم تو اپنے ہی کمائے ہوئے پیسوں میں سے تھوڑے سے پیسے ساتھ لے کر آئے ہیں۔"

"اچھا' تم تو دونوں وہاں بھی کوئی کام کرتے تھے۔؟" خواجہ صابر علی نے پوچھا۔ "کیا کرتے تھے؟ اور اس کام کو چھوڑ کر کیوں بھاگ آئے؟"

اس سوال کا سچا جواب ایک لمبی اور تفصیلی داستان کا متقاضی تھا اور اس داستان کے بھی دو حصے تھے۔ ایک تو وہ جس کا تعلق مسعود سے تھا اور دوسرا وہ جس کا تعلق ناصر



سے تھا۔

مسعود نے داستان کے دونوں حصے باری باری خواجہ صابر علی کو سنا دیئے جو بغیر کسی مداخلت کے بڑے غور اور توجہ کے ساتھ اس کی بات سنتا رہا وہ اسے پوری طرح بولنے کا موقع دینا چاہتا تھا زیادہ سے زیادہ بولنے کا۔

"اچھا' تو یہ بات ہے....." اس نے مسعود کی پوری بات سننے کے بعد' مطمئن انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ اسے مسعود کی تمام باتوں کا پورا یقین آیا تھا۔ اپنی فراست' تجربے اور قیافہ شناسی کی بنیاد پر وہ بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا کہ یہ لڑکا جھوٹ نہیں بول رہا ہے بلکہ اس نے بڑی سادگی اور ایمان داری کے ساتھ اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا ہے۔

"جی ہاں چاچا جی۔" مسعود نے رقت بھری آواز میں کہا۔ "اگر ہم لوگ وہاں بھٹے پر کام کرتے رہتے تو ہمارا قرضہ کبھی بھی ادا نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم اس طرح حاجی مدد علی قریشی کے غلام بنے رہتے اور فخرو ہمیں اسی طرح مارتا رہتا۔"

"وہ ہمیں بہت مارتا تھا چاچا جی۔" ناصر بھی بولے بغیر نہ رہ سکا اور اب جبکہ مسعود نے سب کچھ بتا ہی دیا تھا تو پھر اس کے بولنے میں کوئی نقصان نہیں تھا۔ "وہ بلا وجہ مارتا تھا اور گالیاں بھی دیتا تھا۔"

"ہر آدمی کے اپنے اپنے دکھ ہوتے ہیں۔" خواجہ صابر علی نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔ "یہاں نہ کوئی تم کو بلاوجہ مارے گا نہ گالیاں دے گا۔" اس نے ان سے کہا۔ "اور تمہیں تنخواہ بھی برابر ملتی رہے گی۔ تم اپنے پیسوں کو جس طرح چاہو استعمال کر سکتے ہو۔ تمہاری مرضی ہے۔"

"ہم..... ہم..... پیسے جمع کریں گے چاچا جی۔" ناصر نے جلدی سے کہا۔ "ہمیں..... حاجی مدد علی قریشی کا قرضہ اتارنا ہے۔"

"ہاں چاچا جی۔" مسعود نے بھی جلدی سے اس کی تائید کی۔ "ہم اس لئے تو خاص طور سے کراچی آئے ہیں۔"

"اور وہ تمہارے ماما جی۔؟" صابر علی نے تیز نظروں سے مسعود کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "کیا واقعی تمہارے کوئی ماموں کراچی میں موجود ہیں یا تم نے....."

"میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا چاچا جی۔" مسعود نے جلدی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میرے ماما جی کراچی میں ہیں اور ان کے بارے میں' میں نے جتنی باتیں کہی

تھیں وہ سب سچ ہیں۔ وہ ہمارے ہاں سیالکوٹ میں آتے رہتے تھے۔ آخری بار وہ وقت آئے تھے جب میری ماں کا انتقال ہوا تھا۔ اس کے بعد سے میں نے ان کو نہیں لیکن میں نے ان کے بارے میں جو کچھ اپنی ماں سے سنا تھا وہ یہی ہے۔ کہ وہ بلدیہ کا میں کوئی بڑے افسر ہیں اور ان کے پاس موٹر سائیکل....."

"تم اس طرح سے تو ان کو کبھی بھی تلاش نہیں کر سکو گے۔" خواجہ صابر علی کہا۔ "میں دیکھوں گا کوشش کروں گا شاید کوئی راستہ نکل آئے لیکن تم اپنے گھر کے پاس تو واپس نہیں جانا چاہتے نا؟"

"نہیں نہیں چاچاجی۔ بالکل نہیں۔" مسعود نے فوراً کہا۔ "ہم وہاں واپس نہیں چاہتے۔ ہم اگر وہاں واپس جائیں گے تو حاجی مدد علی ہمیں دوبارہ پکڑ لے گا اور پھر ہم سے کبھی بھی نہیں نکل سکیں گے۔ مجھے معلوم ہے وہ بھاگنے والے لڑکوں کو زنجیر دیتا ہے۔"

"ہم اپنے گھروں کو اس وقت واپس جائیں گے چاچاجی جب ہم حاجی مدد علی کا اتار سکیں گے۔" ناصر نے کہا۔ "اور ابھی تو ہم انہیں صرف خط لکھوا دیں گے او خیریت کی اطلاع دے دیں گے۔ میری اماں کو جب میری خیریت کا خط مل جائے گا تو کی ساری پریشانی دور ہو جائے گی اور وہ خوش بھی ہو جائیں گی۔"

"لیکن ہم انہیں اپنا پتہ نہیں بتائیں گے۔" مسعود نے جلدی سے کہا۔ "اگر خط میں اپنا پتہ لکھ دیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے ابا مجھے ڈھونڈتے ہوئے یہاں آجائیں۔ پھر تو وہ مجھے اور ناصر کو پکڑ کر لے جائیں گے۔"

"تم پتہ مت لکھوانا۔" خواجہ صابر علی نے کہا۔ "یہ ٹھیک ہے بغیر اپنا پتہ لکھے ہوئے خط بھیج دینا اس طرح ان لوگوں کی تسلی بھی ہو جائے گی اور تم لوگ بھی محفوظ گے۔"

ان کی طویل گفتگو کا یہ سیشن بہت دیر تک جاری رہا' اور اس کے اختتام پر صابر علی نے ان دونوں کو ہدایت دیتے ہوئے کہا۔ "کسی کو بھی میرا مطلب ہے کو یا حامد کو' کسی کو بھی اپنے بارے میں یہ سب کچھ مت بتانا۔ بس وہی کہنا جو اب کہتے آئے ہو یعنی یہ کہ تم اپنے والدین کی مرضی سے محنت مزدوری کر کے پیسہ کما غرض سے کراچی آئے ہو یہاں رہنا اور کام کرنا چاہتے ہو۔ اپنے بارے میں زیادہ کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔"



"جی ہاں چاچاجی۔" مسعود نے کہا۔ "ہم اس سے زیادہ کسی سے کچھ کہیں گے ہی نہیں۔"

"اچھا اب جاؤ اور آرام سے سو جاؤ۔" خواجہ صابر علی نے ایک مطمئن اور پُر سکون مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "رات بہت ہو گئی ہے اور صبح اٹھ کر کام پر بھی جانا ہے۔"

وہ دونوں جب وہاں سے اٹھے تو اپنے آپ کو پھولوں کی طرح ہلکا محسوس کر رہے تھے۔ ان کے دل کھلے ہوئے تھے اور ان کے وجود امید کی خوشبو سے مہک رہے تھے قسمت ان کا ساتھ دے رہی تھی۔ حالات کتنی تیزی کے ساتھ ان کے لئے سازگار ہوتے چلے جا رہے تھے۔ کراچی آتے ہی انہیں وہ سب کچھ مل گیا تھا جس کے خواب کو وہ اپنے دل میں بسائے ہوئے یہاں تک آئے تھے۔ اب اگر دل میں کسی بات کا خوف تھا تو صرف یہ کہ کہیں گھر سے ان کی تلاش میں کوئی یہاں تک نہ آن پہنچے۔

صرف وہی دونوں مطمئن نہیں تھے خواجہ صابر علی بھی بہت خوش اور مطمئن تھا۔ ان کو سب سے زیادہ خوشی تو اس بات کی تھی کہ اس کا قیاس بالکل صحیح نکلا تھا اور ساتھ ہی اس کی حکمت عملی بھی کامیاب رہی تھی۔ وہ ان لڑکوں سے سچ اگلوانے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اب وہ حنیفہ کو یہ سب کچھ بتانے کے لئے بے چین تھا کہ اس نے ایک بڑا معرکہ سر کر لیا ہے۔ کاروبار کے لئے دو بہت سستے ملازم بھی مل گئے تھے جن پر مکمل بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔

ان دونوں کے جانے کے بعد اس نے حنیفہ کو بلایا اور خوشی اور فخر کے ساتھ چہچہاتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"دیکھ لو حنیفہ بیگم۔ جو کچھ میں نے کہا تھا اس کا ایک ایک حرف سچ نکلا میں نے تو پہلی نظر میں ہی بھانپ لیا تھا کہ دونوں گھر سے بھاگے ہوئے لڑکے ہیں۔"

"اے ہے۔ تو کہیں پولیس نہ پیچھے لگی ہو۔ کوئی جرم کر کے تو نہیں بھاگے ہیں....." اور پھر اس نے حنیفہ کو ان دونوں کے بارے میں وہ سب کچھ تفصیل سے بتا دیا جو اس نے ان ہی کی زبانی سنا تھا۔

"مسعود کی ماں تو خیر سوتیلی ہے۔" حنیفہ نے پوری بات سننے کے بعد آہستہ سے کہا۔ "لیکن ناصر کی ماں کی حالت تو بہت بری ہو گی۔ وہ دکھیا تو مچھلی کی طرح تڑپ رہی ہو گی۔ ایک ہی بیٹا اس کا پھوٹی آنکھوں کا تارا اور وہ بھی یوں غائب ہو گیا۔ نہ جانے کہاں کہاں دھکے کھاتی پھر رہی ہو گی۔"

"اسے یہ تو معلوم ہو ہی گیا ہو گا کہ وہ دونوں ایک ساتھ غائب ہیں۔" خواجہ صابر علی نے کہا۔ "اس طرح اس نے یہ سمجھ لیا ہو گا کہ وہ دونوں ایک ساتھ ہی کہیں پہنچے ہیں اور یہ کہ اس کے بیٹے کو کسی نے اغوا نہیں کیا ہے۔ پھر بھی اس کو اس کی خیریت کے بارے میں جلد از جلد اطلاع مل جانی چاہئے۔ تم ایسا کرنا کل ہی ان سے پوچھ کر ایک لکھ دینا لفافہ میں لیتا آؤں گا۔ کل رات کو ہی اسے لفافے میں بند کر کے ڈلوا دیں گے تاکہ صبح کی ڈاک میں نکل جائے۔ ان کے گھر والوں کو کم از کم ان کی خیریت تو معلوم ہو جائے۔"

"ہاں میں لکھ دوں گی۔" حنیفہ نے کہا۔ "تم لفافہ لیتے آنا۔"

اگلے دن' رات کو حنیفہ نے ان دونوں کو اپنے پاس بٹھا کر ان سے پوچھا کہ وہ کس کے نام لکھوانا چاہتے ہیں اور اس میں کیا لکھوانا چاہتے ہیں۔ وہ دونوں اس کے متعلق پہلے ہی طے کر چکے تھے۔

"خط میرے ابا کے نام لکھ دیجئے چاچی۔" مسعود نے کہا۔ "ایک ہی خط کافی ہے اس میں میرے بارے میں لکھ دیجئے اور ناصر کے بارے میں بھی اور یہ کہ میرے ابا اور امی کی امی کو بھی اطلاع دے دیں کہ ناصر میرے ساتھ ہے اور ہم لوگ کراچی میں بالکل خیریت سے ہیں ہمیں یہاں نوکری مل گئی ہے۔" اور وہ باقی باتیں بتانے لگا۔ "لیکن یہاں کا پتہ نہ لکھئے گا چاچی نہ کسی کا نام۔" اس نے کہا۔ "اور یہ بات خاص طور سے لکھ دیجئے کہ ہمارے بارے میں کسی کو نہ بتائیں خاص طور سے حاجی مدد علی قریشی کو۔"

"ٹھیک ہے' لکھ دیتی ہوں۔" حنیفہ نے کہا اور خط لکھنے بیٹھ گئی۔ اس نے پورا خط لکھ لیا اور اس کے بعد اسے ان دونوں کو سنا دیا وہ دونوں اس کو سن کر بہت خوش ہوئے خط اردو میں لکھا گیا تھا اور ناصر نے اس کے ایک ایک لفظ کو بڑے غور سے سنا اور اس کے مطلب کو پوری طرح سے سمجھنے کی کوشش کی۔

"ٹھیک ہے یا کچھ اور بھی لکھنا ہے؟" حنیفہ نے پوچھا۔

"نہیں چاچی۔ بس ٹھیک ہے۔" مسعود نے کہا۔ "اور کیا لکھنا ہے بھلا۔ ساری ضروری باتیں تو آپ نے لکھ دیں۔"

"اچھا اب پتہ بتاؤ۔" حنیفہ نے کہا اور مسعود سے پوچھ کر لفافے پر پتہ لکھنے لگی۔ "پہنچ کر امتیاز احمد کو ملے۔" پتہ لکھنے کے بعد اس نے لفافے کو نم کر کے بند کر دیا۔

"اسے ابھی جا کر لیٹر بکس میں ڈال آؤ۔" خواجہ صابر علی نے ان سے کہا۔ "سڑک



کے اس پار کونے میں لیٹر بکس لگا ہوا ہے۔ حامد کو ساتھ لے لو وہ بتا دے گا۔"

دونوں خوشی خوشی وہاں سے روانہ ہوئے۔ انہوں نے حامد کو ساتھ لیا اور سڑک پار کر کے اس جگہ پہنچے جہاں زمین میں لیٹر بکس گڑھا ہوا تھا۔ کچی زمین میں لگا ہوا لیٹر بکس ایک طرف کو کافی جھکا ہوا تھا۔ انہوں نے خط اس میں ڈال دیا۔

"ہمارا خط کتنے دن میں سیالکوٹ پہنچ جائے گا حامد چاچا؟" واپسی میں ناصر نے پُر اشتیاق لہجے میں حامد سے پوچھا۔

"میرے خیال میں' تین چار دن تو لگیں گے ہی۔" حامد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"تین چار دن۔" ناصر نے سرگوشی کے عالم میں' دل ہی دل میں کہا۔ "تین چار دن کے بعد اماں کو میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہو جائے گا اور ان کی ساری پریشانی دور ہو جائے گی۔"

وہ لوگ گھر واپس آ کر اپنے بستر پر جا کر لیٹ گئے۔

بادل تو آج شام سے ہی تھے اور کسی کسی وقت ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی ہونے لگتی تھی۔ آدھی رات کے بعد بڑی تیز اور دھواں دھار بارش شروع ہو گئی۔ مسعود اور ناصر کی آنکھ کھل گئی۔ ان کی چارپائی دروازے کے قریب تھی اور وہاں پانی کی بوچھاڑ آ رہی تھی۔ حامد بھی اٹھ گیا۔ اس نے ان سے کہا کہ اپنی چارپائی اندر کی طرف گھسیٹ لو۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ بادل بڑے زور سے گرج رہے تھے اور بجلی بار بار چمک رہی تھی۔ بارش معلوم نہیں کب تک ہوتی رہی۔ وہ دونوں آنے والے دنوں کے خوبصورت اور سہانے خواب دیکھتے ہوئے دوبارہ سو گئے۔

اگلے روز صبح کے تقریباً نو بجے تھے جب پوسٹ مین عبداللہ خان اس لیٹر بکس کے پاس پہنچ گیا جس میں گزشتہ رات مسعود اور ناصر نے خط ڈالا تھا۔ عبداللہ خان کو آج آنے میں کافی دیر ہو گئی تھی۔ رات کی بارش نے ٹرانسپورٹ کا سارا نظام درہم برہم کر دیا تھا اور سڑکوں پر اس قدر پانی بھرا ہوا تھا کہ گاڑیوں کا چلنا مشکل ہو رہا تھا۔

پوسٹ مین عبداللہ خان نے لیٹر بکس کو دیکھا جو پہلے ہی ایک جانب کو جھکا ہوا تھا رات کی تیز اور طوفانی بارش کے نتیجے میں اور بھی زیادہ جھک گیا اور بالکل ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ عبداللہ خان اس سے پہلے کئی بار محکمے والوں کو رپورٹ کر چکا تھا ان سے کہہ چکا تھا کہ لیٹر بکس کو زمین سے نکال کر دوبارہ' ایک نئے چبوترے پر نصب کیا جائے' مگر محکمے میں کسی نے اس کی بات پر توجہ ہی نہیں دی تھی۔

عبداللہ خان نے لیٹر بکس کا تالہ کھولا اور ہاتھ ڈال کر اس میں پڑے ہوئے خط نکالنے چاہے لیکن اندر بارش کا پانی بھرا ہوا تھا اور تمام خط جن کی تعداد کچھ زیادہ نہیں تھی' پانی میں بھیگ کر خراب ہوگئے تھے۔ وہ کئی گھنٹے سے پانی کے اندر پڑے ہوئے تھے اور اتنی دیر میں کاغذوں کی لگدی میں تبدیل ہوچکے تھے۔ لیٹر بکس کے آس پاس بھی نشیب میں پانی ہی پانی بھرا ہوا تھا۔

عبداللہ خان نے ان تمام خطوں کو نکالا اور لفافوں پر لکھے ہوئے پتوں کو پڑھنے کی کوشش کی لیکن ایک بھی پتہ پڑھا نہیں جاسکا۔ بارش کے پانی میں کئی گھنٹے تک بھیگتے رہنے کی وجہ سے سارے حروف مٹ گئے تھے اور اب ان کو پڑھنا ناممکن تھا لفافے کھل گئے تھے اور ان کے اندر رکھے ہوئے کاغذ الگ ہوگئے تھے۔ وہ بھی پانی میں بھیگ کر بالکل خراب ہوچکے تھے اور ان کے سارے حروف مٹ گئے تھے۔

پوسٹ مین عبداللہ خان نے کاغذوں کی اس لگدی کو لے جاکر آگے ایک کوڑا گھر میں پھینک دیا۔

مسعود اور ناصر پوری طرح مطمئن اور خوش تھے کہ ان کے گھر والوں کو ان کی خیریت کی اطلاع مل جائے گی اور اس کے ساتھ ہی ان کی ساری پریشانی ختم ہوجائے گی۔

"اماں اب تک تو بہت ناراض ہوں گی مجھے برا بھلا بھی کہہ رہی ہوں گی۔" ناصر نے دل میں سوچا۔ "میں گھر سے پیسے بھی لے آیا تھا نا۔ ابا کی طرح۔ ابا بھی تو پیسے چرا کر گھر سے بھاگ گئے تھے لیکن ابا نے تو وہ سارے کے سارے پیسے نشے کے لئے چرائے تھے اور پھر وہ ہمیشہ کے لئے گھر سے بھاگ گئے۔ میں نے تو صرف تھوڑے سے پیسے لئے ہیں۔ وہ بھی اس لئے کہ میں کراچی جاسکوں اور اب تو میں کراچی آگیا ہوں۔ مجھے کام بھی مل گیا ہے۔ ایک ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ کھانا کپڑا' رہائش وغیرہ سب مفت۔ اس سے زیادہ اور کیا مل سکتا تھا مجھے؟ اماں کو خط کے ذریعے جب یہ سب کچھ معلوم ہوگا تو وہ کس قدر خوش ہوں گی۔ ان کی ساری ناراضگی دور ہوجائے گی وہ اور آپا دونوں بہت خوش ہوں گی مگر ان کے اور آپا کے لئے کتنا مشکل ہوگا اس خوشی کی خبر کو چھپائے رکھنا' لیکن چھپانا تو ان کو پڑے گا اگر اس پاجی حاجی کو معلوم ہوگیا تو وہ ہمیں کراچی سے پکڑوا لے گا۔ وہ کسی کو اس بارے میں کچھ نہیں بتائیں گی اور نہ ہی مسعود کے ابا اور امی بتائیں گے لیکن ایک بات ہے..... آپا مراد کو تو ضرور بتائیں گی۔ ہاں..... آپا مراد کو ضرور بتائیں گی۔ وہ مراد سے کوئی بات نہیں چھپاتیں۔ مراد کو تو ہمارے گھر کی ساری باتیں معلوم رہتی ہیں۔



یہ بات بھی اس کو ضرور معلوم ہوجائے گی..... چلو اچھا ہے۔ مراد کسی سے نہیں کہے گی وہ تو بہت اچھا ہے۔"

مسعود کو بھی اب پورا اطمینان تھا۔ اس کی سوتیلی ماں اس کے بارے میں اب یہ خیال نہیں کرے گی کہ وہ اس کو اور اپنے باپ کو دھوکا دے کر بھاگ گیا اور گھر سے کچھ پیسے بھی لے گیا۔ "وہ دونوں تو یہ جان کر خوش ہوں گے کہ میں کراچی آگیا ہوں اور اس اجنبی اور نامانوس شہر کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی مجھے اور ناصر کو ایک ایک ہزار روپے ماہانہ کی نوکری' مفت کھانے' پینے' کپڑے اور رہائش کے ساتھ مل گئی اور ایک ہزار روپے ماہانہ تنخواہ ابھی ابتداء ہے۔ کچھ عرصے کے بعد اس میں اضافہ بھی ہوگا۔ اب تو میں اس وقت گھر واپس جاؤں گا جب میرے پاس پندرہ ہزار روپے کی رقم موجود ہوگی تاکہ حاجی مدد علی قریشی کا قرضہ ادا کیا جاسکے۔"

مسعود اور ناصر کو یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ ان کا بھیجا ہوا خط تو چند فرلانگ سے زیادہ کی مسافت طے کر ہی نہیں سکا۔ وہ دونوں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھنے میں حق بجانب تھے۔ اس اجنبی اور نامانوس شہر کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی ان کو بالکل اچانک اور غیر متوقع طور پر وہ سب کچھ مل گیا تھا جس کی تلاش اور تمنا میں وہ کراچی آئے تھے۔ سر چھپانے کے لئے ایک چھت' کھانے کے لئے روٹی' پہننے کے لئے کپڑا اور کرنے کے لئے کام تھا اور کام کے عوض ملنے والے پیسے تھے۔

اول دن سے ہی مسعود نے بزرگانہ انداز میں ناصر کو یہ بات سمجھا دی تھی کہ یہاں کام میں کسی بھی قسم کی ہیرا پھیری' کوتاہی' غفلت یا نکمے پن کا ہرگز مظاہرہ نہ کرے۔ "خدا نے ہمارے اوپر بڑا کرم کیا ہے اور ہم کو ایک ٹھکانہ دلوا دیا ہے پھر صابر چاچا جیسا اچھا آدمی۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اس سب کو غنیمت جانیں اور خوب دل لگا کر کام کریں ایسا نہ ہو کہ صابر چاچا یا حنیفہ چاچی کسی بات پر ناراض ہو کر ہم کو یہاں سے نکال دیں۔ خدانخواستہ اگر ایسا ہوا تو پھر ہم بھلا دوسرا ٹھکانہ کہاں تلاش کرتے پھریں گے۔"

"نہیں نہیں' ایسا نہیں ہونا چاہئے۔" ناصر نے ایک دم سہم کر کہا۔ "میں تو بہت اچھی طرح کام کروں گا۔ جو کچھ مجھ سے کہا جائے گا وہی کروں گا میں صابر چاچا اور حنیفہ چاچی کو کبھی ناراض نہیں کروں گا۔" اور یوں ان دونوں کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوگیا جو ان کی پرانی زندگی سے یکسر مختلف تھا۔ سب سے بڑا' بنیادی فرق اور اہم ترین فرق یہ تھا کہ یہ ان کے لئے خوش حالی کا دور تھا خوب پیٹ بھر کر کھانا اور وہ بھی اچھا ملتا

تھا۔ یہاں تقریباً روز ہی گوشت پکتا تھا۔ ناصر گھر میں تو مہینوں گوشت نہیں کھاتا تھا
اماں شام کو چوہدریوں کے گھر سے جو تھوڑا بہت بچا کھچا کھانا لاتی تھیں اس میں اکثر گو
بھی ہوتا تھا لیکن وہ کتنا تھوڑا سا ہوتا تھا جبکہ کھانے والے تو اتنے بہت سے ہوتے
اور یہاں تو ہر شخص کے حصے میں اچھا خاصا گوشت آجاتا تھا۔ اس کے علاوہ، گھر
مٹھائیوں کے ڈھیر لگے رہتے تھے۔ دودھ دہی کی فراوانی تھی۔ مٹھائیوں سے تو چند ہی
میں ان کا جی بھر گیا تھا۔ مٹھائیوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے بنتا دیکھ دیکھ کر اب ان
کوئی خاص کشش باقی نہیں رہی تھی۔ ان کے لئے بازار سے اچھے، عمدہ، سلے سلا
شلوار قمیض سوٹ خریدے گئے تھے۔ نئی چپلیں دلائی گئی تھیں۔ یہ ساری چیزیں ان
لئے خوش دلی اور شادمانی کا کام کرنے اور بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرنے کے جذبے کو فر
دینے کا بھی باعث بنیں۔ دونوں اپنے آپ کو زندگی کے سانچے میں بڑی تیزی کے سا
فٹ کرتے چلے جارہے تھے۔

خواجہ صابر علی نے خوب سوچ سمجھ کر ان دونوں کو تجرباتی بنیاد پر اپنے پاس رکھ
تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ ابھی کچھ عرصے تک تو وہ دونوں بھاگ کر کہیں اور نہیں جا
گے کیونکہ وہ اس شہر میں نئے ہیں ان کا کوئی جاننے والا بھی یہاں نہیں ہے البتہ اس امکا
کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ کچھ تجربہ کار ہوجائیں گے تو کسی زیادہ تنخواہ والے کام
خاطر یہاں سے بھاگ جائیں گے۔ محنت مزدوری کرنے والے لڑکوں اور نوجوانوں کو ا
شہر میں طرح طرح کے بے شمار کام مل جاتے تھے۔ خواجہ صابر علی کی یہ کوشش تھی کہ ا
دونوں ٹھیک ٹھاک طرح کام کرتے رہیں تو وہ انہیں اپنے ہی ساتھ رکھے۔

اس نے مسعود کو تو اپنے ساتھ دکان پر لے جانا شروع کردیا کیونکہ مسعود عمر میں ذر
بڑا تھا اور وہ دکان کے کام کو زیادہ بہتر طور پر سنبھال سکتا تھا اس کے ساتھ ہی اس نے
اپنے بیٹے خواجہ طاہر علی کو دکان پر آنے سے بالکل منع کردیا۔ اسے اب صرف پڑھائی کی
طرف توجہ دینے کی ضرورت تھی۔ ناصر کو اس نے گھر پر رکھنے کا فیصلہ کیا۔ ناصر کو باڑے
میں حامد کی مدد بھی کرنی تھی اس کے علاوہ دوسرے گھر پر کام بھی انجام دینے تھے جن میں
مٹھائیاں تیار کرنے میں حنیفہ اور سلیم چاچا کی مدد کرنا بھی شامل تھا۔ دونوں لڑکوں نے اپنی
اپنی ڈیوٹیاں سنبھال لی تھیں اور وہ بڑی ہی مستعدی کے ساتھ اپنے اپنے کاموں میں
مصروف تھے۔

وہ دونوں، گھر کے دیگر افراد کی طرح علی الصبح بیدار ہوجاتے تھے اور تھوڑی سی دیر



ے بعد ان کی مصروفیات کا سلسلہ شروع ہوجاتا تھا۔ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد
واجہ صابر علی اور مسعود، دودھ کے کنستر اور مٹھائیوں کے تھال وغیرہ سوزوکی میں رکھ کر
ہن کے لئے روانہ ہوجاتے اور ناصر حامد کے ساتھ گھر پر رہتا۔ زیادہ تر دودھ تو دکان پر
ج دیا جاتا تھا لیکن کچھ دودھ یہاں باڑے پر بھی رکھا جاتا تھا اسے یہیں فروخت کیا جاتا
خریدنے والے تمام کے تمام اس محلے کے آس پاس کے لوگ ہوتے تھے جو اپنے
پنے برتن لے کر آتے تھے۔ ناصر نے دودھ کو ناپنے، پیسوں کا حساب کتاب کرنے کا سب
م بہت جلدی سیکھ لیا اور اب اس کو کسی کی سرپرستی کی ضرورت نہیں تھی۔ روز کے
یا لگے بندھے گاہک تھے۔ وہ ان سب کو جان گیا تھا اور وہ سب بھی اس کو جان گئے
ے۔

صبح سے لے کر دوپہر کے کھانے تک کا تقریباً سارا ہی وقت ناصر، باڑے میں گزارتا
حامد کے ساتھ مل کر کام کیا کرتا تھا۔ جو کام حامد اس کو بتاتا، وہ بڑی مستعدی اور خوش
کے ساتھ کرتا رہتا۔ حامد کو اس کی چھوٹی موٹی غلطی پر کبھی اس پر غصہ بھی آجاتا تھا وہ
کو ڈانٹتا بھی تھا لیکن اس ڈانٹ میں ناصر کو اس زہریلی نفرت کا شائبہ تک نہیں محسوس
جس سے فخرو کا پورا وجود عبارت تھا اور نہ ہی یہاں کا کام بھٹے کے کام کی طرح جان
بے کیف، غیر دلچسپ اور پُر مشقت تھا۔ یہاں کام کرنے کی ایک فضا بنی ہوئی تھی۔

دوپہر کا کھانا ناصر اور حامد ساتھ ہی کھاتے اور پھر کچھ دیر کے لئے دونوں آرام
تے۔ دوپہر کے بعد ناصر گھر کے اندر چلا جاتا اور اب گویا اس کی ڈیوٹی کی دوسری شفٹ
وع ہوتی تھی۔ سلیم آچکا ہوتا تھا وہ اور حنیفہ مٹھائیاں بنانے کی تیاریوں میں لگے
تے۔ ناصر بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاتا۔ ناصر کو کبھی بھی چولھے، باورچی خانے اور
انے پکانے وغیرہ کے کاموں سے کوئی لگاؤ نہیں رہا تھا۔ وہ تو اپنے گھر میں باورچی خانے
صرف کچھ دیر کھانے کے لئے جاکر بیٹھتا تھا لیکن یہاں کراچی میں وہ مٹھائیاں بنانے کے
میں بڑی دلچسپی لے رہا تھا اور تیزی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مٹھائیاں بنانا سیکھ رہا تھا۔
ے کا کام اس کے لئے اس درجہ اجنبی اور نیا نہیں تھا جتنا کہ مٹھائیاں بنانے کا کام۔

مسعود، خواجہ صابر علی کے ساتھ دکان پر جاتا تھا۔ صبح کو وہاں پہنچتے ہی وہ دکان کو
ول کر فوراً اس کی صفائی وغیرہ کرتا۔ خواجہ صابر علی دکان کے اندر داخل ہونے سے
کھڑے ہو کر کچھ دعائیں پڑھتا۔ اس کے بعد دکان کے اندر داخل ہوتا۔ وہ مسعود کے
تھ مل کر جلدی جلدی سوزوکی سے دودھ کے کنستر اور مٹھائی کے تھال اتارتا اور انہیں

اندر رکھتا۔ اس کے ساتھ ہی کاروبار شروع ہو جاتا۔ آج کے دن کا کاروبار۔ گاہکوں
آمدورفت شروع ہو جاتی یہ سلسلہ دوپہر کے کھانے کے وقفے تک جاری رہتا۔ کھانے
وقت دکان کا آدھا شٹر گرا دیا جاتا خواجہ صابر علی اور مسعود دکان کے اندر بیٹھ کر ایک
کھانا کھاتے جو وہ صبح اپنے ساتھ گھر سے لے کر آتے تھے کھانے کے وقفے کے خاتمے
بعد شٹر اٹھا دیا جاتا اور کاروبار ایک بار پھر شروع ہو جاتا۔

رات کو جب دکان بند ہوتی تو وہ دونوں دودھ کے خالی کنستروں اور مٹھائی کے
تھالوں کو سوزوکی میں رکھ کر گھر کے لئے روانہ ہو جاتے۔ سارا دن گاہکوں سے نمٹنا
کا کام تھا وہی چیزوں کو تولنا اور ناپنا اور انہیں گاہکوں کے حوالے کرتا تھا۔ دونوں مختلف
کے تجربات سے گزر رہے تھے جن کا وہ آپس میں تبادلہ کرتے رہتے تھے۔ ناصر کا وقت
پر' گھر کے لوگوں اور یہاں کام کرنے والوں کے درمیان گزرتا تھا۔ صبح کے وقت
سارے گاہک دودھ خریدنے کے لئے آیا کرتے تھے جن سے ناصر ہی نمٹتا تھا اور وہیں
کے لوگوں کے علاوہ دوسرے لوگوں سے ملنے جلنے اور ان سے بات چیت کرنے کا موقع
رہتا تھا جس کے نتیجے میں وہ اس شہر کی سماجی زندگی سے اپنے رابطے کو استوار کر رہا
مسعود کو تو سارا دن ہی دوسرے لوگوں سے ملنے' جلنے' بات چیت کرنے اور گھلنے
ہونے کا موقع ملتا رہتا تھا۔ وہ ناصر کے مقابلے میں بہت زیادہ تیزی کے ساتھ کراچی
زندگی کا حصہ بنتا جا رہا تھا۔

رات کو جب سب لوگ کھانے سے فارغ ہو جاتے' تو حنیفہ ان دونوں کو تھو
بہت پڑھاتی بھی تھی۔ اصل میں حنیفہ کو خود پڑھنے پڑھانے کا شوق تھا اور وہ اکثر کہا
تھی کہ اگر اس کو موقع ملتا تو وہ اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرتی اور کوئی سائنس داں بن کر
نئی چیزیں ایجاد کرتی۔

خواجہ طاہر علی نے اب دکان جانا بالکل چھوڑ دیا تھا اس کی وہاں کوئی ضرورت نہ
تھی۔ وہ اپنی ساری توجہ پڑھائی پر مرکوز کئے ہوئے تھا۔

ایک ماہ مکمل ہو جانے کے بعد جب ان دونوں کو پہلی بار خواجہ صابر علی نے
ہاتھ سے تنخواہ دی اور دونوں کے ہاتھ میں ایک ایک ہزار روپے کے نوٹ آئے تو
مسرت سے ان کا عجیب عالم تھا۔ ناصر نے تو کبھی اتنی بڑی رقم چھوئی بھی نہیں تھی کیونکہ
تنخواہ تو بھٹے پر آکر اس کی ماں لے جاتی تھی اور جہاں تک مسعود کا تعلق تھا تو اس
بھی کبھی ایک وقت میں اتنے بہت سارے پیسے حاصل نہیں کئے تھے۔ دونوں اس وقت



اپنے آپ کو دنیا کے امیر ترین افراد میں شمار کر رہے تھے۔ کام تو وہ اس سے پہلے بھی
کرتے رہے تھے اور انہیں تنخواہ بھی ملتی رہی تھی لیکن جس آزادی کا انہیں اس وقت
احساس ہو رہا تھا وہ ایک بالکل نئی چیز تھی یہ ان کی محنت کی وہ کمائی تھی جس پر خالصتاً ان کا
اپنا اختیار تھا وہ اس رقم کے بلا شرکت غیرے مالک تھے۔ اسے جس طرح سے چاہیں' خرچ
کر سکتے تھے۔ کوئی ان کو روک نہیں سکتا تھا۔ کوئی ان سے یہ رقم لے کر اپنی جیب میں
نہیں ڈال سکتا تھا۔ کوئی انہیں ان کی اس کمائی سے محروم نہیں کر سکتا تھا۔ ملکیت کا یہ
انوکھا احساس تھا جس نے ان کے وجود کو ایک نئے نشے سے واقف کر دیا تھا۔

"اب..... اب ہم ان پیسوں کا کیا کریں گے مسعود؟" ناصر نے رات کو تنہائی
میں مسعود سے پوچھا۔

"یہ کیا بیوقوفی کی بات ہے؟" مسعود نے ہنستے ہوئے کہا۔ "کیا مطلب ہوا کہ کیا
کریں گے۔؟ ارے بھائی' ہمارے پیسے ہیں ہمارے اپنے پیسے اور....."

"میرا مطلب یہ ہے کہ ابھی ہم ان کا کیا کریں گے؟" ناصر نے اپنی بات کی وضاحت
کرتے ہوئے کہا۔ "ان کو کہاں رکھیں گے؟ کہاں چھپائیں گے ان کو جہاں یہ بالکل محفوظ
رہیں۔ ہمیں ابھی ان کو خرچ کرنے کی تو ضرورت ہے نہیں۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ پیسے
جمع کرنے ہیں تاکہ ہم جلد از جلد قرضے کی رقم ادا کر سکیں۔"

"پیسے تو ہمیں جمع ہی کرنے ہیں۔" مسعود نے کہا۔ "مجھے پندرہ ہزار روپے جمع
کرنے ہیں اور تم کو دس ہزار روپے' اور جب ہم دونوں یہ رقم جمع کر لیں گے تو پھر واپس
گھر چلیں گے اور اپنے گھر والوں کو حیران کر دیں گے۔ انہیں ہماری ان ساری باتوں کا
یقین آجائے گا جو ہم نے ان کو اپنے خط میں لکھی تھیں۔"

"اور پھر کس قدر مزہ آئے گا!" ناصر نے اس آنے والے مزے کا تصور کرتے
ہوئے کہا۔ "اماں اور آپا دونوں کس قدر خوش ہوں گی۔ حاجی مدد علی قریشی کا قرض ادا
ہو جائے گا اور اماں سارے جھنجھٹوں سے چھوٹ جائیں گی مگر..... مگر..... میں یہ
سوچتا ہوں مسعود اس کے بعد پھر میں کیا کروں گا؟"

"کیا مطلب؟" مسعود نے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ ایک بار قرضے کی پوری رقم ادا کر دینے کے بعد پھر ہم لوگ کیا کریں
گے؟" ناصر نے کہا۔ "ظاہر ہے کہ ہم دوبارہ بھٹے میں تو کام نہیں کریں گے اور ہمارے
علاقے میں پتہ نہیں ہمیں کوئی اور کام ملے یا نہ ملے یا اگر ملے بھی' تو مزدوری بھی اتنی

ملے یا نہ ملے۔"

"ہاں اس بارے میں تو کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا۔" مسعود نے پُرخیال انداز میں

"اس لئے' اس لئے مسعود' میں یہ سوچ رہا ہوں کہ جب میں قرضے کی رقم
کر لینے کے بعد گھر جاؤں گا تو پھر وہاں رہوں گا نہیں۔ کچھ دن رہ کر دوبارہ واپس کر
آجاؤں گا اور اسی طرح کام کرتا رہوں گا۔ پھر..... بس' پھر میں کراچی میں ہی ر
گا۔ سال دو سال میں ایک آدھ بار گھر جاتا رہوں گا لیکن پیسے برابر بھیجتا رہوں گا۔ اما
نوکری چھڑوا دوں گا۔ جب میں یہاں رہ کر کام کروں گا تو پھر اماں کو وہاں دوسروں
گھروں میں کام کرنے کی کیا ضرورت ہے۔؟ ان سے کہوں گا کہ اب وہ آرام کریں
کام کرتی ہیں بے چاری۔ شام کو جب وہ چوہدریوں کے گھر سے واپس آتی ہیں تو کس
طرح تھکی ہوئی ہوئی ہیں۔ میں تو یہی سوچ رہا ہوں مسعود۔ میں اب وہاں رہوں گا نہیں
میں تو اب کراچی میں ہی رہوں گا۔"

"تم ٹھیک سوچ رہے ہو۔" مسعود نے بہت دھیمی آواز میں کہا۔ "میں بھی.....
شاید میں بھی ایسا ہی کروں بلکہ مجھے بھی ایسا ہی کرنا چاہئے ہاں تمہارا خیال ٹھیک ہے
بھی کراچی میں ہی رہوں گا بس ایک بار میں قرضے کی رقم ادا کردوں پھر میں ہمیشہ کے
آزاد ہو جاؤں گا اور پھر تو مجھے جلدی جلدی گھر جانے کی ضرورت بھی نہیں ہوگی بس
پیسے بھیج دیا کروں گا۔ ابا کو' اماں کو' اور کیا چاہئے انہیں اس کے علاوہ؟ ان کو پیسے چا
ہیں۔ سو وہ میں ان کو بھیج دیا کروں گا۔"

"یہ تو بہت ہی اچھا ہوگا مسعود کہ تم بھی کراچی میں ہی رہو گے۔" ناصر نے
زیادہ خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "پھر تو واقعی بہت مزہ آئے گا۔ پھر ہم کو نہ کسی سے ڈر
کی ضرورت ہوگی نہ کسی سے چھپنے کی پھر تو ہم سب لوگوں سے یہ بات ڈنکے کی چوٹ
کہہ سکیں گے کہ ہم کراچی میں رہتے اور کام کرتے ہیں کوئی شخص ہم سے قرضے کی
واپس مانگنے والا نہیں ہوگا۔"

کچھ دیر کے لئے وہ دونوں آنے والے بے حد خوش گوار اور روح پرور دنوں
سنہری خوابوں میں گم ہوگئے۔ دونوں اپنی زندگی میں رونما ہونے والی موجودہ مثبت تبدیلی
سراہتے ہوئے' اس سے بھی زیادہ' مزید راحت بخش تبدیلی کے خواب بُن رہے تھے
مستقبل انہیں بہت اچھا بڑا امید افزا اور سکون و مسرت سے بھرپور لگ رہا تھا۔ انہیں
یقین تھا کہ عملی زندگی کی جس شاہراہ پر انہوں نے اپنا قدم رکھ دیا ہے وہ انہیں خوشحالی



اور کامیابی کی طرف ہی لے جائے گی۔ ناصر اپنی بہن جنت کو دلہن بنے ہوئے دیکھ رہا تھا۔
اس نے خوب پیسے کما کر اپنی ماں کے ہاتھ پر لا کر رکھ دیئے تھے اور ماں اب جنت
کی شادی کر رہی تھی جنت دلہن بنی ہوئی کتنی اچھی لگ رہی تھی مگر دولہا کون تھا؟ اور
اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن کے پردے پر خود بخود مراد کی تصویر ابھر آئی۔ گو کہ وہ
بھی ان باتوں کا مطلب پوری طرح نہیں سمجھتا تھا تاہم اس کو اس بات کا بخوبی اندازہ تھا
کہ جنت' ماں کے منع کرنے کے باوجود چوری چوری مراد سے ملتی رہی ہے اور مراد بھی
اس کی عدم موجودگی میں خاموشی سے ان کے گھر کے چکر کاٹتا رہتا اور جنت سے باتیں
کرنے کے لئے آجاتا ہے۔ ماں کی شدید مخالفت کے باوجود وہ دونوں ایک دوسرے سے ملنا
اور باتیں کرنا چاہتے ہیں اور مراد خود اس کا بھی تو کافی خیال رکھتا تھا اس روز جب مراد
نے پرویز کو ڈانٹا اور مارا تھا تو پھر اس کے بعد سے پرویز نے اس کو ستانا چھوڑ دیا تھا۔ "تو کیا
اپنا کا دولہا مراد ہوگا؟ مگر کیسے؟ اماں تو نہیں مانیں گی۔"

"مجھے یہاں دکان کا کام بہت اچھا لگتا ہے۔" اچانک ناصر' مسعود کی آواز سن کر
اپنے خیالات سے چونک پڑا۔ "بھٹے کے اس لعنتی کام سے یہ کام ہزار درجہ زیادہ بہتر ہے
اور میں تو یہ چاہوں گا کہ یہیں کام کرتا رہوں میں نے دکان چلانا سیکھ لیا ہے اور میں اب
کسی بھی دوسری دکان پر کام کر سکتا ہوں لیکن میں تو یہی چاہتا ہوں کہ اس دکان پر کام
کرتا رہوں اس سے زیادہ اچھی جگہ بھلا اور کہاں مل سکے گی؟"

ناصر نے مسعود کی بات سن کر آہستہ سے گردن ہلا دی۔ دراصل وہ مسعود کی بات کو
پوری توجہ کے ساتھ سن نہیں رہا تھا۔ اس وقت اس کا ذہن مراد اور جنت کے ساتھ الجھ
رہا تھا۔ اس نے مسعود کو کبھی بھی مراد کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ مسعود تو شاید مراد
کو جانتا بھی نہیں تھا۔ اس نے مسعود سے اپنے گھر کے بارے میں بہت ساری باتیں کی
تھیں اپنی ماں کے بارے میں' اپنے باپ کے بارے میں' گھر کی مشکلات مسائل اور
دشواریوں کے بارے میں لیکن اس نے مراد اور جنت کے بارے میں مسعود سے کبھی کوئی
بات نہیں کی تھی۔ شاید نیم شعوری طور پر وہ اس معاملے کو ایک قیمتی اور مقدس راز کی
طرح اپنے سینے میں ہی چھپائے رکھنا چاہتا تھا اور اس نے اس راز کو راز ہی رکھا وہ مسعود
کی باتیں غور سے سننے لگا۔

"میں بھی' بس اب کراچی میں ہی رہوں گا۔" مسعود کہہ رہا تھا۔ "وہاں کیا رکھا ہے
زندگی ہے؟ اور ہمارے گھروں میں؟ کیا ہے وہاں؟ کچھ بھی تو نہیں ہے اور

یہاں..... یہاں دیکھو کیا کچھ نہیں ہے اس گھر میں جہاں ہم رہ رہے ہیں اور یہ کتنے اچھے ہیں۔ سب لوگ بہت اچھے ہیں اور آدمی کے پاس اگر کام کرنے کا جو قوت ہو تو وہ اس شہر میں اپنے لئے کوئی نہ کوئی جگہ ضرور بنالیتا ہے۔"

دونوں کو تنخواہ ملی تھی۔ زندگی میں پہلی بار وہ اس طرح سے آزادانہ کمائی کر بنے تھے اور اس کے نتیجے میں ان کے خیالات و تصورات کی رو ایک نئے جو ولولے کے ساتھ بڑی تیزی کے ساتھ آگے کی جانب بھاگ رہی تھی نئی نئی باتیں دل آرہی تھیں اور سرشاری کی ایک کیفیت تھی جس نے ان دونوں کو اپنی گرفت میں رکھا تھا۔

"اچھا تو اب ہم ان پیسوں کو رکھیں گے کہاں؟" ناصر کے ذہن میں پھر سوال ان دونوں کے پاس رہنے کے لئے کوئی علیحدہ کمرہ تو تھا نہیں۔ دونوں باڑے میں ساتھ ہی رہتے تھے ان کے پاس کوئی سامان وغیرہ بھی نہیں تھا جس کے لئے انہیں الماری یا بکس وغیرہ کی ضرورت ہوتی بس چند جوڑے کپڑے تھے' جو باڑے کے حصے میں جہاں وہ دونوں سوتے تھے ایک طرف کھونٹیوں پر ٹنگے رہتے تھے۔ حامد کے ایک الماری تھی جس میں وہ اپنی چیزیں رکھتا تھا اور اس الماری کو وہ ہمیشہ تالہ لگا تھا کیونکہ باڑے میں باہر کے لوگ بھی آتے رہتے تھے اور ناصر نے جب یہ بات سے کہی تو مسعود بھی سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے پیسے ملنے کی خوشی میں یہ تو سوچا ہی کہ وہ ان پیسوں کو رکھیں گے کہاں اور ان کی حفاظت کس طرح کریں گے۔

"میری سمجھ میں ایک بات آتی ہے۔" مسعود نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا ایسا کیوں نہ کریں ہم اپنے اپنے پیسے حنیفہ چاچی کے پاس رکھوا دیں؟ وہ ہمارے پیسے پاس جمع کرتی رہیں گی اور ہماری رقم محفوظ رہے گی۔"

"ہاں....." ناصر نے اس کی بات سے فوراً اتفاق کر لیا۔ "یہ ٹھیک۔ اماں بھی تو اکثر پیسے ماسی خیراں کے پاس رکھوا دیا کرتی تھیں اس روز جب حاجی قریشی سے پہلی بار پانچ ہزار روپے لے کر آئی تھیں تو وہ اس رقم کو ماسی خیراں کے رکھوانا چاہتی تھیں۔ مگر ماسی خیراں کو کہیں جانا تھا اگر اس روز وہ رقم ماسی خیراں ہوتی تو ابا اسے نہ لے جاسکتے اور وہ رقم ضائع نہ ہو پاتی۔"

"اب یہ قسمت کی بات ہے ناصر۔" مسعود نے ایک لمبی اور گہری سانس ہوئے کہا۔ "تم لوگوں کی قسمت میں ہی وہ رقم نہیں تھی۔ اب اس کے بارے



تم زندہ ہو صحت مند ہو کام کرنے کے قابل ہو تو اس سے کہیں زیادہ رقم کما لو گے۔ پانچ ہزار روپے کی وہ موٹی رقم اب تم صرف پانچ ماہ میں کما لو گے۔ انشاء اللہ۔"

"ہاں....." ناصر کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی اس کے وجود میں عزم حوصلے اور سرخوشی کی روشنی پھوٹنے لگی۔ ہاں' وہ کام کرے گا..... وہ پیسے کمائے گا۔ سارے پیسے کمائے گا اور پھر اس کے گھر کے سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ شدت جذبات سے اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

انہوں نے اگلے ہی روز حنیفہ سے بات کی کہ وہ ان کے پیسے اپنے پاس رکھ لے۔

"سارے کے سارے پیسے جمع کرو گے؟" حنیفہ نے کہا۔ "ان میں سے کچھ خرچ نہیں کرو گے؟"

"ہم..... کس چیز میں خرچ کریں گے؟" مسعود نے کہا۔ "ساری چیزیں تو ہمیں ہوئی ہیں۔"

"مگر بہت ساری چیزیں ایسی ہیں جن کی ابھی تم کو ضرورت ہے۔" حنیفہ نے کہا۔ تم دونوں اپنی اپنی تنخواہ میں سے اس مہینے سو سو روپے نکالو اور میں ان چیزوں کی ایک فہرست بناتی ہوں جو تمہیں درکار ہوں گی وہ ساری چیزیں بازار سے خرید لو۔ حامد کو ساتھ لے جانا سو روپے کے اندر اندر ہی آجائیں گی۔ باقی پیسے تم لوگ اپنے پاس چھوٹے موٹے خرچے کے لئے رکھنا۔"

"جیسا آپ کہیں چاچی۔" مسعود نے کہا اور تائید کے لئے ناصر کی طرف دیکھا ناصر نے فوراً گردن ہلا دی۔

"اچھا تو اب ہم ایک فہرست بناتے ہیں کہ تم لوگوں کو کن کن چیزوں کی ضرورت ہے۔" حنیفہ نے کہا اور کاغذ قلم لے کر ان کے ساتھ بیٹھ گئی۔ "ٹوتھ پیسٹ اور ٹوتھ برش۔" اس نے کہا اور لکھنے لگی۔ "سب سے زیادہ ضروری تو یہ چیزیں ہیں۔"

کراچی آنے سے پہلے ان دونوں نے ٹوتھ پیسٹ یا ٹوتھ برش کبھی بھی استعمال نہیں کیا تھا البتہ وہ مسواک بڑی پابندی سے کرتے تھے وہاں لوگوں میں مسواک کرنے کا رواج عام تھا لیکن جب انہوں نے کراچی میں آکر یہاں اس گھر میں رہنا شروع کیا تھا تو انہیں یہاں کوئی بھی شخص صبح کو مسواک کرتا ہوا نظر نہیں آیا تھا۔ حامد نے انہیں دانت صاف کرنے کا ایک پاؤڈر دے دیا تھا جو ایک شیشی میں تھا حامد خود بھی دانتوں کی صفائی کے لئے یہی پاؤڈر استعمال کرتا تھا لیکن گھر کے لوگ ٹوتھ پیسٹ اور ٹوتھ برش ہی استعمال کرتے

تھے۔ حنیفہ نے ان لوگوں کے لئے ضروری اشیاء کی فہرست میں بھی سب سے پہلا
پیسٹ اور ٹوتھ برش لکھا۔

"صابن..... نہانے اور کپڑے دھونے کا۔" حنیفہ نے باآواز بلند کہا اور
لگی۔ مسعود اور ناصر صرف گردن ہلاتے رہے۔ "ایک ایک رومال ایک ایک چھو
ہاتھ پونچھنے کے لئے....." حنیفہ نے اس قسم کی کئی چھوٹی موٹی چیزیں لکھیں اور
لوگوں سے بولی۔ "لکڑی کی ایک چھوٹی الماری گھر میں پڑی ہوئی ہے تم لوگ اس کو
جاؤ اس کا تالہ بھی ٹھیک ہے اسے باڑے میں رکھ لو اور اپنی یہ ساری چیزیں اس میں
کرو۔ چاہو تو اپنے کپڑے بھی تہہ کر کے اس میں رکھ سکتے ہو....."

"بہت بہت مہربانی چاچی۔" مسعود نے کہا۔ "آپ لوگ بہت مہربان ہیں بہت
ہیں آپ لوگ۔"

"میں تو چاہتی ہوں کہ تم دونوں اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھ کر رہو محنت اور
داری کے ساتھ کام کرو اور اپنے چاچا کا زیادہ سے زیادہ بوجھ ہلکا کرو۔"

"ہاں چاچی۔" مسعود نے جلدی سے کہا۔ "ہم خود بھی تو یہی چاہتے ہیں ہم اس
سے کہیں اور نہیں جانا چاہتے۔ یہیں رہ کر کام کرنا چاہتے ہیں۔"

حنیفہ نے لکڑی کی ایک چھوٹی سی پرانی الماری ان دونوں کے حوالے کر
بالکل ٹھیک ٹھاک حالت میں تھی اور اس کا تالہ بھی ٹھیک تھا۔ انہوں نے باہر لا
الماری کو اچھی طرح صاف کر لیا اور اپنے کپڑے جو باہر کھونٹیوں پر ٹنگے ہوئے تھے
کے اس الماری کے اندر رکھ دیئے۔ حنیفہ کا دیا ہوا یہ تحفہ انہیں پسند آیا تھا اور وہ
اس کو دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔

حنیفہ نے ان دونوں کی تنخواہوں میں سے ایک ایک سو روپے نکال کر ناصر کو
دیئے تھے اور اس سے کہا تھا کہ کل دن میں حامد کے ساتھ جا کر ساری چیزیں بازا
لے آئے۔ "تم لوگوں کے باقی پیسے میرے پاس امانت ہیں۔" اس نے کہا۔ "جب
چاہے لے لینا۔"

اگلے دن مسعود تو حسب معمول صبح کو خواجہ صابر علی کے ساتھ ضروری
سامان لے کر دکان چلا گیا اور ناصر باڑے میں رہ کر حامد کے ساتھ کام میں لگا رہا۔ رد
لگے بندھے گاہک دودھ لینے کے لئے آنا شروع ہو گئے تھے اور ناصر ہی ان سے
گزشتہ ایک ماہ کے دوران ناصر تقریباً ان سب کو پہچان گیا تھا اور سب بھی ناصر کو



گئے تھے۔ کئی لوگوں سے تو اس کی اچھی خاصی دوستی بھی ہو گئی تھی۔ دودھ بیچنے کا کام ختم
ہوا تو پھر باڑے کے دوسرے کام شروع ہو گئے۔ کافی دیر کے بعد جب ذرا فرصت ملی تو پھر
ناصر حامد کو ساتھ لے کر بازار گیا جو یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ حنیفہ نے فہرست حامد کو
دے دی تھی اور اسے ان چیزوں کے بارے میں بتا بھی دیا تھا۔ حامد کو ساتھ لے جا کر بازار
سے وہ ساری چیزیں خرید لیں اور کچھ دیر کے بعد دونوں گھر واپس آ گئے۔

ناصر کو آج ایک اور نئی خوشی ملی تھی۔ یہ ان چھوٹی چھوٹی معمولی سی چیزوں کے ملنے
کی خوشی تھی جنہیں حنیفہ کی ہدایت پر خریدا گیا تھا اور اب یہ چیزیں اس کی ملکیت تھیں۔
ٹوتھ برش ٹوتھ پیسٹ' صابن' موزے' رومال اور تولیہ وغیرہ۔ ان میں سے کوئی بھی چیز
ایسی نہیں تھی جو ناصر نے اس سے پہلے کبھی استعمال کی ہو وہ گتے کے ڈبے میں بند معمولی
سے ٹوتھ برش کو دیکھتا تھا اور خوش ہوتا تھا۔ ٹوتھ پیسٹ کے ٹیوب کو دیکھتا تھا اور خوش
ہوتا تھا معمولی درجے کے سستے ٹوائلٹ سوپ کی خوشبو سونگھتا تھا اور مست ہوا جاتا تھا۔
یہ ساری کی ساری چیزیں مل کر زندگی کو کتنا خوبصورت بنا دیتی ہیں۔ "جب میں گھر جاؤں
گا تو یہاں سے بہت ساری چیزیں اماں کے لئے آپا کے لئے اور بچوں کے لئے لے کر
جاؤں گا۔" اس نے ایک سرشاری کے احساس کے ساتھ سوچا۔ "اور..... مراد کے
لئے؟" اچانک اس کے ذہن میں سوال ابھرا۔ "ہاں کیوں نہیں کچھ نہ کچھ تو مراد کے لئے
بھی۔"

اور اب اس کو رات کا بڑی بے چینی کے ساتھ انتظار تھا کہ مسعود گھر واپس آئے تو
وہ اس کو یہ ساری چیزیں دکھائے جنہیں اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ الماری میں رکھ کر
تالا بند کر دیا تھا اور چابی اپنے پاس رکھ لی تھی۔ ٹوتھ برش خریدنے میں حامد نے یہ احتیاط
برتی تھی کہ دو الگ الگ رنگ کے ٹوتھ برش لئے تھے۔ "میں مسعود سے کہوں گا کہ وہ
دونوں میں سے اپنی مرضی کے رنگ کا برش لے لے۔" ناصر نے دل ہی دل میں کہا۔
"دوسرا برش میں لے لوں گا۔"

دونوں چھوٹے تولیے بھی الگ الگ رنگ کے تھے اور ناصر نے تولئے کے انتخاب
کا بھی مسعود کو موقع دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ سو سو روپے تقریباً سارے کے سارے ہی
خرچ ہو گئے تھے۔

☆======☆======☆

مسعود اس وقت دکان پر ایک گاہک کے لئے دہی تول رہا تھا جب ایک آدمی دکان پر

آیا۔ گٹھیلے اور مضبوط بدن کا آدمی تھا اس کے جسم پر چمک دار ریشمی کپڑے کا شل
کرتا شلوار قمیض سوٹ تھا۔

"کیا حال ہے خواجہ صاحب؟" اس نے آتے ہی خواجہ صابر علی سے مخاطب ہو
اپنی بھاری آواز میں بے تکلفانہ انداز میں کہا۔ خواجہ صابر علی اس کو دیکھتے ہی فوراً اس
جانب متوجہ ہو گیا۔

"دعا ہے آپ کی چوہدری صاحب۔" خواجہ صابر علی نے جلدی سے جواب
"اللہ کا بڑا کرم ہے۔ احسان ہے' آیئے' کچھ لسی وغیرہ..... کوئی مٹھائی....."
کے لہجے میں کچھ عاجزی کا سا عنصر شامل معلوم ہوتا تھا۔

"نہیں نہیں خواجہ صاحب۔" اس شخص نے ٹھہرے ہوئے مستحکم لہجے میں
"پھر کبھی سہی۔ ابھی تو میں ذرا جلدی میں ہوں کئی ضروری کام چھوڑ کر آیا ہوں۔"

"اچھا..... بہت اچھا..... جیسی آپ کی مرضی۔"

خواجہ صابر علی نے کہا اور جلدی سے دراز میں سے نوٹ نکال کر گننے لگا اس
کچھ نوٹ گن کر الگ کئے اور پھر خاموشی سے اس شخص کی طرف بڑھا دیئے۔

مسعود اس وقت تک گاہک کو دہی دے کر فارغ ہو چکا تھا اور غور سے یہ منظر
رہا تھا۔ اس شخص نے خواجہ صابر علی کے ہاتھ سے روپے لئے اور گنے بغیر انہیں
میں ڈال لیا۔

"گن تو لیجئے چوہدری صاحب۔" خواجہ صابر علی نے کہا۔

"کیا ضرورت ہے جی۔" اس شخص نے اسی طرح بھاری لب و لہجے میں کہا۔ "
نے تو گن کر ہی دیئے ہوں گے۔"

"جی ہاں میں نے تو گن کر دیئے ہیں لیکن اگر آپ بھی....."

"بس ٹھیک ہے۔" اس شخص نے خواجہ صابر علی کی بات کاٹ دی۔ "اب
ہوں۔" اور وہ خواجہ صابر علی کے جواب کا انتظار کئے بغیر وہاں سے چلا گیا۔ اس کے
ہی خواجہ صابر علی کی آنکھوں کا رنگ جیسے بدل گیا ان کی جھکی ہوئی آنکھیں تن گئیں
ان میں سے جیسے آگ نکلنے لگی عاجزی اور مسکینی کا جو تاثر چند لمحے پہلے ان کی آنکھو
میں تھا وہ ایک دم غائب ہو گیا تھا۔

لوگ دکان میں آتے تھے تو پیسے دے کر جاتے تھے۔ سامان خریدتے تھے اور
دیتے تھے لیکن یہ کون آدمی تھا جو دکان پر آکر یہاں سے پیسے لے گیا تھا؟ اور چاچا ا



اور مٹھائی کی پیش کش بھی کر رہے تھے؟ مسعود سے ضبط نہیں ہو سکا۔ "چاچا یہ کون
ی تھا؟" اس نے پوچھا۔

"یہ پولیس والا تھا بیٹا۔" خواجہ صابر علی نے تلخ اور زہریلے لہجے میں جواب دیا۔
لیس والا۔ علاقے کے تھانے سے آیا تھا پیسے لینے کے لئے۔"

"علاقے کے تھانے سے؟" مسعود نے تعجب سے پوچھا۔ "مگر..... کس بات کے
؟ وہاں کوئی سامان تو نہیں گیا تھا۔"

"مہینے کے پیسے۔" خواجہ صابر علی نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔
تہ..... مہینے کا بھتہ..... یہ ہر مہینے بھتہ لینے آتا ہے اور ہمیں دینا پڑتا ہے۔
س والے سارے ہی دکان والوں سے بھتہ لیتے ہیں۔"

مسعود کے لئے یہ لفظ نیا نہیں تھا وہ اس کے مفہوم سے بھی کسی قدر واقف تھا۔
ہ وہ ہوتا ہے جو غنڈے اور بدمعاش وصول کرتے ہیں اور شاید پولیس والے
.....

"اور..... اور..... اگر آپ یہ بھتہ دینے سے انکار کر دیں تو؟"

"تو؟" خواجہ صابر علی نے بڑے زہریلے انداز میں کہا۔ "تو میں اس علاقے میں
نہیں چلا سکوں گا مجھے یہاں اپنا کاروبار ختم کر دینا ہو گا یہی پولیس والے یہی تھانے
لے میری دکان کے تالے تڑوائیں گے یہاں چوری کروائیں گے میرے خلاف کوئی
ا مقدمہ بنا کر مجھے حوالات میں بند کر دیں گے میں ان کو باقاعدگی کے ساتھ بھتہ نہیں
ں گا تو میں اس پورے علاقے میں کبھی بھی کاروبار نہیں کر سکوں گا۔"

"مفت کے پیسے۔" مسعود نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

"کل پہلی تاریخ تھی۔" خواجہ صابر علی نے کہا۔ "یوں سمجھ لو کہ مہینہ شروع ہوا
اور اب اس کے ساتھ ہی بھتہ خوروں کی آمد بھی شروع ہو گئی ہے ابھی تو تم دیکھتے
"

"کیا مطلب؟" مسعود نے چونک کر کہا۔ "کیا ابھی اور لوگ بھی آئیں گے؟ کوئی
بھی آئے گا؟"

"ہاں بیٹا....." خواجہ صابر علی نے کہا۔ "ابھی انکم ٹیکس والے آئیں گے۔
بجلی والے آئیں گے بلدیہ والے آئیں گے سرکاری پارٹی کے لوگ آئیں گے مخالف
ٹی کے لوگ آئیں گے....."

"ارے؟" حیرت کے مارے مسعود کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "یہ اتنے سا
لوگ؟ اور یہ سب کے سب آپ سے پیسے لے کر جائیں گے۔ مگر..... کیوں؟
بات کے پیسے؟"

خواجہ صابر علی اس کو سرکاری و نیم سرکاری محکموں اور حکمراں و مخالف
پارٹیوں کی جانب سے بھتے کی وصولی کے اسباب کے بارے میں بتانے لگا۔ ہر ایک کے
اپنا الگ الگ جواز موجود تھا۔

"ان سب کو ہماری کمائی سے اپنا حرام کا حصہ چاہئے۔" صابر علی نے وضاحت
کے بعد کہا۔ "اگر ان کو ان کا حصہ نہیں ملے گا تو یہ ہماری زندگی دوبھر کر دیں
پولیس والے سرکاری اور نیم سرکاری محکمے سیاسی پارٹیاں غنڈے بدمعاش سب ہی کو
اور راضی رکھنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر دو پیسے کما پاتے ہیں۔ کاروبار میں اگر ان سب
سے کسی کو بھی ناخوش کر دو تو وہ اپنے طریقے سے اتنا زیادہ پریشان کرے گا کہ کاروبا
ہی ناممکن ہو جائے گا پھر آدمی کیا کرے؟ بال بچوں کا پیٹ کہاں سے پالے؟ بال بچ
پیٹ پالنے سے پہلے تو ان لوگوں کے پیٹ کے دوزخ میں ایندھن جھونکنا ہوتا ہے او
ایسا دوزخ ہے جو ہمیشہ جلتا اور بھڑکتا بھی رہتا ہے اس کی منحوس گرمی میں کبھی کمی
آتی۔ کوئی حکومت آئے کوئی حکومت جائے' کوئی سیاسی پارٹی جیتے کوئی سیاسی پارٹی ہا
اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ بھتہ لینے والے تو اسی طرح مضبوطی سے اپنی جگہ پر
رہتے ہیں۔"

مسعود کے لئے یہ بڑی حیران کن بات تھی۔ اسے حکومت سے' سیاست سے
پارٹیوں وغیرہ سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اس کے گھر میں سیاست پر کوئی گ
نہیں ہوتی تھی۔ کاروبار اور سیاست کا' سیاست اور حکومت کا' حکومت اور بھتہ خور
آپس میں کیا تعلق تھا' اس کے بارے میں اسے کچھ نہیں معلوم تھا۔ آج خواجہ صابر
سے تھوڑی سی باتیں سن کر اسے یوں معلوم ہوا کہ یہ تو ایک پوری دنیا ہی الگ تھی
کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔

اسی دن پولیس والے کے جانے کے کافی دیر بعد ایک اور آدمی آیا اور وہ بھی خو
صابر علی سے کچھ رقم لے کر چلا گیا۔ صابر علی نے مسعود کو بتایا کہ وہ انکم ٹیکس کا آدمی تھ
مسعود نے آج سے پہلے کبھی انکم ٹیکس' ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن اور شاپ انسپکٹر وغیرہ
الفاظ نہیں سنے تھے اور نہ وہ ان چیزوں کے بارے میں کچھ جانتا تھا آج ہی اس کو یہ



معلوم ہوا تھا۔

اس کے بعد دکان بند ہونے کے وقت تک کوئی اور نہیں آیا۔ روانگی سے پہلے
مسعود نے خواجہ صابر علی سے اس کے بارے میں پوچھا۔

"آئیں گے' سب آئیں گے۔" خواجہ صابر علی نے جواب دیا۔ "مہینے کے پہلے ہفتے
کے اندر اندر سب ہی آجاتے ہیں۔ کل تین تاریخ ہو گی۔ بلدیہ کا آدمی تو کل ضرور آئے
گا۔ وہ تین تاریخ سے زیادہ دیر کبھی نہیں کرتا۔ اس کے علاوہ دوسرے لوگ بھی آئیں
گے۔ تم دیکھتے رہنا۔ کاروبار کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے بیٹا۔ اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ
ایمان داری کے ساتھ کاروبار کر لے تو ممکن نہیں ہے۔ ہر طرف گوشت نوچنے والے
بھیڑیے موجود ہیں۔"

اس رات کو مسعود نے اپنے آج کے انوکھے اور منفرد تجربے میں ناصر کو بھی شریک
کیا اور اسے بھتے اور بھتہ خوروں کے بارے میں وہ سب کچھ بتایا جو اسے خواجہ صابر علی
سے معلوم ہوا تھا۔

"چاچا کہہ رہے تھے کہ سارے ہی کاروبار کرنے والوں کو بھتہ دینا پڑتا ہے اور
بھتہ دیئے بغیر کاروبار کر ہی نہیں سکتے۔" مسعود نے اپنی بات کے آخر میں ناصر سے کہا۔
"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ حاجی مدد علی قریشی کو بھی بھتہ دینا پڑتا ہو گا اس سے بھی بھتہ
وصول کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی آتا ہو گا۔"

"ہاں' شاید آتا ہو' اور جو کوئی بھی آتا ہو گا حاجی کے پاس دفتر میں ہی آتا ہو گا۔ ہم
لوگوں کو اس کے بارے میں کیا معلوم ہو سکتا ہے؟" ناصر نے جواب دیا۔ "خدا جانے دفتر
میں کون کون آتا ہو گا۔"

"چاچا کہہ رہے تھے کہ کل بلدیہ کا آدمی بھی آئے گا۔" مسعود نے کہا۔ "اور شاید
کچھ اور لوگ بھی۔"

"بلدیہ کراچی کا آدمی؟" اچانک ناصر کے دماغ میں ایک خیال بجلی کی طرح کوند گیا۔
"ہاں' بلدیہ کراچی کا آدمی؟" مسعود نے جواب دیا۔ "اور شاید کچھ دوسرے لوگ
بھی۔"

"ارے تو ایک کام کرنا۔" ناصر نے جلدی سے کہا۔ "صابر چاچا سے کہو کہ جب
بلدیہ کراچی کا آدمی بھتہ لینے کے لئے آئے تو وہ اس سے تمہارے ماموں کے بارے میں
پوچھ سکتا ہے وہ ان کو جانتا ہو۔"

"ارے ہاں۔" مسعود نے بہت خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "یہ تو تم نے بہت اچھی بات کہی ہے۔ میں کل صبح ہی صابر چاچا سے کہہ دوں گا وہ اس آدمی سے بات تو کرکے دیکھیں شاید اسے کچھ علم ہو۔"

"اگر تمہارے ماموں کا پتہ چل جائے تو مزا ہی آجائے۔" ناصر نے کہا۔ "بہت ہی اچھا ہو۔"

"یوسف ماما مل جائیں تو بہت اچھی بات ہے۔" مسعود نے کہا۔ "لیکن..... میں تم کو ایک بات بتاؤں ناصر میں نے گزشتہ ایک ماہ کے دوران اس بات کا اچھی طرح سے اندازہ لگالیا ہے کہ ہم لوگ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکتے ہیں کیونکہ ہم کام کر سکتے ہیں اور کام کرنا چاہتے ہیں اور کام تو ہمیں ملا ہی ہوا ہے اور کہیں اور بھی مل سکتا ہے۔ اس لئے ہم اب کسی کے سہارے کے اس طرح محتاج نہیں ہیں جس طرح پہلے تھے میں تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں۔" اس کی آواز ایک دم ہلکی ہوگئی۔ "میں نے صابر چاچا کو اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا اس علاقے میں آگے جاکر مٹھائی کی ایک بڑی سی دکان ہے وہ صرف مٹھائی کی دکان ہے۔ آج جب صابر چاچا کسی کام سے دکان سے باہر گئے ہوئے تھے تو اس دکان کے مالک کا بھائی میرے پاس آیا تھا اور مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میں اس کی دکان پر آکر کام کروں کیونکہ اس کو ایک لڑکے کی ضرورت ہے اور جو لڑکا اس کے پاس پہلے کام کرتا تھا' وہ کام چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ میں نے اسے منع کر دیا لیکن میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم کو کسی دوسری جگہ بھی کام مل سکتا ہے تو پھر ہم کسی کے کندھوں پر بار نہیں بنیں گے کسی کے محتاج نہیں رہیں گے۔"

"ہاں۔" ناصر نے فوراً جواب دیا۔ "ہم کیوں کسی کے محتاج رہیں؟ ہم خود اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکتے ہیں۔"

معاشی جدوجہد میں آزادانہ شمولیت نے ان دونوں بچوں کے دلوں کو زبردست خود اعتمادی بخشی تھی اور ان کی شخصیتوں میں ایک نکھار پیدا کر دیا تھا۔ وہ زندگی کے ہر چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھے۔

"یوسف ماما اگر مل جائیں تو بہت ہی اچھا ہو گا۔" مسعود نے کہا۔ "لیکن اب ہم ان کے گھر جاکر رہیں گے نہیں ہم جہاں رہ رہے ہیں وہیں ٹھیک ہیں۔" ناصر کو بھی اس کے خیال سے پوری طرح اتفاق تھا۔

جو چیزیں ناصر دن کے وقت حامد کے ساتھ باہر جاکر لایا تھا اور جنہیں اس نے بڑی



ی احتیاط کے ساتھ الماری میں بند کر کے رکھ دیا تھا' وہ اس نے مسعود کے گھر آتے ہی بڑے ذوق و شوق اور اضطراب و ہیجان کے عالم میں اس کو دکھا دی تھیں اور وہ دونوں بہت زیادہ خوش ہو کر ان کے بارے میں دیر تک باتیں کرتے رہے تھے ان کو دیکھتے رہے تھے یہ سب کچھ ان کے لئے بالکل نیا اور بہت سرور انگیز تھا۔

"تھوڑے بہت پیسے اگر خرچ بھی ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔" مسعود نے ناصر سے کہا۔ "اب آخر ہم یہاں اتنے بڑے شہر میں رہ رہے ہیں یہاں کی زندگی ہمارے گھر کی زندگی سے کتنی مختلف ہے یہاں آدمی کو کتنی بہت سی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے اور حنیفہ چاچی نے جو بھی چیزیں منگوائی ہیں وہ صرف ہمارے ہی استعمال کے لئے تو ہیں ان سے صرف ہمیں کو فائدہ پہنچے گا۔"

"ہاں۔" ناصر نے کہا۔ "اور یہ سب بڑی اچھی اور ضروری چیزیں ہیں ہم نے پہلے تو کبھی ان کو استعمال نہیں کیا لیکن اب تو یہ بہت اچھی لگتی ہیں۔ اچھی بھی اور ضروری بھی۔" وہ خوش دلی کے ساتھ ہنسا۔

اگلے دن صبح کو دکان میں مسعود نے خواجہ صابر علی سے اپنے ماموں یوسف علی خان کے بارے میں ایک بار پھر بات کی اور ان سے کہا کہ وہ بلدیہ کے اس آدمی سے جو بھتہ لینے کے لئے آتا ہے اس کے ماموں کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کرے۔

"اچھا ہاں۔" خواجہ صابر علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تمہارے ماموں یوسف علی خان جن کے بارے میں تم نے بتایا تھا کہ وہ بلدیہ کراچی میں کام کرتے ہیں۔ ہاں۔ ٹھیک میں اس آدمی سے کہہ دوں گا لیکن اس وقت بھی میں نے تم کو بتایا تھا کہ اس طرح سے ان کو تلاش کرنا ناممکن ہے اور اب کراچی میں تقریباً ایک ماہ کا عرصہ گزارنے کے بعد تم خود بھی اس بات کو اچھی طرح سے سمجھ گئے ہو گے کہ یہاں بغیر مکمل پتے کے کسی شخص کو تلاش ہی نہیں کیا جا سکتا۔ تم کو ان کے بارے میں اس کے سوا اور کچھ نہیں معلوم کہ وہ بلدیہ کراچی میں کام کرتے ہیں اور ناظم آباد میں رہتے ہیں۔"

"اور ان کے پاس موٹر سائیکل ہے۔" مسعود نے جلدی سے کہا۔ "اور ان کا اپنا ذاتی مکان ہے۔ میں ان کے بارے میں بس اتنا ہی جانتا ہوں لیکن صرف اتنی معلومات کی بنا پر انہیں قیامت تک نہیں تلاش کیا جا سکتا۔ میں اس بات کو اچھی طرح سے سمجھ گیا ہوں۔ مگر وہ بلدیہ والا آدمی۔ وہ تو کام ہی بلدیہ کے دفتر میں کرتا ہے شاید وہ ان کے بارے میں کچھ جانتا ہو۔"

"میں اس سے پوچھ لوں گا۔" صابر علی نے کہا۔ "لیکن بہت مشکل ہے۔ کراچی کا کوئی صرف ایک دفتر نہیں ہے اس کے بہت سارے دفاتر ہیں جو شہر بھر میں ہوئے ہیں۔ دو چار سو نہیں ہزاروں آدمی بلدیہ کراچی کے دفاتر میں کام کرتے ہیں۔ طرح کیسے کسی کو تلاش کیا جا سکتا ہے؟"

بلدیہ کراچی کا آدمی بھتہ لینے کے لئے اس روز آن پہنچا اور صابر علی نے کے سامنے ہی اس سے یوسف علی خان کے بارے میں بات کی۔ وہ ہنسنے لگا۔ "کمال ہیں خواجہ صاحب۔" اس نے کہا۔ "کے ایم سی میں تو نہ جانے کتنے بہت سے یوسف خان موجود ہوں گے۔ نہ ڈپارٹمنٹ کا پتہ ہے نہ عہدہ معلوم ہے' نہ کوئی اور حوالہ تو صورت میں بھلا کس طرح تلاش کیا جا سکتا ہے؟ یہ ممکن نہیں ہے۔"

"میرے کہنے کا مقصد یہ ہے' کہ آپ اس نام کو ذہن میں رکھئے۔" خواجہ صابر نے اس سے کہا۔ "اگر کبھی بھی کسی وقت بھی آپ کو اس نام کے کسی آدمی کے بارے میں علم ہو جائے تو پھر بتایئے گا۔ بس یاد رکھئے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" اس شخص نے کہا۔ "یاد رکھوں گا۔"

اگلے چند روز کے اندر طرح طرح کے بھتہ خور دکان پر آتے رہے اور بھتہ کر جاتے رہے۔ مسعود اس سارے تماشے کو حیرت تجسس اور اضطراب کے ساتھ رہا۔

☆======☆======☆

وقت کے دریا کا بہاؤ اپنی پوری تیزی و تندی کے ساتھ جاری رہا۔ مسعود اور ناصر کراچی میں رہتے اور خواجہ صابر علی کے ملازموں کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے ایک سال گزر گیا۔ اس ایک سال کے عرصے میں ان دونوں کا اپنے گھر والوں سے رابطہ نہیں ہوا' مگر دونوں اپنی اپنی جگہ پر مطمئن تھے کہ ان کے گھر والے ان کی خیریت سے آگاہ ہیں۔ اس ایک سال کے عرصے کے دوران ان دونوں کے پاس دس دس ہزار روپے سے کچھ زیادہ رقم جمع ہو چکی تھی گویا ناصر کے پاس اس کے اپنے حساب سے قرض کی پوری رقم موجود تھی اور وہ کسی وقت بھی گھر جا سکتا تھا لیکن مسعود کے پاس اس کی پوری رقم جمع نہیں ہوئی تھی اسے پورے پندرہ ہزار روپے چاہئیں تھے۔ چنانچہ انہوں نے طے کیا تھا کہ وہ دونوں ایک ساتھ اس وقت اپنے گھر جائیں گے جب دونوں ہی کے پاس قرض کی ادائیگی کے لئے مطلوبہ رقم موجود ہو گی۔



مسعود کے ماموں یوسف علی خان کا کوئی پتہ نہیں چل سکا تھا۔ بلدیہ کے آدمی نے سلسلے میں معذرت کر لی تھی اور پھر وہ آدمی چلا گیا تھا۔ اس کی جگہ ایک دوسرا آدمی آیا تھا۔ اس سے خود مسعود نے بات کی تھی جو اب بالغ لوگوں کا سا طرز عمل اختیار کر گیا تھا یہ دوسرا آدمی بھی اس سلسلے میں کوئی مدد نہ کر سکا۔ گزرنے والے دن کا اہل بن چکا تھا مسعود اور ناصر کی زندگی میں بڑی دور رس تبدیلیاں نمودار ہو گئی تھیں وہ دونوں اب کراچی کی زندگی کا ایک حصہ بن چکے تھے جو ہزارہا گوناگوں رنگوں کا مرقع تھی۔ وہ مکمل روانی اور عمدگی کے ساتھ اردو بولتے تھے۔ حنیفہ نے انہیں اچھا لکھنا پڑھنا بھی سکھا دیا تھا۔ خواجہ صابر علی کے گھر میں وہ اطمینان بخش طریقے سے رہ رہے تھے۔ ناصر نے اس دوران ہر طرح کی مٹھائیاں بنانی سیکھ لی تھیں اور وہ اچھا خاصا کاریگر بن گیا تھا۔ اب وہ زیادہ تر مٹھائیاں کسی کی سرپرستی اور ہدایت کے بغیر ہی بنا لیا کرتا تھا۔ مسعود دکان داری کے کام میں خوب ماہر ہو گیا تھا اور خواجہ صابر علی اکثر پورے پورے دن کے لئے ساری دکان اس پر چھوڑ کر دوسرے ضروری کاموں کے لئے چلا جاتا تھا اور اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا تھا اس کو دکان کے لئے ایک ایسا ملازم ملا ہوا ہے جس پر روپے پیسے کے معاملے میں وہ مکمل اعتماد کر سکتا ہے۔

ناصر کو گھر بہت یاد آتا تھا۔ اماں یاد آتی تھیں۔ آپا یاد آتی تھیں چھوٹی بہنیں یاد آتی تھیں اور مراد بھی یاد آتا تھا۔ وہ اب بہت بے چینی کے ساتھ اس وقت کا انتظار کر رہا تھا جب مسعود کے پاس بھی پوری رقم جمع ہو جائے اور وہ دونوں ایک ساتھ اپنے گھر جا سکیں۔

وہ دونوں خواجہ صابر علی کے خاندان میں شامل ہو کر ایک مطمئن زندگی گزار رہے تھے کہ ایک دن اچانک اس خاندان کی جمی جمائی اور پُرسکون زندگی میں ایک بڑی خوفناک قسم کی ہلچل پیدا ہو گئی جس نے اس سارے سکون اور اطمینان کو غارت کر کے رکھ دیا۔

ایک روز یکایک خواجہ صابر علی کو بلدیہ کراچی کی جانب سے یہ نوٹس موصول ہوا کہ وہ ایک ماہ کے اندر اندر اس زمین کو خالی کر دے جس پر اس نے اپنا باڑہ اور مکان تعمیر کیا ہوا تھا کیونکہ یہ زمین بلدیہ کراچی کی ملکیت تھی اور خواجہ صابر علی نے اس پلاٹ پر ناجائز قبضہ کیا ہوا تھا۔ اس نوٹس کو ملتے ہی خواجہ صابر علی سخت بدحواس ہو گیا۔

☆======☆======☆

ناصر کے فرار سے اس کے گھر پر جو قیامت ٹوٹ پڑی تھی اس کا مقابلہ کرنا زمین

کے لئے کوئی آسان کام نہیں تھا۔ وہ اپنی بدنصیبی کا ماتم کرتے کرتے نہ تھکتی تھی۔

اچھی خاصی زندگی تھی جب گامو ٹھیک ٹھاک تھا اور کام کرتا تھا۔ بچے بھی کم
گزارہ ہو جاتا تھا۔ غریبی میں بھی خوش رہنے کے کچھ نہ کچھ بہانے موجود تھے آگے
اندھیرا نہیں معلوم ہوتا تھا لیکن پھر یکایک نہ جانے کہاں سے گامو کو ہیروئن جیسے ظالم
قاتل نشے کی لت پڑ گئی جس نے اس کو پوری طرح چاٹ کر جسمانی طور پر بے جان کر
کے ساتھ ساتھ ذہنی اور اخلاقی طور پر بھی دیوالیہ کر دیا اور وہ اپنی زندگی کے ساتھ
اپنے بیوی بچوں کی زندگی کا بھی دشمن بن گیا اور ایک دن آخری چرکہ لگا کر آخری
لیوا صدمہ دے کر ان سب لوگوں کی دنیا سے ہمیشہ کے لئے نکل گیا۔

شوہر کی اس ذلت آمیز المناک اور قزاقانہ حرکت کے بعد بھی زمین کی ہمت
چت نہیں ہوئی تھی۔ اس کے توشے میں ابھی بہت کچھ باقی تھا۔ وہ خود تو تھی ہی اس
بھی تھا۔ چھوٹا سہی مگر مرد بچہ تھا ہاتھ پیر سلامت تھے کھا کما سکتا تھا اور گھر والوں کو بھی
سکتا تھا۔ وہ خود کام کرتی تھی۔ ناصر کام کرتا تھا اور ان دونوں کی دن بھر کی مشقت کے
میں گھر کا چولہا روشن ہوتا تھا بچوں کے پیٹ کو روٹی کا ٹکڑا نصیب ہوتا تھا اور اس
علاوہ جنت کی شادی کی تیاریوں میں بھی تھوڑی بہت مدد مل جاتی تھی۔ شوہر کے بے
ہونے کے بعد سے زمین جو کچھ کما کر لاتی تھی وہ تقریباً سارے کا سارا گھر میں ہی خرچ
جاتا تھا اور اتنا بچ ہی نہیں پاتا تھا لیکن ناصر کی نوکری کے بعد سے حالات قدرے بہتر
گئے تھے کچھ نہ کچھ بچت ہو جاتی تھی جو جنت کی شادی کی تیاریوں کے کھاتے میں ڈال
جاتا تھا اور یہ تو ایک ہی کھاتہ تھا ابھی تو تین کھاتے اور کھلنے باقی تھے مگر زمین کے دل
حوصلہ پیدا ہو چکا تھا۔ "بیٹا کام کر رہا ہے کماؤ ہے۔ کچھ نہ کچھ ہو گا اللہ بہنوں کے
سے بھائی کی کمائی میں برکت دے گا اپنے حبیب کے صدقے ان سب کی نیا پار لگائے گا
ان کے گھروں کو آباد کرائے گا۔" وہ بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ سوچتی۔

لیکن تقدیر نے ایک بار پھر اس کو ایک ایسا زور دار دھچکا دیا کہ وہ زندگی کی سنگلاخ
شاہراہ پر چاروں شانے چت گر پڑی اور اس افتاد کے نتیجے میں اس کے جسم کا گوشت
جگہ سے ادھڑ گیا ہڈیاں چٹخ کر ٹوٹ گئیں وہ لہولہان ہو گئی۔

لیکن پھر اچانک ہی ناصر لاپتہ ہو گیا اور اس انکشاف نے کہ وہ اپنی مرضی سے بھاگ
گیا ہے زمین کے وجود کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس انکشاف کا مطلب تھا
ناامیدی اور مایوسی۔ وہ یہاں سے بیزار ہو کر اپنی ماں اور بہنوں کو زندگی کا عذاب



بھیجنے کے لئے چھوڑ کر چلا گیا تھا اور اب اس کو بھلا واپس آنے کی کیا جلدی تھی یا کیا
ضرورت تھی! یہ اس کا اولین تاثر تھا۔

زمین کے لئے زندگی کی آنے والی ساعتیں خوف' بے یقینی اور دردناک عذاب
بنا لپٹی ہوئی تھیں۔ جب اس کا شوہر پیسے لے کر بھاگا تھا تو وہ اس درجہ مایوس نہیں ہوئی
تھی۔ ایک سہارا اس کے پاس موجود تھا۔ کم از کم یہ اطمینان تھا کہ ایک بیٹا ہے جو سب کو
سہارا دے سکے گا لیکن آج یہ سہارا بھی چھن گیا تھا اور وہ زندگی کے سائیں سائیں کرتے
ہوئے بیاباں میں اپنے آپ کو بالکل تنہا اور بے سہارا محسوس کر رہی تھی۔ اس کے
چاروں طرف مایوسی کی دھند میں لپٹے ہوئے بے مہر سناٹوں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

وہ مراد کے ساتھ مسعود کے گھر گئی اور مسعود کی سوتیلی ماں فریدہ اور مسعود کے
باپ امتیاز سے ملی۔ وہ دونوں سخت برہم' پریشان افسردہ اور غضب ناک ہو رہے تھے۔

"ہمیں تو برباد کر ڈالا اس منحوس نے۔" فریدہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "غضب
خدا کا' پندرہ ہزار روپے کی چوٹ دے کر چلا گیا۔ اب ہم حاجی کو یہ رقم کہاں سے ادا
کریں گے؟"

"اور حاجی ان لوگوں میں سے نہیں ہے جو کسی کے ساتھ کوئی رعایت کر دیں۔"
امتیاز نے قرض کے بوجھ تلے جیسے کراہتے ہوئے کہا۔ "میں اور فریدہ اس کے پاس گئے
تھے بات کرنے کے لئے مگر وہ تو کوئی بات سننے کے لئے تیار ہی نہیں ہے۔ اس کا تو بس
ایک ہی مطالبہ ہے یا تو لڑکے کو کام پر واپس لاؤ ورنہ قرضے کی رقم واپس کرو اور قرضے کی
رقم بھی پندرہ ہزار روپے سے بڑھ کر نہ جانے کتنی زیادہ ہو چکی ہے۔"

"ہم سے بھی وہ یہی کہہ رہا ہے۔" زمین نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "میری سمجھ میں
کچھ نہیں آ رہا ہے کہ میں کیا کروں کس کے پاس جاؤں کس سے فریاد کروں۔"

"فریاد کس سے کریں گے جی؟" فریدہ نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "لڑکوں کو
کوئی زبردستی پکڑ کر نہیں لے گیا ہے۔ وہ تو اپنی مرضی سے خود بھاگے ہیں۔ اس کے لئے
ہم کس سے فریاد کر سکتے ہیں؟"

"خدا جانے وہ کہاں گئے ہوں گے۔" زمین نے کہا۔ "ہمارا تو کسی دوسرے شہر میں
کوئی عزیز رشتے دار بھی نہیں ہے جس کے پاس وہ گیا ہو۔ آپ لوگوں کے کوئی عزیز شہر
سے باہر ہیں؟"

"میرے کچھ عزیز لاہور میں اور کچھ گوجرانوالہ میں ہیں۔" امتیاز نے کہا۔ "میں نے

ان سے ٹیلی فون پر رابطے کئے ہیں۔ مسعود ان میں کسی کے پاس نہیں پہنچا ہے اور
وقت بھی وہ ان میں سے کسی کے پاس پہنچے گا وہ لوگ مجھے اس کی اطلاع دے دیں
میں جس ہوٹل میں کام کرتا ہوں وہاں کا فون نمبر میں نے لکھوا دیا ہے۔"

"لیکن وہ وہاں جائے گا نہیں۔" فریدہ نے کہا۔ "اسے اچھی طرح معلوم ہے
وہ وہاں جائے گا تو اس کے بارے میں ہم لوگوں کو علم ہو جائے گا۔"

"آپ لوگوں نے پولیس میں رپورٹ لکھوائی ہو گی؟" زمین نے پوچھا۔
پولیس والے ان دونوں کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔"

"پولیس والے؟" امتیاز نے بیزاری سے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "وہ کیا کریں
بھلا؟ وہ تو سارا دن مال بنانے کے دھندے میں لگے رہتے ہیں۔ اس کیس میں ان
لئے مال بنانے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے تو وہ اس میں کیوں دلچسپی لیں گے بھلا؟"

"سنا ہے بھٹے میں فخرو بچوں پر بہت ظلم کرتا ہے۔" مراد نے اس سارے
گفتگو میں پہلی بار حصہ لیتے ہوئے کہا۔

"ارے کوئی حلال تو نہیں کر ڈالتا بچوں کو۔" فریدہ نے فوراً تڑخ کر کہا۔ "آخر
بھی بہت سارے بچے ہیں جو بھٹے میں کام کرتے ہیں۔ فخرو کو کیا صرف انہی دونوں
دشمنی تھی اصل بات یہ ہے کہ دونوں کام نہیں کرنا چاہتے تھے۔ کام سے بھاگتے
دونوں اور اس لئے وہ گھروں سے پیسے لے کر بھاگ گئے اور ہماری گردنیں پھنسا
اب اس قرضے کی رقم کو کہاں سے ادا کریں گے؟"

مراد خاموش ہو گیا اور اس کے بعد اس نے کوئی بات نہیں کی۔ سارا وقت خا
بیٹھا رہا۔ زمین ہی ان دونوں میاں بیوی سے اس معاملے کے بارے میں باتیں کرتی
وہ یہ جاننا چاہتی تھی کہ آیا ان لوگوں کو اس بارے میں کوئی اندازہ تھا۔ وہ دونوں کہاں
ہوں گے لیکن انہیں اس بارے میں کوئی اندازہ نہیں تھا اور اگر اندازہ ہوتا بھی تو
زمین کیا کر سکتی تھی۔ اس کا کون بیٹھا تھا جو کسی دوسری جگہ جا کر اس کے بیٹے کو تلا
کر کے لاتا؟

وہ کچھ دیر تک ان لوگوں کے گھر رہی اور اس کے بعد یہ کہہ کر ان سے رخ
ہوئی کہ انہیں اگر کبھی ان دونوں کے بارے میں کوئی اطلاع ملے تو اس کو ضرور بتا دیں

"میں خود آپ کے پاس آ کر آپ کو بتا دوں گا۔" مراد نے جلدی سے کہا اور زمین
نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ تو دل سے مراد کو ناپسند کرتی تھی اور اس با



قطعی روادار نہیں تھی کہ وہ اس کے گھر آئے لیکن مجبوری تھی۔ مصیبت اور ابتلا کی
ساعت میں بس دو ہی افراد تو اس کے مونس و غم گسار تھے۔ ایک تو ماسی خیراں اور
سرا مراد۔ تاہم زمین کے دل میں مراد کے لئے کوئی نرم گوشہ نہیں پیدا ہوا تھا۔ جو کچھ
ہو رہا تھا مجبوری کی حالت میں ہو رہا تھا۔

"میں ان لوگوں سے ملتا رہوں گا چاچی۔" ان کے گھر سے نکلنے کے بعد مراد نے
بار پھر اپنی بات دہرائی۔

"اور اگر مجھے کوئی بھی نئی بات معلوم ہو گئی تو میں آپ کو ضرور بتاؤں گا۔ ویسے اتنی
تو یقینی ہے کہ وہ دونوں پہلے سے خوب اچھی طرح سوچ سمجھ کر اور منصوبہ بنا کر یہاں
گئے ہیں ان کے ذہن میں پہلے سے سب کچھ موجود ہو گا۔ وہ یوں ہی اچانک نہیں چل
ے ہیں۔"

"ہاں بیٹا۔" زمین نے درد میں ڈوبی ہوئی ایک گہری اور لمبی سانس بھرتے ہوئے
"کہیں بھی گئے، ہمیں تو برباد کر گئے۔ ہم تو لٹ گئے تباہ ہو گئے۔ اب ہم یہ دس ہزار
پے کس کے گھر سے لا کر حاجی کے سر پر ماریں گے؟ اور وہ تو کہتا ہے کہ بارہ ہزار روپے
ینے ہوں گے۔"

مراد کو اپنے باپ کی بات بڑی شدت کے ساتھ یاد آئی لیکن اس نے زبان سے کچھ
ں کہا۔ وہ زمین کے دکھے ہوئے دل کو اور زیادہ نہیں دکھانا چاہتا تھا وہ اس کے زخموں
نمک نہیں چھڑکنا چاہتا تھا۔

"میں..... اور بھی لوگوں سے معلوم کروں گا۔" زمین کے ساتھ ساتھ چلتے
ئے اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "شاید کوئی ایسا شخص مل جائے جس نے ان
نوں کو کہیں دیکھا ہو، ایک ساتھ جاتے ہوئے۔ اب تک تو میں بس اتنا ہی معلوم کر سکا
ں کہ ان دونوں کو ایک ساتھ بسوں کے اڈے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ وہاں
سے وہ بس میں بیٹھ کر ریلوے اسٹیشن بھی جا سکتے ہیں اور کہیں اور بھی۔"

"میں پولیس والوں سے بھی معلوم کرتی رہوں گی۔" زمین نے کہا۔ "شاید.....
مرا ان کے دل میں نیکی ڈال دے اور وہ میرے بچے کو تلاش کر دیں۔"

مراد، زمین کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا کچھ دور تک آیا اور پھر اپنے گھر کی طرف چلا
کیونکہ اسے زمین کے ساتھ اس کے گھر تک جانے کی ضرورت نہیں تھی اور فی الحال کوئی
بات بھی نہیں تھی جو اسے زمین سے کرنی ہو۔

مراد کو اس صورتِ حال پر بہت دکھ تھا۔ اسے یہ دکھ صرف اس وجہ سے نہیں
کہ یہ جنت کا دکھ تھا جو اس کو اتنی اچھی لگتی تھی کہ وہ ہر وقت اس کو اپنے ساتھ
چاہتا تھا۔ بلکہ یہ دکھ اسے اس لئے بھی تھا کہ زمین جیسی غریب' بے آسرا اور بے
عورت بری طرح برباد ہو گئی تھی۔

اس کی تو زندگی بھر کی کمائی لٹ گئی تھی کیا تھی اس کی زندگی بھر کی کمائی؟ یہی
بیٹا اور وہی اب غائب ہو گیا تھا۔ مراد اس بات کو بخوبی سمجھتا تھا کہ ناصر اور مسعود دو
ہی بھٹے کے ماحول کی سخت گیری سے گھبرا کر بھاگ گئے تھے لیکن وہ زمین کے سامنے
کر یہ بات نہیں کہنا چاہتا تھا۔ کیونکہ زمین کو یہ بات پسند نہیں تھی اور ویسے بھی اب
بات کو کہنے سے کیا فائدہ تھا؟ بھاگنے والے تو بھاگ ہی گئے تھے اور وہ اب شاید اتنی جلد
واپس آنے والے بھی نہیں تھے۔ مراد کو زمین سے گہری ہمدردی تھی گو کہ زمین ا
سخت ناپسند کرتی تھی اور مراد کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی لیکن اس کے باوجود م
اس غریب اور بے سہارا عورت سے ہمدردی تھی اور وہ اس کی مدد بھی کرنا چاہتا تھا
اس کی کیا مدد کر سکتا تھا؟ اس کے پاس رقم تو تھی نہیں جو وہ زمین کے حوالے کر
کہتا کہ اس سے وہ حاجی کا قرضہ اتار دے۔ اور یہی وہ لمحہ تھا جب مراد کے دل میں
بار یہ خیال آیا کہ اس کو کچھ کرنا چاہئے۔ وہ عمر میں ناصر اور مسعود دونوں ہی سے
اور ناصر اور مسعود پچھلے ایک سال سے کما رہے تھے جبکہ اس نے ابھی تک کچھ کما
شروع نہیں کیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس کے پاس پیسے ہوتے تو وہ زمین کی مدد
تھا پورے دس ہزار نہ سہی پھر بھی تھوڑے بہت پیسے تو وہ اس کو دے سکتا تھا اس
قرض کے بوجھ کو کچھ تو ہلکا کر سکتا تھا لیکن اس کے پاس تو کوئی رقم نہیں تھی کیونکہ وہ
نہیں کرتا تھا۔

اس واقعے سے مراد کی زندگی میں ایک نیا موڑ آ گیا اور اس نے ایک عاقل' بالغ
ذمہ دار آدمی کی حیثیت سے سوچنا شروع کر دیا۔ جنت دکھی تھی۔ جنت کی ماں دکھی
جنت کا دکھ دور کرنے کے لئے وہ فوری طور پر تو کچھ نہیں کر سکتا تھا لیکن اس کے
جنت کے معاملے کو صرف فوری طور پر ہی تو نہیں ختم ہو جانا تھا۔ اسے تو ابھی بہت
تک جانا تھا۔ کہاں تک؟ یہ تو مراد خود بھی نہیں جانتا تھا۔ نہ جانے کہاں تک لیکن
دور تک جانا تھا۔ اسے اپنے مستقبل کا جو راستہ نظر آ رہا تھا اس پر وہ اپنے ساتھ
جنت کی پرچھائیں بھی دیکھ رہا تھا۔ جنت دم قدم اس کے ساتھ تھی۔



مراد ابھی تک کوئی خاص کام نہیں کرتا تھا۔ بس یوں تھا کہ اپنے باپ کے کام میں
تھوڑی بہت مدد کر دیتا تھا۔ اس کے ساتھ منڈی چلا جاتا تھا۔ وہاں سبزیوں کی خریداری
وغیرہ میں اس کی مدد کرتا تھا۔ اس کے علاوہ' وہ گھر کے دوسرے کام کراتا تھا۔ حساب
کتاب وغیرہ رکھتا تھا۔ گھر میں بکریاں اور مرغیاں پلی ہوئی تھیں۔ ان کی دیکھ بھال کرنا بھی
اس کی ذمہ داری تھی۔ اچھے خاصے کام تھے جو اس کو مصروف رکھنے کے لئے کافی تھے
لیکن اب ان کاموں کے ساتھ ساتھ اسے کمائی کے لئے بھی کچھ کرنا تھا۔ وقت آ گیا تھا کہ
اب اس کی جیب میں کچھ پیسے بھی ہوں۔

وہ بچپن سے ہی اپنے باپ کے ساتھ منڈی آتا جاتا رہتا تھا اور سبزیوں کے کاروبار
کے بارے میں اسے بہت کچھ معلوم تھا۔ بلکہ یہی وہ واحد کاروبار تھا جس کے بارے میں
اسے کچھ معلوم تھا لیکن وہ اپنے باپ کی طرح سبزی فروش نہیں بننا چاہتا تھا۔ وہ منڈی جاتا
تھا اور دیکھتا تھا کہ وہاں کام کرنے والے بیوپاری کتنی زیادہ کمائی کرتے تھے۔ ٹھیلا لگانے
والوں اور چھوٹی موٹی عارضی یا مستقل دکانوں پر بیٹھ کر سبزی بیچنے والے غریبوں کے
مقابلے میں ان لوگوں کی کمائی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔ مراد کے ذہن میں یہ بات آئی
کہ وہ اس سسٹم کا کاروبار شروع کرے اس نے اس کے بارے میں کافی سوچا۔ "دنیا بھر کی
سبزیوں کے بجائے موسم کی صرف کوئی ایک چیز پکڑ لوں۔" اس نے اپنے آپ سے کہا۔
"آلو' پیاز' لہسن' ادرک وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جو تقریباً سارا سال چلتی رہتی ہیں۔ ان میں
سے بھی کسی ایک چیز کو پکڑا جا سکتا ہے یا پھر موسم کی چیز..... کوئی بھی چیز ہو سکتی ہے۔"

اس رات کو جب اس نے اپنے باپ سے اس بارے میں گفتگو کی تو محمد یونس بہت
حیران ہوا' اور خوش بھی۔ اس کے بیٹے نے کبھی بھی اس طرح سے کاروبار میں دلچسپی کا
مظاہرہ نہیں کیا تھا وہ تو بس مارے باندھے تھوڑی بہت اپنے باپ کی مدد کر لیتا تھا اور اس
سے زیادہ کچھ نہیں اور اب وہ خود کاروبار میں دلچسپی لے کر اپنے باپ کو ایک نئی راہ سجھا
رہا تھا ایک ایسی راہ جس پر چلنے کا محمد یونس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا اس کی ساری
زندگی سبزی منڈی سے سبزی خرید کر ٹھیلے پر بیچتے ہوئے گزر گئی تھی اس نے کبھی بھی
خود فروش بیوپاری بننے کا خواب نہیں دیکھا تھا۔

"تم تو کبھی کام میں کوئی دلچسپی ہی نہیں لیتے۔" محمد یونس نے پیار بھری شکایت آمیز
لہجے سے اپنے نوجوان بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں اکیلا کیا کیا کروں؟ یہ سارا
کام مجھ سے اکیلے تو نہیں ہو سکے گا۔ آخر کوئی تو ساتھ دینے والا' ہاتھ بٹانے والا ہو۔ اکیلا

آدمی کہاں کہاں دھکے کھاتا پھرے گا؟"

"میں نے سوچ لیا ہے ابا۔" اس نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "ہمیں بالکل چھو
پیمانے پر ہی سہی لیکن کچھ تھوک کا کاروبار شروع کرنا چاہئے۔ دیکھیں' ہمارے پاس ا
کوٹھری خالی پڑی ہوئی ہے۔ خالی ہی سمجھو اس میں تھوڑے بہت کاٹھ کباڑ کے علاوہ ا
کیا ہے؟ ہم اس کو صاف کرکے ٹھیک ٹھاک کرلیں گے اور پھر یہاں ہم ایسی چیزوں کا
کر سکیں گے جو جلدی خراب نہ ہونے والی ہوں جیسے آلو ہے' پیاز ہے' ادرک
پھلوں میں ناریل ہے اور دوسری چیزیں ہیں پھر بعد میں ہم ان کو زیادہ قیمت پر بیچ
گے۔"

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔" محمد یونس نے محتاط انداز میں کہا۔ "لیکن اس میں
کبھی نقصان بھی ہوجاتا ہے۔ اگر مال خراب ہوجائے' وقت پر فروخت نہ ہوسکے' یا
وجہ سے منڈی میں قیمتیں گرجائیں تو پھر نقصان ہوجاتا ہے....."

"تو ٹھیک ہے ابا۔" اس نے جواب دیا۔ "آدمی جب کاروبار کرتا ہے تو اسے نقص
بھی ہوسکتا ہے لیکن میں تو اتنے دنوں سے منڈی کے سارے تھوک فروشوں کو
پھولتے ہی دیکھ رہا ہوں ان سب کی کمائی اور آمدنی میں اضافہ ہی ہو رہا ہے اور ان میں
تو کوئی بھی بھاری نقصان اٹھا کر غریب نہیں ہوگیا۔"

"پرانے لوگ ایک بات کہتے تھے بیٹا۔" محمد یونس نے کہا۔ "وہ یہ کہ پیسے کو
کھینچتا ہے بڑے بیوپاریوں کا بیوپار بھی بڑا ہوتا ہے اور ان کے پاس پیسہ بھی زیادہ ہوتا
انہیں اگر ایک سودے میں نقصان ہوتا ہے تو دوسرے سودے میں وہ فائدہ اٹھالیتے
اس طرح ان کا حساب تو ٹھیک ٹھاک چلتا رہتا ہے ہم بھلا ان لوگوں کا مقابلہ کہاں کر
ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم یہ کام نہیں کریں گے۔ کریں گے اور ض
کریں گے۔ اگر تم میرے ساتھ ہوگے' میری مدد کروگے' تو پھر ہم بہت کچھ کرسکتے ہیں۔"

دونوں باپ بیٹے بہت رات گئے تک اس چھوٹے سے کام کے بارے میں
کرتے رہے جس کا وہ آغاز کرنے جارہے تھے اور بعد میں مراد' اس چھوٹے سے کام
ایک بڑے سے کاروبار میں تبدیل ہوتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اس کے دل میں ایک نامعلوم
اضطراب کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اسے خود پر حیرت ہو رہی تھی کہ اس نے اب تک
انداز میں کیوں نہیں سوچا تھا اگر اس نے پہلے ہی اس کام کا آغاز کردیا ہوتا تو اب تک
اس میں کافی ترقی ہوچکی ہوتی۔



کل ہی میں جنت کو اس کے بارے میں بتاؤں گا۔" اس کے چہرے پر ایک مسرت
انگیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "جنت اس بات سے یقیناً خوشی ہوگی۔ چلو' کوئی تو خوشی کی
بات ہو اس کے لئے..... وہ تو چاروں طرف سے دکھوں میں ہی گھری ہوئی ہے بے
چاری کو سکھ کا سانس لینے کا تو موقع ہی نہیں مل پاتا۔" اس پر خود بھی افسردگی طاری
ہونے لگی۔ جنت کا ہر دکھ مراد کا اپنا دکھ تھا۔

اگلے روز علی الصباح وہ اپنے باپ کے ساتھ منڈی چلا گیا جہاں دونوں اپنے نئے
کاروبار کی تیاریاں کرنے لگے۔ آج ہی گھر کی اس کوٹھری کو بھی صاف کرنا تھا جس میں
کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا اور اسے مال رکھنے کے لئے ٹھیک ٹھاک کرنا تھا۔ ایک نئے کام کی
ابتدا کرنی تھی۔

دوپہر کے وقت وہ چپکے سے جنت کے گھر پہنچ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ زبین اس
وقت گھر پر نہیں ہوگی اور جنت چھوٹی بہنوں کے ساتھ گھر پر اکیلی ہوگی۔

اس کو دیکھ کر جنت کے چہرے پر ایک پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ جنت تو اس
وقت ایک پیکر ملال بنی ہوئی تھی اور اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی غم کی پرچھائیوں کے پس
منظر میں یہ مسکراہٹ بڑی انمول اور بے جوڑ معلوم ہوتی تھی۔

"اماں بہت پریشان ہیں۔" جنت نے آہستہ سے کہا۔ "ہم سب بھی پریشان ہیں۔ کیا
کریں کچھ سمجھ میں نہیں آتا اب کیا ہوگا..... آگے کیا ہوگا..... خدا جانے۔"

"پریشان ہونے سے کچھ نہیں ہوگا جنت۔" مراد نے اپنی آواز میں اپنے وجود کی
گرمی نرمی اور حلاوت کو گھولنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "پریشانی کی بات تو یقیناً ہے
اس میں کوئی شک نہیں لیکن انسان کو حوصلہ نہیں ہارنا چاہئے۔ ہوسکتا ہے ناصر جلد ہی خود
واپس آجائے۔ اب کم از کم اتنی بات تو معلوم ہو ہی چکی ہے کہ وہ اپنی مرضی سے یہاں
سے گیا ہے اور کسی نے اس کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کی ہے وہ اپنی مرضی سے گیا ہے
تو اپنی مرضی سے واپس بھی آجائے۔"

جنت نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا' اور ننھی کلثوم کو چھوٹے چھوٹے
کھلونے دکھا کر کھلاتی رہی۔

"میں نے اب کاروبار شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔" قدرے توقف کے بعد مراد
نے جنت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور جنت ایک دم چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"کاروبار؟" جنت نے تعجب سے کہا۔ "اب تو تم کسی کسی وقت اماں کے پاس

آجاسکتے ہو۔ بس' اور باتوں کے علاوہ ان کو یہ بھی بتا دینا اپنے بارے میں۔"

"ہاں' ضرور بتا دوں گا۔" مراد نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا۔ "دو تین دن کے بعد مسعود کے گھر کا چکر لگاؤں گا اور وہاں کی جو بھی خیر خبر ہوگی وہ لے کر چاچی کے پاس آؤں گا اور انہیں اپنے بارے میں بھی بتا دوں گا۔"

مراد زیادہ نہیں رکا وہ کچھ کچھ بنتی ہوئی بات کو بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ ناصر کے فرار کے واقعے کی وجہ سے اسے اس گھر میں محدود پیمانے پر دوبارہ آنے جانے کا موقع مل گیا تھا اور وہ اسے ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر زمین کو پتہ چل گیا کہ وہ اس کی غیر موجودگی میں جنت کے پاس آتا جاتا ہے تو یہ موقع بھی چھن جائے گا اور سب سے زیادہ خطرہ تو خیراں کی طرف سے تھا وہ برابر یہاں آتی جاتی رہتی تھی۔

مراد وہاں سے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگیا اور گھر پہنچ کر اپنی ماں کے ساتھ اس کوٹھری کی صفائی میں لگ گیا جسے وہ لوگ اپنے مال کی ذخیرہ گاہ کے طور پر استعمال کرانے کا ارادہ رکھتے تھے۔

زمین اس روز دو دن کے ناغے سے جب کام پر پہنچی تو حد درجہ خوفزدہ تھی۔ ناصر کے بھاگ جانے کا غم تو اپنی جگہ پر تھا ہی۔ خود نوکری سے نکالے جانے کا خوف اس کی روح کو زیر کئے ہوئے تھا۔ اگر کہیں چوہدریوں کے ہاں سے ملازمت سے جواب مل گیا تو؟ وہ پچھلے دو دن سے کام پر نہیں جاسکی تھی۔ سارا سارا دن اِدھر سے اُدھر بھاگتی دوڑتے' دھکے کھاتے اور روتے ہوئے گزرا تھا۔ اسے تو اپنے تن بدن کا ہوش نہیں تھا کام کا ہوش کہاں سے ہوتا؟ لیکن جب درد اور صدمے کی لہروں میں تھوڑا سا ٹھہراؤ پیدا ہوا تو پھر دوسری چیزوں کا بھی ہوش آنے لگا اور دوسری مجبوریوں نے بھی اپنی موجودگی کا احساس دلانا شروع کیا۔

وہ دو دن کے ناغے سے کام پر پہنچی تو سب سے پہلے بڑی چوہدرائن سے اس کا سامنا ہوا یہ بھی غنیمت تھا۔ بڑی چوہدرائن کے مزاج میں پھر بھی کچھ دھیماپن تھا۔ جبکہ چھوٹی چوہدرائن تو بالکل ننگی تلوار تھی اور فوراً ہی جسم اور دماغ پر ایسے ایسے گھاؤ لگانا شروع کر دیتی تھی کہ انسان مر مر جاتا تھا۔ بڑی چوہدرائن نے اس کے بکھرے ہوئے بالوں' اترے چہرے' سوجی ہوئی' کیچڑ بھری آنکھوں اور لڑکھڑاتی ہوئی چال کو دیکھ کر قدرے تشویش کے لہجے میں اس سے پوچھا۔ "کیا تم بیمار ہوگئی تھیں؟" انداز سوال کا بھی تھا اور ڈانٹنے کا بھی لیکن بہت زیادہ درشت نہیں تھا۔



جواب میں زمین اک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ارے کیا ہوا؟ اب کیا ہوگیا؟" بڑی چوہدرائن نے تعجب سے کہا۔ "کیوں رو رہی ہے۔"

اسی وقت چھوٹی چوہدرائن بھی وہاں آن پہنچی اس نے اس روتی ہوئی زمین کو دیکھا اس کی آنکھوں سے غصہ ابلنے لگا۔ اس کے چہرے کے عضلات تن کر سخت ہوگئے اس نے کڑی نظروں روتی ہوئی زمین کو دیکھ کر کہا۔ "رونے دھونے کا ڈرامہ چھوڑو اور سیدھی طرح یہ بتاؤ کہ تم دو دن سے کہاں تھیں؟ میں نے آج شام کو ایک دوسری عورت کو بلایا ہے....."

"نہیں چھوٹی بی بی!" زمین نے لرز کر دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "ایسا نہ کیا جائے میں تو پہلے ہی بالکل برباد ہوچکی ہوں بالکل لٹ چکی ہوں۔ میرا تو سب کچھ چھن گیا۔"

"وہ بات پرانی ہوچکی ہے۔" چوہدرائن نے اس کی بات کاٹتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔ "اب کب تک اس کا رونا روتی رہوگی؟ تمہارا میاں پیسے لے کر آج تو نہیں بھاگا اس بات کو تو تقریباً سال بھر کا عرصہ ہوچکا۔"

"وہ بات تو پرانی ہوگئی چھوٹی بی بی۔" اس نے روتے ہوئے کہا۔ "میں اس کا ذکر نہیں کر رہی ہوں میں تو ایک اور تازہ مصیبت کا ذکر کر رہی ہوں جس کی میں اچانک شکار ہوگئی ہوں میرا بیٹا ناصر غائب ہوگیا ہے۔"

"کیا؟" بڑی چوہدرائن نے چونک کر کہا۔ "تمہارا بیٹا غائب ہوگیا ہے؟ تمہارا تو ایک ہی بیٹا تھا نا؟ جسے تم نے اینٹوں کے بھٹے پر کام سے لگوا دیا تھا؟"

"جی ہاں' جی ہاں بڑی بی بی۔" زمین نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ "ایک ہی بیٹا تھا میرا..... ناصر..... اور وہ لاپتہ ہوگیا ہے۔ معلوم نہیں' کہاں چلا گیا..... کون سے شہر کو گیا۔"

"تو کیا تم کو یہ معلوم ہے کہ وہ کسی دوسرے شہر چلا گیا ہے۔؟" چھوٹی چوہدرائن نے کڑی نظروں سے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔ "تم کچھ جانتی ہو اس کے بارے میں؟"

جواب میں زمین نے مختصراً ان کو سارا احوال سنا دیا۔

"دونوں بھاگے ہیں جی۔" آخر میں اس نے روتے ہوئے کہا۔ "وہ اور مسعود"

..... دونوں ایک ساتھ ہی گھروں سے بھاگ گئے ہیں' اور حاجی مدد علی قریشی دونوں کے گھر والوں کے سروں پر لاٹھی لئے کھڑا ہے۔"

"کیوں نہیں کھڑا ہوگا؟" چھوٹی چوہدرائن نے چیخ کر کہا۔ "اس سے قرضہ لیتے وقت تم نے نہیں سوچا تھا کہ آخر اتنے بہت سے پیسوں کی واپسی کا کیا بندوبست ہوگا؟ بات یہ ہے کہ تم جیسے لوگ تو اپنے بچوں کو بیچتے ہو۔ ان پر بچپن میں ہی اتنا ظلم کرتے ہو کہ وہ گھبرا کر پریشان ہو کر گھروں سے بھاگ جاتے ہیں اور پھر چوریاں کرتے ہیں' ڈاکے ڈالتے ہیں' مجرم بنتے ہیں۔"

"نہیں نہیں چھوٹی بی بی۔" زمین نے دہل کر کہا۔ "میرا ناصر ایسا نہیں ہے وہ چور ڈاکو نہیں ہے وہ مجرم نہیں ہے۔"

"مجرم کوئی ماں کے پیٹ سے تو نہیں پیدا ہوتا زمین!" چھوٹی چوہدرائن نے کہا۔ "ایسے ہی بچے ہوتے ہیں' ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جو گھروں سے بھاگ بھاگ کر مجرم بن جاتے ہیں۔ تم لوگ اپنے بچوں کے ساتھ ظلم کرتے ہو۔ آخر کیا وجہ ہے کہ غریبوں کے ہی بچے گھروں سے بھاگتے ہیں؟ ہمارے بچے گھروں سے کیوں نہیں بھاگتے؟"

زمین اس سوال پر چکرا گئی۔ اس نے بظاہر بالکل سادہ اور آسان سے سوال کے جواب میں سماجی نشیب و فراز اور طبقاتی کشمکش کی جو قرنوں پرانی تاریخ سموئی تھی اس کے بارے میں زمین کچھ بھی نہیں جانتی تھی نہ جان سکتی تھی واقعی چھوٹی چوہدرائن کی بات ٹھیک تھی بچے تو غریب گھرانوں کے ہی بھاگتے ہیں۔

"خدا نہ کرے کہ آپ کے بچے گھروں سے بھاگیں جی۔" زمین نے گڑگڑانے والے انداز میں کہا۔ "اللہ نے آپ کو دولت دی ہے۔ خوش حالی دی ہے۔ آپ کے بچے سدا خوش رہیں جی۔ وہ بھلا کیوں گھروں سے بھاگیں؟ ان کے لئے تو گھروں میں دنیا کی ہر نعمت موجود ہے۔ اللہ اس سے بھی زیادہ نعمت دے۔ عزت دے۔"

زمین نے غیر شعوری طور پر ان الفاظ میں ساری معاشرتی تاریخ کو سمیٹ لیا تھا۔

"اچھا تو اب کیا ارادہ ہے؟" چھوٹی چوہدرائن نے کڑوے لہجے میں کہا۔ "کام کرنے کا ارادہ ہے یا اب تمہارے پاس کام کے لئے وقت نہیں ہے؟ میں کسی دوسری عورت سے بات کرلوں؟"

"نہیں نہیں چھوٹی بی بی' میں بھلا کام نہیں کروں گی تو پھر کیا کروں گی۔ مجھے تو اس کے علاوہ چار چھوٹی بڑی جانوں کے پیٹ کا دوزخ بھرنا ہے۔ میں کام نہیں کروں گی تو ان



اور کون کام کرے گا؟ باپ نشے کا مارا' نہ جانے کہاں جاکر مرگیا اور اللہ نام کا ایک اب وہ بھی آنکھوں سے اوجھل ہوگیا اور میں رہ گئی اکیلی ان ننھی ننھی جانوں کے زندگی کا بوجھ ڈھونے کے لئے۔" وہ ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"اچھا' چلو پھر اب کام تو شروع کرو۔" چھوٹی چوہدرائین نے کہا۔ "تمہارا بیٹا اپنی مرضی سے گیا ہے ہوسکتا ہے کچھ دنوں کے بعد خود ہی اپنی مرضی سے واپس آجائے۔"

اور بھی کئی لوگوں نے زمین سے یہ بات کہی تھی اور یہ بات اس کے دل کو لگی بھی ناصر کو کوئی زبردستی اٹھا کر تو نہیں لے گیا تھا۔ وہ اپنی مرضی سے گیا تھا اور واقعی' وہ مرضی سے واپس آبھی سکتا تھا۔ اس کے دل میں امید کی ایک لہر سی اٹھی اور اس نے ترتلخ و ترش اور دل آزار باتیں سننے کے باوجود' تشکر آمیز نظروں سے چھوٹی رائن کی طرف دیکھا جس کے ان الفاظ نے اس کے شکستہ وجود کو ایک نیا حوصلہ عطا کیا

"بس جی' ابھی لیجئے۔" زمین نے پھرتی سے باورچی خانے کی طرف بڑھتے ہوئے "میں آگئی ہوں تو کوئی کام باقی نہیں رہے گا۔ سارے کام کرکے جاؤں گی۔"

باورچی خانے میں ایک طرف جھوٹے برتنوں کا پہاڑ جیسا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ دو دن سے بھی برتن استعمال ہو رہے تھے' انہیں کسی نے دھونے کی ضرورت نہیں محسوس کی بلکہ ملازمہ کی آمد کے انتظار میں انہیں ایک طرف کو ڈال دیا گیا تھا اور یوں ان کی میں اضافہ ہوتا گیا تھا۔ گھر میں زمین کے علاوہ ایک اور عورت بھی کام کرتی تھی اس کے فرائض مختلف تھے۔ اسے باورچی خانے اور گھر کے اندر کی صفائی وغیرہ کا کام کرنا ہوتا تھا۔ وہ بچوں کی دیکھ بھال کرتی تھی' ان کے سارے کام کرتی تھی کپڑے دھوتی تھی اور استری کرتی تھی' سارے گھر کے بستر' چادریں' تکئے کے غلاف وغیرہ بدلتی اور انہیں صاف رکھتی تھی۔

اس سے برتن نہیں دھلوائے تھے ورنہ اس کے دوسرے کاموں کا ہرج ہوتا' کیونکہ زمین کی طرح وہ بھی شام کو گھر چلی جاتی تھی۔ جھوٹے برتنوں کا ڈھیر زمین کے انتظار میں

کاموں کا سلسلہ تو بہت دراز تھا لیکن زمین نے سب سے پہلے جھوٹے برتنوں کے ڈھیر سے نمٹنے کا فیصلہ کیا اور جب اس نے اس کو ہاتھ لگایا تو اس کو معلوم ہوا کہ برتنوں کے اندر لگی ہوئی جھوٹن سڑ رہی تھی اس میں سے بدبو اٹھ رہی تھی۔ کئی برتنوں میں

چھوٹے چھوٹے کیڑے رینگ رہے تھے پھپھوند لگ رہی تھی۔

"اف میرے خدا!" اس نے دل ہی دل میں کراہتے ہوئے کہا۔ "اگر کسی نے صرف گرم پانی سے ہی کھنگال دیا ہوتا تو ان کی یہ حالت نہ ہوتی اب کتنی محنت کرنا پڑے گی ان کو پوری طرح سے صاف کرنے میں۔"

اس نے چادر اتار کر ایک طرف ڈال دی اور پھر کسی بھوکے شکاری جانور کی طرح جھوٹے برتنوں کے ڈھیر پر پل پڑی۔

وہ دل ہی دل میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کر رہی تھی کہ وہ بچ گئی۔ بغیر کسی اطلاع کے دو دن کے ناغے کی صورت میں نوکری کے ختم ہو جانے کے پورے امکانات موجود تھے اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس کی بستی کی ایک سے زائد عورتیں اس کام پر دانت لگائے بیٹھی تھیں اور وقتاً فوقتاً یہاں کے چکر بھی لگاتی رہتی تھیں۔ وہ تو بڑی چوہدرائن اس کے لئے اپنے دل میں ذرا نرم گوشہ رکھتی تھی' ورنہ چھوٹی چوہدرائن نے تو شاید اس کی چھٹی ہی کروا دی ہوتی۔ نوکری بچ گئی تھی' وہ خود اور اس کے بچے فاقہ کشی سے بچ گئے تھے۔ وہ خود دربدری سے محفوظ ہی تھی۔ اب کم از کم اتنا تو تھا کہ دو وقت کی روٹی کا سہارا اس سے نہیں چھنا تھا۔ اس کے چلتے ہاتھ پیر تھے' اور ان ہاتھ پیروں کی مدد سے وہ اپنی اور اپنے بچوں کی کفالت کا بوجھ اٹھا سکتی تھی بشرطیکہ اسے بیروزگار کر کے اس کے منہ کا نوالہ اس سے چھین نہ لیا جائے۔

برتن دھوتے دھوتے وہ ہلکان ہو گئی۔ سڑی ہوئی جھوٹن کی بُو نے اس کا دماغ خراب کر دیا مگر پھر بھی وہ خود کو مطمئن محسوس کر رہی تھی۔ اس کا روزگار ختم نہیں ہوا تھا۔ اس کا رزق اس سے نہیں چھنا تھا۔

"نہ جانے کہاں ہو گا؟" یکایک درد کی ایک تیز و تند لہر اس کے دل میں اٹھی اور اس کے سارے وجود میں پھیلتی گئی۔ "میرا لعل..... میرا بچہ..... میرے جگر کا ٹکڑا..... نہ جانے کہاں ہو گا۔ نہ جانے ان دنوں اس نے کیا کھایا ہو گا اور کہاں سویا ہو گا۔ اس نے یہ دن اور رات کس طرح گزارے ہوں گے۔ نہ جانے..... نہ جانے..... کہاں۔"

"دیکھو زمین۔" اچانک وہ ایک تحکمانہ آواز سن کر چونک پڑی اور اس کے خیالات کی رو ٹوٹ گئی۔ "سارا کام ختم کر کے جانا ہے' یہ نہیں کہ تم گھر بھاگنے کی جلدی میں آدھا کام چھوڑ دو۔ دو دن سے نہ تو باورچی خانے کے صفائی ہوئی ہے اور نہ برتن دھو



گھر کے دوسرے حصوں کی صفائی وغیرہ ہوئی ہے۔ سارا کام ٹھیک طرح سے ختم ہونا۔" چھوٹی چوہدرائن اس کے سر پر کھڑی ہوئی تقریر کر رہی تھی۔

"جی چھوٹی بی بی۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "آپ بے فکر رہیں میں نے کہا نا' میں آئی ہوں اور اب آ گئی ہوں تو انشاء اللہ۔ سارا کام ختم کر کے جاؤں گی چاہے مجھے آدھی راتیں نہ ہو جائے۔"

وہ واقعی آدھی رات تک کام کرنے کے لئے تیار تھی اور کر سکتی تھی اگر ایسا ضروری تھا۔ کیونکہ اسے اپنی ملازمت کو بچانا تھا۔ اپنے اور اپنے بچوں کے رزق کو بچانا تھا روٹی کے نوالوں کو بچانا تھا جن سے محروم ہو جانے کے بعد زندگی کی ساری اقدار دم توڑ دیتی ہیں۔ روٹی کے نوالے..... پیٹ کا ایندھن..... اس ایندھن میں تو انسان اپنا کیا کچھ جلا کر پھونک دیتا ہے۔

چھوٹی چوہدرائن تقریر جھاڑ کر چلی گئی اور زمین ایک بار پھر جھوٹے برتنوں کے ڈھیر دھونے لگی۔ اس کے محنت کرنے والے سیاہ کھردرے' بدوضع اور درشت ہاتھوں کی رگڑ کے نتیجے میں جھوٹے برتنوں کا ڈھیر سکڑتا جا رہا تھا اور اس کے برابر ہی صاف' دھلے ہوئے چم چم کرتے برتنوں کا ایک نیا ڈھیر جیسے زمین سے اگتا چلا آ رہا تھا اور وہ اس کو فاتحانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

زمین کو آدھی رات تو نہیں ہوئی' البتہ معمول کے لحاظ سے کوئی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی دیر ہو گئی۔ اس نے آج ذرا سا بھی آرام نہیں کیا تھا اور جس وقت سے آئی ہوئی اس وقت سے کولہو کے بیل کی طرح کام کئے جا رہی تھی اپنے حصے کے رزق کو پانے کے جذبے نے اس کی رگوں میں ایک نئی توانائی بھر دی تھی۔ برآمدے میں جلنے والی تیز روشنی کے بلب کے باوجود آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا اور کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ سارے دن کی جان توڑ مشقت نے شدید ذہنی کوفت کے ساتھ مل کر جسم و جاں کے لئے ایک عجیب و غریب آزار اور صدمے کی شکل اختیار کر لی تھی۔

رات کے اول پہر میں وہ گھر جانے کے لئے روانہ ہوئی تو اس کے پاؤں من من بھاری ہو کر جیسے تختہ ہو رہی تھی۔ انگلیاں ٹیڑھی ہو گئی تھیں اور ان کے گھسے ہوئے تلوے میں جلن ہو رہی تھی۔ چھوٹی چوہدرائن نے اسے کچھ کھانا دیا اور ازراہِ کرم' روزانہ کے حساب میں کچھ زیادہ ہی دے دیا جسے اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ پوٹلی میں باندھنے

کے بعد اپنے کپڑے کے تھیلے کے اندر رکھ لیا اور پھر وہ گھر جانے کے لئے روانہ ہوئی۔
لیکن وہ سیدھی گھر نہیں گئی۔ وہ صبح ہی سے گھر سے طے کر کے نکلی تھی اور
نے جنت کو بھی بتا دیا تھا کہ وہ تھانے سے ہوتی ہوئی آئے گی شاید ناصر کی کوئی خیر خبر
ہو۔

اب اگرچہ اس کا انگ انگ تھکن سے چُور ہو رہا تھا وہ بُری طرح سے
ہو رہی تھی پھر بھی اس نے پہلے تھانے کا رخ کیا اب تھکن کا کیا تھا؟ تھکنا تو روز ہی
کو تھانے جاتی تو کام پر دیر ہو جاتی اور اب وہ مزید کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتی تھی
شام کو تو پھر یہی حالت ہوتی تھی یہی وقت ہوتا تھا یا اس سے کچھ پہلے لیکن اس
فرق پڑتا تھا؟ جانا تو بہر حال تھا ہی۔

گرتی پڑتی' ہانپتی' تھانے پہنچی تو وہاں' پورے تھانے میں' دو کانسٹیبلوں کے علاوہ
کوئی تھا ہی نہیں۔ بہت سارے لوگ مختلف کاموں کے سلسلے میں تھانے میں آئے ہو
بیٹھے کسی ذمہ دار افسر کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک عمر رسیدہ عورت رو رو کر
رہی تھی۔ اس کی نوجوان بیٹی کو علاقے کے کونسلر کے اشارے پر کچھ بدمعاش اٹھا کر
گئے ہیں کیونکہ اس نے کونسلر کے چھوٹے بھائی کو اپنی بیٹی کا رشتہ دینے سے انکار
تھا۔ ایک نوجوان' آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے اپنی نئی سائیکل کے چوری ہو جانے
داستان سنا رہا تھا' جو اس نے کافی دنوں تک تھوڑے تھوڑے پیسے جمع کرنے کے بعد
ہفتہ پہلے ہی خریدی تھی۔

معلوم یہ ہوا کہ کہیں کوئی جلسہ ہو رہا تھا جس میں ایک وزیر کو تقریر کرنی تھی
تھانے کا سارا عملہ اس جلسے کے انتظام میں مصروف تھا۔

"اور یہ جلسہ کب شروع ہو گا اور کب ختم ہو گا۔" زمین نے کانسٹیبل سے پوچھا

"اماں' وہ لوگ نہ مجھ سے پوچھ کر جلسہ شروع کریں گے نہ مجھ سے پوچھ کر
ختم کریں گے۔" کانسٹیبل نے بڑی بیزاری کے ساتھ کہا۔ "افسر لوگ ہیں' بادشاہ ہیں
ہیں' اپنی مرضی کے مالک ہیں' جب جی چاہے گا شروع کریں گے' جب جی چاہے گا
کریں گے' ویسے جلسہ شروع ہونے کا ٹائم تو تین بجے کا تھا' لیکن پانچ بجے شام تک
شروع نہیں ہوا تھا۔"

اور اب تو رات تھی..... زمین کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ تھانے کے فرش پر
کونے میں دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے بیٹھی تھی اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اب وہ



اٹھ ہی نہیں سکے گی۔ ٹانگیں بے جان ہو رہی تھیں اور عمارت سے باہر نکل آئی۔
وقت برباد کیا۔ ناحق ہی وہ اپنے درماندہ وجود کو گھسیٹتی ہوئی یہاں تک لائی تھی اور اتنی
یہاں بیٹھی ہوئی پولیس افسر کا انتظار کر رہی تھی۔ کیا فائدہ ہوا؟ اس سے تو اچھا
وہ گھر ہی چلی جاتی۔

وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اب اس کو واپس چلا جانا چاہئے۔ جلسہ نہ معلوم کب ختم ہو
تھانے کا عملہ کب واپس تھانے میں آئے' کہ اتنے میں وہی افسر چند سپاہیوں کے ساتھ
میں داخل ہوا جس کو اس نے ناصر کی گمشدگی سے مطلع کیا تھا اور رپورٹ کروائی
اس نے زمین کو دیکھ کر پہچان لیا۔

"ہاں اماں..... کیسے آنا ہوا؟" اس نے خود ہی زمین سے پوچھا۔ "تمہارے بیٹے
پتہ چلا؟"

زمین اس کے اس سوال پر سخت حیران ہوئی۔ پولیس افسر الٹا اس سے پوچھ رہا تھا
اس کے بیٹے کا کچھ پتہ چلا اور اس کے ساتھ ہی اس کو اپنے ان تمام سوالوں کا جواب
مل گیا جنہیں ذہن میں رکھ کر وہ یہاں آئی تھی۔ ٹانگوں کی اینٹھن میں یک بارگی اور
اضافہ ہو گیا' آنکھوں کے آگے پھیلا ہوا اندھیرا اور گہرا ہو گیا اور کانوں میں آنے والی
پولیس سائیں کی آواز اور زیادہ بڑھ گئی۔

"نہیں صاحب جی۔" اس نے بمشکل لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں تو یہاں اس
آئی تھی کہ آپ سے معلوم کروں کہ شاید آپ لوگوں نے اس کے بارے کچھ معلوم
کہیں سے کچھ پتہ چلا ہو اس کے متعلق میں تو۔"

"ہم کوشش کرتے رہے ہیں اماں۔" پولیس والے نے کہا۔ "مگر ابھی تک کچھ پتہ
چلا ہے بات یہ ہے اماں کہ اپنی مرضی سے گھروں سے بھاگ جانے والے بچوں کا
بڑی مشکل سے سراغ لگا پاتی ہے کیونکہ وہ بچے پولیس سے چھپتے ہیں۔ تم کو کہیں سے
کے بارے میں کوئی سراغ ملا؟ میرا مطلب ہے' کوئی نئی بات اس کے متعلق معلوم
ہے؟"

"نہیں صاحب۔" زمین نے کہا' اور کراہتے ہوئے بمشکل اپنی جگہ سے اٹھ کر
کھڑی ہو گئی۔ صدمے کے بوجھ نے اس کے سارے وجود کو اس بری طرح سے دبا رکھا تھا
اس سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔

"پھر کبھی چکر لگا لینا۔" پولیس افسر نے اپنے کمرے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے

کہا۔ "اگر کوئی بات معلوم ہو تو آکر مجھ کو بتانا ویسے ہم لوگ بھی خیال رکھیں گے۔"

اور اس کے ساتھ ہی وہ کمرے کے اندر داخل ہوگیا۔ اس نے زمین کے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ سپاہی اس کے پیچھے پیچھے اس کے کمرے میں داخل ہوگئے تھے اور برآمدے میں موجود دوسرے لوگوں میں' جو وہاں کسی ذمہ دار افسر کی آمد کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے' ایک ہلچل سی مچ گئی تھی۔

زمین نے کھڑے ہوکر اپنی لرزتی ہوئی ٹانگوں پر اپنے وجود کو سنبھالا اور اسے گھسیٹتی ہوئی تھانے کی حدود سے باہر آگئی۔

کافی دیر سے جب وہ گھر واپس پہنچی تو اس نے دیکھا کہ گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا' اور ماسی خیراں اور جنت دونوں اندر صحن کی نیم تاریکی میں دروازے کے قریب چارپائی ڈالے بیٹھی تھیں اور ان کی نظریں دروازے کی طرف لگی ہوئی تھیں۔

"لو..... آگئیں....." ماسی خیراں نے اس کو دیکھتے ہی' پلنگ سے اٹھتے ہوئے' جنت کی طرف دیکھ کر کہا۔ "خدا کا شکر ہے گھر تو پہنچیں بہت دیر ہوگئی آج تو۔"

"ہاں ماسی۔" زمین نے اندر قدم رکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے دیر تو آج ہونی ہی تھی میں جنت سے کہہ کر گئی تھی کہ تھانے سے ہوتی ہوئی آؤں گی۔"

"ہاں' جنت نے مجھے بتایا تھا۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "اور میں اس لئے یہاں بیٹھی ہوئی تھی کہ رات کے وقت بچے اکیلے نہ رہیں۔"

زمین اندر آکر آنگن میں پڑے ہوئے دوسرے پلنگ پر جو آنگن کے تقریباً وسط میں پڑا تھا۔ دھنس گئی۔ اس نے اپنا تھیلا ایک طرف رکھ دیا تھا۔ نصرت' صغرا اور کلثوم ماں کو دیکھتے ہی اس کے پاس آن پہنچی تھیں اور کلثوم جلدی سے اس کی گود میں چڑھ گئی تھی۔ زمین نے کلثوم کو کلیجے سے لگالیا اور اسے پیار کرنے لگی۔

"اماں..... کیا ہوا آج چوہدریوں کے ہاں؟" جنت نے جلدی سے پوچھا۔ اسے ماں کی نوکری کی بہت فکر تھی۔ صبح کو ماں جب گھر سے گئی تھی تو کس قدر پریشان اور خوفزدہ تھی۔

"بس بیٹا' خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ نوکری بچ گئی۔" زمین نے کہا۔ "ورنہ چھوٹی چوہدرائن نے تو آج شام کسی دوسری عورت کو بلوا ہی لیا تھا۔ میں نے جب ان لوگوں کو اپنی مصیبت کے بارے میں بتایا تو انہوں نے میرے ساتھ رعایت کی کہ مجھے نوکری سے نہیں نکالا۔"



"شکر ہے خدا کا۔" جنت کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

"مگر آج سارا دن کام کرتے کرتے جان نکل گئی۔" زمین نے پلنگ پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔ "ظالموں نے تین دن کا سارا کام ایک ہی دن میں کروالیا۔ سب کچھ جمع کرکے رکھ چھوڑا تھا کمر دوہری ہوگئی جھوٹے برتنوں کا ڈھیر سمیٹتے سمیٹتے....."

"اور تھانے میں کیا ہوا۔؟" ماسی خیراں نے پوچھا۔

"وہ تو الٹی گنگا بہارہا تھا ماسی۔" زمین نے ایک زہر خند کے ساتھ کہا۔ "مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ مجھے کہیں سے کوئی اطلاع ملی۔ بھلا بتاؤ۔ پولیس والے مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔"

"مطلب یہ کہ ان لوگوں کے پاس کوئی اطلاع نہیں ہے۔؟" ماسی خیراں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"ہاں ماسی....." زمین نے کہا۔ "ان لوگوں کے پاس کوئی اطلاع نہیں ہے۔ انہیں کچھ نہیں معلوم ہے۔"

"اچھا..... اب میں چلتی ہوں۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "بہت دیر ہوگئی ہے۔ اب تم کھانا وانا کھاؤ بچوں کو کھلاؤ۔ سب بچے بے چارے کب سے تمہاری راہ دیکھ رہے تھے۔"

ماسی خیراں چلی گئی اور زمین نے اپنا تھیلا اٹھا کر جنت کی طرف بڑھا دیا۔ "دیکھ لو کیا لیا ہے مجھے تو کچھ ہوش ہی نہیں ہے گرم کرلو۔"

رات کا کھانا کھانے کے فوراً ہی بعد زمین بستر پر ڈھیر ہوگئی اور پھر ایسی سوئی کہ اس کو اپنے ارد گرد کی کچھ خبر ہی نہیں رہی۔ کھانا کھانے کے دوران جنت کا کس قدر شدت کے ساتھ یہ جی چاہ رہا تھا کہ وہ اپنی ماں سے مراد کے بارے میں بات کرے' اس کو یہ بتائے کہ مراد نے کاروبار شروع کردیا ہے اور اب وہ خود اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی تیاری کررہا ہے لیکن یہ بھلا کس طرح ممکن تھا! وہ ماں کے سامنے تو مراد کا نام بھی نہیں لے سکتی تھی۔

زمین تو لیٹ کر سوگئی اور جنت بڑی دیر تک گھر کے کام کاج میں مصروف رہی باورچی خانے کا سارا کام سمیٹنا تھا بچوں کو لٹانا تھا' سلانا تھا' سارے کام نمٹاتے نمٹاتے کافی رات ہوگئی اور پھر وہ لالٹین بجھانے کے بعد اپنے بستر پر لیٹ گئی اور اس نے آنکھیں بند کرلیں۔

آنکھیں بند کرتے ہی مراد اس کے سامنے آکھڑا ہوا وہ بڑا خوش نظر آرہا تھا۔ وہ اس کاروبار کے بارے میں اس کو بتا رہا تھا جسے وہ شروع کرنے جارہا تھا اور وہ اس کی باتیں سن سن کر مسکرا رہی تھی۔ پھر مراد کے ساتھ ہی ناصر بھی آن کھڑا ہوا۔ جنت کے دل میں درد کی ایک لہر اٹھی اور خوشی کی اس لہر کے ساتھ ضم ہوگئی جو مراد کی آمد سے ابھری تھی اور انہیں ابھرتی ڈوبتی لہروں کے درمیان نہ جانے کس وقت اس کو نیند آگئی۔

☆=========☆=========☆

حسب معمول صبح کو سب سے پہلے اٹھنے والی زمین تھی پھر جنت اٹھی اور گھر کا کاروبار روز کی طرح شروع ہوگیا۔ زمین کی کوشش تھی کہ آج وہ وقت سے ذرا پہلے ہی کام پر پہنچ جائے' اور جلدی کام شروع کردے۔ مالکوں کو راضی رکھنا بہت ضروری تھا۔

وہ نکلنے کی تیاری کر رہی تھی کہ اچانک دروازے پر بڑے زور کی دستک ہوئی۔ جنت دروازے کی طرف جانے کے لئے اٹھی لیکن زمین نے اسے روک دیا۔ ٹھہرو' میں دیکھتی ہوں۔ اس نے کہا اور دروازے کے پاس جاکر دروازہ کھول دیا۔ دروازے کے باہر حاجی مدد علی قریشی کا منشی امیر علی کھڑا ہوا اسے خشمگیں نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

زمین نے منشی امیر علی کو دیکھا اور اس کے جسم سے جیسے جان نکل گئی لیکن اس نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی اور اپنے لب و لہجے کو حتی المقدور نرم اور مسکین بنا کر کہا۔ "ارے..... آپ ہیں منشی صاحب..... آیئے آیئے اندر آیئے....." اور اس کے ساتھ ہی اس نے پورا دروازہ کھول دیا۔

"نہیں' میں بیٹھنے کے لئے نہیں آیا ہوں زمین!" منشی امیر علی نے درشت لہجے میں کہا۔ "میرے پاس ٹائم نہیں ہے یہ بتاؤ کہ تم غائب کہاں ہو؟ تم نے بھٹے پر آکر کوئی خیر خبر ہی نہیں دی؟ حاجی صاحب روز صبح وشام تمہارا انتظار کرتے ہیں۔"

"لوجی..... ابھی تین ہی تو دن ہوئے ہیں۔" زمین نے کہا۔ "کون سے مہینے بیت گئے جو میں نے کوئی خیر خبر نہیں دی؟ میں تو خود کس قدر پریشان ہوں منشی جی میرے اوپر تو قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔" اور اس کی آنکھیں چھلکنے لگیں اس نے اپنے میلے دوپٹے کے پلو سے اپنی بھیگی ہوئی آنکھیں پونچھیں۔

"کچھ پتہ چلا لڑکے کا.....؟" منشی امیر علی نے اس کے آنسوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "کوئی خیر خبر.....؟"

"نہیں منشی جی....." زمین نے سسکی لیتے ہوئے کہا۔ "کوئی خیر خبر نہیں.....



کچھ نہیں..... کچھ نہیں معلوم....."

"اچھا تو اب بھٹے پر آکر حاجی صاحب سے بات کرو۔" اس نے کہا۔ "انہوں نے تم کو بلایا ہے بات کرنا چاہتے ہیں وہ تم سے' کل تو وہ شہر میں نہیں ہوں گے پرسوں صبح کو آکر ان سے مل لو۔"

"ضرور آجاؤں گی۔" زمین نے کہا۔ "لیکن صبح کو نہیں آسکوں گی اگر صبح کو آؤں گی تو کام پر جانے میں دیر ہو جائے گی اور چوہدرائن مجھے نکال باہر کریں گی پہلے ہی وہ میرے ناغوں کی وجہ سے مجھ سے بہت ناراض ہیں۔ میں شام کو آجاؤں گی چوہدریوں کے ہاں سے کام ختم کرنے کے بعد....."

"ٹھیک ہے۔" منشی امیر علی نے کہا۔ "تم شام کو آجانا' میں حاجی صاحب سے کہہ دوں گا۔"

"منشی جی....." زمین نے تقریباً گھگیاتے ہوئے کہا۔ "حاجی صاحب..... حاجی صاحب مجھ سے کیا بات کرنا چاہتے ہیں؟ اس دن وہ کہہ رہے تھے کہ مجھے سارے پیسے واپس کرنے ہوں گے اور....."

"وہ تو ہے۔" منشی امیر علی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "پیسے تو تم کو واپس کرنے ہوں گے' ایک ایک پائی واپس کرنی ہوگی آخر تم نے رقم قرض لی تھی۔"

"منشی جی..... آپ کو تو معلوم ہے کہ میں ایک غریب اور بے سہارا عورت ہوں۔" زمین نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "چار چار بیٹیوں کی ماں' آپ حاجی صاحب سے میری سفارش کر دیجئے میرے ساتھ رعایت کریں مجھے یقین ہے کہ ناصر جلد ہی واپس آجائے گا۔"

"اگر واپس آجائے تو پھر کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" منشی امیر علی نے سرسری انداز میں کہا۔ اس نے زمین کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ "وہ واپس آکر کام شروع کر دے تو ٹھیک ہے بس یہ ہو گا کہ جتنے دنوں کا اس نے ناغہ کیا ہے اتنے دنوں کی تنخواہ کاٹ لی جائے گی جس دن سے دوبارہ کام شروع کرے گا اس دن سے اس کی نئی تنخواہ لگنا شروع ہوگی۔"

"کچھ کریں منشی جی۔" زمین کے لہجے میں لجاجت تھی خوشامد تھی' التجا تھی بے بسی تھی دکھ تھا۔

"میں کون ہوتا ہوں کچھ کرنے والا بھئی.....؟" منشی امیر علی نے بے نیازی سے

کہا۔ ”نہ رقم میری تھی اور نہ میں بھٹے کا مالک ہوں یہ تمہارے اور حاجی صاحب کے درمیان کا آپس کا معاملہ ہے خود ہی آکر بات کرلینا۔ اچھا میں چلتا ہوں پھر تم پرسوں شام کو آجانا۔“ اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔

”ضرور آجاؤں گی۔“ اس نے کہا۔ اور دروازہ بند کرلیا۔

دروازہ بند کر کے جب وہ پلٹی تو اس نے جنت کو اپنے سامنے ہی کھڑے ہوئے پایا دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں اور زمین کو جنت کی آنکھوں میں آنسو چھلکتے ہوئے نظر آئے جنت نے اس کے اور منشی امیر علی کے درمیان ہونے والی ساری گفتگو سن لی تھی اور صاف ظاہر تھا کہ حاجی مدد علی قریشی کا زمین کو بلانے کا کیا مقصد ہو سکتا تھا۔

”اب حاجی پیسے مانگے گا اماں.....؟“ جنت نے دروازے کے پاس سے ہٹتے ہوئے آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اس نے اسی لئے تم کو بلایا ہو گا۔“

”ہاں بیٹا۔“ زمین نے تھکے ہوئے لہجے میں آہستہ سے کہا۔ ”وہ اب پیسے مانگے گا کیوں نہیں مانگے گا؟ آخر اس نے پیسے دیئے بھی تو تھے۔“

”مگر ہم اس کے پیسے کہاں سے ادا کریں گے اماں؟“ جنت نے کہا۔ ”اور.....وہ تو رقم بھی بہت بڑھا کر بتا رہا ہے دس ہزار کی رقم کو اس نے بڑھا کر بارہ ہزار تک پہنچا دیا ہے شاید اس سے بھی آگے.....“

”اللہ مالک ہے بیٹی۔“ زمین نے جلدی جلدی باورچی خانے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ابھی کتنے بہت سے کام پڑے ہوئے تھے اور آج وہ جلدی سے جلدی کام پر پہنچ جانا چاہتی تھی۔ ”دیکھوں گی پرسوں شام کو کیا کہتا ہے میں نصیبوں جلی اتنی بڑی رقم کہاں سے دے سکتی ہوں؟“

”اماں تم ایسا کرنا اکیلی مت جانا۔“ جنت نے اس کو مشورہ دیا۔ ”ماسی خیراں کو بھی ساتھ لے جانا۔“

”ہاں، تمہاری بات تو ٹھیک ہے۔“ زمین نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ چوہدریوں کے گھر سے کام ختم کر کے پہلے میں اپنے گھر آؤں اور پھر ماسی خیراں کو اپنے ساتھ لے کر بھٹے پر جاؤں۔“

”ہاں اماں ایسا ہی کرو۔“ جنت نے کہا۔ ”ماسی خیراں کو ضرور ساتھ لے کر جانا، حاجی مدد علی قریشی سے سارے معاملات تو ماسی خیراں کی موجودگی میں ہی طے ہوئے تھے شاید ماسی خیراں کا ہی کچھ خیال کرلے۔“ جنت کے لہجے میں بڑی گہری حسرت اور آرزومندی



”ہائے، کیسا دغا دے گیا مجھے ناصر.....“ زمین ایک دم رونے لگی۔ ”خود بھی برباد رہا ہو گا کہیں اور ہمیں بھی برباد کر گیا ایسی اولاد کے ہونے سے تو اچھا ہے کہ اولاد ہی نہ ہو۔ میری بھی کیسی قسمت پھوٹی مرد ملا تو ایسا کہ بس کلیجے پر گھاؤ ہی گھاؤ لگاتا رہا اور اولاد تو ایسی کہ اس نے بھی کلیجہ زخمی کر ڈالا۔“

”وہ آجائے گا اماں۔“ جنت نے اپنی ماں کو اس طرح سے تسلی دینے کی کوشش کی وہ خود کوئی بزرگ ہو اور اس کی ماں اس سے چھوٹی ہو جسے اس کے حرفِ تسلی کی ضرورت ہو۔ ”وہ ضرور گھر آجائے گا، لوٹ کر گھر آئے گا ایک نہ ایک دن.....“

”اور اس وقت تک ہم لوگوں کا کیا حال ہو چکا ہو گا۔“ زمین نے چادر کے پلو سے میلی میلی آنکھوں کے میلے میلے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”ہم کہاں ہوں گے اس وقت؟ جب اس کو گھر آنے کا ہوش آئے گا تو ہم لوگ اس وقت کون کون سے عذاب سے گزر چکے ہوں گے اور گزر رہے ہوں گے؟ جب سب کچھ برباد ہو جائے گا اور پھر وہ آیا تو کیا فائدہ.....؟ بس یہ کہ اس کے آنے سے کلیجے میں ٹھنڈک پڑ جائے گی.....“

”یہ کیا کم خوشی کی بات ہو گی اماں کہ وہ واپس آجائے گا۔“ جنت نے اس کی بات کاٹی۔ ”وہ گھر واپس آجائے گا تو کیا تم کو خوشی نہیں ہو گی؟“

”ہائے میں تو مر جاؤں گی خوشی کے مارے۔“ زمین نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”خدا کرے وہ واپس تو آئے اور جلد واپس آئے وہ آجائے اور کام پر بیٹھ جائے سارے دلدر ہی نہ دور ہو جائیں ہمارے.....“

زمین جلدی جلدی تیاریوں میں مصروف ہو گئی کام پر جانا تھا دیر نہیں ہونی چاہئے وہ اپنے آپ کو بڑی مشکل سے اس بحران سے نکالنے میں کامیاب ہو سکی تھی جو ماں کے باعث پیدا ہو گیا تھا چوہدرانیوں نے اس پر رحم کھایا تھا اور اس کے ساتھ مدد کردی تھی۔

جلدی جلدی تیاریاں کر کے وہ اپنے کام پر چلی گئی اور جنت گھر کو اور بچوں کو سنبھالنے میں لگ گئی۔

☆=======☆=======☆

مراد اس دن کافی مصروف رہا، اس نے اپنے باپ کے ساتھ خاصا وقت منڈی میں

گزارا۔ کاروبار میں اس کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کو دیکھ کر اس کا باپ بہت خوش تھا وہ اپنے بیٹے کی شکل میں ایک نوجوان اور کامیاب بیوپاری کو ابھرتے ہوئے دیکھ رہا تھا باپ اور بیٹا دونوں ہی ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اور مراد اپنے باپ کو اپنا بہت اچھا دوست سمجھتا تھا۔

اس روز شام کے وقت مراد، مسعود کے گھر گیا مسعود کی سوتیلی ماں فریدہ کے علاوہ مسعود کا باپ امتیاز بھی گھر پر موجود تھا۔

"کچھ پتا چلا چاچا.....؟" مراد نے امتیاز سے پوچھا۔

"پتہ کیا خاک چلے گا؟" امتیاز کے بجائے فریدہ نے جل کر جواب دیا۔ "گھر سے پیسے لے کر گیا ہے، جیب گرم ہے اس کی اور ہمارے سر پر مصیبتوں کا پہاڑ کھڑا کر گیا ہے۔ حاجی ہم سے پیسوں کی واپسی کا تقاضا کر رہا ہے، ہم کہاں سے لائیں اتنی بڑی رقم..... وہ تو ہم کو عدالت میں کھینچنے کی دھمکی بھی دے رہا ہے۔"

"آپ پریشان نہ ہوں چاچی۔" مراد نے آہستہ سے مگر اعتماد سے خالی لہجے میں کہا "انشاء اللہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا مسعود واپس ضرور آئے گا۔"

"خدا جانے کہاں نکل گیا کدھر نکل گیا۔" امتیاز کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور اس کے لہجے میں بڑا دکھ تھا یہ ایک چوٹ کھائے ہوئے مایوسی کے شکار انسان کی آواز تھی "خدا جانے اب کب واپس آئے گا اور آئے گا بھی یا نہیں....."

"نہیں، نہیں ایسا نہ کہئے چاچا۔" مراد نے جلدی سے کہا۔ "دیکھئے نا کتنے ہی لڑکے ہوتے ہیں جو گھروں سے چلے جاتے ہیں اور پھر کچھ عرصے کے بعد خود ہی واپس آجاتے ہیں اصل بات تو یہ ہے کہ وہ دونوں اپنی مرضی سے گئے ہیں انہیں کسی نے اغوا نہیں کیا ہے اگر کوئی انہیں پکڑ کر لے جاتا تو وہ زیادہ دردناک صورتِ حال ہوتی اپنی مرضی سے گئے ہیں اور انشاء اللہ اپنی مرضی سے واپس آجائیں گے۔"

"ناصر کے بارے میں کچھ معلوم ہوا؟" فریدہ نے پوچھا۔ "تم گئے تھے ان لوگوں کی طرف.....؟"

"جی..... ناصر کی بھی کوئی خیر خبر نہیں ہے۔" مراد نے کہا۔ "کہیں سے کوئی اطلاع نہیں ہے اس کے بارے میں۔"

"دونوں ہی بھگوڑے کہیں ایک ساتھ ہوں گے۔" فریدہ نے کہا۔ "چوریاں کریں گے ڈاکے ڈالیں گے جیل جائیں گے، جب جیب میں پیسے نہیں ہوں گے تو پھر کیا کریں گے؟ یہی سب کچھ کریں گے نا.....؟"



"وہ..... وہ لوگ کوئی کام بھی تو کر سکتے ہیں چاچی۔" مراد نے محتاط انداز میں کہا۔

"کام.....؟ ہونہہ۔" فریدہ نے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "اگر کام ہی کرنا تھا تو یہاں ہی نہ رہتے؟ یہاں سے بھاگتے کیوں؟ وہ تو یہاں سے بھاگے ہی اس لئے ہیں کہ انہیں کچھ کام نہ کرنا پڑے۔"

"اچھا میں اب چلتا ہوں۔" مراد نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں پھر چکر لگاؤں گا اور اگر کہیں سے ان کے بارے میں کچھ معلوم ہو گا تو میں آپ لوگوں کو بتاؤں گا۔"

"میرا دل کہتا ہے کہ وہ کراچی گئے ہیں۔" امتیاز نے گہری افسردگی کے ساتھ کہا۔ "دوسرے شہروں میں اپنے رشتے داروں سے میں نے معلوم کر لیا ہے وہ وہاں کہیں نہیں اس کا مطلب ہے کہ وہ صرف کراچی میں ہی ہو سکتے ہیں گھروں سے بھاگنے والے وہ تو لڑکے سیدھے کراچی ہی پہنچتے ہیں مگر ہم کراچی جا کر اس کو تلاش نہیں کر سکتے۔ کراچی تو انسانوں کا بہت بڑا جنگل ہے اور کسی جنگل میں کوئی ایک پتے کو کیوں کر تلاش کر سکتا ہے؟ اور ویسے بھی کراچی میں ہمارا کوئی ہے ہی نہیں میں آج تک کبھی کراچی گیا ہی نہیں وہاں جا کر بغیر پتے نشان کے کسی کو تلاش کرنا کوئی مذاق ہے بھلا....."

"اور پھر پیسے کا خرچہ....." فریدہ بولی۔ "ہزاروں روپے چاہئیں کراچی جانے اور وہاں رہنے کے لئے....."

"اللہ مالک ہے جی....." مراد نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں پھر آؤں گا کسی وقت....." اور اس کے ساتھ ہی وہ وہاں سے چلا آیا۔

اس کے پاس اب جنت کے گھر جانے کا ایک جواز موجود تھا وہ مسعود کے والدین کو ملنے کر آرہا تھا اور خبر یہ تھی کہ کوئی خبر نہیں تھی کوئی خبر نہ ہونا بھی تو ایک خبر ہی تھا۔

وہ کافی دیر سے اس وقت جنت کے گھر پہنچا جب زمین اپنے کام پر سے واپس آچکی تھی اس کو دیکھتے ہی زمین کی آنکھوں میں امید کی ایک جھلک نمودار ہوئی شاید..... شاید..... اس کے پاس کوئی خبر ہو..... لیکن اس کی بات سن کر اس کو محض مایوسی ہوئی۔

"میں شام کو مسعود کے گھر گیا تھا چاچی....." اس نے کہا۔ "ان لوگوں کو مسعود کی کوئی خیر خبر نہیں معلوم۔ میں اور بھی کئی لڑکوں سے ان کے بارے میں پوچھ گچھ کرتا رہا ہوں لیکن کسی کو بھی کچھ پتہ نہیں ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں نے اپنا پروگرام

بہت ہی خفیہ رکھا تھا کسی کو بھی ان کا علم نہیں ہے۔"

"ہاں بیٹا....." زمین نے ایک لمبی اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "کسی کو بھی کچھ نہیں معلوم..... اب مقدر کا کھیل ہے بیٹا..... ہمارا نصیب اگر پھوٹا ہوا نہ ہوتا تو ناصر گھر سے بھاگتا ہی کیوں....."

کچھ دیر تک فضا پر بڑی گہری بوجھل اور ناگوار قسم کی خاموشی طاری رہی۔ جنت اپنی ماں کے پاس بیٹھی ہوئی تھی اور چھوٹی بچیاں بھی ماں کے قریب ہی موجود تھیں اب تو نصرت بھی کم از کم اتنی سمجھ دار تو ہو ہی گئی تھی کہ وہ اس معاملے کو اس حد تک سمجھ سکتی تھی کہ بھائی گھر سے بھاگ گیا ہے اور اس کا کوئی پتہ نہیں ہے اور اماں اور آپا بہت پریشان ہیں۔

"میں کھوج میں لگا ہوا ہوں چاچی....." کچھ دیر کے بعد مراد نے کہا۔ "جیسے ہی کہیں سے کوئی بات معلوم ہو گئی میں آپ کو بتاؤں گا۔"

جنت خاموش بیٹھی ہوئی اپنے دوپٹے کے پلو کو انگلیوں سے مروڑ رہی تھی اس کی آنکھوں میں جیسے بجھے ہوئے ستاروں کی گرد تیر رہی تھی۔

"میں نے منڈی میں کاروبار شروع کر لیا ہے چاچی۔" کچھ دیر کے بعد مراد نے زمین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "پہلے تو ابا میرے لئے دکان تلاش کرتے رہے تھے ان کا ارادہ تھا کہ مجھے دکان کرا دیں لیکن مجھے چھوٹی دکان کا کاروبار کچھ پسند نہیں آیا چاچی..... میں نے سوچا کہ تھوک کا بیوپار کرنا اچھا رہے گا تھوک کے بیوپار میں منافع بہت ہے مال خرید کر گھر پر ہی ذخیرہ کر لیتا ہوں ہمارے گھر میں جگہ تو کافی ہے میں اور دونوں مل کر کاروبار کر رہے ہیں۔"

"یہ تو تم نے بہت اچھا کیا بیٹا۔" زمین نے کہا۔ اس کو اچانک یاد آیا کہ ایک روز ناصر نے اس سے کہا تھا کہ مراد نے اس کو بتایا ہے کہ اس کے ابا اس کو دکان کروانے والے ہیں اور ناصر کی بات سن کر اس کو بری طرح ڈانٹا تھا اور تنبیہہ کی تھی کہ وہ مراد سے زیادہ میل جول نہ رکھا کرے۔

اور اب مراد خود اس کے سامنے بیٹھا اس کو اپنے کاروبار کے بارے میں بتا رہا تھا اور وہ سب کچھ سننے پر مجبور بھی تھی وقت بدلتے کیا دیر لگتی ہے وہ جو مراد کی صورت دیکھنے کی روادار نہیں تھی اب مراد کی آمد کی منتظر رہتی تھی اور اس کی باتیں بڑے غور اور توجہ کے ساتھ سننے پر مجبور تھی اور جنت کو بھی اس کے سامنے آنے سے نہیں روکا



جنت تو اس کے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی آخر جب مراد جنت کے گمشدہ بھائی کے حوالے سے گھر میں آئے گا تو پھر جنت کو اس کے سامنے آنے سے کس طرح روکا جا سکے گا؟

"بس چاچی' آپ کی دعا چاہئے۔" مراد نے قدرے عاجزی اور مسکینی کے ساتھ کہا۔ "میرا کاروبار چل نکلے' دو پیسے ہاتھ میں آنے لگیں تو میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھوں گا' اپنے ہاتھ کی کمائی کی تو بات ہی کچھ اور ہوتی ہے چاچی.....اس کا تو مزا ہی کچھ اور ہے۔"

"کتنی سچی بات کہی ہے تم نے بیٹا....." زمین نے فوراً ہی اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "اپنے ہاتھ کی کمائی کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے یہی تو میں نے ناصر کو بھی سمجھایا تھا میں یہی چاہتی تھی کہ وہ بچپن سے ہی خود اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے اور کسی کا محتاج نہ رہے۔ بن باپ کے بچے کے سر پر ہاتھ رکھنے والا بھلا کون ہوتا ہے؟ میں ٹھہری عورت ذات..... ننھی ننھی بچیوں کا ساتھ..... میرے لئے گامو کے بعد ناصر ہی سب کچھ تھا اگر وہ کام کرتا رہتا تو کتنا اچھا ہوتا مگر میری قسمت....." اس نے ایک بار پھر ٹھنڈی سانس بھری۔

"تمہارے لئے میں دعا کرتی ہوں بیٹا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "خدا کرے کہ تمہارا کاروبار کامیاب ہو اللہ تم کو ترقی دے ماں باپ کے کلیجے کو ٹھنڈا رکھو۔"

"بس یہی چاہئے چاچی..... آپ کی دعا چاہئے۔" مراد نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "اس کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہئے۔"

مراد ابھی بیٹھا ہی ہوا تھا کہ ماسی خیراں آ گئی۔ مراد نے اس کو دیکھ کر سلام کیا اور ماسی خیراں نے اس کو دعا دی ماسی خیراں کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ ناصر کے فرار کے بعد سے مراد کی جانب زمین کے رویے میں خاصی تبدیلی آ گئی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ مراد ناصر کو تلاش کرنے میں ان لوگوں کی مدد کر رہا تھا اور اس سارے معاملے میں اس کی ذاتی دلچسپی لے رہا تھا۔

ماسی خیراں کے آنے کے بعد مراد زیادہ دیر نہیں رکا وہ کچھ دیر تک ان لوگوں کے ساتھ باتیں کرتا رہا اور ماسی خیراں کو مسعود کے گھر کا احوال سنانے کے بعد وہاں سے جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"کوئی نئی بات معلوم ہو بیٹا تو ضرور بتانا۔" زمین نے اس سے کہا۔ "میں تو کہیں آ

جا بھی نہیں سکتی۔ دم مارنے کی فرصت نہیں ملتی مجھے۔ صبح کی گئی شام ڈھلنے تک واپس آپاتی ہوں پھر کہاں جاؤں؟ کس کے پاس جاؤں؟"

"آپ کو کہیں آنے جانے کی ضرورت نہیں ہے چاچی۔" مراد نے کہا۔ "میں خود بھاگ دوڑ کرتا رہوں گا اور جو بھی نئی بات معلوم ہو گی آپ کے پاس آکر فوراً آپ کو اس کے بارے میں بتاؤں گا۔"

"خدا تمہیں زندگی دے بیٹا۔" زمین نے کہا اور مراد وہاں سے چلا گیا اس کے جاتے وقت جنت نے نظر اٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھا اور خاموشی کے ساتھ پلنگ پر بیٹھی رہی۔

"میں تو تمہیں بلوانے والی ہی تھی، ماسی خیراں۔" مراد کے جانے کے بعد زمین نے ماسی خیراں سے کہا۔ اس نے مراد کے سامنے منشی امیر علی کی آمد اور اپنی طلبی کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ "بات یہ ہے کہ صبح کو منشی امیر علی آیا تھا۔"

"اچھا.....؟" ماسی خیراں نے ایک دم متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ "کیا کہتا تھا؟"

"حاجی نے مجھ کو بلایا ہے۔" زمین نے کہا۔ "کل تو حاجی کے پاس وقت نہیں۔ پرسوں وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے میں نے منشی سے کہا ہے کہ میں شام کو کام پر واپس آنے کے بعد ہی آسکوں گی۔"

"اچھا..... ہاں ٹھیک ہے۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "تم نے ٹھیک کیا۔"

"میں چاہتی ہوں کہ تم بھی میرے ساتھ چلو ماسی خیراں....." زمین نے کہا۔

"میں جانتی ہوں اس نے مجھے کیوں بلایا ہے کوئی ڈھکی چھپی بات تو ہے نہیں۔ ظاہر ہے رقم کے سلسلے میں ہی بلایا ہو گا اگر تم بھی ساتھ میں ہو گی تو ذرا میری ہمت بندھی رہے اور تم بھی اس کو سمجھانے بجھانے میں میرا ساتھ دے سکو گی۔"

"میں ضرور تمہارے ساتھ چلوں گی۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "میں خود بھی حاجی سے بات کروں گی اس کو سمجھانے کی کوشش کروں گی۔"

"خدا تمہارا بھلا کرے ماسی خیراں۔" زمین نے کہا۔ "تمہارے دم سے مجھے کتنا سہارا ہے۔"

"سہارا تو اللہ کا ہے زمین۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "اسی سے لو لگاؤ وہی سب مشکلیں حل کرے گا۔"

"اس میں کیا شک ہے۔" زمین نے آہستہ سے کہا۔



دوسرے دن زمین ماسی خیراں کو ساتھ لے کر شام ڈھلے حاجی مدد علی قریشی کے پاس گئی۔ زمین چوہدریوں کے پاس سے کام کر کے آج ذرا جلدی گھر آگئی تھی۔ اس نے بڑی بہو رائن کو بتا دیا تھا کہ اس کو بھٹے کے مالک حاجی مدد علی قریشی نے بلایا ہے اور اس کے ساتھ جانا ہے گھر آنے کے بعد وہ ماسی خیراں کو ساتھ لے کر حاجی مدد علی قریشی کے پاس چلی گئی۔

منشی امیر علی نے دونوں عورتوں کو دفتر میں بٹھایا۔ یہ جگہ زمین کے لئے نئی نہیں تھی وہ اس سے پہلے بھی یہاں برابر آتی رہتی تھی یہیں سے وہ ناصر کی تنخواہ کو پلو میں باندھ کر خوشی خوشی گھر جاتی تھی اور یہاں آتے وقت بھی بہت خوش ہوتی تھی لیکن آج وہ خوشی خوشی یہاں نہیں آئی تھی آج تو یہاں آتے ہوئے اس کا کلیجہ کانپ رہا تھا اور جسم ایسے جیسے ساری جان نکلی جا رہی تھی اسے ایک ایک قدم اٹھانا دوبھر ہو رہا تھا اور جب وہ اس دفتر کے اندر داخل ہو رہی تھی تو اس کو ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی قتل گاہ میں داخل ہو رہی ہو۔

حاجی مدد علی قریشی اس وقت دفتر میں موجود نہیں تھا لیکن وہ گھر میں تھا منشی امیر علی نے زمین کو بتایا کہ وہ ابھی ذرا دیر میں آجائے گا۔

ان دونوں کو تقریباً آدھے گھنٹے تک انتظار کرنا پڑا اس کے بعد حاجی مدد علی قریشی ہاتھ کی ایک تیلی سے اپنے دانتوں میں خلال کرتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ کھانا کھا کر آرہا تھا۔ دروازے میں داخل ہونے سے پہلے اس نے چند لمحوں کے لئے تیلی اپنے دانتوں میں سے نکالی منہ میں سے کھانے کے فالتو ریزوں کو زور سے زمین پر تھوکا اور پھر کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔ زمین اور ماسی خیراں نے اس کو سلام کیا اور اس نے منہ میں تیلی پھنسائے پھنسائے ان کو جواب دیا اور پھر ان کے سامنے اس بڑی سی گھومنے والی سیاہ رنگ کی کرسی میں دھنس گیا جو اس کی میز کے ساتھ لگی رہتی تھی۔

"کہاں ہے ناصر؟" اس نے کرسی پر بیٹھتے ہی زمین کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔ "کچھ پتا اس کا.....؟"

"نہیں حاجی صاحب....." زمین نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "کچھ پتہ نہیں چلا حاجی صاحب میں تو اپنی بدنصیبی پر آٹھ آٹھ آنسو روتی ہوں ناصر اور وہ بھی گندا....."

"صرف تم اپنی ہی بدنصیبی پر نہیں روتی ہو زمین میں بھی اپنی بدنصیبی پر روتا

ہوں۔" حاجی مدد علی قریشی نے سپاٹ اور خشک لہجے میں کہا۔ "ہماری تو بہت بڑی رقم پھنس گئی ہے اور اب تم کو کہیں نہ کہیں سے اس کا بندوبست کرنا پڑے گا۔"

"میں تو بہت مجبور اور بے بس ہوں حاجی صاحب....." زمین نے روتے ہوئے کہا۔ "میں اتنی بڑی رقم کا بندوبست بھلا کہاں سے کر سکوں گی؟"

"تمہارے سامنے دو ہی راستے ہیں زمین....." حاجی مدد علی قریشی نے اس کی گریہ وزاری پر کوئی توجہ دیئے بغیر کہا۔ "یا تو تم ناصر کو کام پر واپس لے آؤ اور یا پھر وہ رقم واپس کرو جو تم نے قرض لی تھی۔"

"ناصر کو لانا اگر میرے بس میں ہوتا' حاجی صاحب تو میں کب کا اس کو لا کر آپ کے قدموں میں پھینک دیتی۔" زمین نے کہا۔ "لیکن میں تو اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی۔ خدا گواہ ہے مجھے تو کچھ نہیں معلوم کہ وہ کہاں چلا گیا ہے میں تو اس کی یاد میں آٹھ آٹھ آنسو روتی ہوں۔"

"اور ہم جو سولہ سولہ آنسو رو رہے ہیں' اس کا کیا ہو گا؟" حاجی نے خشک لہجے میں کہا۔ "دیکھو بھئی میں کاروباری آدمی ہوں اور تم کو معلوم ہے کہ کاروبار کوئی مذاق نہیں ہے آدمی کا لاکھوں روپیہ پھنس جاتا ہے کاروبار میں اور یہ بھی جان لو کہ کاروبار میں ہمیشہ فائدہ ہی نہیں ہوتا نقصان بھی ہوتا ہے۔ اپنے ملازموں کو تو ہم نقصان میں بھی شریک نہیں کرتے خود ہی بھگت لیتے ہیں جو بھی بھگتنا ہوتا ہے لیکن ہم پیسہ اس طرح ضائع نہیں کر سکتے۔ تم پر دس ہزار روپے کی رقم واجب الادا ہے جو اب بڑھ کر بارہ ہزار سے کچھ زیادہ کی ہو چکی ہے صحیح رقم تو منشی امیر علی بتائیں گے تم وہ رقم ادا کر دو اور میں تمہارا کاغذ تم کو واپس کر دوں گا۔"

"یہ بے چاری کہاں سے رقم ادا کرے گی حاجی صاحب.....؟" ماسی خیراں نے زمین کی وکالت کرتے ہوئے کہا۔ "اس کے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے اور اوپر سے چار چار بیٹیوں کی شادی کا بوجھ اس کے کندھوں پر دھرا ہوا ہے آپ خدا ترس آدمی ہیں حاجی صاحب' اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیا ہے آپ....."

"ارے بھئی اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے دیا ہے تو اس لئے تو نہیں دیا ہے کہ میں اس کو یوں لٹاتا اور برباد کرتا پھروں؟" حاجی مدد علی قریشی نے بڑی ناگواری کے ساتھ کہا۔ "آخر میں نے اس کو پیسے قرض دیئے تھے اب ایمانداری کا تقاضا یہ ہے کہ یہ میرے پیسے واپس کرے اگر اس کا بیٹا کام پر واپس نہیں آتا تو پھر پیسے تو واپس کرنے ہوں گے۔"



...ے کی رقم اس طرح سے ہضم تو نہیں کر سکتیں واپس تو دینے ہوں گے پیسے.....
...ہیں سے کرو' کچھ کرو۔"

اس دوران منشی امیر علی ایک رجسٹر کو لئے ہوئے خاموشی سے کچھ حساب کتاب میں مصروف تھا۔

"یہ بے چاری کہاں سے کرے گی حاجی صاحب؟" ماسی خیراں نے کہا۔ "گھروں میں جھاڑو برتن کرنے والی غریب عورت..... یہ اتنی بڑی رقم کہاں سے لائے گی..... آپ کچھ خیال کریں' حاجی صاحب....."

اس وقت منشی امیر علی بول اٹھا۔ "میں نے حساب لگایا ہے۔" اس نے کہا اور پھر جو رقم اس نے بتائی وہ بارہ ہزار روپے سے بھی زیادہ کی تھی۔

"دیکھو بھئی میں زیادہ سے زیادہ یہ رعایت کر سکتا ہوں کہ مزید سود روک دوں۔" حاجی مدد علی قریشی نے کہا۔ "ورنہ سود کا طریقہ تو یہ ہوتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ قرض کی رقم پر سود برابر بڑھتا جاتا ہے اب تم چونکہ ایک غریب عورت ہو اس لئے میں تمہارے ساتھ اتنی رعایت کر سکتا ہوں کہ اس رقم کو یہیں روک دوں۔ چنانچہ میں اس رقم کو تیرہ ہزار پر لا کر ختم کر دیتا ہوں ورنہ جیسے جیسے دن گزرتے جائیں گے رقم بڑھتی جائے گی اب تم یہ جان لو کہ تم کو میرے کل تیرہ ہزار روپے ادا کرنے ہیں اور کوشش کرو کہ جس قدر جلدی ممکن ہو سکے تم یہ رقم ادا کر دو میں تمہیں دو ماہ کی مہلت دیتا ہوں۔ آج سے دو ماہ کے اندر اندر تم کچھ نہ کچھ بندوبست کر کے یہ رقم ادا نہ دو۔ ورنہ اس سے کیا فائدہ کہ تم کو کچہری تھانے میں گھسیٹتا پھروں۔ تم بچوں والی عورت ہو میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا لیکن اگر تم نے رقم ادا نہیں کی تو پھر میرے پاس عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہو گا اور اس صورت میں پھر تم کو معاہدے پر لکھی ہوئی شرائط کے مطابق پوری واجب الادا رقم ادا کرنی ہو گی یہ مت بھولو کہ تم کاغذ پر انگوٹھا لگا چکی ہو۔"

"حاجی صاحب اب آپ اتنی سختی تو نہ کریں۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "کچھ تو خیال کریں اس کا..... اس کا شوہر....."

"ساری باتوں کا خیال کر کے ہی تو میں اتنی رعایت دے رہا ہوں۔" حاجی مدد علی قریشی نے کہا۔ "اگر اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میں اس سے ایک ہفتے کے اندر اندر پیسے وصول کر کے دکھا دیتا۔ یہ غریب اور بے سہارا عورت ہے اس لئے اس کو اتنی چھوٹ دے رہا

ہوں اور دو ماہ کی مہلت بھی اس لئے دے رہا ہوں کہ اگر اس عرصے میں ناصر واپس آجائے اور دوبارہ کام شروع کر دے تو پھر اس سارے معاملے پر نئے سرے سے غور کیا جا سکتا ہے۔"

"تیرہ ہزار تو بہت بڑی رقم ہے حاجی صاحب۔" اچانک زمین کی آنکھیں چمک پڑیں اور اس کے وجود کا سارا درد اس کی کھوکھلی اور گلوگیر آواز میں اتر آیا۔ "میں کہاں سے لاؤں گی تیرہ ہزار روپے کی رقم مجھے تو کوئی ادھار بھی نہیں دے گا۔"

"ایک ادھار چکانے کے لئے دوسرا ادھار کون دے گا؟" ماسی خیراں نے آہستہ سے کہا۔

"اب تم لوگ جاؤ۔" حاجی مدد علی قریشی نے گویا اپنی طرف سے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ "اور دو مہینے کے اندر اندر رقم کا بندوبست کر لینا ابھی کافی لمبی مدت ہے اس دوران کچھ نہ کچھ کر ہی سکتی ہو تم..... اور اتنی بات اچھی طرح جان لو کہ یہ رقم تم کو ہر صورت میں ادا کرنی ہے۔" اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ چلتے چلتے ماسی خیراں نے اس سے مزید کچھ کہنے سننے اور رعایت حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن حاجی مدد علی قریشی کچھ سننے کے لئے تیار نہیں تھا اس نے زمین کو مزید کوئی رعایت دینے سے صاف انکار کر دیا۔

وہ دونوں جب بھٹے کے احاطے سے نکل کر باہر آئیں تو زمین ہلکی ہلکی سسکیوں کے ساتھ رو رہی تھی اسے یہ توقع تو پہلے بھی نہیں تھی کہ حاجی مدد علی قریشی اس کے ساتھ کوئی رعایت کرے گا لیکن پھر بھی ایک موہوم سا خیال تھا کہ شاید بہتری کی کوئی صورت نکل آئے لیکن کیا صورت نکل سکتی تھی؟ رقم کی واپسی تو بہرحال ضروری تھی کیونکہ ناصر کی واپسی کا کوئی یقین نہیں تھا۔

"ہم اس سے دوبارہ بات کریں گے۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "تم اتنی پریشان مت ہو کوئی نہ کوئی صورت تو نکالنی ہو گی یا پھر دیکھیں گے کسی اور کو بیچ میں ڈال کر فیصلہ کروائیں گے شاید حاجی رقم میں کچھ کمی کرنے کے لئے تیار ہو جائے اگر رقم کچھ کم ہو جائے تو کچھ تو سہولت ہو جائے گی۔ ناصر کی واپسی کے سہارے تو نہیں بیٹھا جا سکتا۔ کون جانے وہ کب تک واپس آئے....."

"اور وہ حاجی مجھے جیل بھجوانے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔" زمین نے روتے ہوئے کہا۔ "ظاہر ہے کہ وہ تو یہ کرے گا ہی میں نے رقم لی ہے اس کے کاغذ پر انگوٹھا لگا



ہے میں اس بات سے انکار کس طرح کر سکتی ہوں.....؟"

"ایک کام کرو زمین۔" ماسی خیراں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "تم چوہدرانیوں سے بات کر کے دیکھو۔ اگر وہ تمہیں کچھ رقم قرض دے دیں چھ سات ہزار چار پانچ ہزار..... جتنی بھی دے سکیں پھر تمہاری تنخواہ میں سے کاٹتی رہیں۔ پھر دیکھیں گے کچھ اور بھی سوچیں گے۔"

"ارے ماسی خیراں ..... بھلا وہ لوگ کیا دیں گی؟" زمین نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "ان کا بس چلے تو وہ الٹا مجھ سے ہی کچھ نہ کچھ لے لیں..... پھر بھی میں بات کر کے دیکھوں گی۔"

"ان کو ساری صورت حال کا علم تو ہے ہی۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "انہیں مجبوری کا اندازہ ہو سکتا ہے وہ تمہارا کچھ خیال کر لیں۔"

"میں کل ہی ان سے بات کروں گی۔" زمین نے کہا۔ "میں بڑی چوہدرائن سے بات کروں گی چھوٹی تو اسی وقت جھٹ سے منع کر دے گی۔"

دونوں باتیں کرتی ہوئی گھر واپس آگئیں ماسی خیراں اپنے گھر چلی گئی اور زمین اپنے گھر آگئی جہاں جنت بڑی بے چینی کے ساتھ اس کا انتظار کر رہی تھی۔

اپنی ماں کی آنکھوں کے گرد آنسوؤں کی گدلاہٹ دیکھ کر ہی جنت کو فوراً اندازہ ہو گیا کہ وہ کوئی اچھی خبر لے کر نہیں آئی ہے۔ ویسے جنت کسی اچھی خبر کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

حاجی سے جو بھی بات ہوئی تھی' وہ زمین نے جنت کو بتا دی۔ جنت کے لئے اس میں کچھ بھی غیر متوقع نہیں تھا لیکن جو کچھ بھی تھا وہ بڑا یاس انگیز اور دردناک تھا۔

"اماں' مجھے بھی کہیں کام پر لگا دو نا۔" اس نے شکستہ آواز میں اپنی ماں سے کہا۔ "میں بھی کہیں کچھ کرنے لگوں گی تو دو پیسے ہاتھ میں آئیں گے کچھ تھوڑا بہت تو کام بنے گا۔"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ کام ملنا آسان نہیں ہے۔" زمین نے کہا۔ "میں اپنے ہی کام کو کس مشکل سے سنبھالے ہوئے ہوں اب تک کئی عورتیں تو تاک لگائے بیٹھی ہیں اور ..... اگر تم بھی کام کرنے چلی جاؤ گی تو بچیوں کو کون دیکھے گا؟" "یہ چھوٹی چھوٹی بچیوں کا عذاب جو میری جان کے ساتھ لگا ہوا ہے' اس کا کیا ہو گا؟ گھر کو کون سنبھالے گا؟"

"ماسی خیراں تھوڑا بہت خیال کرلیا کریں گی۔" جنت نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں بیٹا..... کسی پناہ دینے والی ٹہنی پر اتنا زیادہ بوجھ مت ڈالو کہ وہ ٹوٹ کر گر جائے۔" زمین نے کہا۔ "ماسی خیراں نے ہمارے لئے کتنا کچھ کیا ہے اور وہ کتنا کچھ کر رہی ہیں ہم ان پر اس سے زیادہ بوجھ نہیں ڈال سکتے۔"

"میں کچھ کرلیتی تو اچھا تھا اماں۔" جنت نے کہا۔ "کچھ تمہارا ہاتھ بٹا لیتی۔"

"ارے بیٹا جو ہاتھ بٹا سکتے تھے، جنہیں ہاتھ بٹانا چاہئے تھا وہ تو اپنا کالا منہ کرکے جانے کہاں کہاں دفعان ہوگئے، مجھے اکیلے طرح طرح کے عذاب جھیلنے کے لئے..... میں اور تم اکیلے ہی تو رہ گئے ہیں اس گھر کو سنبھالنے والے..... تم بس بچیوں کی دیکھ بھال کرتی رہو اور میری ہڈیوں میں جب تک دم ہے، میں کچھ نہ کچھ کرتی رہوں گی، جب تک سانس ہے، بدن میں تو کام سے ہاتھ نہیں روکوں گی اور جس دن یہ سانس بھی بند ہوگیا اس دن اللہ حافظ ہے پھر تو یہ ہے کہ جس نے پیدا کیا ہے، وہی پرورش کی سبیل بھی نکالے گا۔" اس کی آنکھوں سے یکبارگی آنسو بہنے لگے۔

"خدا کے لئے ایسی باتیں تو منہ سے مت نکالو اماں۔" جنت نے گلوگیر آواز میں کہا اور اپنی ماں کے گلے لگ گئی۔ اس رات زمین کو بڑے بُرے بُرے خواب دکھائی دیتے رہے کبھی اس نے دیکھا اس کے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑی لگی ہوئی ہے اور پولیس کے سپاہی اس کو گھسیٹتے ہوئے جیل کی طرف لے جا رہے ہیں اور حاجی مدد علی قریشی ہاتھ میں ایک ہنٹر لئے ہوئے ان کے ساتھ ہے۔ حاجی مدد علی کے دانت کسی خونی درندے کے دانتوں کی طرح بہت بڑے بڑے ہیں اور وہ ہنس رہا ہے ہنسنے کی وجہ سے اس کے دانتوں کی ہیبت ناکی میں اور بھی زیادہ اضافہ ہوگیا ہے اور پھر وہ بڑے زور سے ایک شیطانی قہقہہ لگاتے ہوئے زمین کی پشت پر ایک ہنٹر رسید کردیتا ہے اور زمین بلبلا کر چیختی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھ کھل جاتی ہے کبھی وہ دیکھتی ہے کہ وہ اور ناصر دونوں رسیوں سے جکڑے ہوئے کسی حوالات کے ننگے کھردرے اور چبھنے والے فرش پر پڑے ہوئے ہیں اور دور کہیں سڑک پر جنت بھیک کا پیالہ ہاتھ میں لئے ہوئے دھیرے دھیرے چل رہی ہے اور تینوں چھوٹی بچیاں اس کے پیچھے پیچھے ہیں۔

اس طرح کے خوفناک خواب ساری رات اس کو تنگ کرتے رہے اور اسے ٹھیک سے نیند نہیں آسکی۔ صبح کو وہ معمول سے جلدی ہی بیدار ہو کر روز مرہ کی تیاریوں میں لگ گئی کم خوابی کی وجہ سے اس کا سر بھاری اور آنکھوں میں جلن ہو رہی تھی



رات گزری تھی اور کس قدر بُری صبح تھی۔ نیا طلوع ہونے والا دن اس کے لئے صرف درد اور خوف کی علامت تھا۔

کچھ دیر کے بعد وہ کام پر روانہ ہوگئی اور آج وہ کچھ جلدی پہنچ گئی۔ آج چوہدرانیوں کو راضی رکھنا بہت ضروری تھا کوئی خاص امید تو نہیں تھی لیکن شاید..... شاید خدا ان کے دل میں نیکی ڈال دے اور وہ کچھ تھوڑی بہت مدد کردیں۔

کچھ دیر کے بعد جب اس کو موقع ملا تو اس نے ہمت کرکے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ بڑی چوہدرائن کے ساتھ اس بارے میں گفتگو کی۔ اس نے بڑے دبے دبے لفظوں میں گہری عاجزی اور مسکینی کے ساتھ جیسے حالات نے اس کے وجود اور اس کی شخصیت کا جیسے ایک حصہ بنا دیا تھا بڑی چوہدرائن کو اپنی بپتا سنائی اور اسے بتایا کہ حاجی مدد علی قریشی اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

"افسوس کی بات ہے۔" بڑی چوہدرائن نے ساری بات سننے کے بعد کہا۔ "لیکن اب حاجی کی بھی تو مجبوری ہے وہ بھی کیا کرے؟ پھر بھی اسے تمہارے ساتھ کچھ تھوڑی بہت رعایت تو کرنی چاہئے۔"

"اگر آپ کچھ مدد کردیں بڑی بی بی....." زمین گھگیاتے ہوئے بولی۔ "جو بھی تھوڑی بہت کچھ بھی ہو سکے تو میرا بوجھ ہلکا ہو جائے گا آپ میری تنخواہ میں سے کاٹتی رہئے گا۔ میں آپ کی پائی پائی....."

"نہیں زمین..... " بڑی چوہدرائن نے اس کی بات کاٹتے ہوئے جواب دیا۔ "ایسا بالکل ممکن نہیں ہے تم کو تو معلوم ہے ہمارا نیا مکان بن رہا ہے اور اس میں اندازے سے کہیں زیادہ پیسہ لگ چکا ہے اور ابھی خدا جانے اور کتنا پیسہ لگے گا ہمارا ہاتھ تو آج کل بہت تنگ ہے ہم تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتے۔"

"کچھ تھوڑا بہت ہی ہو جاتا بڑی بی بی....." زمین کی زبان سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔

"نہیں زمین کچھ بھی نہیں ہو سکے گا۔" بڑی چوہدرائن نے کہا۔ "ابھی کل ہی پچاس ہزار روپے کا سریا اور منگوانا پڑا ہے جتنا ٹھیکے دار نے بتایا تھا اس سے کہیں زیادہ سریا پہلے ہی لگ چکا ہے اور ابھی شاید مزید لگے گا مکان بنوانا کوئی مذاق تھوڑی ہے۔"

واقعی مکان بنوانا کوئی مذاق نہیں تھا۔ زمین خاموش ہوگئی اس کو معلوم تھا کہ آگے کچھ کہنا بیکار ہے ایک ہلکی سی موہوم سی آس تھی سو وہ بھی ختم ہوگئی۔ آگے کیا ہوگا، اس

کے بارے میں تو کچھ سوچتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا۔

کام ختم کرکے وہ گھر کے لئے روانہ ہوئی۔ بڑی چوہدرائن نے آج از راہ نوازش اسے کچھ زیادہ کھانا دے دیا تھا شاید اس طرح وہ اس کے غم و اندوہ کی کچھ تلافی کرنا چاہتی تھی۔ زمین جب اپنے گھر میں داخل ہوئی تو اسے اندھیرا کچھ زیادہ ہی لگا جنت اور چھوٹی بچیاں اسے پرچھائیوں کی طرح چلتی پھرتی نظر آ رہی تھیں۔

جنت نے اپنی ماں کے چہرے کی طرف دیکھا اور یکبارگی اس کے دل میں درد کی ایک گہری ٹیس اٹھی جو آن کی آن میں اس کے سارے وجود کو ہلا کر گزر گئی پچھلے کچھ دنوں کے دوران اماں کے چہرے کا رنگ کس قدر پھیکا اور سیاہ ہو گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے ان کے چہرے کو جھلسا کر رکھ دیا تھا اور چہرے کا اچھا خاصا گوشت نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا اس کی جگہ ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ کیسی ہو گئی تھیں اماں..... دیکھتے ہی دیکھتے کس قدر تیزی سے بدل گئی تھیں اور آج تو وہ ہر دن سے زیادہ مضمحل اور پژمردہ نظر آ رہی تھیں۔ کاش وہ ان کی کچھ مدد کر سکتی۔ زمین گھر میں آکر صحن میں پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئی اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بہت زیادہ تھک گئی ہو جیسے وہ کسی تپتے ہوئے بے آب و گیاہ ریگ زار میں میل ہا میل کا پیدل سفر کرکے آ رہی ہو اور اب اس کی ٹانگوں میں ایک قدم اٹھانے کی بھی سکت نہ ہو اور اس کے جسم سے ساری جان نکل چکی ہو۔

"کھانا گرم کرلو۔" اس نے جنت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور خود پلنگ پر دراز ہو گئی۔ جنت نے ایک میلا کچیلا سا تکیہ لا کر اس کے سر کے نیچے رکھ دیا اور زمین نے آنکھیں بند کرلیں۔

جنت نے اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ اس کی ضرورت ہی نہیں تھی جنت کو پہلے سے معلوم تھا کہ چوہدرائن کیا جواب دیں گی اور ان کا جواب اسے اپنی ماں کے چہرے پر لکھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ جنت نے زمین کے تھیلے میں سے کھانا نکالا تینوں بچیاں اس کے گرد جمع ہو گئی تھیں وہ ان کو ساتھ لے کر باورچی خانے میں چل گئی۔ کھانے کے دوران زمین نے خود ہی جنت کو بتایا کہ بڑی چوہدرائن نے اس کی ذرا سی بھی مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا ہے۔ "ان کا مکان بن رہا ہے۔" زمین کے لہجے میں تھکن اور گہری اداسی تھی۔ "ان کے پاس ہمیں دینے کے لئے کوئی پیسہ نہیں ہے۔"

"مجھے تو پہلے ہی اندازہ تھا اماں....." جنت نے آہستہ سے کہا۔ "وہ لوگ بھلا



کیوں مدد کرنے لگے؟"

زمین نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے کھانا کھاتی رہی۔ ان لوگوں نے ابھی کھانا ختم ہی کیا تھا کہ ماسی خیراں آ گئی۔

"میں تو ابھی خود تمہاری طرف آنے والی تھی۔" زمین نے اس کو دیکھتے ہی کہا۔ "بس یہی سوچ رہی تھی کہ کھانا کھالوں تو چلوں۔"

"اچھا بتاؤ تم نے چوہدرانیوں سے بات کی تھی؟" ماسی خیراں اس بارے میں جلد از جلد سب کچھ جان لینے کی خواہشمند تھی۔

"کی تھی....." زمین نے نظریں جھکا کر آہستہ سے کہا۔ "اور ان کا وہی جواب جس کی ان سے امید تھی وہ لوگ کوئی ذرا سی بھی مدد نہیں کر سکتے۔"

ماسی خیراں خاموش ہو گئی۔ زمین بھی خاموش تھی۔ جنت بھی خاموش تھی سب خاموش تھے اور ذرا دیر تک وہ سب کے سب اس طرح خاموش بیٹھے رہے جیسے وہ گونگے ہو گئے ہوں جیسے سب کے سب بولنا بھول گئے ہوں۔ تینوں اپنے اپنے خیالات میں گم تھے۔

"کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا ماسی خیراں۔" کچھ دیر کے بعد زمین نے شکستہ آواز میں کہا۔ "حاجی مدد علی قریشی سے پیچھا چھڑانا آسان تو نہیں اگر اس نے مجھے جیل بھجوا دیا تو میرے بچے تو در در کو بھیک مانگتے پھریں گے۔"

"اے ہے توبہ کرو زمین۔" ماسی خیراں نے جلدی سے کہا۔ "کیوں ایسی بری بری باتیں زبان سے نکالتی ہو؟ خدا نہ کرے ایسا ہو بھیک مانگیں تمہارے دشمن..... تم بھلا کیوں بھیک مانگو۔"

کچھ دیر کے بعد میلے دوپٹے سے اپنی نم آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے وہ ماسی خیراں کے ساتھ بیٹھی اپنے جملہ اثاثوں کا حساب کتاب کر رہی تھی۔

"حاجی تیرہ ہزار مانگ رہا ہے۔" زمین نے آہستہ سے کہا۔ "اور تیرہ ہزار تو شاید بڑی مشکل سے کھینچ تان کر کسی طرح سے پورے کرلوں گی۔"

"وہ کیسے.....؟" ماسی خیراں نے پوچھا۔

"دیکھو..... پانچ ہزار تو وہ تھے جو حاجی سے بعد میں ملے تھے وہ ویسے کے ویسے رکھے ہوئے ہیں ان میں سے کوئی ایک پیسہ بھی خرچ نہیں ہوا۔ یہ سارے پیسے میں دوبارہ حاجی کے حوالے کر سکتی ہوں۔ تو اب اس کے آٹھ ہزار بچتے ہیں ان کا بھی کچھ

بندوبست ہو سکتا ہے۔" اس کی آواز کسی ہلکی سی سسکی میں تبدیل ہو گئی تھی۔

"کیا بندوبست کرو گی تم.....؟" ماسی خیراں نے پوچھا۔

"کچھ زیور بنوا کر رکھے ہیں جنت کے لئے..... اور کچھ نصرت کے لئے..... کچھ سونے کے ہیں کچھ چاندی کے ہیں۔" زمین اس طرح بول رہی تھی جیسے خواب کے عالم میں بول رہی ہو اس کی زبان سے نکلنے والے الفاظ ایک خواب ناک کیفیت کی عکاسی کر رہے تھے۔ "تم کو معلوم ہی ہے ماسی خیراں..... زیادہ چیزیں تو تمہارے ساتھ ہی کر خریدی تھیں۔"

"ہاں' مجھے یاد ہے۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "مجھے اچھی طرح یاد ہے۔"

"اور کچھ زیور میرا اپنا ہے۔" زمین اسی خوابناک انداز میں بول رہی تھی۔ "بڑی مشکل سے گامو کی دست برد سے بچا کر رکھا تھا اس کو..... وہ بھی اس کے ساتھ دوں گی تو اس سارے زیور کو اگر بیچوں تو شاید آٹھ ہزار روپے مل جائیں اور اگر اتنے مل سکیں تو پھر گھر کی کچھ اور چیزیں بیچی جا سکتی ہیں۔ کچھ برتن جمع کر کے رکھے ہیں لڑکیوں کے لئے..... کچھ اور دوسری چیزیں ہیں سب کو بیچ دوں گی کچھ بچے ہوئے پیسے بھی ہیں کسی نہ کسی طرح سے آٹھ ہزار کی رقم پوری کر دوں گی۔"

"پھر تمہارے پاس بچے گا کیا.....؟" ماسی خیراں نے آہستہ سے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں؟" زمین نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ "یہ تیرہ ہزار روپے پورے کرنے کے بعد میرے پاس کچھ نہیں بچے گا۔ میرے پاس اپنی بچیوں کو دینے کے لئے ایک چھلا بھی باقی نہیں رہے گا جو کچھ بھی اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر بچیوں کے لئے جمع کیا ہے' اب حاجی کو دینا پڑے گا تب کہیں جا کر اس کا قرضہ پورا ادا ہو سکے گا۔"

یہ الفاظ کہتے وقت اس نے پہلے ایک نظر جنت کے چہرے پر ڈالی جو ان دونوں کے قریب ہی خاموش بیٹھی ہوئی ان کی باتوں کو سن رہی تھی اور دوسری نظر اس نے کلثوم پر ڈالی۔ جنت سے کلثوم تک کتنا طویل فاصلہ تھا جو اس کو طے کرنا تھا اور اس پورے فاصلے کو طے کرنے کے لئے اس کو کتنے زادِ راہ کی ضرورت تھی اور یہاں تو سفر کے پہلے مرحلے کا ہی زادِ راہ لٹا جا رہا تھا کچھ بھی باقی نہ بچنے والا تھا پھر اگلے مراحل کے لئے زادِ راہ کے بارے میں تو سوچنا ہی بے کار تھا شاید سارا سفر ہی نئے سرے سے شروع کرنا ہو گا..... مگر کیسے.....؟ کیسے ہو سکتا تھا یہ سب کچھ.....؟

ایک دم سے اس کو ایسا لگا جیسے آن کی آن میں جنت پوری طرح جوان ہو گئی ہے



اور اس کی سرکش جوانی اس کے لئے ایک للکار بن گئی ہے اور جنت سے چند قدم پیچھے نصرت کھڑی ہے اور.....

"نہیں..... نہیں زمین۔" وہ ماسی خیراں کی آواز سن کر جیسے اپنے خواب سے چونک پڑی۔ "ایسا مت کرنا زمین..... اگر تم نے سب کچھ حاجی کو دے ڈالا تو پھر بچیوں کے لئے تمہارے پاس کیا بچے گا؟ پھر یہ بے چاریاں کیا کریں گی؟"

"اللہ مالک ہے ماسی خیراں....." زمین نے ایک لمبی اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "جو کچھ بھی ان کی قسمت میں لکھا ہے' وہی ان کے ساتھ ہو گا میں اور تم بھلا کیا کر سکتے ہیں؟"

جنت سر جھکائے بیٹھی تھی اس تمام گفتگو کے دوران وہ کچھ نہیں بولی تھی لیکن یہ ساری باتیں سن سن کر اس کا دل جیسے اندر سے ٹکڑے ٹکڑے ہوا جا رہا تھا کاش..... کاش..... وہ لڑکی نہ ہوتی' کاش اس گھر میں کوئی بھی لڑکی نہ ہوتی' کاش اس کی تینوں چھوٹی بہنیں لڑکیوں کے بجائے لڑکے ہوتیں..... لڑکی ہونا نہ صرف اپنے لئے عذاب تھا بلکہ اپنے والدین کے لئے بھی عذاب تھا۔

"لیکن کیا لڑکا ہونا عذاب نہیں تھا؟" اس کے وجود کے اندر سے کہیں بہت دور سے ایک سوال نے سر ابھارا۔ "آخر ناصر بھی تو لڑکا تھا' مسعود بھی تو لڑکا تھا..... اور..... اور ابا بھی تو لڑکے تھے..... لیکن..... شاید ان لوگوں کی بات دوسری ہے انہیں جہیز نہیں چاہئے ہوتا۔"

جنت کا دماغ بری طرح الجھا ہوا تھا۔ "آخر اماں بھی تو "لڑکی" ہیں وہ اس گھر میں اکیلی کمانے والی اور سارے گھر کی پرورش کرتی ہیں۔"

"اس نے وقت دیا ہے۔" یکایک گہری خاموشی میں ماسی خیراں کی آواز ایک بار پھر گونجی۔ "اس نے دو ماہ کا وقت دیا ہے دو ماہ کی مدت اچھی خاصی ہوتی ہے زمین کیا خبر اس عرصے کے دوران ناصر واپس ہی آ جائے اور یہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل ہو جائے۔ ویسے میں دوبارہ اس کے پاس جاؤں گی مگر ابھی نہیں کچھ دنوں کے بعد میں اس سے بات کروں گی ہم رعایت حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔"

"تم کوشش کر دیکھو ماسی خیراں.....۔" زمین نے مایوسی کے ساتھ کہا۔ "مجھے تو امید نظر آتی نہیں کہ حاجی میرے ساتھ کوئی رعایت کرے گا وہ اپنے پیسے لئے بغیر میری جان نہیں چھوڑے گا۔"

"پیسے تو وہ لے گا۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "پیسے لئے بغیر جان نہیں چھوڑے گا یہ بات بالکل صحیح ہے تمہاری..... لیکن اگر پیسوں میں کچھ کمی ہو جائے تو اچھا ہے اور کچھ مزید مہلت بھی مل جائے میں اس کے لئے کوشش کروں گی ابھی ہمارے پاس دو مہینے تو ہیں۔"

"دو مہینے میں کیا ہو جائے گا ماسی خیراں.....؟" زمین نے کہا۔ "کہیں سے پیسے آنے کی امید تو نہیں ہے ہاں بس یہ ایک دل کو بہلانے والی بات ہے کہ ناصر واپس آجائے گا کاش..... خدا کرے..... یہ بات سچ ہو جائے۔" زمین ایک بار پھر مضمحل اور نڈھال سی ہو گئی۔

جنت ان دونوں کی باتیں خاموشی سے سن رہی تھی اور بہت دیر سے یہ سوچ رہی تھی کہ اسے بھی کچھ بولنا چاہئے لیکن وہ کیا بول سکتی تھی؟ اس نے بہت چاہا کہ کوئی ایسی بات کہے جس کی کوئی اہمیت ہو لیکن اس وقت ایسی کوئی بات اس کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہی تھی۔

ماسی خیراں چلی گئی اور اس کے جانے کے بعد سب لوگ سونے کی تیاری کرنے لگے زمین بہت تھکی ہوئی تھی جب جسم کے ساتھ ساتھ دل بھی تھکا ہوا ہو' روح بھی تھکی ہوئی ہو تو انسان مردے سے بدتر ہو جاتا ہے جنت اس رات بہت دیر تک جاگتی رہی اور اپنی اور اپنے گھر والوں کی بدنصیبیوں پر غور کرتی رہی اسے اپنی ماں پر حد درجہ ترس آ رہا تھا کوئی بھی تو اس کو سکھ دینے والا نہیں تھا سب نے اس کو صرف دکھ دیئے تھے اور دکھوں کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے اس کی کمر ٹیڑھی ہوئی جا رہی تھی۔ جنت کے دل میں بڑی شدت کے ساتھ یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ وہ اپنی ماں کے دکھوں کو کم کرنے کے لئے کچھ کرے۔ ماں کے دکھوں میں اضافے کا ایک اہم سبب جنت اور اس کی چھوٹی بہنوں کا وجود بھی تو تھا۔ چار چار لڑکیاں..... اور باپ اور بھائی لاپتہ..... نہ ہونے کے برابر..... اکیلی جان ماں کی' کیا کیا کرے؟ کس طرح کرے؟

لڑکی ہونے کے خجالت آمیز احساس نے جنت کو ایک بار پھر اپنی گرفت میں لے لیا اور اسے اپنا وجود بالکل ہی بے مصرف' حقیر اور بے مایہ نظر آنے لگا اس سے تو اچھا تھا کہ وہ پیدا ہی نہ ہوئی ہوتی۔ اپنی ماں کے دکھوں میں اضافے کا سبب تو نہ بنتی..... لیکن اگر وہ نہ پیدا ہوئی ہوتی تو پھر ماں کی عدم موجودگی میں ان ننھی ننھی جانوں کی دیکھ بھال کون کرتا؟ پھر تو ماں نوکری بھی نہیں کر سکتی تھی۔ جنت اپنے وجود کی افادیت اور عدم افادیت



کے درمیان ڈولتی رہی اور پھر اسے نیند آگئی۔

اگلے دن صبح کو زمین معمول کے مطابق کام پر روانہ ہو گئی اور جنت چھوٹی بچیوں کے ساتھ اکیلی رہ گئی اس کے ذہن میں بہت ساری باتیں آپس میں گڈمڈ ہو رہی تھیں اگر اس نے واقعی سب کچھ بیچ کر حاجی کا قرضہ چکا دیا تو پھر اس کے بعد کیا ہو گا؟ پھر اس کے اور چھوٹی بہنوں کے لئے کیا رہ جائے گا؟ لیکن پھر اماں اور کریں بھی کیا؟ یکبارگی اس کے دل میں ایک نئے عزم' نئے ولولے اور جوش نے جنم لیا۔ اگر اماں سارا سارا دن کام کر سکتی ہیں تو میں کیوں نہیں کر سکتی؟ کیا میرے ہاتھ پیروں میں جان نہیں ہے؟ میں تو اماں سے زیادہ محنت کر سکتی ہوں ٹھیک ہے اماں سب کچھ بیچ کر اس منحوس حاجی کا قرضہ چکا دیں اور اس کے چنگل سے اپنی جان چھڑا لیں پھر ہم ایک نئی زندگی شروع کریں گے میں کام کروں گی۔ اماں اگر نہیں مانیں گی تو میں خود ماسی خیراں سے بات کروں گی اور پھر یہ کوئی بہت بڑا مسئلہ بھی نہیں ہے۔ نصرت اب سمجھدار ہو رہی ہے جلد ہی وہ اس قابل ہو جائے گی کہ اپنے آپ کو بھی سنبھال لے اور صغرا اور کلثوم کو بھی..... انسان کے سر پر جب پڑتی ہے تو وہ سب کچھ کر لیتا ہے' آدمی جب ایک قدم آگے بڑھاتا ہے تو اس کے سامنے بہت سارے راستے خود بخود کھل جاتے ہیں۔

اس نئے خیال نے جنت کے دل کو بہت سکون بخشا۔ محض اس تصور سے ہی اس کو اپنے اندر ایک نئی زندگی کی لہریں اٹھتی ہوئی محسوس ہوئیں اور دل سے یہ احساس تیزی سے مٹنے لگا کہ اس کا وجود بالکل بے معنی اور بے مصرف ہے۔ نہیں..... ایسا نہیں تھا ماں کی بھی اپنی ایک افادیت تھی۔

دوپہر کے بعد دروازے پر ایک محتاط انداز کی دستک ہوئی یہ جانی پہچانی دستک تھی جنت کے علاوہ اور کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ یہ دستک کس کی ہے یہ دستک جو دروازے سے شروع ہوتی تھی' سیدھی جنت کے دل تک پہنچتی تھی جنت کے ہاتھ غیر شعوری طور پر اپنے چہرے کی طرف اٹھ گئے جہاں بہت سارے بال بکھرے ہوئے تھے اس نے جلدی سے بالوں کو ٹھیک کیا' دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر پھیر کر گویا اس گرد و غبار کو صاف کرنے کی کوشش کی جو وہاں سرے سے موجود ہی نہیں تھا اور پھر دروازے کے پاس جا کر آہستہ سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے ہی مراد کھڑا ہوا تھا جنت نے اسے اندر بلایا تپتی ہوئی دوپہر میں چھوٹی بچیاں اندر کمرے میں سو رہی تھیں مراد اور جنت دالان میں چارپائی پر بیٹھ

"کوئی خیر خبر ملی مسعود اور ناصر کی.....؟" مراد کے بیٹھتے ہی جنت نے اس سے سوال کیا۔ اس وقت اس کے لئے سب سے بڑا سوال یہی تھا کسی بھی دوسرے سوال سے زیادہ اہم۔

"نہیں جنت۔" مراد نے جواب دیا۔ "میں نے اس بھٹے میں کام کرنے والے دوسرے بہت سارے لوگوں سے بھی اس بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن کسی کو بھی کچھ پتہ نہیں بلکہ لوگ تو الٹا مجھ سے پوچھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ میں ناصر کے بارے میں ان سے زیادہ جانتا ہوں۔"

"لیکن کیوں.....؟" جنت نے پوچھا۔ "وہ ایسا کیوں سمجھتے ہیں؟"

"شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے ناصر کی تلاش کے سلسلے میں دوسرے کے مقابلے میں کچھ زیادہ سرگرمی دکھائی۔" مراد نے کہا۔ "میں تو بہت سارے لوگوں سے معلوم کرتا پھرتا تھا نا!"

"دو دن پہلے حاجی کا منشی امیر علی آیا تھا۔" جنت نے آہستہ سے کہا۔ "حاجی نے اماں کو بلایا تھا کل اماں' حاجی کے پاس گئی تھیں۔"

"اچھا....." مراد نے کہا۔ "کیا کہتا تھا وہ؟"

"وہی جو پہلے کہتا تھا۔" جنت نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یا تو لڑکے کو کام پر حاضر کرو ورنہ ساری رقم ادا کرو اس نے دس ہزار روپے تو پہلے ہی بنا رکھے ہیں۔"

"ایسے لوگوں کے قرضے میں یہی ہوتا ہے۔" مراد نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "تبھی تو میرے ابا اس قسم کے قرضوں کے سخت خلاف ہیں میں نے تم کو پہلے ہی بتایا تھا نا..... ابا کہتے ہیں کہ آدمی اگر اس قسم کے قرضوں کے جال میں پھنس جائے تو پھر وہ اس سے باہر نکل کر نہیں آسکتا۔ اس کی تو زندگی تباہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ خیر تم پوری بات بتاؤ۔"

جنت نے مراد کو ساری بات تفصیل سے بتا دی اس نے یہ بھی بتا دیا کہ اماں نے چوہدرائن سے رقم ادھار مانگی تھی لیکن چوہدرائن نے صاف انکار کردیا۔

"اور حاجی نے اماں کو دھمکی دی ہے کہ اگر دو ماہ کے اندر اندر اس کی رقم ادا نہیں کی گئی تو وہ اماں کو عدالت میں گھسیٹے گا اور جیل میں بند کرا دے گا۔" جنت کی آواز بھرا رہی تھی اور مراد کے چہرے کا رنگ سیاہ پڑتا جا رہا تھا اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا اپنا



د پگھل کر موم بنتا جا رہا ہے اور یہ موم جنت کے وجود میں ضم ہوتا جا رہا ہے جو درد کی ت سے پگھل کر موم بن چکا ہے درد کی حدت اور دکھ کی تمازت سے پگھلے ہوئے ان وں کے وجود آپس میں مل کر ایک ہو گئے ہیں درد..... پگھلتا ہوا بہتا ہوا درد.....

"پھر.....؟" کچھ دیر کے بعد اس نے آہستہ سے پوچھا۔ "تمہاری اماں کیا کریں ا؟"

"ابھی تو وقت ہے۔" جنت نے کہا۔ "دو ماہ کی مدت مقرر کی ہے حاجی نے اور تیرہ ر روپے کی رقم..... ماسی خیراں کہہ رہی تھی کہ وہ حاجی سے بات کرے گی ابھی ں کچھ عرصے کے بعد اور کچھ رعایت حاصل کرنے کی کوشش کرے گی۔"

"اور اگر حاجی نے رعایت نہ دی تو؟" مراد نے پوچھا۔

"تو پھر اماں کے پاس جو کچھ ہے وہ اس کو بیچ کر حاجی کی رقم ادا کردیں گی۔" جنت نے کہا۔ "اس کے علاوہ وہ اور کیا کرسکتی ہیں؟ اگر اس عرصے کے دوران اتفاق سے ناصر ہیں آگیا اور کام پر جانے لگا تو پھر تو سمجھو کہ مسئلہ ہی حل ہو گیا لیکن ناصر کی واپسی کے ے میں کوئی کیا کہہ سکتا ہے؟"

"ہاں۔" مراد نے آہستہ سے گردن ہلا دی۔ "اس کے بارے میں تو یقین کے ساتھ ئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"ہم کوئی اماں کو جیل تھوڑی جانے دیں گے۔" یکایک جنت کے لہجے میں گہرا اعتماد و تحکام پیدا ہو گیا اور وہ ایک نو عمر لڑکی سے ایک عاقل و بالغ عورت بن گئی جسے زندگی کے لونا گوں مسائل اور پیچیدگیوں کا گہرا ادراک تھا۔ "میں نے سوچ لیا ہے اگر نوبت یہاں ک پہنچی کہ اماں کو قرضہ ادا کرنے کے لئے سب کچھ بیچ دینا پڑا تو پھر میں بھی گھر میں خالی ں بیٹھوں گی میں بھی کام کروں گی اماں کی طرح..... آخر وہ بھی تو اتنا کام کرتی ں۔"

"تم..... تم کیا کام کرو گی جنت.....؟" مراد نے دبے لہجے میں پوچھا۔

"کوئی بھی کام..... کوئی بھی ایسا کام جس میں آدمی کے ہاتھ میں دو پیسے آئیں اں کی طرح کسی گھر میں بھی کام کرسکتی ہوں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہو گا مراد..... آخر گھر چلانا ہے۔"

مراد نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اسے یوں لگ رہا تھا جیسے جنت ایک دم اپنی عمر سے بہت بڑی ہو گئی ہے اور اس کا یہ سوچنا غلط بھی نہیں تھا۔ جنت واقعی اپنی عمر

سے بہت بڑی ہوگئی تھی زمانہ جب کسی بچے کی پشت پر زور سے ایک ٹھوکر مارتا ہے تو اس بچے کی عمر میں فوراً ہی کئی سال کا اضافہ ہو جاتا ہے ایسا ہی ناصر کے ساتھ ہوا تھا ایسا ہی مسعود کے ساتھ ہوا تھا اور ایسا ہی جنت کے ساتھ ہو رہا تھا لیکن جنت کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا اس کا انداز مختلف تھا۔

"مشکل تو یہ ہے کہ ناصر کو واپس لانے کی کوئی صورت ہی نہیں ہو سکتی۔" مراد نے کہا۔ "مسعود کے ابا کہہ رہے تھے کہ وہ دونوں یقیناً کراچی گئے ہوں گے اور میرا بھی یہی خیال ہے وہ دونوں کراچی ہی گئے ہوں گے بھلا وہاں سے ان کو کون ڈھونڈ کر لا سکتا ہے؟"

کچھ دیر تک خاموشی طاری رہی۔ "تمہاری اماں اب تو مجھ سے اچھی طرح پیش آنے لگی ہیں۔" کچھ دیر کے بعد مراد نے آہستہ سے جنت سے کہا۔

"اور اس کی وجہ بھی تم جانتے ہو۔" جنت نے کہا۔ "تم نے نازک اور مشکل وقت میں ہمارا ساتھ دیا ہے' ہماری مدد کرنے کی کوشش کی ہے' ہمارے گھر میں تو کوئی مرد ہی نہیں ہے جو بھاگ دوڑ کرے اور کچھ پتہ لگائے ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ ناصر اور مسعود دونوں ساتھ ساتھ گھروں سے گئے ہیں۔"

"میں تمہاری اماں کو راضی رکھنے کی کوشش کرتا رہوں گا۔" مراد نے کہا۔ "میں تو تم لوگوں کے ہر دکھ کو اپنا دکھ سمجھتا ہوں۔ تم سب لوگ مجھ کو بہت اچھے لگتے ہو اور سب سے بڑھ کر تو تم....." جنت کے دل میں روشنی کا ایک لپکا سا ابھرا اور اس کے سارے وجود میں سرسراتا چلا گیا ذرا سی دیر کے لئے وہ ہر دکھ کو بھول گئی اور اسے ساری دنیا بہت اچھی لگنے لگی۔

"اچھا اب میں چلتا ہوں۔" اچانک مراد نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "ابھی منڈی جانا ہے ایک مال کا سودا کرنا ہے ابا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"کیسا چل رہا ہے تمہارا کاروبار.....؟" جنت نے بھی اس کے ساتھ ہی اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"اچھا ہے۔" مراد نے جواب دیا۔ "کافی اچھا ہے ابھی تو سمجھو کہ اس میدان میں محض قدم رکھا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ جلد ہی میں کافی پیسے کمانے لگوں گا۔"

"یہ بہت اچھا ہوگا۔" جنت نے کہا۔ "آدمی کی جیب میں جب پیسے ہوتے ہیں تو اس کے دس کام نکل جاتے ہیں اور جب پیسے نہیں ہوتے تو ہر کام رک جاتا ہے آدمی کو ایسا لگتا ہے جیسے اسے کسی نے زمین میں گاڑ دیا ہو۔"



مراد اس کے گھر سے نکلا تو سیدھا سبزی منڈی پہنچا جہاں اس کا باپ اس کا انتظار کر رہا تھا پھر وہ دونوں اپنے کاموں میں مصروف ہوگئے۔

مراد ذرا دیر سے گھر پہنچا اس کا باپ کچھ پہلے ہی گھر پہنچ چکا تھا ماں رات کے کھانے کی تیاریوں میں مصروف تھی اس نے مراد کو دیکھا اور قدرے کڑے تیوروں کے ساتھ اس سے بولی۔ "یہ تم اس چور' ہیرو پنچی گامو کے گھر کے چکر کیوں لگاتے رہتے ہو؟"

"گامو کے گھر کے چکر.....؟" مراد کو ایک دم سے جھٹکا لگا' وہ چونکا اور پھر فوراً ہی سنبھل گیا۔ "کون کہتا ہے کہ میں گامو کے گھر کے چکر لگاتا رہتا ہوں؟"

"نادر آیا تھا آج سہ پہر کو میرے پاس۔" مراد کی ماں منظوراں نے اس سے کہا۔ "وہ کہہ رہا تھا کہ اس نے تمہیں کئی بار گامو ہیرو پنچی کے گھر آتے جاتے دیکھا ہے اور ایک دن تو تم گامو کی بیوی اور بڑی بیٹی کے ساتھ کہیں جا رہے تھے کس لئے جاتے ہو تم وہاں.....؟" منظوراں کے لہجے میں ناپسندیدگی اور ناگواری تھی۔

نادر' منظوراں کا ایک دور کا عزیز تھا جو زیبن اور جنت کے پڑوس میں ہی رہتا تھا اس کی عمر کوئی پچاس سال کے قریب تھی اور وہ کسی کارخانے میں کام کرتا تھا آج سے دس سال پہلے اس کی بیوی اس کو اور دو بچوں کو چھوڑ کر کسی دوسرے مرد کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی تھی۔ نادر اس کو بہت مارا کرتا تھا ایک بار تو اس نے اس کا ہاتھ توڑ دیا تھا اور اس کے ہاتھ پر کافی دنوں تک پلاسٹر چڑھا رہا تھا۔ آخر ایک دن وہ گھر میں موجود سارا زیور اور نقدی وغیرہ سمیٹ کر اور اپنے دونوں بچوں کو بھی چھوڑ کر ایک اور مرد کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی اور پھر کبھی واپس نہیں آئی اور نہ اس کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکا کہ وہ کہاں چلی گئی۔ اس کے بعد سے نادر اپنے گھر میں اکیلا رہتا تھا دونوں بچے اب بڑے ہو چکے تھے اور ایک درزی کی دکان پر کام کرتے تھے۔ نادر پچھلے کچھ دنوں سے بیکار تھا اور اس کا زیادہ تر وقت گھر پر ہی گزرتا تھا اور دوسروں کے گھروں کی سن گن لیتا پھرتا تھا۔

"وہ..... بات یہ ہے اماں کہ گامو کا بیٹا ناصر ابھی تک نہیں مل سکا ہے۔" مراد نے کہا۔ "میں اس کے بارے میں ہی معلوم کرنے کے لئے دو ایک بار گامو کی بیوی کے پاس گیا تھا نہ تو ناصر کا پتہ چل سکا ہے اور نہ مسعود کا....."

"تو تمہیں اس سے کیا.....؟" منظوراں نے کہا۔ "تم کیا ان کو ڈھونڈ کر لا دو گے کہیں سے؟ ایسے لڑکوں کا کیا بھروسہ.....؟" اس کے لہجے میں تلخی گھلنے لگی۔ "جیسا

باپ آوارہ اور بدمعاش ویسی ہی اولاد نکمی اور ناکارہ..... باپ بھی گھر سے پیسے چوری کرکے بھاگا اور اب بیٹا بھی چوری کرکے بھاگ گیا وہ اچھے لوگ نہیں ہیں ان کے پاس مت آیا جایا کرو۔"

"وہ مصیبت زدہ لوگ ہیں اماں....." مراد نے مختصر سے الفاظ کہہ کر بات کو ختم کردیا وہ اس معاملے کے بارے میں اپنے والدین سے زیادہ بات نہیں کرنا چاہتا تھا وہ جانتا تھا کہ اس کی ماں ان لوگوں کو بالکل پسند نہیں کرتی ہے۔

"تو ہم نے ساری دنیا کے مصیبت زدہ لوگوں کی مصیبتیں دور کرنے کا ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا ہے۔" منظوراں خاموش رہنے پر تیار نہیں تھی۔ "جیسی کرنی ویسی بھرنی..... اس عورت نے بھی تو پیسے کی لالچ میں اپنے بیٹے کو بھٹے کے مالک کے ہاتھوں بیچ دیا تھا اب خود ہی بھگتے اس مصیبت کو....."

مراد کے دل پر بڑی گہری چوٹ لگی۔ "کوئی معاملہ اندر سے کیسا ہوتا ہے اور باہر سے کیسا نظر آتا ہے۔" اس نے دل ہی دل میں کہا۔ "ہر معاملہ ہر شخص کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔" زندگی کے نت نئے تجربات کے پیچ و خم مراد کے نو عمر اور کچے ذہن کو ایک خاص قسم کی پختگی عطا کررہے تھے۔

"اس یہودی سے قرض لے کر گامو کی بیوی نے خود ہی اپنے آپ کو مصیبت میں پھنسا دیا۔" مراد کے باپ محمد یونس نے جواب تک خاموش بیٹھا ہوا ساری باتیں سن رہا تھا' کہا۔ "اب لڑکا تو بھاگ گیا گھر سے اور وہ خود پریشان پھر رہی ہے اس کی اس پریشانی کا کسی کے پاس کیا علاج ہے؟" محمد یونس کے لہجے میں ترشی اور ناپسندیدگی نہیں تھی بلکہ کچھ درد مندی کا سا تاثر ملتا تھا۔

"ہاں جی' اور کیا۔" منظوراں نے فوراً اپنے شوہر کی بات کی تائید کی۔ "کسی کے پاس کیا علاج ہے؟" اور پھر وہ ایک دم سے مراد کی طرف مڑ کر اور اس سے مخاطب ہو کر بولی۔ "میں پچھلے دو ہفتے سے تم سے کہہ رہی ہوں کہ کسی وقت ذرا دیر کے لئے شاداں کے گھر ہو آؤ وہ لوگ کئی دفعہ آچکے ہیں اور تم گھر پر ہی نہیں ملتے۔"

"چلا جاؤں گا اماں....." مراد نے کہا۔ "ابھی تو تم دیکھ رہی ہو منڈی میں نیا نیا کام شروع کیا ہے وقت بھی تو نہیں مل پاتا۔ میں کسی دن موقع نکال کر شاداں خالہ کے ہاں ہو آؤں گا۔"

شاداں' منظوراں کی بہن تھی اور اس سے ایک سال چھوٹی تھی وہ اپنے شوہر اور



بچوں کے ساتھ ایک دوسری قریبی بستی میں رہتی تھی۔ اس کا شوہر سمیع اللہ' راج مزدور تھا ان کے تین بچے تھے سب سے بڑی بیٹی ثمینہ تھی۔ ثمینہ کے بعد ایک بیٹا حیدر اور پھر ایک بیٹی رقیہ تھی۔

مراد کو گو اپنی خالہ اور اس کے گھر والوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی وہ وہاں بہت کم جاتا تھا شاداں خالہ کی باتوں سے اسے بہت الجھن ہوتی تھی وہ بات بے بات جھوٹ بولنے کی عادی تھیں اور اب تو اس کی یہ عادت اس قدر پختہ ہوچکی تھی کہ اس کو خود بھی اس کا احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ کب جھوٹ بول رہی ہیں اور کب سچ..... وہ بڑی چرب زبان اور تیز مزاج تھیں اور اپنے شوہر کو خاصا دبا کر رکھا ہوا تھا۔ ثمینہ میں بھی اپنی ماں کی عادتوں کی خاصی جھلک موجود تھی۔

مراد کو تو اپنی خالہ شاداں اور اس کے گھر والوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن منظوراں کو اپنی بہن اور اس کے گھر والوں سے گہری دلچسپی تھی اور اس دلچسپی کی سب سے بڑی وجہ ثمینہ تھی جو مراد سے کوئی تین سال چھوٹی تھی۔

ثمینہ کا باپ راج مزدور تھا اس کے پاس اپنا ایک پختہ اور عمدہ مکان موجود تھا جو اس نے باپ سے ورثے میں پایا تھا جو خود بھی ایک راج مزدور تھا اس نے اپنے دو بھائیوں کے ساتھ مل کر یہ عمدہ مکان اپنے ہاتھ سے تیار کیا تھا زمین کا ٹکڑا تو پہلے سے موجود تھا ہاتھوں کی فراواں محنت مفت کی تھی۔ ساز و سامان کے لئے پیسے خرچ کرنے پڑتے تھے جن کا بندوبست سب مل کر کسی نہ کسی طرح کرتے رہے تھے اور کئی برس کی طویل مدت کے دوران یہ اچھا سا مکان بن کر تیار ہوگیا تھا پھر ایک حادثے میں دونوں بھائی جو غیر شادی شدہ تھے ہلاک ہوگئے اور یہ مکان صرف سمیع اللہ کے باپ کی ملکیت قرار پایا اور سمیع اللہ کو اپنے باپ سے ورثے میں ملا۔ تقدیر کی گردش کے ساتھ ساتھ چیزیں بھی کس طرح گھومتی ہیں اور کس کس کا نصیب کہاں کی چیزوں کو اپنے اندر گھسیٹ لاتا ہے۔

سمیع اللہ کی مالی حالت اچھی خاصی تھی اور پھر سب سے بڑی اور اہم بات یہ تھی کہ ثمینہ' منظوراں کی سگی بہن کی بیٹی تھی اس کی سگی بھانجی تھی اور منظوراں دل سے یہ چاہتی تھی کہ اپنی بہن کی بیٹی کو اپنی بہو بنا کر اپنے گھر لائے اور خود شاداں بھی یہی چاہتی تھی بھلا بہن کے بیٹے سے زیادہ بہتر داماد اور کہاں مل سکتا تھا؟

لیکن منظوراں کی طرف سے ابھی تک کوئی باقاعدہ پیغام نہیں آیا تھا اور نہ ہی اس سلسلے میں کوئی نتیجہ خیز بات ہوئی تھی۔ بات دونوں بہنوں کے دلوں میں تو موجود تھی اور

کبھی کبھی دل سے نکل کر ہلکے پھلکے اور سرسری انداز میں باہر بھی آجاتی تھی لیکن کسی بھی فیصلہ کن مرحلے میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ اگر منظوراں کا بس چلتا تو وہ کب کی مراد اور ثمینہ کی منگنی بھی کر چکی ہوتی بشرطیکہ مراد مان جاتا لیکن مراد کا باپ محمد یونس اس کے لئے بالکل تیار نہیں تھا۔

"شادی..... شادی..... شادی۔" ایک روز اپنی بیوی کے اصرار کے جواب میں محمد یونس نے جھلا کر کہا۔ "آخر ایسی کیا خدا کی مار پڑی ہے اتنی جلدی شادی کر دینے کی؟ نہ کوئی کام دھام' نہ کوئی کمائی' نہ روزگار نہ دھندا..... اور بس شادی کر دو لڑکے کی۔ تم عورتوں کو اس کے علاوہ اور بھی کچھ سوجھتا ہے؟"

"میں کب کہہ رہی ہوں کہ تم کل اس کی شادی کر دو۔" منظوراں نے اپنے مؤقف کا دفاع کرتے ہوئے کہا۔ "شادی جب جی میں آئے کرو..... دو سال بعد کرو..... چار سال بعد کرو..... میں تو یہ چاہتی ہوں کہ منگنی ہو جاتی دونوں کی....."

"نہیں بالکل نہیں.....۔" محمد یونس نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا۔ "وقت آنے پر دیکھا جائے گا پہلے تو لڑکے کو کسی قابل ہونے دو اس کے بعد ان باتوں کے بارے میں سوچو۔ ابھی اس کی شادی میں بہت دیر ہے جب وقت آئے گا تو لڑکی بھی تلاش کر لیں گے نہ اس کے لئے لڑکیوں کی کمی ہو گی اور نہ ثمینہ کے لئے لڑکوں کی..... سب کو خدا اس کے مقدر کا جوڑ دیتا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" منظوراں نے کہا۔ "لیکن اگر بات پکی ہو جائے تو کیا ہرج ہے؟ ہم بھی مطمئن ہو جائیں گے اور وہ لوگ بھی مطمئن ہو جائیں گے۔"

"جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے نیک بخت۔" محمد یونس نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ "کسی سے کوئی وعدہ مت کرو۔ وقت آنے پر دیکھیں گے ابھی اس کام میں دیر ہے۔"

"اور اگر اس عرصے میں شاداں اور سمیع اللہ نے ثمینہ کی بات کہیں اور طے کر دی تو؟" منظوراں نے کہا۔ "ہم انہیں ایسا کرنے سے کس طرح روک سکتے ہیں؟"

"روکنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔" محمد یونس نے کہا۔ "اگر انہیں کوئی اچھا بر مل جاتا ہے تو ضرور کر دیں اس میں کیا برائی ہے؟ ہم تو ان کی بھلائی ہی چاہتے ہیں۔"

منظوراں خاموش ہو گئی تھی اور اس وقت اس نے اس موضوع پر مزید بات نہیں کی۔



اصل میں محمد یونس اس معاملے میں نیم شعوری طور پر کچھ ذہنی تحفظات کا شکار تھا اس کی سالی شاداں ایک بہت تیز طرار اور تند مزاج عورت تھی' اس کی طبیعت میں خاصی کڑواہٹ تھی اور اس نے اپنے شوہر کو بھی بالکل دبا کر رکھا ہوا تھا خود منظوراں بھی کوئی نرم مزاج عورت نہیں تھی' محمد یونس کا ایک ہی بیٹا تھا اور وہ اس کو کھونا نہیں چاہتا تھا' باپ بیٹے کے درمیان تعلقات خاصے بے تکلفانہ اور دوستانہ نوعیت کے تھے۔ اس کے دماغ کے کسی دور دراز گوشے میں یہ موہوم سا خیال موجود تھا کہ کہیں شاداں اس سے اس کا بیٹا جدا نہ کر دے اور منظوراں تو شاداں کی بہن ہی تھی اس وجہ سے وہ منظوراں کی اس تجویز کو قبول کرنے سے ہچکچا رہا تھا۔ علاوہ ازیں محمد یونس کو اس بات کا بھی اندازہ تھا کہ مراد کو اپنی خالہ سے اور اس کے گھر والوں سے کوئی بھی خاص لگاؤ نہیں تھا اور ثمینہ میں تو اس نے کبھی بھی کوئی دلچسپی نہیں لی تھی' مہینوں گزر جاتے تھے وہ شاداں کے گھر کا رخ بھی نہیں کرتا تھا اور اگر شاداں اپنے بچوں کے ساتھ ان لوگوں کے گھر آئی بھی ہوتی تھی تو اگر مراد گھر میں موجود ہوتا بھی تھا تو بھی وہ کوئی زیادہ گرمجوشی کا مظاہرہ نہیں کرتا تھا۔

مراد کو اپنی ماں کی دلی خواہش کا اندازہ تھا لیکن اسے تو ثمینہ ذرا بھی اچھی نہیں لگتی تھی ایسا نہیں تھا کہ ثمینہ بدشکل تھی یا اس کے اندر کوئی اور برائی تھی لیکن مراد کی نظر میں اس کے اندر سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ وہ جنت نہیں تھی' جنت تو بس ایک ہی تھی اور ساری دنیا میں کوئی بھی دوسری لڑکی جنت نہیں ہو سکتی تھی اور مراد تو بس جنت سے ہی دوستی رکھنا چاہتا تھا۔ جنت کے تصور سے ہی اس کے دل میں لطیف ترین نازک ترین جذبات و احساسات کی نرم نرم لہریں اٹھنے لگتیں اور اس پر یہ کیفیت کسی بھی دوسری لڑکی کے تصور سے طاری نہیں ہوتی تھی' جنت کے علاوہ ہر لڑکی بس ایک عام سی لڑکی تھی اور جنت کو تو وہ جیسے اپنے وجود کا ایک حصہ سمجھتا تھا جسے وہ اپنے سے جدا کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

مراد نے اس وقت تو اپنی ماں سے کہہ دیا کہ وہ کسی وقت موقع نکال کر شاداں خالہ کے ہاں ہو آئے گا لیکن درحقیقت اس کا وہاں جانے کا کوئی خاص ارادہ نہیں تھا اور ویسے بھی آج کل فرصت کم تھی' ایک تو منڈی میں کافی وقت لگ جاتا تھا نیا نیا کام شروع کیا تھا' تجربہ بھی زیادہ نہیں تھا' باپ نے بھی ساری زندگی صرف سبزی کا ٹھیلا ہی لگایا تھا اور اب

جو کام کی نوعت بدل گئی تھی تو اس کے لئے بھی یہ ایک کسی حد تک نیا تجربہ تھا۔

☆=========☆=========☆

دن ایک ایک کرکے گزرتے رہے' ہر روز جب نیا سورج طلوع ہوتا تو زمین سے پہلے یہ یاد کرتی کہ حاجی کی دی ہوئی مہلت میں اب کتنے دن باقی رہ گئے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اس کے دل کے کسی نہاں خانے سے ایک بجھی بجھی سی موہوم سی امید ابھارتی کہ شاید آج ناصر کے بارے میں کوئی خبر مل جائے' شاید وہ خود ہی آجائے یا کہیں سے اس کے بارے میں کچھ معلوم ہو اور انہی ٹوٹی پھوٹی امیدوں اور محرومیوں کے بوجھ کو سنبھالے ہوئے وہ اپنے کام پر روانہ ہو جاتی جہاں سارا دن طرح طرح کے خیالات کے ہجوم اس کے دل و دماغ پر یلغار کرتے رہتے اور پھر شام کو جب وہ گھر واپس آتی تو دروازے کی دہلیز پار کرتے وقت اس پر ایک نامعلوم سا ہیجان طاری ہو جاتا شاید کوئی خبر..... شاید کوئی خبر..... لیکن نیم تاریک گھر کی اداس چہار دیواری میں صرف ایک اذیت ناک بے خبری ہی اس کی منتظر ہوتی۔ ناصر کا کچھ پتہ نہیں تھا' کوئی خبر' کوئی اطلاع کوئی خط..... کچھ نہیں..... کچھ نہیں اور دن گزر رہے تھے ایک ایک کرکے..... ہر روز جب نیا دن طلوع ہوتا تو مہلت کی مدت میں ایک دن کی کمی ہو چکی ہوتی تھی اور اسی کے ساتھ زمین کی امیدوں کا دائرہ بھی سکڑتا جا رہا تھا۔

مراد گاہے بگاہے زمین کے پاس آتا رہتا تھا اور وہ صرف اس وقت آتا تھا جب وہ ایک چکر مسعود کے گھر کا لگا لیتا تھا تاکہ زمین کو یہ بتا سکے کہ وہ مسعود کے گھر سے ہو کر آ رہا ہے اور اس طرح اپنی آمد کا ایک معقول جواز مہیا کر سکے اگرچہ مسعود کے گھر سے اسے مسعود اور ناصر کے بارے میں تو کوئی خبر ہی نہیں ملتی تھی جو خبر ملتی تھی وہ صرف حاجی مدد علی قریشی کے قرضے سے متعلق ہوتی تھی۔

حاجی مدد علی قریشی نے مسعود کے باپ امتیاز کو بلوایا تھا اور اس سے بھی قرضے کی واپسی کا تقاضا کرتے ہوئے اسے یہ دھمکی دی تھی کہ عدم ادائیگی کی صورت میں وہ قانونی کارروائی کرے گا۔ مسعود کے والد نے پندرہ ہزار روپے کی رقم قرض لی تھی اور حاجی کے کہنے کے مطابق اب اس میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ امتیاز اور فریدہ نے غفور چاچا کو درمیان میں ڈالا تھا جن کے ذریعے حاجی مدد علی قریشی کے ساتھ ان کا معاملہ ہوا تھا اور غفور چاچا ان کے تصفیے کے لئے کوئی راہ نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔

مراد نے جب زمین کو یہ بات بتائی تو زمین نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔



"ہماری طرف سے کوئی بھی نہیں ہے سوائے ماسی خیراں کے اور کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس کو میں ساتھ لے جا کر حاجی سے بات کر سکوں یہ سارے کام تو مردوں کے ہوتے ہیں۔"

"اگر آپ کہیں چاچی تو میں آپ کے ساتھ چل کر حاجی سے بات کروں۔" اچانک مراد نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا اس کے لہجے میں بڑی عمر کے لوگوں کی سی خود اعتمادی تھی۔

"نہیں بیٹا۔" زمین نے کہا۔ "ماسی خیراں اپنے طور پر جو کچھ بھی کر سکتی ہے وہ کر رہی ہے اور کرے گی تمہارے حاجی سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا اگر اسے کوئی رعایت دینی ہے تو وہ ماسی خیراں کے کہنے سے بھی دے گا اور اگر نہیں دینی ہے تو نہیں دے گا اس کا قرضہ تو میں بہرحال ادا کر ہی دوں گی چاہے آدھے پیٹ کھا کر گزارہ کرنا پڑے۔"

اس کی آواز بھرا گئی۔

مراد کے دل میں درد کی ایک لہر اٹھی اور اسے نڈھال کرتی چلی گئی یہ لوگ تو واقعی بلک رہے تھے ان پر تو جیسے زمین تنگ ہو گئی تھی۔

مراد اپنی خالہ شاداں کے گھر تو نہیں گیا البتہ اس نے کاروباری مصروفیات میں کچھ زیادہ وقت دینا شروع کر دیا۔ اس نے پوری سنجیدگی کے ساتھ کاروبار شروع کیا تھا اور اسے ابتدائی کامیابیاں حاصل ہونی شروع ہو گئی تھیں اور یہ اس کے لئے بہت زیادہ خوشی کی بات تھی کہ وہ خود اپنے ہاتھوں کی کمائی کھا رہا تھا اس کا باپ بھی اس سے بہت خوش تھا۔

پیاز ان دنوں کافی سستی چل رہی تھی سیزن اچھا جا رہا تھا اور خیال تھا کہ کچھ دنوں کے بعد پیاز کی قیمت میں اضافہ ہو جائے گا منڈی کے بعض حلقوں میں یہ بھی سنا جا رہا تھا کہ پیاز بیرون ملک بھیجی جانے والی ہے لیکن کسی کو ٹھیک سے کچھ معلوم نہیں تھا کچھ بیوپاری پیاز کا ذخیرہ کر رہے تھے۔ مراد نے بھی کافی چھان بین اور غور و خوض کے بعد اپنے گھر میں کافی بڑی مقدار میں پیاز کا ذخیرہ کر لیا تھا اس کو یقین تھا کہ اس سودے میں اگر اتنی زیادہ منافع نہیں بھی ہوا تو بھی نقصان تو بالکل نہیں ہو گا کیونکہ پیاز کی قیمت کے گرنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا بلکہ سیزن کے اختتام کے ساتھ قیمت میں اضافہ ہونے کا ہی امکان زیادہ تھا۔

کچھ ہی دنوں کے بعد اچانک پیاز مارکیٹ سے غائب ہونی شروع ہو گئی معلوم ہوا کہ بڑے بڑے بیوپاری اعلیٰ سرکاری حکام کی مدد سے پیاز کی بیرون ملک اسمگلنگ کر رہے ہیں اور انہوں نے مارکیٹ سے بڑے پیمانے پر پیاز کی خریداری شروع کر دی ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے پیاز مارکیٹ سے عنقا ہو گئی اور اس کی قیمت بھی آسمان سے باتیں کرنے لگی عام آدمی کے لئے تو پیاز کا استعمال جیسے ایک عیاشی بن گیا غریبوں کے گھروں میں کھانا بغیر پیاز کے پکنے لگا۔

مراد کو اس ایک ہی ہلے میں بھاری منافع ہو گیا اس کے پاس پیاز کا جو ذخیرہ موجود تھا اس نے وہ سارا فروخت کر دیا اور اس سودے میں اس کو تقریباً دس ہزار روپے کا خالص منافع حاصل ہو گیا۔

دس ہزار روپے! مراد خوشی سے پھولے نہیں سماتا تھا اس کے تو تصور میں بھی نہیں تھا کہ وہ ایک ہی سودے میں اتنی بڑی رقم کما لے گا اور اس کا باپ محمد یونس جو سارا زندگی سبزی کا ٹھیلا لگاتا رہا تھا اور محض سو دو سو روپے منافع کے حصار میں گردش کرنے والا ایک معمولی سبزی فروش تھا اور اپنی اور اپنے بیٹے کی اس شاندار کامیابی پر بہت حیران اور مسرور تھا۔ کچھ بھی تو نہیں کرنا پڑا تھا نہ دن بھر آواز لگانا نہ پھیری لگانا نہ جلتی دھوپ اور کڑکڑاتے جاڑے اور تیز طوفانی بارشوں میں ٹھیلے کے ساتھ ساتھ زمین کا گز بنے رہنا کچھ بھی تو نہیں کرنا پڑا تھا کوئی بھی تو محنت نہیں کرنی پڑی تھی بس ایک چیز سستے داموں خرید کر ذخیرہ کر لی اور پھر ایک دم سے اس چیز کی قیمت آسمان سے باتیں کرنے لگی اس وقت اس چیز کو بیچ دیا اور دام کھرے کر لئے ..... دوسروں کی جیبوں کے بہت سارے پیسوں کو اپنی جیب میں منتقل کر لیا..... اسی کا نام تو کاروبار ہے..... دوسروں کی جیبوں کے پیسوں کو اپنی جیب میں منتقل کرنے کا فن..... مراد کو اس فن سے قریبی طور پر وابستہ ہونے کا پہلی بار موقع ملا تھا۔

اکٹھا دس ہزار روپے منافع ہو گیا تھا اور مراد اور اس کے باپ کے علاوہ مراد کی ماں منظوراں بھی بہت خوش تھی اس کے گھر میں پہلی بار اکٹھے دس ہزار روپے آئے تھے یہ تو بہت بڑی بات تھی۔

سب سے زیادہ خوشی تو مراد کو تھی اس کے پاس پیسہ آیا تھا اور کے ساتھ ہی اس کو اپنے اندر ایک نئی قوت کے ابھرنے کا احساس ہو رہا تھا یہ پیسے کی قوت تھی جو اس کی خود اعتمادی میں اضافہ کر رہی تھی اور اس کی شخصیت کو ایک نیا رنگ دے رہی تھی۔



اگلے روز شام کو مراد نے کچھ عمدہ قسم کے پھل خاصی مقدار میں خریدے اور لے کر جنت کے گھر پہنچا وہ اس وقت آیا تھا جبکہ زمین اپنے کام سے واپس گھر آ چکی

"میں دو دن پہلے مسعود کی طرف گیا تھا۔" اس نے زمین سے کہا۔ "مسعود کے نے بتایا ہے کہ غفور چاچا کسی تصفیے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں لیکن ابھی تک کوئی نہیں بن سکی ہے وہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ حاجی پندرہ ہزار روپے لینے پر آمادہ ہو تو وہ کسی نہ کسی طرح سے کچھ بندوبست کر دیں گے دو تین قسطوں میں ..... مگر ابھی اس کے لئے تیار نہیں ہوا ہے۔ بہرحال بات چل رہی ہے اور جہاں تک مسعود ہے تو اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ہے کہیں سے کچھ نہیں معلوم ہو

"اب ماسی خیراں بھی کسی دن حاجی کے پاس جانے والی ہے۔" زمین نے ایک سانس بھر کر کہا۔ "دیکھو حاجی ہمارے ساتھ کیا رعایت کرتا ہے اور کرتا بھی ہے یا ....."

"آپ ابھی ماسی خیراں کو حاجی کے پاس نہ بھیجیں۔" مراد نے کہا۔ "پہلے یہ دیکھئے کہ مسعود کے والد کے ساتھ کیا معاملہ کرتا ہے اگر اس نے صرف اصل رقم واپس لینے اتفاق کیا اور باقی سود وغیرہ کی رقم چھوڑ دی تو پھر اس سے کہا جا سکتا ہے کہ ناصر کے میں بھی ایسا ہی کرے اور اگر وہ مسعود کے والد سے قسطوں میں رقم واپس لینے لئے تیار ہو جاتا ہے تو....."

"ہاں بیٹا۔" زمین نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "تمہاری بات ٹھیک ہے اگر وہ مسعود گھر والوں کے ساتھ رعایت کر سکتا ہے تو ہم بھی اس سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے بھی رعایت کرے۔"

"یہی میرا مقصد ہے چاچی....." مراد نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "وہاں غفور چاچا میں پڑے ہیں' حاجی اس کی بات کافی مانتا ہے۔ اگر غفور چاچا نے مسعود کے کا تصفیہ کروا دیا تو پھر ہم حاجی سے وہی ساری رعایتیں ناصر کے معاملے میں بھی سکے۔"

"ہاں ٹھیک ہے مراد....." زمین نے کہا۔ "لیکن اس معاملے کا تصفیہ کب تک ہو تمہیں کچھ اندازہ ہے؟"

"میں مسعود کے گھر کا چکر لگاتا رہوں گا اور اس کے والدین سے ملتا رہوں گا" مراد نے کہا۔ "وہ لوگ جانتے ہیں کہ مسعود کا دوست ہوں اس سے ہمدردی رکھتا ہوں اس لئے وہ مجھے ساری بات بتا دیتے ہیں۔ جیسے ہی مجھے کچھ معلوم ہو گا میں آپ لوگوں کو فوراً بتا دوں گا۔"

جنت اپنی ماں کے پاس بالکل خاموش بیٹھی ہوئی تھی اس تمام عرصے کے دوران اس نے ایک بار بھی نظر اٹھا کر مراد کی طرف نہیں دیکھا تھا وہ صرف اس کی باتیں غور سے سن رہی تھی۔

"چاچی....." کچھ دیر کے بعد مراد نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "مجھے ایک سودے میں کافی اچھا منافع ہوا ہے آپ کی دعا سے ..... میں اس خوشی میں بچوں کے لئے تھوڑے سے پھل....."

"تمہیں فائدہ ہوا خدا مبارک کرے۔" زمین نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "لیکن بیٹا اس سب کی ضرورت نہیں ہے تم نے ناحق تکلیف کی تم ان کو لے جاؤ۔"

"نہیں چاچی۔" مراد نے کہا۔ "میں تو بچیوں کے لئے لایا ہوں آپ رکھ لیجئے بچیاں کھائیں گی تو مجھے خوشی ہو گی۔"

"خیر..... اس بار تو میں رکھے لیتی ہوں بیٹا لیکن آئندہ اس قسم کی تکلیف نہ کرنا۔" زمین کے لہجے میں قدرے سختی تھی جو ناگواری کی حدوں کو چھوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی اور اس کا یہ رویہ مراد کے لئے غیر متوقع تھا وہ جانتا تھا کہ زمین اپنی بیٹی جنت کے حوالے سے اس کو بالکل ناپسند کرتی ہے اور اگر ان دنوں اس کو اس گھر میں آنے جانے کی اور یہاں کے لوگوں سے ملنے جلنے کی اجازت ملی ہوئی ہے تو یہ محض ناصر کے حوالے سے ہے اور وہ بالکل صحیح سمجھ رہا تھا۔ مراد سے ملنا اس سے باتیں کرنا اور اس کو اپنے گھر میں آنے کی اجازت دینا زمین کی مجبوری تھی وہ سب کچھ اپنی مرضی سے تو نہیں کر رہی تھی یہ تو حالات کا جبر تھا جو اس سے یہ کروا رہا تھا۔

"تکلیف تو کوئی نہیں ہے چاچی....." مراد نے جلدی سے بات کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "میں اپنی خوشی میں آپ سب لوگوں کو شریک کرنا چاہتا ہوں آپ نے مجھے کامیابی کی دعا دی تھی۔"

"میں تم کو ہمیشہ کامیابی کی دعا دوں گی بیٹا۔" زمین نے کہا اور اس کے ساتھ ہی زمین کے دل میں بڑی شدت کے ساتھ یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش اس کی دوسری



بھی اسی طرح قبول ہو جاتیں۔

مراد کچھ دیر کے بعد چلا گیا تو زمین نے ان پھلوں کو غور سے دیکھا جو مراد دے گیا بہت مہنگے اور عمدہ قسم کے پھل تھے اور کافی مقدار میں تھے زمین کے گھر میں تو نہ کتنے عرصے سے ایسے پھل اور اتنی بڑی مقدار میں نہیں آئے تھے بلکہ اتنے عمدہ شاید اس کے ہاں کبھی آئے ہی نہ تھے۔ اس نے ایک بڑا سا سرخ رنگ کا سیب اور اس کو دانتوں سے کاٹا۔ سیب کی خوشبو اور اس کی مٹھاس اس کے منہ میں گھلنے حلق سے اترنے لگی اور تب اچانک زمین کو یاد آیا خود اس نے اور اس کے بچوں نے دنوں سے سیب نہیں کھایا ہے وہ تو جیسے سیب کا ذائقہ ہی بھول گئی تھی۔

اس نے ایک اور سیب ہاتھ میں لے کر جنت کی طرف بڑھا دیا۔ "لو..... تم بھی اب وہ لے ہی آیا ہے تو کھانا تو پڑیں گے ہی۔ ویسے میں نے اس کو سختی سے منع تو ہے کہ وہ آئندہ نہ لائے۔ ہمیں اپنا تماشا نہیں بنوانا ہے پاس پڑوس والے اگر گے تو وہ ہمارے بارے میں کیا سوچیں گے؟"

جنت نے اپنی ماں کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے اس کے ہاتھ سے وہ لے لیا اور اسے غور سے دیکھنے لگی۔ جنت کے لئے وہ سیب محض ایک سیب نہیں کی خوشبو اور اس کی مٹھاس میں تو ایک پوری دنیا آباد تھی۔ "بچے اگر جاگ رہے کچھ ان کو بھی دے دو۔" زمین نے جنت سے کہا۔ "ورنہ صبح کو دے دینا۔"

"دیکھتی ہوں ماں۔" جنت نے کہا اور وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔

مراد کو کاروبار میں جو اچانک اور غیر متوقع منافع ہوا تھا اس کے بارے میں جان کر دلی خوشی ہوئی تھی لیکن اس کی مجبوری یہ تھی کہ وہ اپنی ماں کے سامنے کھل کر شی کا اظہار بھی تو نہیں کر سکتی تھی ماں کی موجودگی میں تو وہ ناصر کے معاملے کے راد سے اور کوئی بات ہی نہیں کرتی تھی۔

بچیاں سو گئی تھیں جنت نے پھل بہت سنبھال کر رکھ دیئے۔ سارے گھر میں اچھے زہ پھلوں کی خوشبو بس گئی تھی اور اس ایک خوشبو میں جنت کو بہت ساری کی ملی ہوئی لگ رہی تھیں۔

خالہ کے ساتھ زمین اور ماسی خیراں کی گفتگو کو تقریباً ڈیڑھ ماہ کا عرصہ گزر گیا تھا ماسی خالہ مدد علی قریشی کے پاس جانے کے لئے تیار تھی لیکن ابھی زمین نے خود ہی اس کو ایا تھا۔ مسعود کے گھر والوں کے ساتھ حاجی کے تصفیے کا انتظار تھا اور اس کے

بارے میں اطلاع مراد کو لے کر آئی تھی۔ مراد برابر مسعود کے والدین کے پاس آ
رہتا تھا لیکن ابھی تک یہ معاملہ طے نہیں ہوا تھا۔

اس روز جب مراد مسعود کے گھر گیا تو فریدہ نے اس کو بتایا کہ غفور چاچا کی
محنت اور بھاگ دوڑ کے نتیجے میں حاجی ان لوگوں کو کچھ رعایتیں دینے کے لئے تیار
ہے۔

"غفور چاچا نے اس کو اس بات پر راضی کر لیا ہے کہ وہ صرف پندرہ ہزار رو
رقم کا مطالبہ کرے گا۔" فریدہ نے اس کو بتایا۔ "اور باقی رقم کو ختم کرے گا۔ بس
رقم کا ہی معاملہ ہے وہ بہت ناک بھوں چڑھا رہا تھا اور اس بات کے لئے تیار نہیں
تھا لیکن غفور چاچا نے اس کو بہرحال راضی کر لیا۔"

"تو اب آپ لوگوں کو اس کو کل پندرہ ہزار روپے کی رقم ادا کرنا ہے؟" مرا
وضاحت چاہی۔

"ہاں۔" فریدہ نے جواب دیا۔ "لیکن بیٹا یہ رقم بھی بھلا کچھ کم ہوتی ہے؟ ذرا
تو پندرہ ہزار روپے..... اور وہ بھی ایک ایسے بال بچے دار شخص کے لئے جس
اور ذریعہ آمدنی بھی نہ ہو ..... ہمیں یہ سب کچھ کس طرح کرنا پڑے گا یہ ہمارا
جانتا ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں تھا وہ بالکل سچ بول رہی تھی امتیاز جیسے غریب آدمی کے
اتنی بڑی رقم کا بندوبست کرنا کوئی آسان بات تو نہیں تھی تندور میں روٹیاں لگانے
ایک غریب مزدور کی اوقات ہی کیا؟

"اور یہ رقم آپ لوگوں کو کب ادا کرنی ہو گی؟" مراد نے فریدہ سے پوچھا۔

"حاجی تو زیادہ مہلت دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔" فریدہ نے کہا۔ "لیکن غفور
نے کہہ سن کر کچھ زیادہ مہلت دلوا دی ہے اب ہم اگلے دو ماہ میں یہ رقم ادا کر سکیں
زیادہ سے زیادہ تین قسطوں میں....."

"اور مسعود کا کچھ پتہ چلا؟" مراد نے پوچھا۔

"ارے اس کا کیا پتہ چلنا تھا۔" فریدہ نے دکھ اور نفرت کے ساتھ کہا۔ "اس
ہم کو تباہ کر دیا اور خود جا کر کہیں آرام سے بیٹھ گیا۔ ارے اس بے غیرت کو اگر اپنے
باپ کا اور چھوٹے بہن بھائیوں کا ذرا سا بھی خیال ہوتا تو وہ اس طرح ہمیں مصیبت
مبتلا کر کے جاتا ہی کیوں..... اور تم بتاؤ جنت کے بھائی کے بارے میں کوئی اطلاع ملی



مراد اس کے اس سوال پر ایک دم سٹپٹا گیا اس نے ناصر کے لئے یہ کون سا حوالہ
چلی کیا تھا؟ مراد نے تو اس سے یا کسی سے بھی اس معاملے پر گفتگو کے دوران جنت کا
ہی نہیں لیا تھا۔ بات تو ناصر کی تھی اور ناصر کا اپنا نام تھا سب لوگ اسے ناصر کے نام
ہی جانتے تھے۔ جنت کا بھائی! اس حوالے میں تو ایک گہری معنویت اور ایک خاص
پوشیدہ تھا جسے سمجھنا مراد کے لئے مشکل نہیں تھا۔

"آپ ناصر کی بات کر رہی ہیں۔" اس نے سرسری انداز میں کہا۔ "زیبن چاچی
کئی دن پہلے ملی تھیں ناصر کا بھی کوئی پتہ نہیں ہے۔"

کچھ دیر کے بعد وہ وہاں سے چلا آیا۔ فریدہ نے ناصر کے لئے جو حوالہ استعمال کیا تھا
کے بارے میں مراد بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا لوگ..... لوگ..... سمجھ
تھے لوگوں کی آنکھیں بند نہیں تھیں آخر وہ زیبن کے گھر کے چکر کاٹتا پھر رہا ہے
اس نے خود کو ان کے دکھوں کے اندر اتنا زیادہ سمو رکھا ہے؟ لوگ سمجھ رہے
..... اس احساس سے اس کے دل میں خوشی کی ایک لطیف سی لہر بھی اٹھی اور اسے
خوف بھی محسوس ہوا۔

وہاں سے اٹھ کر وہ سیدھا زیبن کے پاس پہنچا۔ زیبن کو آئے ہوئے کچھ ہی دیر
تھی اور وہ سب لوگ کھانا کھا رہے تھے آج چوہدریوں کے ہاں مہمان آئے ہوئے
اور زیبن کو واپسی میں دیر ہو گئی تھی۔

"آؤ بیٹا کھانا کھا لو۔" زیبن نے اسے مدعو کرتے ہوئے کہا۔

"بسم اللہ کیجئے چاچی۔" مراد نے کہا۔ "میں نے آج دوپہر کا کھانا بھی بہت دیر سے
تھا اب رات کو دیر سے کھاؤں گا آپ لوگ اطمینان سے کھائیے۔"

جب کھانا ختم ہوا تو زیبن نے جنت سے کہا' مراد کے لئے چائے بنا لائے۔ مراد کے
پر زیبن اکثر اس کے لئے چائے بنوا لیتی تھی اور اس وقت مراد کی خوشی کا عالم ہی
اور ہوتا تھا جب جنت اس کو چائے کی پیالی پکڑاتی تھی۔

"میں ابھی مسعود کے گھر سے آ رہا ہوں۔" اس نے زیبن سے کہا اور پھر اس کو
بات بتا دی۔

"اچھا.....؟ تو پھر تو ہم بھی حاجی سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ دس ہزار پر بات ختم کر
زیبن نے کہا۔ "میں آج ہی ماسی خیراں سے بات کرتی ہوں اگر اس نے مسعود
والوں کے ساتھ اتنی رعایت کی ہے تو ہمارے ساتھ بھی رعایت کرے۔"

مراد کچھ دیر تک وہاں رہا اور "جنت کے بھائی" کے لطیف و نازک اشارے کو یاد کر کے محظوظ ہوتا رہا۔

اس کے جاتے ہی زمین سیدھی ماسی خیراں کے پاس پہنچی اور اس نے اس کو ساری بات بتا دی۔

"بس پھر کل ہی میں حاجی کے پاس پہنچتی ہوں۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "تم فکر مت کرو۔ میں تو اس کی جان کو آجاؤں گی۔ اس کا پیچھا نہیں چھوڑوں گی تم دیکھنا دس ہزار پر ہی معاملہ کرواؤں گی۔ اگر نہیں مانے گا تو پھر میں بھی چار آدمیوں کو جمع کر کے ان کے سامنے فیصلہ کراؤں گی۔"

"خدا تمہارا بھلا کرے ماسی خیراں۔" زمین نے کہا اور کچھ دیر بیٹھ کر وہاں سے چلی آئی۔

اگلے دن صبح کو گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر ماسی خیراں حاجی مدد علی قریشی کے پاس اس کے بھٹے پہنچی دفتر میں حاجی مدد علی قریشی اور منشی امیر علی موجود تھے۔

"حاجی صاحب۔" سلام دعا کے بعد ماسی خیراں نے اس سے کہا۔ "آپ نے مسعود کے گھر والوں کے ساتھ تو خاصی رعایت کر دی ہے اب کچھ اس غریب عورت کا بھی خیال کر لیجئے زمین کے تو آگے پیچھے کوئی ہے ہی نہیں۔ وہ بے چاری بچوں والی عورت ہے چار چار بیٹیوں کا بوجھ ہے کچھ....."

"دیکھو بھئی جہاں تک رعایت کرنے کا تعلق ہے تو مسعود کے معاملے میں تو میں نے غفور بھائی کے بہت کہنے سننے کی وجہ سے رعایت کی ہے اور اپنا سراسر نقصان کیا ہے لیکن اب ہر معاملے میں تو میں نقصان برداشت نہیں کر سکتا اگر اسی طرح نقصان برداشت کرتا رہوں گا تو مجھے تو یہ بھٹہ بند کر دینا ہو گا۔"

"نہیں حاجی صاحب۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "خدا نے آپ کو عزت دی ہے دولت دی ہے ہم غریبوں کی دعا ہے کہ آپ کا کاروبار چلتا رہے بس زمین کے ساتھ بھی کچھ ایسا کر لیجئے کہ....."

"منشی جی....." حاجی نے ماسی خیراں کی بات کاٹتے ہوئے امیر علی سے مخاطب ہو کر کہا۔ "ذرا شمس الدین کے پاس تو چلے جاؤ ابھی..... اس سے کہنا کہ پیسے ابھی تک نہیں پہنچے۔"

"اچھا جاتا ہوں۔" منشی امیر علی نے کہا اور دفتر سے باہر نکل آیا اس کے جانے کے



بعد حاجی مدد علی قریشی اور ماسی خیراں کمرے میں اکیلے رہ گئے۔

"اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا کر لیجئے حاجی صاحب کہ وہ اور اس کے بچے آپ کو دعائیں دیں، غریب عورت ہے....."

"آخر تم لوگ چاہتے کیا ہو مجھ سے.....؟" حاجی مدد علی قریشی نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔

"بس یہی کہ رقم اور ادائیگی کی مدت میں جو زیادہ سے زیادہ رعایت آپ دے سکیں۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "بس اصل کی رقم پر معاملہ کر لیجئے باقی سود وغیرہ....."

"تم اگر چاہو تو اصل کی رقم بھی چھوڑ سکتا ہوں۔" اچانک حاجی مدد علی قریشی نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیا.....؟" ماسی خیراں نے چونک کر کہا۔ اس کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ اس سے سننے میں کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ "جی.....؟ آپ نے کیا کہا حاجی صاحب۔" ماسی خیراں نے وضاحت طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے یہ کہا ہے اگر تم اور زمین چاہو تو ایک صورت ایسی ہو سکتی ہے کہ میں تمہارا سارا قرضہ معاف کر دوں بلکہ دس پندرہ ہزار روپے اوپر سے اپنی طرف سے بھی تمہیں دے دوں۔"

"اوئے۔" ماسی خیراں حیرت سے آنکھیں پھاڑے حاجی مدد علی قریشی کو دیکھ رہی تھی اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ حاجی مدد علی قریشی ہی بول رہا ہے۔ آخر ہوا کیا اسے یہ خدائے رحمت کیوں اس قدر جوش میں آگیا۔ "آپ ایسا کریں گے؟ آپ ایسا کیوں کریں گے حاجی صاحب؟ آپ زمین سے کیا چاہتے ہیں؟ اس غریب عورت کے پاس آپ کو دینے کے لئے کیا رکھا ہے؟"

"دیکھو ماسی خیراں تم سمجھ دار عورت ہو۔" حاجی مدد علی قریشی نے کہنا شروع کر دیا۔ "دنیا میں لوگ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور اس طرح سے دنیا کا کام چلتا ہے میں زمین کے ساتھ کھل کر بات کرنے کے لئے تیار ہوں بشرطیکہ زمین اپنی بیٹی جنت کی شادی میرے ساتھ کر دے۔"

"کیا.....؟" ماسی خیراں کو چکر آیا اسے اپنے اردگرد کی ہر شے تیزی سے گھومتی محسوس ہو رہی تھی تقریباً پچپن سالہ حاجی مدد علی قریشی جو نواسے پوتوں والا تھا جنت جیسی لڑکی سے شادی کی بات کر رہا ہے جو ابھی پورے تیرہ سال کی بھی نہیں ہوئی۔

"آپ..... جنت سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟"

"تو اس میں اس قدر حیرت کی کیا بات ہے؟" حاجی مدد علی قریشی نے خاصی ڈھٹائی کے ساتھ کہا۔ "آخر مرد ہوں اتنی زیادہ عمر بھی نہیں ہے ابھی میری ..... اور مذہب نے اور قانون نے مجھے چار شادیاں کرنے کی اجازت دی ہے آخر میں کوئی خلافِ شرع یا خلافِ قانون بات تو نہیں کر رہا ہوں۔"

"مگر حاجی صاحب آپ کی تو اولادیں بال بچوں والی ہیں۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "ماشاء اللہ بھرا پُرا گھر ہے' لوگ تو اکثر دوسری شادی اولاد کے لئے کرتے ہیں آپ کے ساتھ تو ایسی کوئی مجبوری نہیں ہے' ماشاء اللہ آپ کے تو بیٹے ہیں بیٹیاں ہیں اور ان میں سے بھی کچھ بچوں والے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے خیراں۔" حاجی مدد علی قریشی نے کہا۔ "مگر بات یہ ہے کہ سلمٰی پچھلے دس سال سے برابر بیمار چلی آرہی ہے اور اس کی وجہ سے میری گھریلو زندگی بری طرح متاثر ہو رہی ہے سارا گھر الٹ پلٹ رہتا ہے میں چاہتا ہوں کہ کوئی نوجوان لڑکی ہو جو گھر کو سنبھال سکے اور سب کچھ ٹھیک ٹھاک کر سکے۔"

"اور آپ کو بھی سنبھال سکے۔" ماسی خیراں نے یہ الفاظ دل ہی دل میں کہے۔

"لیکن..... حاجی صاحب جنت تو ابھی کافی چھوٹی ہے۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "اتنی جلدی اس کی شادی.....؟"

"میری اور سلمٰی کی جب شادی ہوئی تھی تو سلمٰی جنت سے زیادہ سے زیادہ سال بھر بڑی ہو گی۔" حاجی مدد علی قریشی نے کہا۔ "چلو فی الحال تو ایسا ہو جائے کہ نکاح ہو جائے بات پکی ہو جائے رخصتی بعد میں ہوتی رہے گی میں اس کے لئے تیار ہوں ویسے زمین کی مرضی ہے اگر وہ فوراً رخصتی کرنا چاہے تو میں اس کے لئے بھی تیار ہوں میں جنت کو اپنے گھر لے آؤں گا۔"

"حاجی صاحب اس بات کا فیصلہ میں نہیں کر سکتی۔" ماسی خیراں نے اپنے چہرے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ "اس بات کا فیصلہ تو زمین ہی کر سکتی ہے لیکن آپ کو مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہو گا اگر زمین اس رشتے کے لئے تیار نہیں ہوئی تو آپ اس سے بھی قرضے کی صرف اصل رقم طلب کریں گے اور سود وغیرہ کا تقاضا نہیں کریں گے اور اس رقم کی ادائیگی کے لئے بھی آپ اس کو کم از کم دو ماہ کی مزید مہلت دیں گے جس طرح کہ آپ نے مسعود کے گھر والوں کے ساتھ طے کیا ہے۔"



"چلو میں تمہاری یہ بات ماننے کو تیار ہوں۔" حاجی مدد علی قریشی نے کہا۔ "ایسا ہی سہی لیکن تم یہ کیوں فرض کر رہی ہو کہ زمین میری اس تجویز کو نہیں مانے گی؟ دیکھو تم زمین کو سمجھانا میں قرضے کی ساری رقم معاف کر دوں گا زمین کو دس پندرہ چلو بیس ہزار روپے کی رقم الگ سے دے دوں گا یہ صرف زمین کے لئے ہو گی اس سے جنت کا کوئی تعلق نہیں ہو گا۔ جہیز کی مجھے ضرورت نہیں اور شادی کے اخراجات بھی میں ہی برداشت کروں گا۔ میں جنت کو نکاح کے وقت بیس ہزار روپے حق مہر کے فوری طور پر ادا کر دوں گا جنت کو میری پہلی بیوی اور بچوں کے ساتھ نہیں رہنا ہو گا میں اسے اپنے نئے مکان میں رکھوں گا جو بس اب تیار ہونے ہی والا ہے' جنت کی تو قسمت جاگ جائے گی اسے سچ مچ جنت مل جائے گی۔"

"میں آپ کا پیغام زمین کو پہنچا دوں گی۔" ماسی خیراں نے اٹھتے ہوئے کہا وہ جلد از جلد اس جگہ سے نکل جانا چاہتی تھی اسے اس کمرے کی بند فضا میں گھٹن سی محسوس ہو رہی تھی وہ تازہ ہوا میں جا کر سانس لینا چاہتی تھی۔

"صرف پیغام ہی نہیں پہنچانا ہے خیراں۔" حاجی مدد علی قریشی نے کہا۔ "زمین کو سمجھا بجھا کر راضی بھی کرنا ہے اس کو سمجھانا کہ اس کی بیٹی کی اور اس کے سارے خاندان کی بھلائی اسی میں ہے کہ میری بات مان لے۔ جنت کی شادی میرے ساتھ ہو جائے تو ان لوگوں کے سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔"

"میں اس سے کہوں گی۔" ماسی خیراں نے تھکے تھکے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"اور ایک بات اور..... حاجی مدد علی قریشی نے اس کے ساتھ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "تم نے اگر زمین کو راضی کر لیا تو تمہارے انعام کے پورے پانچ سو روپے الگ' یہ میرا وعدہ ہے۔"

"نہیں حاجی صاحب۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "یہ آپ کا اور زمین کا معاملہ ہے میں بیچ میں انعام لینے والی بھلا کون ہوتی ہوں؟" اور اس کے ساتھ ہی وہ جلدی سے دروازے سے باہر نکل آئی۔

حاجی مدد علی قریشی کے کمرے سے باہر آکر اس نے کھلی اور روشن فضا میں ایک گہری سانس لی اور بہت سی تازہ ہوا کو اپنے پھیپھڑوں میں جذب کر لیا اس کو ایسا لگا جیسے اس کی کثیف ہوا سے بھرے ہوئے سیلے ہوئے نیم تاریک تہہ خانے سے نکل آئی ہے اور

وہاں سے باہر آتے ہی اس کی آنکھیں اس کا دل و دماغ سب کچھ روشن ہو گیا ہے۔

حاجی کی اس تجویز کے بارے میں وہ زمین سے کیا کہے گی؟ اس کے ذہن میں ایک زبردست ہیجان خلفشار برپا تھا۔ حاجی اسے زمین کو آمادہ کرنے کے بدلے میں پانچ سو روپے کی دلالی کی بھی پیش کش کر رہا تھا۔ ماسی خیراں کو اچانک ایسا لگا جیسے وہ کوئی نائیکہ ہو دلالہ ہو اور حاجی مدد علی قریشی جیسے گاہکوں کے لئے لڑکیاں فراہم کرتی ہو' یکبارگی اسے حاجی مدد علی قریشی سے گھن آنے لگی اور اپنے آپ سے بھی۔

وہ حاجی مدد علی قریشی کی بیوی کو اچھی طرح جانتی تھی اور اسے اکثر دیکھتی رہتی تھی وہ ایک موٹی اور عمر رسیدہ عورت تھی تقریباً پچاس سال کی عمر کی اور اس کا ڈھول کی طرح نکلا پیٹ جو کافی نیچے کو بھی ڈھلکا ہوا تھا اس کے وجود کے آگے آگے چلتا تھا لیکن جہاں تک ماسی خیراں کی معلومات کا تعلق تھا اسے کوئی خاص یا عام بیماری نہیں تھی وہ تو خوب کھاتی پیتی تھی اور گھومتی پھرتی تھی ہاں اس کو اگر کوئی بیماری تھی تو عمر رسیدگی کی اور اس بیماری کا تو کسی کے پاس علاج نہیں تھا۔

حاجی کی پانچ اولادیں تھیں جن میں سے تین شادی شدہ اور خود بھی بال بچوں والی تھیں ایک لڑکا اور ایک لڑکی نو عمر تھے اور ابھی اسکولوں میں پڑھ رہے تھے اور حاجی مدد علی قریشی ایک تیرہ سال سے کم عمر کی لڑکی کو نکاح کے نام پر خریدنا چاہتا تھا وہ اس کی ماں کو ایک معمولی سی رقم ادا کر کے اس نو عمر لڑکی کا تازہ تازہ گرم گرم گوشت خریدنا چاہتا تھا ماسی خیراں کو ابکائی آنے لگی' اس کی نظروں کے سامنے جنت کا حسین اور نازک پیکر لہرا رہا تھا اور پھر اس نے کھچڑی داڑھی' کھچڑی بالوں اور جھریوں بھرے چہرے والے ایک موٹے' تازے' بھاری بھرکم درندے کو اس نازک پیکر کے ساتھ بیٹھے دیکھا۔

"زمین کیا فیصلہ کرے گی؟" ماسی خیراں دل ہی دل میں سوچ رہی تھی۔ "کیا وہ حاجی مدد علی قریشی کی تجویز مان لے گی؟ شاید..... مان ہی لے۔ اس میں فائدہ ہے وہ اپنی عمر بھر کی کمائی کے نقصان سے بچ جائے گی آخر اس کے سینے پر مونگ دلنے کے لئے اور بھی تو تین بیٹیاں بیٹھی ہوئی ہیں جنت کے علاوہ..... اور زمین کی مدد کرنے والا کون ہے؟ ناصر کے بارے میں کسی کو کیا معلوم..... لیکن..... کیا جنت جیسی پیاری اور معصوم لڑکی کا یہی حشر ہونا چاہئے؟ کیا یہی اس کی تقدیر ہے؟" ایک دم ماسی خیراں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

وہ تھکے تھکے قدموں سے اپنے گھر کی طرف جا رہی تھی کہ اچانک ایک آواز سن کر



چونک پڑی۔ کوئی اس کا نام لے کر اس کو سلام کر رہا تھا اس نے چونک کر دیکھا۔ وہ مراد خانجو سامنے سے آ رہا تھا۔

ماسی خیراں نے مراد کو دیکھا اور اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے رک گئی۔

"کہاں سے آ رہی ہو ماسی خیراں؟ سب خیریت تو ہے؟" مراد نے اس سے پوچھا۔ "تم حاجی کے پاس کب جاؤ گی زمین چاچی کے معاملے میں بات کرنے کے لئے.....؟"

"میں وہیں گئی تھی۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "وہیں سے آ رہی ہوں۔"

"اچھا؟" مراد نے فوراً پُر اشتیاق لہجے میں پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟ حاجی نے کیا کہا؟"

"حاجی اس بات کے لئے تیار ہے کہ وہ قرضے کی ساری کی ساری رقم معاف کر دے گا۔" ماسی خیراں نے مراد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گہری اور بھاری آواز میں کہا۔

مراد اور جنت کے درمیان پسندیدگی اور چاہت کا جو ایک استوار ہوتا ہوا' فروغ پاتا ہوا' مستحکم ہوتا ہوا رشتہ موجود تھا ماسی خیراں اس سے کسی حد تک واقف تھی اور وہ اس پر معترض بھی نہیں تھی وہ مراد کو ایک خراب لڑکا نہیں سمجھتی تھی اور جہاں تک جنت کا تعلق تھا اس کو تو وہ بیٹی کی طرح عزیز رکھتی تھی چنانچہ جب اسے مراد اچانک راستے میں مل گیا تو اس نے اس کو حاجی کی پیشکش کے بارے میں بتانے کا فیصلہ کر لیا۔ کیا خبر مراد تک یہ اطلاع دیر سے پہنچے۔ وقت کس کا انتظار کرتا ہے بتا دینا بہتر تھا۔

"کیا.....؟" مراد نے آنکھیں پھاڑ کر حیرت اور بے یقینی کے عالم میں کہا۔ "ساری رقم معاف کر دے گا مگر کیوں؟ کیسے؟ کیا ناصر کا کچھ پتہ چل گیا ہے؟"

"یہ بات نہیں ہے۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "ذرا ادھر آ جاؤ پیڑ کے نیچے..... ادھر تو دھوپ بہت تیز ہے۔"

اور وہ سامنے والے درخت کی طرف چل پڑی۔ مراد بے تابانہ انداز میں اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا دونوں ایک گھنے درخت کی چھاؤں میں نیچے آ کر کھڑے ہو گئے جہاں خوشگوار قسم کی ٹھنڈک تھی۔

"ہاں تو پھر کیا بات ہے ماسی خیراں؟" مراد نے وہاں آتے ہی جلدی سے پوچھا۔

"وہ جنت سے شادی کرنا چاہتا ہے۔" ماسی خیراں نے ایک دم' سپاٹ اور سرد لہجے میں کہا۔

"کیا.....؟" مراد کا چہرہ مسخ ہو گیا۔ "جنت سے شادی کرنا چاہتا ہے؟ حاجی شادی

کرنا چاہتا ہے؟ دوسری شادی.....؟"

"ہاں۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "وہ جنت سے شادی کرنا چاہتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ اگر زمین اس کے لئے راضی ہو جائے تو وہ نہ صرف یہ کہ سارا قرضہ معاف کر دے گا بلکہ زمین کو الگ سے کچھ رقم بھی دے دے گا۔" اس نے صحیح رقم نہیں بتائی حالانکہ اسے معلوم تھی' وہ مراد کو ایک دم سے زبردست دباؤ کا شکار نہیں بنانا چاہتی تھی اصل بات تو اس نے اس کو بتا ہی دی تھی۔

"حاجی کچھ پاگل تو نہیں ہو گیا ہے؟" مراد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "بھلا کہاں جنت اور کہاں وہ..... وہ تو عمر میں اس کے باپ سے بھی بڑا ہے۔"

"ہاں بیٹا..... مگر اس کے پاس پیسہ ہے۔" ماسی خیراں نے آہستہ سے کہا۔ "پیسے کے بل بوتے پر ہی تو وہ زمین پر دباؤ ڈالنا چاہتا ہے۔"

"تو..... تو..... کیا زمین چاچی اس کے لئے راضی ہو جائیں گی۔" مراد نے سخت ذہنی اذیت' ہیجان اور انتشار کے عالم میں ماسی خیراں سے ایک ایسا سوال پوچھا جس کا ماسی خیراں کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

"میں کیا کہہ سکتی ہوں بیٹا؟" ماسی خیراں نے کہا۔ "جنت اس کی بیٹی ہے اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار بھی اس کو ہے اچھا بیٹا میں اب چلتی ہوں گھر پر بہت سارے کام پڑے ہوئے ہیں۔"

"ہاں' ہاں چلو۔" مراد نے جلدی سے کہا۔ وہ خود بھی ماسی خیراں کے ساتھ ساتھ چلنے لگا وہ اس سے زیادہ سے زیادہ باتیں کرنا چاہتا تھا وہ جاننا چاہتا تھا کہ حاجی نے اور کیا کیا کہا ہے۔

"ماسی خیراں' حاجی مدد علی قریشی کا تعلق تو اس برادری سے نہیں ہے جس سے زمین کا تعلق ہے۔" اس نے چند قدم ساتھ چلنے کے بعد پوچھا۔

"ہاں....." ماسی خیراں نے اس کو جواب دیا۔ "حاجی مدد علی قریشی ان لوگوں کی برادری کا نہیں ہے' اس کا تعلق دوسری برادری سے ہے۔"

"تو پھر.....؟" اس نے درد انگیز سادگی کے ساتھ پوچھا۔ "پھر یہ شادی کیسے ہو سکتی ہے؟"

"کیوں نہیں ہو سکتی بیٹا؟" ماسی خیراں نے کہا۔ "جہاں پیسہ ہو اور طاقت ہو' وہاں سب کچھ ہو سکتا ہے' پیسے اور طاقت کے بل بوتے پر تو انسان اپنی ہر خواہش منوا سکتا ہے



ہاں..... دیکھو..... میں نے تم کو تو یہ بات بتا دی ہے لیکن خدا کے واسطے اور کے سامنے اس کا ذکر نہ کر بیٹھنا۔ زمین سے تو ابھی میری ملاقات بھی نہیں ہوئی ہے نہیں معلوم کہ وہ اس بارے میں کیا فیصلہ کرے گی۔"

"نہیں نہیں..... ماسی۔" مراد نے کہا۔ "میں بھلا کس سے کہنے جاؤں گا۔"

"تم کو یہ بات میں نے اس لئے بتا دی کہ تم خود بھی اتنی بھاگ دوڑ کر رہے ہو اور لوگوں سے ہمدردی رکھتے ہو۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "ورنہ بات ایسی نہیں ہے کہ میں سے اس کا ذکر کر سکوں۔"

"تم اطمینان رکھو ماسی خیراں میں کسی سے نہیں کہوں گا۔" مراد نے کہا۔ "لیکن تم بتانا ضرور کہ زمین چاچی نے اس معاملے میں کیا فیصلہ کیا میں تم سے پوچھوں گا۔"

"ہاں میں تم کو بتا دوں گی۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "اب فیصلہ کرنا تو زمین کا ہی کام ہے۔"

"تو..... حاجی مدد علی قریشی اور کیا کہتا تھا؟" مراد مزید تفصیلات جاننا چاہتا تھا لیکن خیراں اس کو مزید کچھ نہ بتا سکی کیونکہ اس وقت ایک اور عورت وہاں آ گئی اور ماسی سے دعا سلام کے بعد ان لوگوں کے ساتھ چلنے لگی۔

"کہاں سے آ رہی ہو ماسی خیراں.....؟" اس عورت نے جو ماسی خیراں کے پڑوس رہتی تھی' اس سے پوچھا۔

"حاجی مدد علی قریشی کے پاس سے آ رہی ہوں۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "تم کو معلوم ہے زمین کا بیٹا ناصر گھر سے کہیں چلا گیا ہے اور حاجی زمین سے اپنی رقم واپس مانگ رہا اسی معاملے کے بارے میں بات کرنے کے لئے حاجی کے پاس گئی تھی۔"

مراد اس کی باتیں سن رہا تھا اور دم بخود تھا اب وہ آگے اور کیا کہے گی؟

"پھر.....؟" اس عورت نے کہا۔ "کیا کہتا ہے حاجی.....؟"

"کہہ سن کر تو بہت آئی ہوں۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "اب آگے اس کی مرضی ہے بہتر تو ہے کہ کچھ نہ کچھ رعایت کر دے گا آخر وہ غریب' بچوں والی عورت کہاں سے اتنا سارا پیسہ....."

مراد نے دل ہی دل میں اطمینان کی سانس لی۔

"ہاں ماسی خیراں۔" اس عورت نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "وہ تو بے چاری ہے بدقسمت۔ میاں کو نشے نے کھایا اور بیٹا یوں آوارہ نکل گیا' آج کل یہ نشہ بہت پھیلا

ہوا ہے' ماسی وہ میرا نندوئی ہے نا رشید اس کے دونوں بھائی بھی نشہ کرنے لگے ہیں ہیروئن پیتے ہیں ہیروئن..... دونوں سوکھ سوکھ کر زندہ لاش کی طرح ہوتے جا رہے ہیں' خدا معلوم کہاں سے یہ لت لگ گئی ہے لوگوں کو..... دونوں کے گھر برباد ہو رہے ہیں' بچے برباد ہو رہے ہیں اور انہیں کوئی پروا ہی نہیں ہے بس رات دن نشے میں دھت پڑے رہتے ہیں' میری نند کو رات دن اپنے میاں کی فکر کھائے جاتی ہے کہیں وہ بھی نشہ نہ شروع کر دے' چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اس کے....."

"خدا ہر ایک کو اس منحوس نشے سے محفوظ رکھے۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "پہلے تو کبھی نام بھی نہیں سنا تھا اس کا' اب یہ نہ جانے کہاں سے نکل آئی ہے جدھر دیکھو ہیروئن..... ہیروئن..... ہیروئن..... جگہ جگہ ہیروئن بیچنے کے اڈے بن گئے ہیں اور سنا ہے بڑے بڑے لوگوں کا بڑے بڑے افسروں اور حاکموں کا اس کے پیچھے ہاتھ ہے۔"

"ہاں ماسی کیوں نہیں ہو گا۔" اس عورت نے جلدی سے کہا۔ "افسر لوگوں کے حکم کے بغیر تو پتہ بھی نہیں ہل سکتا' آدھی سے زیادہ چوریاں پولیس والے کرواتے ہیں اور بدمعاشی کے نہ جانے کون کون سے دھندے کرواتے ہیں' اب اپنے ہی محلے میں دیکھ لو اللہ داد خان کس آزادی سے ہیروئن کا اڈہ چلا رہا ہے اور ساتھ میں چوری کے مال کی خرید و فروخت کا دھندا بھی کرتا ہے کیا بگاڑ لیا کسی نے اس کا؟ اس کا بڑا بھائی پولیس میں جو ہے مجال ہے محلے والوں کی جو اس کے خلاف کوئی کارروائی کر سکیں۔"

"ہاں بیٹی۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "ایسا تو ہے ایسا ہی ہے ساری تباہی بڑے لوگ پھیلاتے ہیں' غریب تو صرف ان کے ظلم کی چکی میں پستا رہتا ہے اور روتا رہتا ہے۔"

وہ دونوں آپس میں باتیں کرتی ہوئی جا رہی تھیں اور مراد کے وجود کو تو جیسے انہوں نے فراموش ہی کر دیا تھا۔ مراد کو اندازہ ہو گیا کہ اب وہ دونوں اپنے گھر تک ایک ساتھ ہی جائیں گی اور مراد کو ماسی خیراں سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع نہیں مل سکے گا۔

"بعد میں سہی۔" اس نے دل میں کہا۔

"اچھا ماسی خیراں میں چلتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "اب ذرا منڈی کی طرف بھی چکر لگانا ہے۔"

"ہاں ہاں جاؤ۔" ماسی خیراں نے جلدی سے کہا۔ "سنا ہے تم نے منڈی میں اپنا کاروبار شروع کر دیا ہے۔"



"ہاں ماسی۔" مراد نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "کچھ کوشش تو کر رہا ہوں۔"

"اللہ کاروبار میں برکت دے بیٹا۔" ماسی خیراں نے کہا اور مراد ان دونوں سے رخصت ہو کر چلا گیا۔ ماسی خیراں اس عورت کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی اپنے گھر تک چلی گئی۔

زمین سے تو اب رات کو ہی تفصیلی بات ہو سکتی تھی لیکن ماسی خیراں کے دل میں بار بار یہ خیال آتا تھا کہ وہ زمین کو کیا مشورہ دے سکتی ہے' زمین اس سے پوچھے گی ضرور..... تو وہ کس خیال کا اظہار کرے؟ اگر ایک طرف حاجی کے ساتھ جنت کی شادی کی صورت میں زمین کے بہت سارے مسائل حل ہو جاتے تھے اور اس کے سر پر لدے ہوئے بوجھ میں کافی کمی ہو جاتی تھی تو دوسری طرف جنت قتل ہو جاتی تھی! ماسی خیراں کے لئے کوئی فیصلہ کرنا بڑا مشکل تھا' وہ جنت کے قتل نامے پر اپنا انگوٹھا نہیں لگانا چاہتی تھی' کافی سوچ بچار کے بعد اس نے کہا کہ وہ اس معاملے میں بالکل غیر جانبدار رہے گی اور اس کا فیصلہ صرف زمین پر چھوڑ دے گی خود اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

اس کو یہ اطمینان تو بہرحال تھا کہ مراد کو ساری بات فوراً ہی معلوم ہو گئی ہے اور وہ اس معاملے سے بے خبر نہیں ہے اب آگے وہ جانے اور اس کی قسمت۔

شام کو جب زمین اپنے کام سے واپس آئی تو اس نے آتے ہی نصرت کو ماسی خیراں کے گھر بھیجا کہ وہ اس کو بلا کر لے آئے۔ زمین یہ جاننے کے لئے بے چین تھی کہ ماسی خیراں کی حاجی سے کیا بات ہوئی ہے۔

"تم لوگوں نے اور تمہاری اماں نے کھانا کھا لیا ہے' یا ابھی نہیں؟" ماسی خیراں نے نصرت سے پوچھا۔

"ابھی نہیں۔" نصرت نے جواب دیا۔ "اماں ابھی ابھی تو گھر میں گھسی ہیں۔"

"اچھا تو اماں سے کہنا کہ کھانا کھا لیں۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "میں تھوڑا ٹھہر جاؤں گی ابھی میں نے بھی کھانا نہیں کھایا ہے۔"

"اچھا۔" نصرت نے کہا اور وہاں سے چلی گئی۔

ماسی خیراں کے پاس کہنے کے لئے جو بات تھی' وہ صرف چند جملوں میں ختم نہیں ہو سکتی تھی' یہ ایک لمبی بات تھی اور اس کو پوری طرح سے بیان کرنے اور سمجھنے کے لئے کچھ وقت درکار تھا' وہ چاہتی تھی کہ زمین کھانے وغیرہ سے فارغ ہو جائے' اس کے

بعد ہی جا کر وہ اس سے بات کرے' اس نے خود بھی ابھی کھانا نہیں کھایا تھا۔

تقریباً گھنٹہ بھر کے بعد جب وہ زمین کے گھر میں پہنچی تو زمین اور جنت دونوں اس کی منتظر تھیں۔ بچیاں سو چکی تھیں اور زمین اور جنت نیم تاریک صحن میں ایک چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔

"آؤ ماسی خیراں۔" زمین نے اس کو دیکھتے ہی کہا۔ "میں تو کب سے تمہاری راہ دیکھ رہی تھی' کیا کہا حاجی نے؟ کوئی بات بنتی نظر آتی ہے؟" زمین کو سب کچھ جاننے کی بہت جلدی تھی۔

"ہاں بات ہوئی تھی۔" ماسی خیراں نے آہستہ سے کہا اور اس کے اس لہجے سے زمین اور جنت دونوں ایک دم چونک اٹھیں' زمین نے خوف زدہ نظروں سے ماسی خیراں کی طرف دیکھا۔

"وہ بڑی عجیب بات کرتا ہے زمین....." ماسی خیراں نے کہا۔ "کہتا ہے کہ وہ سارا قرضہ معاف کر دے گا اور اپنی طرف سے تم کو بیس ہزار روپے کی رقم الگ سے بھی دے گا اگر تم جنت کی شادی اس کے ساتھ کر دو۔"

جنت وہاں موجود تھی' اپنی ماں کے پاس چارپائی پر بیٹھی ہوئی اور ماسی خیراں کی زبان سے یہ الفاظ سن کر اس کو ایسا لگا جیسے وہ چارپائی سمیت زمین کے اندر دھنستی چلی جا رہی ہے اور اس کا وجود ایک گہری اور تاریک قبر میں اترتا چلا جا رہا ہے جہاں سیلی ہوئی مٹی کی بو' گھٹن اور جہنم کی تپش ہے۔

زمین ذرا دیر تک تو کچھ بول ہی نہیں سکی' اس پر سکتے کی سی کیفیت طاری تھی' اس کے تو وہم و گمان میں بھی یہ بات کبھی نہیں آئی تھی کہ حاجی جو جنت کے باپ گامو سے عمر میں کم از کم دس سال بڑا ہے' جنت سے شادی کا خواہش مند بھی ہو سکتا ہے' اس ایک اور جھٹکے نے اس کے اعصاب کو بالکل نڈھال کر کے رکھ دیا۔

جنت وہاں سے اٹھ کر نہیں گئی' بات اس کی شادی کی ہو رہی تھی اور قاعدے اور روایت کے مطابق اس کو وہاں سے ہٹ جانا چاہئے تھا لیکن وہ نہیں ہٹی' وہ وہیں بیٹھی رہی اور کسی نے اس سے کہا بھی نہیں کہ وہ وہاں سے ہٹ جائے۔ زمین کے تو ہوش ہی ٹھکانے نہیں رہے تھے اور ماسی خیراں تو خود چاہتی تھی کہ جنت بھی سب کچھ سن لے۔

"یہ خیال اس کے دماغ میں کہاں سے آگیا؟" کچھ دیر کے بعد زمین نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔



"کہیں نہ کہیں سے تو آ ہی گیا۔" ماسی خیراں نے کہا اور اس کے بعد اس نے دھیرے دھیرے بولتے ہوئے ساری بات زمین کو بتا دی اور جنت سر جھکائے ہوئے بت بنی بیٹھی رہی..... خاموش..... بے حس و حرکت۔

"یہ تو بڑا اندھیر ہے ماسی خیراں....." پوری بات سننے کے بعد زمین نے پہلی بار زبان کھولتے ہوئے کہا۔ "حاجی کو ایسی بات تو نہیں کہنی چاہئے' وہ تو عمر میں گامو سے بھی بڑا ہے' بہت بڑا ہے' کم سے کم دس بارہ سال....."

"ہاں زمین..... عمروں کا فرق ہے۔" ماسی خیراں نے اسی طرح دھیمے لہجے میں کہا۔ "یہ کوئی جوڑی نہیں ہے۔"

"ارے!" اچانک زمین نے جنت کو کڑی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "تو یہاں بیٹھے کیا کر رہی ہے؟ چل جا یہاں سے' دفع ہو ادھر سے' لو مجھے تو خبر ہی نہیں اور وہ میرے سر پر سوار بیٹھی ہے۔" ایسا لگتا تھا جیسے وہ جنت کی موجودگی سے اب تک بالکل بے خبر رہی ہو اور اس پر یکایک اس کی موجودگی کا انکشاف ہوا ہو۔

جنت وہاں سے اٹھی اور بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی جانے لگی۔ اسے ایسا لگ رہا ہے وہ چل نہیں رہی بلکہ گر رہی ہے کسی بڑے اور تاریک گڑھے میں' گرتی چلی جا رہی ہے۔

"پھر اب کیا کریں ماسی خیراں؟" جنت کے وہاں سے جانے کے بعد زمین نے درد آلود آواز میں ماسی خیراں سے اس کی رائے طلب کی اور ماسی خیراں کے لئے مشکل ترین مرحلہ آن پہنچا تھا۔

"میں کیا بتا سکتی ہوں زمین!" اس نے محتاط انداز میں کہا۔ "حاجی نے جو کچھ کہا' وہ میں نے تم کو بتا دیا ہے' اب تم خود ہی سوچ کر فیصلہ کر لو' تمہارے سامنے دونوں ہی راستے ہیں اچھی طرح سے سوچ لو' غور کر لو اور پھر فیصلہ کرو' ویسے میں نے حاجی کو اس بات پر تیار کر لیا ہے کہ اگر تم اس کا پیغام نامنظور کرتی ہو تو اس صورت میں بھی تم کو قرض کی کل رقم یعنی دس ہزار روپے ادا کرنے ہوں گے اور آج کی تاریخ سے اگلے دو ماہ کی مہلت ہو گی' تمہارے پاس....."

"میں تو بڑی مشکل میں پھنس گئی ہوں۔" زمین نے جیسے اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے کہا۔ "کیا کروں میں؟ میرا تو دماغ ہی کچھ کام نہیں کر رہا ہے۔"

"جلدی کی ضرورت نہیں ہے زمین....." ماسی خیراں نے بدستور غیر جانبدار

رہتے ہوئے اسے تسلی دی۔ "ابھی تمہارے پاس وقت ہے' اس معاملے پر خوب اچھی طرح غور کر لو' شادی کوئی گڈے گڑیا کا کھیل نہیں ہوتی' جو بھی فیصلہ کرو' ہر پہلو پر غور کر کے کرو اور جنت کے بارے میں اچھی طرح سوچ لینا۔"

"کیا کروں؟ کیا سوچوں؟" زیبن نے آہستہ سے کہا۔ "میرا تو دماغ پھٹا جا رہا ہے ہائے ماسی خیراں' حاجی تو میرے شوہر سے بھی دس بارہ سال بڑا ہے' میں اسے اپنی بیٹی شوہر کس طرح بنا دوں؟ اور اگر..... نہ بناؤں تو کیا کروں؟ پھر تو ہر چیز سے ہاتھ دھو کے لئے تیار رہنا چاہئے۔"

"اچھا میں اب چلتی ہوں۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "بہت رات ہو گئی ہے' تم آرام کرو' سو جاؤ' سکون سے سوچنا' اس بارے میں ابھی تمہارے پاس کافی وقت ہے۔"

"تمہاری بہت بہت مہربانی ماسی خیراں کہ تم نے حاجی کو اس بات پر راضی کر لیا اصل رقم پر بھی معاملہ کر لے۔" زیبن نے ماسی خیراں کے ساتھ ہی چارپائی سے ہوئے کہا۔ "اور تم نے مہلت بھی دلوا دی۔"

"مہربانی کس بات کی زیبن؟" ماسی خیراں نے کہا۔ "مجھے اس سے یہ بات تو ہی تھی' اس بات کا شادی والی بات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

ماسی خیراں اپنے گھر چلی گئی اور جب زیبن اسے چھوڑنے کے لئے دروازے جا رہی تھی تو جنت جلدی سے کمرے کے دروازے کے پیچھے سے ہٹ گئی جہاں کھڑی وہ ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔

وہ ساری رات ان تین افراد کے لئے ایک قیامت کی رات تھی' وہ تینوں دوسرے سے الگ الگ اپنے اپنے بستروں پر پڑے ہوئے جاگ رہے تھے اور اپنے دکھوں کی آگ میں جل رہے تھے' ان تینوں کے دکھ گردش حالات اور ٹوٹی قسمت ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے تھے۔

زیبن..... کیا وہ ایک ایسے داماد کو قبول کر لے جو عمر میں اس کے شوہر سے دس بارہ سال بڑا ہے؟ بیشک وہ اس طرح جنت کے فرض سے سبکدوش ہو سکتی تھی' سے نجات حاصل کر سکتی تھی اور جو کچھ جمع تھا اس کے پاس موجود تھا' اس کو بچا ساتھ ساتھ مزید رقم بھی حاصل کر سکتی تھی جو ان مزید تین بھاری پتھروں کو ہٹا آسکتی تھی جو اس کے سینے پر رکھے ہوئے تھے ایک راستہ تو تھا' بات بن تو سکتی جنت.....؟ حاجی کی پہلی بیوی.....؟ جوان جوان اور بال بچے والی اولادیں؟



جنت..... کیا اسے واقعی حاجی مدد علی قریشی کی بیوی بننا ہو گا؟ ہائے ابا تم پیسے لے گھر سے کیوں بھاگ گئے؟ ہائے ناصر تو گھر چھوڑ کر کیوں چلا گیا؟ اب کیا ہو گا؟ اب کیا ہو گا؟ مراد..... مراد بے چارہ کیا کرے گا؟ وہ کیا کر سکتا ہے؟ حاجی کو اپنا پیسہ چاہئے اور مراد؟ مراد بہت طاقتور آدمی ہے مراد..... مراد کی تصویر جنت کی آنکھوں کے سامنے ابھر رہی تھی' ایک ٹوٹی پھوٹی' شکستہ' مٹی مٹی سی' دھندلی دھندلی تصویر..... اور اس مٹی مٹی تصویر کے ساتھ جنت جیسے خود بھی مٹتی چلی جا رہی تھی..... وہ فنا ہو رہی تھی' دکھ کا ہرا چاٹے لے رہا تھا۔

مراد..... اپنی نامرادیوں کو گلے لگائے ہوئے اپنی شومئی قسمت پر نوحہ ال..... لہو کے دریا میں ڈوبا ہوا' اپنے بستر پر پڑا ہوا' کروٹیں بدلتا ہوا' اس کی چشم ہو اسے کیسے کیسے قاتل مناظر دکھا رہی تھی' چاند کی نرم لطیف اور روشن کرن کی طرح بن و نازک جنت دلہن بنی ہوئی تھی' شادی کے سرخ دہکتے ہوئے جوڑے میں ں..... اور اس کے ساتھ اس کا دولہا تھا' حاجی مدد علی قریشی..... اس نے ناب لگا کر اپنے سر اور داڑھی کے سارے بالوں کو سیاہ کر رکھا تھا اور وہ ہنس رہا تھا' پنے ٹوٹے ہوئے دانتوں کی نمائش کر رہا تھا' حاجی ہنس رہا تھا' جنت رو رہی تھی اور مراد ل ہو رہا تھا۔

وہ رات ان تینوں غم زدوں نے اپنے اپنے انداز میں' اپنے اپنے دکھوں کے توشے انبھالے ہوئے گزاری اور جب نیا دن طلوع ہوا تو ایک بار پھر وہی دکھ کا صحرا تھا' وہی لبہ پائی تھی' یہ صحرا کہاں ختم ہو گا؟

مراد نے دوپہر تک کا وقت بڑی مشکل سے گزارا' منڈی میں کام میں اس کا دل کہاں لگا' اسے کوئی بھی چیز اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

دوپہر کے بعد اس نے جنت کے گھر کا رخ کیا' اسے معلوم تھا کہ جنت اس کا انتظار کر رہی ہو گی' وہ ضرور اس سے ملنا چاہتی ہو گی اور اس کا خیال غلط نہیں تھا اس کی دستک کے جواب میں دروازہ تقریباً فوراً ہی کھل گیا جیسے کوئی دروازے کے قریب منتظر ہی بیٹھا ہوا ہو اور مراد اندر داخل ہو گیا۔

جنت کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید ہو رہا تھا یوں لگتا تھا جیسے ایک ہی رات کسی نے اس کے جسم سے سارا خون نکال لیا ہو' اس کی آنکھیں اپنے حلقوں میں ڈگر کر گری تھیں۔

گزشتہ رات جب ماسی خیراں نے یہاں آکر ساری بات بتائی تھی تو اس نے یہ ذکر نہیں کیا تھا کہ راستے میں اسے مراد ملا تھا۔ چنانچہ جنت سمجھ رہی تھی کہ مراد کو اس معاملے کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم ہے۔

"کیا کہتی ہیں زمین چاچی؟" مراد نے اندر آنے کے بعد بہت آہستگی سے جنت سے پوچھا اور جنت ایک دم چونک پڑی' اس نے غور سے مراد کے چہرے کو دیکھا' اپنے دکھ کی فراوانی میں وہ مراد کا دکھ تو جیسے بھول ہی گئی تھی اور اس نے اس بات پر غور ہی نہیں کیا تھا کہ مراد کے چہرے پر کیسی ویرانی برس رہی تھی۔

"کس چیز کے بارے میں؟" جنت نے غمناک حیرت کے ساتھ پوچھا۔

"وہی..... حاجی والے معاملے کے بارے میں۔" مراد نے کہا۔ "جو کچھ حاجی نے کہلوایا ہے' اس کے بارے میں۔"

"مگر تم کو کس نے بتایا؟" جنت کی حیرت میں اور زیادہ اضافہ ہوگیا۔

"مجھے..... مجھے ماسی خیراں نے ہی بتایا تھا۔" مراد نے کہا۔ "وہ جب حاجی کے پاس سے واپس آرہی تھی تو راستے میں مجھے ملی تھی' اس نے مجھے بتایا تھا۔"

جنت ایک دم خاموش ہوگئی' اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں' مراد نے اس کی آنکھوں میں تیرتی ہوئی نمی کو دیکھا اور یکایک اس کے حریم جاں میں جیسے ہزاروں قندیلیں روشن ہوگئیں' ایک ایسے عجیب و غریب درد آگیں احساس کے ساتھ اس کا وجود جگمگا اٹھا جس میں نشاط غم کی سحر آفرینی گھلی ہوئی تھی' ہاں..... جنت کی آنکھوں کی یہ نمی اس کے لئے تھی' مراد کے لئے..... جنت کی آنکھوں سے ٹپکنے والا آنسوؤں کا یہ خزانہ اس کے لئے تھا اور وہ ان سارے موتیوں کو بڑی ہی محبت اور بڑی احتیاط کے ساتھ چن کر اپنے دامن دل میں بھرلینا چاہتا تھا۔

جنت نے گلوگیر آواز میں مراد کو وہ سب کچھ بتا دیا جو رات کو اس نے سنا تھا' مراد اس کی پوری بات سن کر کچھ دیر تک خاموش رہا۔ "پھر..... ابھی چاچی نے کوئی فیصلہ نہیں کیا؟"

"نہیں..... ابھی نہیں۔" جنت نے جواب دیا۔ "اماں نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا' کوئی فیصلہ نہیں کیا۔"

اور تم.....؟" مراد کے اس اچانک سوال پر جنت ایک دم سٹپٹا گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس کے جواب میں کیا کہے اس کو کون سا فیصلہ کرنا تھا؟ اس کے بارے



کون سا فیصلہ کرنے کا اختیار تھا؟ فیصلے تو دوسروں کو کرنے تھے اسے تو صرف ان فیصلوں پر عمل کرنا تھا۔

"میں نے؟" اس نے گھبرا کر کہا۔ "میں..... میں کیا فیصلہ کروں گی؟"

"میرا مطلب ہے کیا تم حاجی سے شادی کرلوگی؟" مراد نے بڑے بھونڈے پن سے سوال کیا اور شاید فوراً ہی اس کو اپنی بیوقوفی کا احساس بھی ہوگیا۔ "یعنی مطلب یہ کہ تم تو شاید کبھی بھی نہیں چاہوگی....."

"میرے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے مراد۔" جنت کی آنکھوں میں ایک بار پھر نمی امڈ آئے۔ "اماں جو بھی فیصلہ کریں گی....."

جنت اور مراد کے درمیان آج تک شادی کے بارے میں کھل کر کوئی بات چیت نہیں ہوئی تھی وہ دونوں ایک دوسرے سے ملتے رہے تھے اور ان کی یہ نو عمری کی چاہت سچائی اور خلوص سے بھرپور تھی لیکن اس میں ابھی تک مستقبل کے منصوبوں کا دخل وقوع نہیں ہوا تھا کیونکہ شاید ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا لیکن اب اچانک یک لخت' یہ وقت آگیا تھا مراد کے لئے اور جنت کے لئے بھی..... فیصلے کی گھڑی آن پہنچی تھی' مراد کی ساری رات ایک مشکل ترین فیصلے کے کڑے عذاب جھیلتا رہا تھا اور اب ان عذابوں میں وہ اپنے ساتھ جنت کو بھی شریک کرنا چاہتا تھا۔

وہ ساری دوپہر ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے' بہت ساری باتیں..... جنت نے اس کی پرواہ بھی نہیں کی کہ نصرت جاگ کر کمرے سے باہر نکل آئی تھی اور وہیں مراد کی موجودگی سے واقف ہوچکی تھی۔ کافی دیر کے بعد جب مراد وہاں سے رخصت ہوا تو جنت کے چہرے کی بیمار سفیدی میں امید کی سرخی جھلکتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

اگلے روز دوپہر سے پہلے مراد ماسی خیراں سے ملا جس نے اسے اپنے قریب چارپائی پر بٹھایا تھا۔

"ہاں کہو۔" ماسی خیراں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"ماسی..... میں جنت سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

مراد نے ایک دم سے سپاٹ لہجے میں کہا اور ماسی خیراں اس کی شکل دیکھنے لگی مراد کی زبان سے یہ بات سن کر اس کے تن بدن میں جیسے پھلجھڑیاں چھوٹنے لگی تھیں مراد نے

جو کچھ ابھی ابھی کہا تھا' وہ نہ صرف یہ کہ ماسی خیراں کی توقع کے مطابق تھا بلکہ اس کے دل کی آرزو بھی تھا' ماسی خیراں بہت سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ جنت کو حاجی کے چنگل سے صرف مراد ہی چھڑا سکتا ہے بشرطیکہ وہ اس کے لیے ہمت کرے تو اور مراد نے ہمت کر ڈالی تھی ماسی خیراں کی آنکھوں کی چمک ایک دم بڑھ گئی۔

"تم..... تم..... جنت سے شادی کرنا چاہتے ہو؟" اس نے رک رک کر اٹک اٹک کر کہا۔ "واقعی؟ کیا تم ایسا کرنے کے لئے تیار ہو؟ تم نے..... نے..... سب کچھ سوچ لیا ہے؟"

"ہاں ماسی خیراں۔" مراد نے کہا۔ "میں نے سب کچھ سوچ لیا ہے اور میں بہ سوچ سمجھ کر تم سے یہ بات کہہ رہا ہوں' تم نے حاجی کو اس بات پر تو راضی کرلیا ہے نا وہ دس ہزار روپے کی رقم لے کر معاملہ ختم کردے گا۔؟"

"ہاں..... لیکن تم کو یہ بات کس نے بتائی؟" ماسی خیراں نے حیرت سے کہا۔ "میں نے تو تم کو یہ نہیں بتایا تھا۔"

"یہ بات مجھے جنت نے بتائی ہے ماسی۔" مراد نے کہا۔ "اس نے مجھے بتایا ہے کہ حاجی کو دس ہزار پر راضی کرنے میں کامیاب ہوگئی ہو اور دو ماہ کی مہلت بھی لے لی تم نے اس سے....."

"ہاں..... یہ ٹھیک ہے۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "تو..... کیا تم جنت سے تھے؟" اس نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

"ہاں ماسی۔" مراد نے آہستہ سے کہا۔ "میں کل جنت سے ملا تھا اور اس نے ساری باتیں بتا دی ہیں حاجی کی دس ہزار روپے کی رقم میں ادا کروں گا زمین چاچی کو کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اپنی ساری چیزیں سنبھال کر رکھیں' حاجی کا قرضہ میں کروں گا۔"

"تم..... بہت بڑی بات کہہ رہے ہو بیٹا مراد۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "کیا تم اپنے والدین سے اس بارے میں مشورہ کرلیا ہے؟ وہ راضی ہوجائیں گے؟"

"میں نے ان سے ابھی بات نہیں کی ہے۔" مراد نے کہا۔ "سب سے پہلے تو چاچی کا راضی ہونا ضروری ہے اگر وہ راضی ہوجائیں تو پھر میں بات کو بڑھاؤں..... اپنے والدین سے نمٹنا میرا کام ہے اگر زمین چاچی راضی ہوتی ہیں شادی ضرور ہوگی۔ بس تم کسی طرح سے زمین چاچی کو راضی کرلو میں کسی کا محتاج



ہوں۔ ماسی اب میں خود کماتا کھاتا ہوں۔" مراد کے لہجے میں بڑی گہری خود اعتمادی تھی ماسی خیراں کی نظروں میں اس کے لئے تحسین کی جھلک تھی۔

"اچھی طرح سے سوچ لو مراد۔" ماسی خیراں نے ایک بار پھر زور دیتے ہوئے کہا۔ "بعد میں پیچھے نہ ہٹ جانا' مجھے معلوم ہے تمہاری ماں' جنت اور اس کے گھر والوں کو دل پسند نہیں کرتی' وہ تمہاری شادی شاید اپنی بہن کی....."

"اس بات کو چھوڑو ماسی۔" مراد نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں جو کچھ کہہ رہا ہوں' اس سے پیچھے ہٹنے والا نہیں ہوں' مرد بچہ ہوں' مرد کی زبان ہے میری....."

"ٹھیک ہے۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "دیکھو مجھے بیچ میں ڈالا ہے تو میرا منہ کالا مت کرنا' میں زمین سے صرف بات ہی نہیں کروں گی بلکہ اس کو راضی کرنے کی کوشش بھی کروں گی۔"

"خدا تمہارا بھلا کرے' ماسی خیراں۔" مراد نے اس کے دونوں ہاتھوں کو گرمجوشی سے تھام لیا۔ "تم یہ کام کرکے مجھ پر ایک ایسا احسان کروگی جس کا بدلہ میں ساری زندگی نہ چکا سکوں گا۔"

مراد ماسی خیراں کے پاس سے واپس آیا تو بڑا پُر امید تھا اسے صرف زمین چاچی کے ہاں کا انتظار تھا اگر زمین چاچی ہی انکار کردیتی تو پھر کچھ نہیں ہوسکتا تھا اور جہاں تک اس کے اپنے والدین کا تعلق تھا' تو وہ بغاوت کرنے کا فیصلہ کرچکا تھا' اپنے باپ کے بارے میں اسے پوری امید تھی کہ وہ اس کو راضی کرلے گا اصل خطرہ تو ماں کی طرف سے تھا۔ اگر جنت پر اتنی بڑی اور المناک افتاد نہ پڑ رہی ہوتی اور اسے حاجی مدد علی قریشی کے ہاں فروخت کردیئے جانے کا خدشہ درپیش نہ ہوتا تو مراد اتنا بڑا قدم نہ اٹھاتا لیکن جنت کے ساتھ پیش آنے والے اس متوقع المیے نے اس کے اندر غیر معمولی جرأت پیدا کردی تھی میں جنت کو یوں تباہ نہیں ہونے دوں گا' کیا جنت کی قسمت میں حاجی مدد علی قریشی کے بڑھاپے کا لکھا ہوا تھا؟

ماسی خیراں کے لئے وقت کاٹنا مشکل ہوگیا تھا وہ شدید بے چینی کے عالم میں اس کی منتظر تھی کہ زمین کام پر سے واپس آئے' کھانے وغیرہ سے فارغ ہو اور پھر وہ اس کے پاس جاکر اس سے مراد کے بارے میں بات کرے۔ اس نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے دلیلوں کی ایک فوج تیار کرلی تھی جن کے ذریعے وہ زمین کو قائل کرنے کی کوشش کرنا چاہتی تھی۔

خدا خدا کرکے شام ہوئی پھر رات آئی اور جب ماسی خیراں کو اندازہ ہوگیا کہ زمین کھانے وغیرہ سے فارغ ہوچکی ہوگی تو وہ زمین کے گھر پہنچی زمین اس وقت چارپائی پر آنکھیں بند کئے ہوئے پڑی تھی جنت نے اس کو ماسی خیراں کے آنے کی خبر دی۔

"آؤ ماسی خیراں۔" زمین جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی' اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور چہرے سے شدید تھکن کا اظہار ہو رہا تھا' ماسی خیراں اس کے پاس ہی جا کر بیٹھ گئی' جنت اس وقت باورچی خانے میں کام کر رہی تھی۔

"پھر کچھ سوچا زمین؟" ماسی خیراں نے اپنی آواز کو دھیما رکھتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی تو کچھ نہیں ماسی خیراں۔" زمین نے آہستہ سے کہا۔ "میرا تو دماغ ہی کام نہیں کر رہا ہے۔"

"آج مراد میرے پاس آیا تھا۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "وہ..... وہ جنت کا ہاتھ مانگ رہا ہے۔"

زمین کے تن بدن کو جیسے ایک زبردست جھٹکا لگا۔ وہ ایک دم تن کر بیٹھ گئی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ماسی خیراں کو دیکھنے لگی۔ "کیا کہہ رہی ہو ماسی خیراں؟ مراد..... مراد.....؟"

"بات یہ ہے زمین کہ کل جب میں حاجی کے پاس سے واپس آرہی تھی تو مراد راستے میں ملا تھا۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "میں نے اس کو ساری بات بتادی تھی پھر آخر میرے پاس آیا اور اس نے کہا کہ وہ حاجی کا دس ہزار روپے خود ادا کردے گا اگر تم جنت کے لئے اس کا رشتہ قبول کرلو۔"

"مگر ماسی خیراں۔" زمین کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ "وہ..... ان لوگوں کی برادری بھی الگ ہے..... وہ تو بالکل غیر لوگ ہیں' دوسری برادری کے..... میں..... لوگ کیا کہیں گے؟"

"جو تمہاری اپنی برادری کے لوگ تھے' زمین انہوں نے کون سا تمہارا دل خوش کردیا؟ کون سا برادری والا تمہارے کام آیا؟ ذرا مجھے بتاؤ مراد تمہاری برادری کا نہیں لیکن اس نے اپنوں سے بڑھ کر تمہارا ساتھ دیا اور تو کسی نے بھی اتنی بھاگ دوڑ نہیں پلٹ کر پوچھا تک نہیں' صرف باتیں ہی بناتے رہے لوگ..... اور پھر زمین..... حاجی کون سا تمہاری برادری کا ہے؟ وہ بھی تو غیر برادری کا ہے۔"

"مگر ماسی خیراں۔ اس کے ماں باپ؟" زمین نے بری طرح الجھتے ہوئے کہا۔



"وہ تو جو کچھ کہیں گے' بعد میں کہیں گے۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "پہلے تمہاری طرف سے تو معاملے کی کوئی صورت بنے اگر تم اپنی رضامندی کا اظہار کرو تو پھر یہ مراد کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے والدین کو تیار کرے گا اور جیسے شریفانہ طریقے سے شادی ہوتی ہے اس طرح شادی ہوگی' حاجی کا قرضہ مراد ادا کرے گا' تم کو اس سلسلے میں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے' تمہارے اوپر قرضے کا کوئی بوجھ نہیں رہے گا۔"

زمین کے لئے یہ سب کچھ بڑا ہی تحیر خیز تھا مراد کی جانب سے یہ پیشکش کہ وہ حاجی کا قرضہ خود ادا کردے گا' بڑی بات تھی..... اس سے مراد کے جذبے کی سچائی کا پتہ چلتا تھا' مراد جیسے غریب' سبزی فروش کے نوعمر بیٹے کے لئے دس ہزار روپے کی رقم بہت بڑی چیز تھی' اس رقم سے تو اس کے ہزار کام نکلتے جبکہ حاجی کے لئے تو لاکھوں روپے کی بات بھی معمولی بات تھی' وہ اگر اس سے زیادہ بھی خرچ کردیتا تو اس کے لئے کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔

ماسی خیراں بہت رات گئے تک زمین کے پاس رہی اور وہ دونوں سرگوشیوں میں باتیں کرتی رہیں۔ ماسی خیراں' زمین کو بہت کچھ سمجھاتی رہی اور اس نے اسے یہ اشارہ بھی دے دیا کہ مراد اور جنت ایک دوسرے کے ساتھ خوش رہیں گے کیونکہ وہ ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔

"تقدیر ایسے موقعے بار بار نہیں دیتی زمین۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "خوب سوچ کر فیصلہ کرو اور ایسا فیصلہ کرو جس میں تم سب لوگوں کی بھلائی ہو۔" اور اس کے بعد وہاں سے چلی آئی۔

زمین کے سامنے تین راستے تھے پہلا راستہ تو یہ تھا کہ وہ اپنا سارا جمع جتھا فروخت کرکے حاجی کا قرضہ ادا کردے اور اس طرح اپنے آپ کو اس بار سے سبکدوش کرلے اس صورت میں پھر اس کے پاس اپنی بچیوں کے لئے کچھ بھی باقی نہ بچتا اور اسے ہر شے سے سرے سے آغاز کرنا پڑتا اور کون جانے زندگی کب تک وفا کرتی اور ہاتھ پیر کب ساتھ دیتے۔

دوسرا راستہ یہ تھا کہ وہ حاجی کی پیشکش کو قبول کرکے جنت کی شادی اس کے ساتھ کرتا سارا قرضہ معاف ہوجاتا' اسے شادی کا کوئی خرچہ بھی نہ کرنا پڑتا اور الگ سے دس ہزار روپے بھی مل جاتے' جنت کو جو رقم ملتی سو الگ..... اس سودے میں تو

سراسر فائدہ ہی فائدہ تھا لیکن جنت کو رقم کے علاوہ اور کیا ملتا؟ اپنے میاں کی پہلی بیوی اور اس کی جوان جوان اولادوں کی بھرپور نفرتیں..... ان کی جانب سے ہمیشہ کی جانے والی تحقیر و تذلیل..... ذلتیں اور رسوائیاں..... مگر غریبی کا دلدر تو دور ہو جاتا۔

تیسرا راستہ یہ تھا کہ وہ جنت کی شادی مراد کے ساتھ کردے جو کہ مراد اور جنت کی خواہش کے عین مطابق ہو۔ اس صورت میں حاجی کا قرضہ تو ادا ہو جاتا اور زمین اپنے زندگی بھر کے اثاثوں سے محروم ہونے سے بچ جاتی لیکن مراد تو غیر قوم اور غیر برادری کی لڑکا تھا مگر وہ کتنی بڑی قربانی کے لئے تیار تھا اس کی سچائی پر شک نہیں کیا جاسکتا تھا مگر..... مگر اس کے ماں باپ؟ کیا وہ رشتہ لے کر آئیں گے؟ لیکن پہلے تو اس کو فیصلہ کرنا تھا کہ وہ مراد کی پیشکش کے بارے میں کیا سوچتی ہے۔

ان تین راستوں میں سے زمین کو کسی ایک راستے کا انتخاب کرنا تھا وہ اپنے آپ کو ایک کڑی آزمائش میں پھنسا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ ان تینوں راستوں میں ہر ایک کی اپنی اپنی چھاؤں تھی اور اپنی اپنی دھوپ تھی اور اسی دھوپ چھاؤں کے سفر میں زمین کو اپنی منزل کا تعین کرنا تھا۔

وہ تقریباً ساری رات اس نے کروٹ بدل بدل کر گزاری ذرا سی دیر کے لئے نیند آجاتی پھر غائب ہو جاتی تھی تاہم وہ یہ اندازہ نہیں لگا سکی کہ دوسری چارپائی پر جنت بھی بے خوابی کے آزار میں مبتلا خاموش پڑی ہوئی ہے۔

صبح ہونے تک زمین فیصلہ کر چکی تھی۔

اگر کوئی اور وقت ہوتا اور مراد نے جنت سے شادی کا پیغام بھجوایا ہوتا تو زمین اس کی سات پشتوں کو ادھیڑ کر رکھ دیتی اور اس کو اچھی طرح سے اس جرأت کا چکھاتی..... لیکن اب تو یہ پیغام ایسی حالت میں آیا تھا کہ جنت اس کے بارے سنجیدگی کے ساتھ غیر جذباتی انداز میں سوچنے پر مجبور تھی۔ ایک وقت تھا کہ وہ مراد کی صورت دیکھنے کی روادار نہیں تھی اور اس نے اس کو اپنے گھر آنے سے سختی کے منع کر رکھا تھا لیکن ناصر کے گھر سے چلے جانے کے بعد تو مراد ایک سہارے کی صورت میں اس کے سامنے آیا تھا اور اب جبکہ وہ حاجی کا قرضہ خود ادا کرنے کے لئے تیار مراد کے بارے میں زمین کا نقطہ نظر بالکل بدل گیا تھا اس نے برادری وغیرہ سب کو بھیجی اور جنت کے لئے مراد کے رشتے کو منظور کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

سوائے مراد کے، جنت سے کسی نے کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی



کے بارے میں تجویزیں پیش کی جاتی رہی تھیں اور فیصلہ بھی کر لیا گیا تھا لیکن اس تو کسی نے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ یہ تو محض اس کی خوش قسمتی تھی کہ جو فیصلہ ہوا، وہ کو دل سے قبول تھا اور کوئی بھی دوسرا فیصلہ اس کے لئے اس قدر زندگی بخش نہیں تا تھا۔

جنت کو خوب معلوم تھا کہ رات کو ماسی خیراں اس کی ماں کے پاس کیوں آئی تھی ان دونوں کے درمیان بڑی دیر تک کیا کھسر پھسر ہوتی رہی تھی کیونکہ مراد نے اس بتایا تھا کہ وہ ماسی خیراں سے بات کر کے اس کو زمین کے پاس بھیجے گا لیکن جنت کو یہ معلوم تھا کہ اس کی ماں نے کیا فیصلہ کیا۔

اپنی ماں کا فیصلہ معلوم کرنے کے لئے وہ بار بار اس کے چہرے کی طرف چوری ری دیکھ رہی تھی، وہ وہاں موجود تاثر کے ذریعے اس کی دلی کیفیت کا اندازہ کرنا چاہتی ی۔ زمین کے چہرے پر ایک ٹھہراؤ کی سی کیفیت تھی، اس ٹھہراؤ میں ایک قسم کی مانیت اور سرخوشی کی جھلک بھی موجود تھی۔ جنت کے لئے یہ طے کرنا مشکل تھا کہ وہ س کو کیا معنی پہنائے۔ اس کی ماں کے چہرے پر یہ طمانیت حاجی کی پیشکش منظور کرنے کی مورت میں بھی ہو سکتی تھی کیونکہ حاجی کی پیشکش میں تو ماں کے لئے فائدہ ہی فائدہ تھا اور یہ طمانیت مراد کا پیغام قبول کرنے کی صورت میں بھی ہو سکتی تھی کیونکہ اس میں بھی بہر حال فائدہ ہی تھا۔

کاش وہ اپنی ماں سے پوچھ سکتی کہ اس نے اس کے مقدر کا کیا فیصلہ کیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ قطعی طور پر ناممکن تھا۔

زمین جلدی جلدی جانے کی تیاریوں میں مصروف تھی اور جنت بھی بیک وقت بت سارے کاموں میں لگی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی وہ اپنی ماں کے طرز عمل کا بہت غور سے جائزہ لے رہی تھی شاید کوئی اشارہ مل جائے، کوئی علامت، ..... کوئی سراغ۔

"اچھا میں چل رہی ہوں۔" زمین نے اپنا تھیلا اور چادر سنبھالتے ہوئے کہا اور جنت کو فوراً ہی اس بات کا احساس ہوا کہ اس کی ماں آج معمول سے کچھ جلدی جا رہی ہے۔ "دروازہ بند کر لو اندر سے۔"

یہی روز کا معمول تھا۔ زمین جب گھر سے نکلی تو جنت گھر کے دروازے تک آئی، اس نے دیکھا کہ اس کی ماں دروازے سے نکلنے کے بعد دائیں طرف مڑنے کے بجائے بائیں طرف مڑ گئی ہے۔ جنت کو حیرت ہوئی ماں نے راستہ کیوں بدلا تھا؟ اسے تو

دائیں طرف مڑنا چاہئے تھا۔ راستہ ہی وہ تھا اور پھر اچانک اس کو اپنے اس سوال کا جواب
مل گیا اس کی ماں بائیں جانب مڑ کر ماسی خیراں کے گھر کی طرف جا رہی تھی۔ وہ دروازے
کی اوٹ میں کھڑی ہو کر اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ یقیناً وہ ماسی خیراں کے گھر جا رہی
تھی اور پھر اس نے اس کو' ماسی خیراں کے دروازے پر پہنچ کر چند لمحوں کے بعد اندر
غائب ہوتے ہوئے دیکھ لیا۔ جنت نے گھر کے اندر آکر دروازہ بند کرلیا اور چند لمحوں تک
دروازے کے پاس ہی کھڑی ہوئی اپنے خیالات میں گم رہی' اس کا ذہن بری طرح سے الجھ
رہا تھا ایک بات تو بالکل صاف تھی اور وہ یہ کہ اس کی ماں نے کوئی نہ کوئی فیصلہ کرلیا ہے
اور اس نے صبح ہی صبح ماسی خیراں سے کیا کہا ہے؟ جو کچھ ہونا تھا' وہ جلد یا بدیر اس کو
معلوم تو ہو ہی جانا تھا لیکن اس وقت وہ ایک ناقابل برداشت تڑپ اور بے چینی کا شکار
تھی وہ یہ جانے بغیر شاید رہ ہی نہیں سکتی تھی کہ اس کی ماں نے اس کے مقدر کے بارے
میں کیا فیصلہ کیا ہے' کیسے معلوم ہو؟ کیا کرے؟ کس سے پوچھے؟ کوئی جانے والا نہیں
اسی وقت معلوم ہو سکتا تھا جب مراد کو بھی اس فیصلے کا علم ہو جاتا اور وہ دوپہر کے بعد چکر
سے اس کے پاس آتا۔

مگر نہیں..... ایک اور راستہ بھی تھا..... ہاں..... ایک اور راستہ بھی
اس کے ہونٹوں پر خود بخود ایک مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ وہ جلدی سے دوبارہ باورچی
خانے میں داخل ہوگئی بچیاں اٹھ گئی تھیں ان کو ناشتہ وغیرہ دینا تھا۔ بچیوں کے سارے
کاموں سے فارغ ہونے کے بعد اس نے نصرت سے کہا۔ "میں ابھی آتی ہوں ذرا ماسی
خیراں کے گھر تک جا رہی ہوں۔ تم دروازے کی اندر سے کنڈی لگا لو کوئی بھی آئے تو کھولنا
مت..... میں ابھی تھوڑی دیر میں آجاؤں گی۔"

نصرت اس کے ساتھ ساتھ دروازے تک آئی اور اس نے اپنی بڑی بہن کے باہر
نکلنے کے بعد دروازے کو اندر سے بند کرلیا۔ تینوں بچیاں اب گھر میں اکیلی تھیں۔ مزید
احتیاط کی غرض سے جنت نے دروازے میں باہر سے بھی کنڈی لگا دی اور پھر وہ ماسی خیراں
کے گھر جا پہنچی۔

"ماسی خیراں۔" اس نے کہا۔ "ذرا تھوڑا سا نمک چاہئے تھا ابھی ابھی میں نے دیکھا
تو بوتل میں نمک بالکل ختم ہوگیا تھا شام کو دکان سے منگوا لوں گی۔"

ماسی خیراں کے دماغ میں ایک جھٹکا سا لگا اور وہ اس کو غور سے دیکھنے لگی۔ کل رات
کو جب ماسی خیراں' زمین سے رخصت ہو کر اپنے گھر آرہی تھی تو اس نے زمین سے



تھوڑا سا نمک مانگا تھا کیونکہ اس کے گھر میں نمک ختم ہوگیا تھا اور وہ شام کو خریدنا بھول
گئی تھی۔ زمین نے باورچی خانے میں سے نمک کی بھری ہوئی بوتل میں سے اچھا خاصا
نمک نکال کر خیراں کو دے دیا تھا۔ جنت اس وقت سامنے موجود نہیں تھی اور اس کو یہ
نہیں معلوم تھی اور اب جنت نمک مانگنے آئی تھی اور کہہ رہی تھی گھر میں نمک ختم
ہوگیا ہے۔

"تمہیں نمک چاہئے؟" ماسی خیراں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں ماسی....." جنت نے کہا۔ "تھوڑا سا نمک..... ابھی اماں آئی تھیں
ہمارے پاس؟"

ایک دم ماسی خیراں کے دماغ میں دوسرا جھٹکا لگا اور اس کے ہونٹوں پر ایک نظر نہ
آنے والی معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی وہ سب کچھ سمجھ چکی تھی۔

"ہاں' زمین میرے پاس سے ہوتی ہوئی گئی ہے۔" اس نے کہا۔ "بہت پریشان تھی
بے چاری ساری رات..... ان مشکل حالات میں کوئی فیصلہ کرنا بہت دشوار ہوتا ہے
بہرحال کوئی نہ کوئی فیصلہ تو کرنا ہی پڑتا ہے انسان کو۔"

جنت التجا آمیز سوالیہ نظروں سے ماسی خیراں کو دیکھ رہی تھی وہ خود ہی مجسم التجا اور
مجسم سوال بن گئی تھی۔ وہ زبان سے تو نہیں پوچھ سکتی تھی' کھل کر تو اس بارے میں
ماں سے سوال نہیں کر سکتی تھی لیکن اس کا رواں رواں مکمل سوال بنا ہوا تھا۔

"مراد تمہیں کیسا لگتا ہے جنت؟" چند لمحوں کے توقف کے بعد ماسی خیراں نے اس
سے بڑے میٹھے اور نرم لہجے میں سوال کیا اور یہ سوال سنتے ہی جنت کے دل میں سرور کی
لہر برقی رو دوڑ گئی' اس ایک سوال میں اس کے تمام سوالوں کے جوابات پوشیدہ تھے۔ یہ
لمحہ تھا جہاں آکر زندگی جیسے ایک دم ٹھہر گئی تھی اور کائنات کی نبض ساکت ہوگئی تھی'
جنت اس لمحے کے دوام کو اپنے وجود کے اندر جذب کرلینا چاہتی تھی' یہ نشاط فراداں کا لمحہ
تھا جس نے یک بارگی اس کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

جنت کی آنکھیں جھک گئی تھیں' چہرہ گلابی ہوگیا تھا۔

ماسی خیراں کو اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا جو کہ اسے بہت پہلے سے معلوم تھا۔
ماسی خیراں بڑے زور سے ہنس پڑی اور جنت گھبرا کر جلدی سے دروازے کی طرف بڑھی
اور باہر جانے لگی۔

"اری ٹھہر تو۔" ماسی خیراں نے اسے زور سے آواز دی۔ "اری نمک تو لیتی جا نیک

بخت۔" لیکن جنت تو ہوا کے ایک لطیف و نازک جھونکے کی طرح دروازے سے باہر جاچکی تھی۔ ماسی خیراں قہقہے لگاتی رہ گئی۔

جنت اپنے گھر کے دروازے پر پہنچی تو اس کا چہرہ پسینے میں تر اور جسم پر ہلکی ہلکی لرزش طاری تھی' اس نے باہر سے لگی ہوئی دروازے کی کنڈی کھولی اور دروازے پر دستک دی ذرا دیر بعد نصرت نے اندر سے پوچھا کہ کون ہے اور جنت کے بتانے پر اس نے دروازہ کھول دیا۔

کلثوم سامنے ہی آنگن میں کھیل رہی تھی جنت نے جھک کر اس کو اٹھالیا اور اسے پیار کرتی ہوئی تیزی سے آنگن میں ناچنے لگی۔ اس کی تو روح وجد میں تھی' سارا وجود مائل بہ رقص تھا' نصرت کو اس کی وجہ نہیں معلوم تھی۔ آپا کو یوں کلثوم کو گود میں اٹھا کر ناچتے دیکھ کر وہ بھی ہنس پڑی اور خود بھی جنت کی قمیض کا دامن پکڑ کر اس کے ساتھ ساتھ ناچنے لگی اور پھر فوراً ہی صغرا بھی اپنی دونوں بڑی بہنوں کے ساتھ اس رقص سرخوشی میں شامل ہوگئی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ تینوں اپنے گھر کے صحن میں اِدھر سے اُدھر بھاگ رہی تھیں اور ناچ رہی تھیں' ہنس رہی تھیں اور ننھی کلثوم بھی جو جنت کی گود میں چڑھی ہوئی تھی' اپنی معصومانہ اور طفلانہ ہنسی اور سرخوشی کو اس ہنگامۂ رقص میں شامل کررہی تھی۔ کتنے دنوں کے بعد اس گھر کے آنگن میں جہاں رات دن اداسی کی دھند چھائی رہتی تھی' خوشی کی ایک رو دوڑتی ہوئی نظر آئی تھی۔ جنت کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس خوشی کی وجہ کیا ہے' وہ سارا دن جنت نے اس سرخوشی کے عالم میں گزار دیا۔

مراد' ماسی خیراں کے پاس اگلے دن پہنچا کیونکہ ماسی خیراں نے اس سے کہا تھا کہ وہ دو ایک دن کے بعد ہی اس کے پاس آئے تاکہ اس اثناء میں وہ زمین کو راضی کرنے کی کوشش کرسکے۔

اور جب وہ ماسی خیراں کے گھر کے دروازے پر دستک دے رہا تھا تو اس کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنی قسمت کے بند دروازے پر دستک دے کر اس کو کھلوانے کی کوشش کر رہا ہے۔

ماسی خیراں نے دروازہ کھول کر اس کو اندر بلایا۔ اندر داخل ہوتے ہی مراد نے اپنی نظریں ماسی خیراں کے چہرے پر گاڑ دیں۔ وہ اس کے چہرے پر موجود نظر نہ آنے والی تحریروں میں اپنی قسمت کے فیصلے کی تحریر کو تلاش کررہا تھا لیکن اس کے لئے کچھ پڑھنا دشوار ہورہا تھا کیونکہ تحریر قطعی طور پر غیر واضح تھی۔



"آؤ بیٹا۔" ماسی خیراں نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "بیٹھو۔"

"بات ہوئی ماسی خیراں.....؟" مراد نے چارپائی پر بیٹھتے ہی پہلا سوال کیا۔

"ہاں' بات ہوئی۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "اور میں نے سمجھا بجھا کر زمین کو راضی بھی کرلیا ہے مگر اور بھی بہت ساری باتیں ہیں جن کے بارے میں سوچنا ہے۔"

مراد کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا اس کا خیال تو یہ تھا کہ زمین اس معاملے میں فیصلہ کرنے میں کچھ وقت لے گی کیونکہ وہ دل سے مراد کو پسند نہیں کرتی تھی اس کے لئے مراد کو داماد کے طور پر قبول کرنا آسان نہیں تھا۔ مراد کے ساتھ ان دنوں اس کا نرم رویہ اس کی مجبوری تھی۔ اس روز پھل لانے پر اس نے جس طرز عمل کا اظہار کیا تھا' مراد اس کی مفہوم سے اچھی طرح واقف تھا۔

اس لئے جب ماسی خیراں نے اس کو بتایا کہ زمین نے اس کے پیغام کو منظور کرلیا ہے تو حیرت اور خوشی کے عالم میں اس کی زبان جیسے گنگ ہوکر رہ گئی۔ زمین نے اس کے پیغام کو منظور کرلیا تھا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ جنت اس کو مل گئی اور وہ جنت کو مل گیا۔ دونوں ایک دوسرے کی زندگی کا حصہ بن گئے تھے مراد کے بامراد وجود میں ایک نئی زندگی کی برقی رو دوڑنی شروع ہوگئی تھی۔

"تو..... تو..... زمین چاچی راضی ہوگئی ہیں؟" اس نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا۔ "یہ تو بہت بڑی بات ہے ماسی خیراں..... میں..... کس زبان سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔"

"میرا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے بیٹا۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "اصل میں تمہیں ان مشکلات پر غور کرنا ہے اور ان پر قابو پانا ہے جو اس شادی کی راہ میں حائل ہیں۔ پتہ نہیں تم کو ٹھیک سے اندازہ بھی ہے یا نہیں۔"

"مجھ کو مشکلات کا اندازہ ہے ماسی۔" مراد نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "پہلے سے اندازہ ہے لیکن میں ان پر قابو پالوں گا سب سے زیادہ ضروری اور بنیادی بات تو زمین چاچی کی منظوری تھی سو وہ حاصل ہوگئی۔"

"صرف زمین کی منظوری ہی تو کافی نہیں ہے۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "تمہارے والدین کی منظوری بھی تو اتنی ہی ضروری ہے۔ زمین کا بھی یہی خیال ہے کہ تمہارے والدین اس رشتے کے لئے راضی نہیں ہوں گے کیونکہ تمہاری ماں تو تمہاری شادی اپنی بہن شاداں کی بیٹی ثمینہ سے کرنا چاہتی ہے۔"

"ماسی خیراں، شادی مجھے کرنی ہے۔" مراد نے کہا۔ "زندگی تو مجھے گزارنی ہے، اماں کو نہیں اور اس بارے میں آخری فیصلے کا اختیار بھی مجھ کو ہی ہے میں اب وہ پہلے والا مراد تو نہیں ہوں، کسی کا محتاج نہیں ہوں، میں خود اپنا کاروبار کرتا ہوں، خود کماتا ہوں۔ اسی لئے میں پورے یقین کے ساتھ یہ وعدہ کررہا ہوں کہ حاجی مدد علی کے قرضے کی رقم بھی ادا کروں گا اپنے پاس سے..... اپنی جیب سے، اس کے لئے مجھے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلانا پڑے گا اور میرے والدین کو میری بات ماننی ہوگی۔"

"دیکھو بیٹا..... لڑکی والوں کی عزت بڑی نازک ہوتی ہے اور لڑکی تو کسی کمزور کانچ کی طرح ہوتی ہے جو ذرا سی ٹھیس بھی برداشت نہیں کر سکتی اور اگر ایک بار ٹوٹ جائے تو پھر دوبارہ اس کو جوڑا بھی نہیں جاسکتا۔" ماسی خیراں سنبھل سنبھل کر کہہ رہی تھی۔ "جب تم جنت کا ہاتھ مانگ رہے ہو تو اس کا مطلب ہے کہ وہ تمہاری عزت بنے جارہی ہے اور اپنی عزت کی حفاظت کرنا ہر مرد کا فرض ہوتا ہے۔"

"ہاں..... ہاں ماسی، اس میں کیا شک ہے۔" مراد نے جلدی سے کہا۔ "تم آگے کہو۔"

"جنت کا رشتہ مانگنے کے لئے تمہارے والدین کو جنت کے گھر اسی طرح آنا ہوگا جس طرح لڑکے والے رشتہ مانگنے کے لئے لڑکی والوں کے گھر جاتے ہیں۔" ماسی خیراں نے کہا۔

"میں..... میں اس کی پوری کوشش کروں گا ماسی خیراں۔" مراد نے قدرے تامل کے بعد جواب دیا۔ "لیکن اگر ایسا نہ ہوسکا ماسی خیراں تو پھر تم کو ہی میری ماں اور میرا باپ بن کر زمین چاچی کے پاس چلنا ہوگا اور اس صورت میں، میں شادی سے پہلے ہی اپنے والدین کا گھر چھوڑ دوں گا، میں الگ گھر لے لوں گا جس میں میرے اور جنت کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوگا، مجھ میں ایسا کرنے کی ہمت ہے ماسی خیراں کیونکہ میں خود کمائی کرتا ہوں۔"

"اچھا تو یہی ہوتا کہ تمہارے والدین آتے....." ماسی خیراں نے کہا۔

"تم تو ساری بات سمجھتی ہو، ماسی خیراں۔" مراد نے کہا۔ "میری مجبوریوں اور مشکلات کو بھی سمجھتی ہو، میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا۔" اس کے چہرے پر قدرے سختی کے آثار پیدا ہوگئے تھے اور لہجے میں بھی درشتی آگئی تھی۔ "لیکن اگر میری ماں اپنی ضد پر اڑی رہیں تو آخر میں بھی بیٹا تو انہی کا ہوں نا۔"



"دیکھو بیٹا، اس بات کو اچھی طرح سے گرہ میں باندھ لو کہ اگر تمہاری ماں اس شادی کے لئے تیار نہیں ہوئی تو پھر اس گھر میں جنت کا گزارہ بھی نہیں ہوسکے گا کیونکہ نفرتوں کے ماحول میں زندہ رہنا انسان کے لئے بڑا مشکل ہوتا ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو ماسی۔" مراد نے فوراً کہا۔ "اسی لئے تو میں تم سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ اگر ماں نہیں مانیں تو میں الگ گھر لے لوں گا، ابا کی طرف سے تو مجھے زیادہ خطرہ نہیں ہے لیکن اماں کی طرف سے مخالفت ہوگی میں جانتا ہوں، مگر میں ان کو راضی کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "پھر تم اپنے گھر والوں سے بات کرو اور ان کو زمین کے پاس لے کر آؤ۔ اگر سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہتا ہے تو پھر نکاح کرلو اور کچھ دنوں کے بعد رخصتی....."

نکاح..... رخصتی..... اس کی اور جنت کی شادی..... یہ کیسے الفاظ تھے؟ مراد کو یہ سب کچھ کسی خوبصورت طلسم خیال کی طرح معلوم ہورہا تھا جو شاید ہوش کا ایک جھٹکا آنے پر ٹوٹ سکتا تھا۔

"اور حاجی کے پاس تم میرے اور زمین کے ساتھ چلنا۔" ماسی خیراں کہہ رہی تھی۔ "اس کو رقم دے کر اس سے وہ کاغذ واپس لینا ہے اور اس کو ضائع کردینا ہے۔"

"صرف اتنا ہی نہیں، حاجی سے رقم کی رسید بھی لینی ہے۔" مراد نے کہا۔ وہ پچھلے کچھ دنوں سے کاروباری معاملات کے بارے میں بہت کچھ جان چکا تھا۔

"جنت بہت اچھی لڑکی ہے بیٹا۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "اور حاجی نے اس کو خریدنے کے لئے کافی رقم لگا دی تھی لیکن زمین نے اس کی پیشکش کو مسترد کرکے اور تمہارا پیغام منظور کرکے صحیح معنوں میں ایک ماں ہونے کا ثبوت دیا ہے میں نے بھی جنت کو کافی اونچ نیچ سمجھائی ہے اب تم میرے سفید بالوں کی لاج رکھنا۔"

"بے فکر رہو ماسی خیراں۔" مراد نے کہا۔ "میرے لئے یہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔"

مراد جب ماسی خیراں کے پاس سے رخصت ہونے لگا تو اس نے ذرا رکتے اور جھجکتے ہوئے اس سے کہا۔ "ایک بات اور کہنی تھی ماسی خیراں، زمین چاچی معلوم نہیں اس کو بتائیں یا نہ بتائیں تم..... تم ذرا جنت کو بتا دینا اس بات کے بارے میں۔"

"جنت کو.....؟" ماسی خیراں ایک دم ہنس پڑی۔ "اچھا..... ٹھیک ہے، بتا

دوں گی۔" اس نے مراد کو یہ نہیں بتایا کہ جنت تو خود سب کچھ معلوم کر چکی ہے۔

مراد وہاں سے چلا آیا اس کا اب جنت کے گھر بار بار اور جلدی جلدی جانے کا ارا نہیں تھا خواہ مخواہ اگر کسی طرح سے زمین چاچی کو پتہ چل گیا تو بنتی ہوئی بات خرا ہو جائے گی۔

مراد نے اس معاملے کے بارے میں پہلے اپنے باپ سے بات کرنے کا فیصلہ کر اسے توقع تھی کہ اس کے باپ کی جانب سے اس کی اتنی شدید مخالفت نہیں ہوگی جتنی ماں کی جانب سے..... اور باپ سے وہ ذرا کھل کر بات کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے ا روز شام کو اپنے باپ سے علیحدگی میں بات کی۔ وہ دونوں اس وقت ایک بیوپاری کے پا سے واپس جا رہے تھے ایک اچھے خاصے منافع کا سودا کر کے..... اور دونوں ہی ب خوش تھے۔

"ابا میں تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔" مراد نے اپنے باپ سے ک "آؤ ذرا دیر کے لئے ادھر پلیا پر بیٹھ جاؤ۔"

"وہ کیوں.....؟" محمد یونس نے سخت تعجب کے ساتھ کہا۔ "پلیا پر بیٹھنے کی ضرورت ہے؟ گھر چل کر بات کیوں نہیں کر سکتے؟ گھر کون سا دور رہ گیا ہے اب؟"

"گھر میں بعد میں بات کریں گے ابا۔" مراد نے کہا۔ "پہلے میں تم سے بات کرنا چ ہوں ذرا دیر کے لئے میرے ساتھ بیٹھو نا۔"

"اچھا' چلو بیٹھ جاتے ہیں۔" محمد یونس نے کہا۔ وہ بدستور حیران ہو رہا تھا لیکن م اب کوئی بچہ تو نہیں تھا وہ تقریباً سولہ سال کا ایک نوجوان لڑکا تھا اور اپنے باپ "کاروباری ساتھی" تھا محمد یونس اس کی بات کو یوں نظرانداز تو نہیں کر سکتا تھا۔

ابا کے پلیا پر بیٹھ جانے کے بعد مراد نے اپنے باپ سے کہا۔ "بات یہ ہے کہ ٹ جنت سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

مراد نے اگر ایک بھاری پتھر اٹھا کر محمد یونس کے سر پر دے مارا ہوتا تو بھی محمد یونس کے دماغ کو شاید اتنے زور کا جھٹکا نہ لگتا جیسا کہ اس کی زبان سے یہ بات سننے کے بعد ا کے دماغ کو لگا۔ چند لمحوں کے لئے تو وہ جیسے بولنے کی قوت سے بھی محروم ہو گیا ا آنکھیں پھاڑے ہوئے مراد کی صورت دیکھتا رہا جس کی دماغی صحت میں اس کو شبہ محسو ہونے لگا تھا۔

"تم..... تم..... کچھ پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟" محمد یونس نے کچھ دیر کے بعد



اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟ کون جنت؟ وہ اس بھگوڑے ہیرو پنچی کی لونڈیا؟"

"ہاں ابا۔" مراد نے سنبھل کر کہا۔ "وہ..... گامو کی بیٹی جنت..... میں..... میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں' اگر میں نے اس سے شادی نہیں کی' اس کی مدد نہیں کی تو اس کی زندگی تباہ ہو جائے گی اور حاجی مدد علی قریشی اسے بیاہ کر لے جائے گا۔"

"لے جائے تمہاری بلا سے۔" محمد یونس نے کہا۔ "تم کو کیا؟ حاجی مدد علی قریشی بیاہ کر لے جائے اسے یا کوئی اور..... تم کو اس سے کیا لینا؟ تمہیں اس سے شادی کرنے کی کیا خدا کی مار پڑی ہے؟ وہ لوگ جانیں' حاجی جانے۔"

"نہیں ابا۔" مراد کے اندر لحہ بہ لحہ ہمت پیدا ہو رہی تھی اور وہ پوری ایمانداری اور سچائی کے ساتھ ساری بات اپنے باپ کو بتا دینا چاہتا تھا۔ اس کو اپنے باپ پر بھروسہ تھا اور اس کو بڑا مان بھی تھا۔ اس نے اپنے باپ کو ہمیشہ اپنے آپ سے بہت قریب پایا تھا اور وہ اس سے اپنے دل کی بات کہنے کے بارے میں سوچ سکتا تھا اور اب وہ سب کچھ کہہ رہا تھا۔ "میں نہیں چاہتا کہ جنت کی زندگی برباد ہو جائے میں..... میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا ابھی تمہاری شادی کی عمر ہے؟" محمد یونس نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "ابھی تو تم کافی چھوٹے ہو۔ اتنی جلدی شادی وغیرہ کے جھمیلے میں کیوں پڑنا چاہتے ہو؟ ابھی کاروبار پر توجہ دو' کچھ پیسے کماؤ' اپنی حیثیت بناؤ پھر مناسب وقت آنے پر کسی اچھی سی لڑکی سے شادی بھی کر لینا' اس ہیرو پنچی کی لونڈیا میں ایسے کون سے لعل لگے ہیں۔"

"نہیں ابا' اور کسی سے نہیں۔" مراد نے آہستہ سے کہا۔ "جنت سے اور صرف جنت سے..... مجھے یہ شادی کرنی ہی ہے تاکہ اسے حاجی مدد علی قریشی کے چنگل سے بچا سکوں۔"

"لیکن اس کا تو قرض وغیرہ کا چکر ہے نا..... جو اس کی ماں نے اپنے بیٹے کے بدلے اس سے لیا تھا اور پھر وہ بیٹا بھاگ گیا..... تو....."

"ہاں ابا۔" مراد نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "قرضے کا چکر ہے' دس ہزار روپے کی رقم ادا کرنی ہے اور حاجی کو وہ رقم اپنے پاس سے میں ادا کروں گا۔"

"ارے..... ارے..... کیا اول فول بک رہے ہو؟" محمد یونس ایک دم ہتھے

سے اکھڑ گیا۔ "کیوں ادا کرو گے تم؟ تم کہاں کے سیٹھ ساہوکار لگے ہوئے ہو جو اتنی بڑی رقم ادا کرو گے؟ کیا وہ قرضہ تمہاری ضمانت پر دیا گیا تھا؟ تمہارا اس قرضے سے کیا تعلق ہے؟"

مراد کو اپنے باپ کو یہ سمجھانے میں تقریباً ایک گھنٹہ لگ گیا کہ اس قرضے کا اس سے کیا تعلق تھا اور اس نے اس کو یہ بھی بتا دیا کہ اس نے ماسی خیراں کے ذریعے زمین کی رضامندی بھی حاصل کر لی ہے۔

"ارے تو جب سب کچھ طے ہی کر لیا ہے تو بارات لے کر چلے جاؤ اور شادی کر لو۔" محمد یونس نے سخت ناراضگی کے ساتھ کہا۔ "پھر مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟ جو جی چاہے سو کرو۔"

"نہیں ابا۔" مراد نے جلدی سے اپنے باپ کے دونوں ہاتھ تھام کر انہیں زور زور سے دباتے ہوئے کہا۔ "بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ سب کچھ تو تمہیں اور اماں کو ہی کرنا ہے۔ تم دونوں ہی تو باقاعدہ پیغام لے کر....."

"تمہاری ماں کبھی نہیں مانے گی۔" محمد یونس نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تم خود بھی اس بات سے واقف ہو کہ وہ تمہاری شادی اپنی بہن کی بیٹی ثمینہ سے کرنا چاہتی ہے۔ آخر وہ اس کی بہن کی بیٹی ہے۔"

"تم سمجھاؤ گے ابا! تو اماں مان جائیں گی۔" مراد نے کہا۔ "تمہاری بات نہیں ٹالیں گی۔"

محمد یونس کے لئے یہ ساری باتیں حد درجہ حیرت انگیز، غیر متوقع اور پریشان کن تھیں۔ مراد کو ابھی سے شادی کی سوجھ رہی تھی۔ ابھی بھلا اس کی عمر ہی کیا تھی! وہ تو اس کے بارے میں اب یہ سوچ رہا تھا کہ وہ کافی پیسے کما کر ایک بڑا بیوپاری بن جائے گا۔ اس کے پاس بہت پیسہ ہو گا اور پھر وہ کسی اچھے گھرانے کی لڑکی سے اس کی شادی کر دے گا۔ لیکن یہاں تو سارا معاملہ ہی چوپٹ ہو گیا تھا۔ اس کے بیٹے نے اس کو کانوں کان خبر تک نہ ہونے دی تھی اور بالا ہی بالا سب کچھ طے ہو گیا تھا۔ وہ دس ہزار روپے کی قرضے کی رقم بھی اپنی جیب سے ادا کر رہا تھا اور جنت سے شادی بھی کر رہا تھا۔

"دیکھو اگر تم جنت کی مدد ہی کرنا چاہتے ہو تو چلو حاجی کو دس ہزار روپے دے کر جنت اور اس کی ماں کی جان چھڑا دو۔ تمہارا کمایا ہوا پیسہ ہے۔ تمہارا حق ہے اس پر۔ لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ تم قرضہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ جنت سے شادی بھی کرو؟"



"ابا میں وہ قرضہ اتار ہی اس لئے رہا ہوں کہ جنت سے شادی کر سکوں۔" مراد نے اپنے باپ کے دونوں ہاتھوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔ "ورنہ مجھے کیا ضرورت تھی قرضہ اتارنے کی؟ دنیا میں کتنے بہت سے لوگ مقروض ہوں گے۔ تو کیا میں ان سب کا قرضہ اتارتا پھروں گا؟"

"میں تم کو ایسا نہیں سمجھتا تھا مراد!" ..... محمد یونس نے غم ناک لہجے میں کہا۔ "تم نے تو مجھے بتائے بغیر ہی سارے فیصلے کر ڈالے۔ اتنے بڑے بڑے فیصلے۔ خیر..... تمہاری مرضی۔"

"نہیں ابا ناراض مت ہو۔" مراد نے اس کے ہاتھوں کو پیار کرتے ہوئے کہا۔ "یہ سب کچھ بہت جلدی میں ہوا ہے ابا۔ اور دیکھو..... میں تمہیں سب کچھ بتا تو رہا ہوں۔ تمہاری شرکت اور منظوری کے بغیر تو کچھ نہیں ہو گا ابا۔ سب کچھ کرنا تو تمہی کو ہے۔ تم کو اور اماں کو۔"

"اپنی ماں سے تم خود ہی بات کر لینا۔" محمد یونس نے کہا۔ "مجھے بیچ میں مت ڈالو۔ میں جانتا ہوں وہ نہیں مانے گی۔ وہ ان سارے لوگوں کو سخت ناپسند کرتی ہے اور میں بھی ان کو پسند نہیں کرتا۔"

"تم جنت کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ابا۔" اس نے کہا۔ "جنت تو بہت ہی اچھی لڑکی ہے۔ اب اگر اس کا باپ ہیروئنچی بن گیا تو اس میں اس کا کیا قصور ہے اور اگر اس کا بھائی گھر سے بھاگ گیا تو وہ اس میں کیا کرے؟ ان ساری باتوں کی ذمہ دار وہ تو نہیں ہے۔"

"اٹھو اب گھر چلو۔" محمد یونس نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ مراد بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا اور وہ دونوں اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

مراد کو اپنے باپ سے جو توقع تھی وہ اسے پوری ہوتی نظر آ رہی تھی۔ اسے بڑی حد تک یقین تھا کہ اس کا باپ اس کی بات مان جائے گا۔ وہ اپنے باپ کو اچھی طرح جانتا تھا۔ لیکن ماں..... ماں کے ساتھ تو زبردست معرکہ ہونے والا تھا اور دل ہی دل میں اس معرکے کی تیاریاں کر رہا تھا۔

محمد یونس کو فی الحقیقت اس ساری صورتِ حال سے ذرہ برابر خوشی نہیں ہوئی تھی لیکن وہ ایک سمجھ دار عاقبت اندیش آدمی تھا۔ یہ بات جس طرح سے شروع ہوئی تھی اور اب جس مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ وہاں پہنچ کر اس کو ختم کرنا بہت مشکل بلکہ ناممکن

تھا۔ ضد کرنے کی صورت میں کوئی بڑی پیچیدگی بھی پیدا ہو سکتی تھی اور مراد اس کی واحد اولاد تھا۔ کون سے اس کے دو چار بیٹے بیٹیاں تھے! اور پھر..... آخر ایک نہ ایک دن مراد کی شادی کہیں نہ کہیں تو کرنی ہی تھی۔ یہ تو اچھا تھا کہ اس کی شادی شاداں کی بیٹی ثمینہ سے نہیں ہو رہی تھی۔ شاداں کی طرف سے تو اس نے اپنے لئے ہمیشہ خطرہ ہی محسوس کیا تھا اور اب یہ خطرہ ہمیشہ کے لئے ٹلتا نظر آ رہا تھا۔

تاہم اس کو بخوبی اندازہ تھا کہ یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں ہو گا۔ وہ منظوراں کو اچھی طرح جانتا تھا اور اس قیامت کے لئے اپنے آپ کو تیار کر رہا تھا جو گھر میں برپا ہونے والی تھی۔

یہ قیامت رات کے کھانے کے بعد اس وقت برپا ہونی شروع ہوئی جب محمد یونس نے اپنی بیوی سے کہا۔ "مراد شادی کرنا چاہتا ہے اور اس نے اپنے لئے لڑکی تلاش کر لی ہے۔"

"لڑکی تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" منظوراں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "لڑکی تو میں نے پہلے ہی تلاش کر لی ہے۔" اس کا خیال تھا کہ اس کا شوہر مذاق کر رہا ہے اور اس مذاق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اپنے دل کی بات کو برملا کہنے کا فیصلہ کیا۔ "جب کہے گا' اس کی شادی کر دیں گے۔"

"وہ ثمینہ سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔" محمد یونس نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "اس نے تو اپنے لئے کوئی دوسری ہی لڑکی تلاش کر لی ہے اور اب مجھے اور تمہیں اس لڑکی کے گھر چل کر شادی کا پیغام دینا ہے۔"

"یہ کیا بکواس ہے؟" منظوراں ایک دم حیران رہ گئی اور اب اس کو اس بات کا احساس ہوا کہ اس کا شوہر اس کے ساتھ مذاق نہیں کر رہا ہے بلکہ یہ تو کوئی بہت ہی بھیانک قسم کی بات تھی۔ "کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"مراد نے گامو کی بیٹی جنت سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" محمد یونس نے گہری سانس کے ساتھ اپنی بیوی سے کہا۔ "اور وہ اس شادی کے لئے ہماری اجازت مانگ رہا ہے۔"

"کیا؟" منظوراں جیسے کفن پھاڑ کر چیخی۔ اس کی آنکھیں ابل پڑی تھیں۔ "اس چوہڑے ہیرو پنچی کی لڑکی سے؟ اس بھگوڑے کی بہن سے؟ ہائے میں مر جاؤں۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ ارے یہ میں کیا سن رہی ہوں۔" اور یکبارگی وہ چیخ چیخ کر رونے لگی اور اپنا سینہ پیٹنے لگی۔



"ارے جیتے جی یہ کبھی نہیں ہو سکے گا میں خون پی جاؤں گی ان ماں بیٹیوں کا ان کم بختوں نے میرے بھولے بھالے بیٹے کو پھانس لیا ہے۔ خدا تمہیں موت دے۔ خدا غارت کرے تمہیں۔"

"گالیاں مت دو اماں!" مراد نے اپنی ماں سے نرمی سے کہا۔ "مجھے کسی نے نہیں پھانسا ہے۔ میں کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہوں جو مجھے کوئی بہلا لے گا۔ یہ میرا اپنا فیصلہ ہے میں جنت سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور میں نے خود ہی یہ بات چلائی ہے ان لوگوں نے نہیں چلائی ہے' اور اماں! وہ بہت اچھے لوگ ہیں ان میں کوئی برائی نہیں ہے۔"

لیکن منظوراں کچھ سننے کے لئے تیار نہیں تھی وہ زیبن اور اس کی بیٹی کو نہایت قسم کی گالیاں دے رہی تھی اور انہیں کوس رہی تھی کہ وہ دونوں مل کر اس کے بیٹے کو اس سے چھینے لے رہی تھیں۔ مراد اپنی ماں کو سمجھانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا لیکن منظوراں کے غیظ و غضب کا آتش فشاں زبردست لاوا اگل رہا تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے اس کے لاوے میں آج اس گھر کے سارے در و دیوار بہہ جائیں گے۔

ابھی تک تو منظوراں کو صرف اتنا معلوم ہو پایا تھا کہ مراد جنت سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اسے یہ نہیں معلوم ہوا تھا کہ یہ شادی کن حالات میں اور کن شرائط کے تحت ہونے والی ہے اور یہ کہ بات چیت کا سلسلہ کہاں تک پہنچ چکا ہے۔ جتنا اس نے جان لیا تھا وہی اس کے لئے ناقابل برداشت تھا اور محمد یونس نے مزید تفصیلات کو فی الحال روکنے کا فیصلہ کر لیا۔ اب ٹھہر کر بات کرنے کی ضرورت تھی۔

"اماں..... میری پیاری اماں۔" مراد نے آتش قہر و غضب کے پیکر' منظوراں کے قریب جا کر اس کے گلے میں باہیں ڈالنے کی کوشش کی۔ "تم میری بات مان لو اماں۔ میں تمہارا ایسا ہی چاہتا ہوں۔"

"دور ہو میرے پاس سے بدنصیب۔" منظوراں نے اسے زور سے دھکا دے کر اپنے پاس سے ہٹاتے ہوئے چلا کر کہا۔ "مت کہہ مجھے اماں۔ نہیں ہوں میں تیری اماں۔ کوئی میں تیرے لئے۔ ہاں' ہاں' میں زہر کھا لوں گی۔ میں اس منحوس دن کو دیکھنے کے لئے زندہ ہی نہیں رہوں گی جب وہ کتیا اس گھر میں میری بہو بن کر آئے۔"

"ایسی بدفال زبان سے مت نکالو نیک بخت۔" محمد یونس نے اس کو سمجھایا۔ "جو تم کہنا ہے' سکون سے اور ٹھنڈے دل سے کہو۔"

لیکن منظوراں کے پاس نہ تو سکون تھا اور نہ ٹھنڈا دل۔ اس کے نو برسوں کے

خواب آن کی آن میں اچانک بری طرح سے چکنا چور ہو گئے تھے۔ شدید مایوسی، جھنجلاہٹ اور غم و غصے کے عالم میں وہ زار و قطار روئے جا رہی تھی اور جنت اور اس کے سارے خاندان کو گالیاں اور بددعائیں دے رہی تھی۔ مراد کا چہرہ پتھر کی طرح سخت ہو رہا تھا۔ اس نے ماں کی خوشامد کرنے کی جو کوشش کی تھی اس میں اس کو کامیابی حاصل نہیں ہو سکی تھی اور اب وہ اپنی ماں کے اس رویے سے بیزاری محسوس کرنے لگا تھا۔

"اس لئے تُو وہاں گھس گھس کر جایا کرتا تھا نامراد۔" منظوراں چیخ رہی تھی۔ "اس لئے ناصر کے بھاگنے سے تیرے اوپر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا اور تُو اس کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھاگا پھر رہا تھا۔ بھائی جو ٹھہرا اس حرافہ کا۔ وہ تو اماں لگتی ہے نا تیری۔ اس کا بھائی گھر سے بھاگ گیا تو تُو کتوں کی طرح اس کی بُو سونگھتا پھرتا تھا ارے موت آئے ان سب کو مرجائیں خدا کرے سب کے سب۔"

مراد کا دل کانپ اٹھا۔ اماں تو بالکل پاگل ہو گئی تھیں۔ وہ جنت کو کوس رہی تھیں اس لڑکی کو کوس رہی تھیں جس کو مراد نے دنیا میں ہر شے سے زیادہ عزیز رکھا تھا۔

"اگر وہ سب کے سب مرجائیں گے اماں، تو یاد رکھنا کہ میں بھی ان کے ساتھ مر جاؤں گا۔" اس نے وہاں سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اور پھر تم میری قبر پر آنسو بہانے کے لئے مت آنا۔" اور اس کے ساتھ ہی وہ وہاں سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

"کیا بالکل پاگل ہو گئی ہو؟" محمد یونس نے آہستہ سے اپنی بیوی سے کہا۔ "یہ کون سا طریقہ ہے جوان اولاد کو سمجھانے کا؟ کیوں ان لوگوں کو گالیاں اور کوسنے دے رہی ہو؟"

"ارے گالیاں اور کوسنے نہ دوں تو کیا دعائیں دوں؟" منظوراں نے تڑپ کر کہا۔ "ان کو پھلنے پھولنے کی دعائیں دوں؟ ان ظالموں کو جنہوں نے میرے بیٹے کو پھانس لیا؟"

"بیوقوفی کی باتیں مت کرو۔" یونس نے اس کو ڈانٹا۔ "کوئی کسی کو پھانس وانس نہیں لیتا۔ آدمی خود ہی پھنستا ہے جو نہ پھنسنا چاہے، اسے کون پھانس سکتا ہے؟ اور اب خدا کے واسطے خاموش ہو جاؤ ہم کو اس معاملے پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے؟"

اس رات محمد یونس نے اپنی بیوی کو وہ ساری باتیں بتا دیں جو مراد نے اس کو بتائی تھیں۔ منظوراں سے کچھ بھی چھپایا نہیں جا سکتا تھا اور نہ اس کی ضرورت تھی اور پھر سب کچھ سن کر منظوراں کو ایسا لگ رہا تھا جیسے ساری دنیا ختم ہو گئی ہے اور اس مری ہوئی ختم شدہ دنیا کا ماتم کرنے کے لئے وہ اکیلی رہ گئی ہے اور اس شورِ ماتم میں اس کے اردگرد



کچھ بدروحیں ناچ رہی ہیں جن کی شکلیں جنت اور زمین اور خیراں جیسی ہیں یہ بدروحیں بڑھ بڑھ کر اس پر حملہ کر رہی ہیں اور وہ ان کے حملوں سے خود کو بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"کوئی بے عقلی کی حرکت مت کرنا۔" محمد یونس نے اپنی بیوی کو سمجھایا۔ "بات بہت آگے تک جا چکی ہے اور ہمارا ایک ہی بیٹا ہے۔ اگر وہ ہم سے جدا ہو گیا تو ہمارے پاس کچھ بھی نہیں رہے گا کیا کریں گے ہم؟ بڑھاپے میں بھیک مانگیں گے کیا؟ بہت سنبھل کر چلنا ہے اس کو سمجھانے بجھانے کی پوری کوشش کریں گے پیار محبت سے نرمی سے، لیکن اگر وہ نہیں مانے گا تو پھر ہم کو اس کی مرضی پر ہی عمل کرنا ہو گا۔"

"کیا مطلب؟" منظوراں نے چونک کر گلوگیر آواز میں کہا۔ "وہ کتیا اس گھر میں ہماری بہو بن کر آئے گی؟"

"اس قسم کی باتوں سے کوئی فائدہ نہیں ہے منظوراں....." محمد یونس نے سنجیدگی سے کہا۔ "اس سے کیا فائدہ ہو گا اگر مراد اس سے شادی کرنے کے بعد اسے اس گھر کے بجائے کسی دوسرے گھر میں لے جائے؟ جوان لڑکا ہے۔ اس کے دماغ پر اس وقت نشہ چڑھا ہوا ہے اور وہ آسانی سے اترنے والا نہیں ہے۔ ہم کو سمجھ داری سے کام لینے کی ضرورت ہے۔"

اگلے دن گھر کی فضا سخت کشیدہ رہی۔ منظوراں کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی تھیں، چہرہ پتھر کی طرح سخت تھا اور وہ مراد سے زیادہ بات بھی نہیں کر رہی تھی۔ مراد صبح ہی صبح منڈی چلا گیا تھا۔

اگلے دن تک گھر میں سرد و گرم جنگ کی بھرپور فضا طاری رہی۔ دونوں نے ہی مراد کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن دونوں کے سمجھانے میں بہت فرق تھا۔ محمد یونس کی باتوں میں نرمی، دردمندی اور افہام و تفہیم کا انداز تھا جبکہ منظوراں کے الفاظ نفرت کے زہر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ غصہ اور نفرت وہ ان دونوں چیزوں کو اپنے رویے سے الگ نہیں کر پا رہی تھی۔ کوشش کے باوجود وہ اس حقیقت سے مفاہمت نہیں کر پا رہی تھی کہ اگر اس نے مراد کو رعایت نہیں دی تو اس کا انجام اس پورے گھرانے کے لئے خطرناک ہو سکتا ہے۔

اس نوعمر لڑکے مراد میں بلا کی مضبوطی تھی۔ وہ ایک مستحکم چٹان کی طرح اپنی جگہ پر جما ہوا تھا۔ جنت کی محبت نے اس کے وجود کو ایک ایسی توانائی سے بھر دیا تھا جس کے

بل بوتے پر وہ ساری دنیا کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ یہ جنت کی محبت ہی تھی جس نے اس کو
زندگی کی جانب ایک بہت سنجیدہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا اور اس نے منڈی میں
کاروبار کرنے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ مالی طور پر کچھ استحکام حاصل کر کے وہ جنت اور اس کے
خاندان کی مدد کرے۔ جنت کی محبت نے اس کو اپنی بے زری کا احساس دلایا تھا اور وہ خود
کو اس بے زری کی دلدل سے نکالنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔

نوبت یہاں تک پہنچی کہ مراد نے اپنی ماں سے صاف کہہ دیا کہ اگر وہ جنت کو اپنی
بہو کے طور پر قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے تو نہ کرے وہ جنت کو الگ گھر میں لے
کر رکھے گا اور اس گھر سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جائے گا۔

منظوراں کا دل خون ہو کر اس کی آنکھوں کے راستے بہنے لگا۔ اس کا بیٹا تو اس
ملکیت تھا' اس کا پورا پورا حق تھا اس ملکیت پر اور اب وہ دوسرے لوگ' غیر لوگ' قابل
نفرت لوگ' اس کے بیٹے کو اس سے چھینے لے رہے تھے۔ ثمینہ کو اپنی بہو بنانے کی آرزو
خاک میں ملی جا رہی تھی۔ شاداں اور اس کے شوہر سمیع اللہ اور خود ثمینہ کو بھی ساری
بات معلوم ہو چکی تھی اور ان سب کو اس سے سخت دھچکا لگا تھا۔

جنت کے گھر مراد کا پیغام لے کر جانے والوں میں اگرچہ منظوراں خود بھی شامل تھی
لیکن وہ سارا وقت تصویر ماتم بنی ہوئی خاموش بیٹھی رہی تھی اور اس نے اپنی ناپسندیدگی
اور نفرت کو چھپانے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی تھی۔ پہلے تو وہ آنے پر راضی ہی نہ
ہو رہی تھی' لیکن پھر محمد یونس کے بہت سمجھانے بجھانے پر راضی ہو گئی تھی۔ "کیا سارا
زندگی کے لئے بیٹے کو کھو دینا چاہتی ہو؟" محمد یونس نے اس سے کہا تھا۔ "اس وقت
اس کے دل میں گرہ پڑ گئی تو یاد رکھنا' زندگی بھر نہیں کھلے گی۔ ایسا نہ ہو کہ ہمارے
بعد میں پچھتاووں کے علاوہ اور کچھ بھی باقی نہ بچے۔ اس کو اس کی مرضی کی زندگی
دو۔"

اس موقع پر سب سے زیادہ سرگرم اور فعال ہستی ماسی خیراں تھی۔ وہ دونوں طرف
سے تھی۔ مراد نے اس کو اپنی سرپرست بنا کر بھیجا تھا اور وہ جنت کی بھی سرپرست تھی
تقریباً ساری باتیں تو پہلے ہی طے ہو چکی تھیں۔ یہ تو محض ایک رسمی سی کارروائی
تھی جس کو پورا کرنا تھا۔ محمد یونس خاصا خوش نظر آ رہا تھا جبکہ منظوراں کی آنکھوں سے
کی صورت پگھلی ہوئی چنگاریاں سی نکل رہی تھیں اور زمین کی آنکھیں تو بار بار نم ہو
جا رہی تھیں وہ مہمانوں کے آگے بچھی بچھی جا رہی تھی۔ "کاش اس وقت جنت کا



یہاں موجود ہوتا۔"

پیغام دیا گیا اور پیغام منظور کر لیا گیا۔ یہ طے پایا کہ اگلے ہفتے جمعے کے مبارک دن
نکاح ہو جائے گا اور پھر عید کے بعد رخصتی ہو جائے گی۔ عید میں ابھی آٹھ مہینے باقی تھے
رخصتی کی تاریخ بھی مقرر کر لی گئی۔ مبارک سلامت کی حقیقی مصنوعی' منافقانہ اور غیر
منافقانہ صداؤں کے درمیان منہ میٹھے کئے گئے لیکن اس شیرینی کا کہیں وجود نہیں تھا جس
سے منظوراں کے کام و دہن کی تلخی کچھ کم ہو سکتی۔

اس کے تین دن کے بعد ماسی خیراں' زیبن اور مراد تینوں حاجی مدد علی قریشی کے
پاس پہنچے۔ مراد اور جنت کی منگنی کی خبر کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی تھی سب ہی کو اس
کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا۔

"آؤ بھئی آؤ۔" حاجی مدد علی قریشی نے ایک کھسیانی مسکراہٹ کے ساتھ ان لوگوں
کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا اور وہ زیبن کی طرف دیکھ کر بولا۔ "بیٹی کی منگنی کر دی'
مبارک ہو۔ مٹھائی کہاں ہے؟"

"مٹھائی ڈھیروں حاجی صاحب۔" زیبن جلدی سے بولی۔ "ضرور پہنچاؤں گی بس
آپ کی دعا چاہئے۔ اپنی بیٹی سمجھ کر دعا دیجئے۔ خدا نصیب اچھا کرے۔"

"انشاء اللہ ..... انشاء اللہ....." حاجی نے جلدی سے کہا اور اپنا نچلا ہونٹ
دانتوں سے کاٹنے لگا۔

ماسی خیراں نے اپنے ہاتھوں سے دس ہزار روپے کی رقم حاجی کو ادا کی اور حاجی سے
کاغذ واپس لیا۔ ساتھ ہی اس رسید پر حاجی سے دستخط لے لئے جو مراد کسی سے لکھوا کر
لایا تھا اور جب وہ کاغذ زیبن کو واپس ملا تو اس کو یوں لگا جیسے اس کی روح آزاد ہو گئی
ہے۔

"آجا بیٹا ناصر۔ واپس آجا۔" زیبن کے دل کی گہرائیوں میں سے' کہیں اور سے
ایک آواز ابھری۔ "اب ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ آجا گھر واپس۔"

اگلے چند دن کے بعد مراد اور جنت کا نکاح ہو گیا۔ اس چھوٹی سی تقریب میں دونوں
جانب سے خاص خاص مہمانوں نے شرکت کی تھی۔ شاداں اور اس کے بچے اس تقریب
میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ صرف شاداں کا میاں سمیع اللہ آیا تھا۔

اس رات منظوراں خاموشی سے بہت دیر تک روتی رہی تھی۔ محمد یونس نے اس کو
بہت سمجھایا تھا جو کچھ ہو رہا تھا اس کو روکا نہیں جا سکتا تھا اور جو کچھ ہونے والا تھا اس کو

بھی نہیں روکا جا سکتا تھا۔ تو پھر دلوں میں تلخیوں کا زہر گھولنے سے کیا فائدہ تھا؟

اس کے بعد عید کے مہینے تک گزرنے والے دنوں کے دوران کوئی خاص بات پیش نہیں آئی۔ زندگی اپنے معمول کے مطابق جاری رہی۔ زیبن چوہدریوں کے ہاں کام کرتی رہی۔ جنت گھر سنبھالتی رہی' مراد منڈی میں کاروبار کرتا رہا اور معقول کمائی کرتا رہا' اور دونوں طرف سے شادی کی تیاریاں بھی ہوتی رہیں۔

زیبن کا آج بھی وہی حال تھا۔ ہر روز شام ڈھلے جب وہ گھر واپس آتی تو ایک شکستہ اور موہوم سی امید اس کی ہم سفر ہوتی۔ ناصر کے بارے میں کوئی خبر اس کے بارے میں کوئی اطلاع۔ مگر نہیں۔ یہاں تو بالکل سناٹا تھا۔

رخصتی کی گھڑی آن پہنچی۔ نکاح تو مہینوں پہلے ہو چکا تھا اور اس کے بعد گزرنے والی مدت کے دوران ماسی خیراں نے بہت کام کیا تھا۔ جنت کے جہیز کی تیاری کا بیشتر کام اس نے کیا تھا۔ زیبن تو کوشش کے باوجود کچھ زیادہ کام نہیں کر سکی تھی کیونکہ اس کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا تھا۔

رخصتی کا منظر بڑا رقت انگیز تھا۔ اس موقع پر زیبن کے سارے اگلے پچھلے زخم ایک بار پھر تازہ ہو گئے تھے۔ بیٹی گھر سے رخصت ہو کر جا رہی تھی لیکن نہ تو باپ اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے کے لئے موجود تھا' اور نہ ہی بھائی اس کے ڈولے کو سہارا دینے کے لئے موجود تھا۔ دونوں کے زندہ یا مردہ ہونے کی کوئی خبر نہیں تھی!

زیبن پچھاڑیں کھا رہی تھی' اور ماسی خیراں اور دوسری عورتیں' باچشم غم اس کو سنبھال رہی تھیں۔ نصرت صغرا اور کلثوم بھی حسب توفیق رو رہی تھیں۔ نصرت کو تو معلوم تھا کہ آپا رخصت ہو کر مراد بھائی کے گھر جا رہی ہیں اور اب وہ وہیں رہیں گی مگر صغرا اور کلثوم ابھی اس بات کو سمجھنے کے لئے بہت چھوٹی تھیں کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے' پھر جنت کی ڈولی چلی گئی اور زیبن کو اچانک گھر میں قبرستان کا سناٹا محسوس ہونے لگا۔

نکاح کے بعد سے رخصتی تک گزرنے والی مدت کے دوران مراد اور جنت کی اکثر ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ انہیں اب کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ ان دونوں کا نکاح ہو چکا تھا۔ تمام روایتی احتیاط اور سماجی تقاضوں کے تحت وہ ان ملاقاتوں کی تعداد محدود ہی رکھتے تھے۔

ہر ملاقات میں جنت کو مراد کی آنکھوں میں اپنے لئے محبت کا ایک گہرا سمندر موجزن نظر آتا تھا اور وہ اس سمندر کی گہرائیوں میں اس طرح ڈوب جاتی تھی کہ اپنے



آپ کو بھی بھول جاتی تھی۔

جنت نے مراد کے گھر میں قدم رکھا تو وہ غم اور خوشی کی ایک ملی جلی اور ناقابل بیان کیفیت کا شکار تھی ایک دنیا ختم ہو رہی تھی ایک دنیا وجود میں آ رہی تھی اور ان دونوں دنیاؤں کے درمیان اسے ابھی نہ جانے کتنے ان جانے تجربوں سے گزرنا تھا۔

وہ دلہن بنی بیٹھی تھی۔ محلے کی عورتیں اس کو دیکھنے آئی تھیں اور گھونگھٹ اٹھا کر اس کی شکل دیکھتی تھیں ان کی زبان سے تحسین و تزئین کے کلمات ادا ہوتے تھے جنت کا پسینے سے بھیگ رہا تھا۔

"گرمی بہت ہو رہی ہے۔" کسی نے کہا۔ "دلہن کا گھونگھٹ اوپر کر دو۔ بے چاری گرمی سے پریشان ہو رہی ہے۔" اور اس کے ساتھ ہی کسی نے اس کا گھونگھٹ کچھ اوپر سرکا دیا۔ اس وقت جنت نے بھولے سے نظریں اٹھا کر سامنے دیکھا۔ اس کی ساس منظوراں کا چہرہ عین اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔

منگنی کے دن سے لے کر آج تک جنت نے منظوراں کو جتنی بار بھی دیکھا تھا اس کے چہرے کو پتھر کی طرح سخت اور ہر قسم کے لطیف احساس سے عاری پایا تھا۔ اس پر تبسم یا ایک ہلکی سی جھلک بھی نظر نہیں آتی تھی۔

لیکن اس وقت منظوراں کا چہرہ ہر بار سے کہیں زیادہ بھیانک نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ نفرت اور غصے کے عالم میں سیاہ ہو رہا تھا اور اس کے خدوخال شدید تناؤ کے عالم میں مسخ ہو رہے تھے۔ اس کی ابلتی ہوئی آنکھوں میں نفرت کی بھڑکتی ہوئی آگ کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ جنت کا سارا وجود خوف و دہشت کے عالم میں کانپ رہا تھا۔ کیا مراد کی آنکھوں سے ٹپکنے والا محبت کا رس منظوراں کی آنکھوں سے ابلنے والے نفرت کے لاوے کو بے اثر بنا سکے گا؟

☆=======☆=======☆

خواجہ صابر علی کو جب بلدیہ کی جانب سے بے دخلی کا نوٹس ملا' تو وہ سخت بدحواس ہو گیا اس کو اپنی ساری دنیا اتھل پتھل ہوتی نظر آئی۔ برس ہا برس کا جما جمایا کاروبار تھا' گھر تھا' سر چھپانے اور دو پیسے کمانے کی جگہ تھی کتنا طویل عرصہ گزر گیا تھا اس جگہ رہتے اور کام کرتے ہوئے اور اس نے تو یہ جگہ پیسے دے کر خریدی تھی۔ ایسے ہی قبضہ کر کے نہیں بیٹھ گیا تھا۔ اس وقت تو یہاں دور دور تک کافی میدان پڑا ہوا تھا اور اب تو آس پاس کی ساری زمین آباد ہو گئی تھی۔ لوگوں نے مکانات بنوا لئے تھے دکانیں تھیں بازار تھا سڑک تھی' رونق تھی سب کچھ تھا آس پاس' کچھ فاصلے پر کئی پلازہ بن گئے تھے جن میں لوگ آباد تھے۔ اس جگہ کی زمین کی قیمت میں بھی بہت اضافہ ہو چکا تھا اور جس پلاٹ پر خواجہ صابر علی کا قبضہ تھا وہ تقریباً سو گز کا کارنر پلاٹ تھا اور اس کی قیمت کافی تھی۔ پچھلے سال ایک پارٹی اس کے پیچھے پڑی ہوئی تھی اور اس سے یہ زمین خریدنا چاہتی تھی۔ خواجہ صابر علی نے ان لوگوں کو بتا دیا تھا کہ یہ زمین لیز شدہ نہیں ہے لیکن اس کے باوجود وہ لوگ کافی قیمت دے کر اس کو خریدنا چاہتے تھے مگر خواجہ صابر علی نے معذرت کر لی تھی اور ان لوگوں کو بتا دیا تھا کہ وہ اس جگہ کو بیچنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔

یہ اس کی رہائش کی جگہ بھی تھی اور حصول رزق کی بھی۔ وہ اس کو اپنے سے الگ نہیں کرنا چاہتا تھا اور اب اچانک بلدیہ کی جانب سے ملنے والے نوٹس نے جیسے اس کے وجود کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا۔

فوراً ہی گھر کے سارے لوگوں کو اس بات کا علم ہو گیا کہ بلدیہ کی جانب سے زمین سے بے دخلی کا نوٹس مل گیا ہے اور ایک ماہ کے اندر اندر اس جگہ سے جانا ہو گا۔ خفیفہ خواجہ طاہر علی' حامد سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ گھر کی فضا یکدم افسردہ اور تشویشناک ہو گئی تھی۔ مسعود اور ناصر بھی اس تشویش اور پریشانی میں پوری طرح شریک تھے۔ وہ دونوں تو گویا اب اس خاندان کا ایک حصہ بن گئے تھے اور اس کی ہر خوشی اور ہر غم میں برابر کے شریک تھے۔ کراچی میں ایک سال کی مدت گزرانے کے بعد وہ



شہری زندگی اور اس کے گوناگوں مسائل کے بارے میں بہت کچھ جان چکے تھے۔ حنیفہ نے ان کو اچھا خاصا لکھنا پڑھنا سکھا دیا تھا۔ وہ اب تھوڑا بہت اخبار وغیرہ بھی پڑھ لیتے تھے مکان سے بے دخلی کا مطلب وہ اچھی طرح سمجھتے تھے۔

خواجہ صابر علی اس کی بیوی حنیفہ اور بیٹا طاہر علی' تینوں کمرے میں بیٹھے ہوئے اس غمگین اور المناک صورت حال کے بارے میں غور کر رہے تھے۔ اب کیا کرنا تھا؟

"میرا خیال ہے کہ ہمیں سب سے پہلے تو بلدیہ کے اس دفتر میں جانا چاہئے جہاں سے یہ نوٹس آیا ہے۔" خواجہ صابر علی نے کہا۔ "ہو سکتا ہے صرف کھانے پینے کا چکر ہو اور وہاں کچھ دے دلا کر بات ختم ہو جائے۔"

"ہاں ہو سکتا ہے۔" طاہر علی نے کہا۔ "اس شہر میں تو رات دن یہی سب کچھ ہوتا رہتا ہے آج تجاوزات ہٹائی جاتی ہیں اور چند روز کے بعد پھر اسی جگہ موجود ہوتے ہیں بلدیہ اور پولیس والوں کو پیسے مل جاتے ہیں تو سارا معاملہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ صرف ریٹ بڑھانے کی اور زیادہ رقم وصول کرنے کی بات ہوتی ہے۔"

"ہاں۔" خواجہ صابر علی نے کہا۔ "خدا کرے' کچھ لے دے کے بات بن جائے۔"

"انشاء اللہ بن جائے گی۔" حنیفہ نے کہا۔ "پیسہ خرچ کرنے سے تو ہر کام ہو جاتا ہے کوئی کام نہیں رکتا۔"

مسعود اور ناصر کو بھی یہ بات معلوم ہو گئی کہ صابر چاچا اور طاہر بھائی کل بلدیہ کے اس دفتر میں جا کر بات کریں گے جہاں سے بے دخلی کا نوٹس آیا تھا۔

"اگر یوسف ماما کا کچھ پتہ چل جاتا تو....." مسعود نے آہستہ سے کہا اور اس کی یہ بات خواجہ صابر علی نے سن لی جو اس وقت قریب سے گزر رہا تھا۔ وہ رک گیا۔

"تم نے اچھا یاد دلایا مسعود۔" اس نے کہا۔ "میں اس کا خیال رکھوں گا۔ دیکھوں گا شاید تمہارے ماموں کو تلاش کرنے کی کوئی صورت نکل آئے۔"

"اگر یوسف ماما مل جائیں تو وہ آپ کی مدد ضرور کریں گے چاچا!" مسعود نے کہا۔ "مجھے اس بات کا یقین ہے وہ بہت اچھے آدمی ہیں۔" مسعود ابھی تک یوسف ماما کی شخصیت کے سحر میں گرفتار تھا۔

"اگر وہ مل جائیں تو پھر دیکھیں گے کیا کرتے ہیں۔" صابر علی نے کہا۔ "ان کا مل جانا بھی کسی معجزے سے کم نہیں ہو گا۔"

اگلے ہی دن دونوں باپ بیٹے صبح کو بلدیہ کے متعلقہ دفتر میں پہنچ گئے۔ خواجہ صابر

علی کو دکان کی فکر نہیں تھی۔ مسعود وہاں موجود تھا تو پھر فکر کی کیا بات!

بلدیہ کے متعلقہ دفتر کے متعلقہ کمرے میں ایک کے علاوہ باقی ساری میزیں خالی پڑی ہوئی تھیں۔ ایک میز کے گرد ایک آدمی بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا اس کے سامنے دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے وہ تینوں آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

"یہ..... آپ کے دفتر سے نوٹس آیا ہے ہمارے نام۔" طاہر علی نے نوٹس اس شخص کو دکھاتے ہوئے کہا۔

اس شخص نے نوٹس پر بس ایک نظر ڈالی اور فوراً ہی بولا۔ "جی ہاں' گیا ہے۔ وہ پلاٹ بلدیہ کا ہے۔ آپ اس کو خالی کر دیجئے۔ آپ کو ایک ماہ کی مہلت تو دی گئی ہے۔"

"مگر دیکھئے نا حکومت تو بار بار یہ اعلان کر رہی ہے کہ ساری کچی بستیوں کی لیز کر دی جائے گی اور وہاں کے رہنے والوں کو زمین پر مالکانہ حقوق دے دیئے جائیں گے تو پھر....."

"وہ رہائشی جگہ نہیں ہے۔" اس شخص نے طاہر علی کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "وہ تو بلدیہ کے پارک کی جگہ ہے۔ وہ تو کسی کو بھی نہیں دی جا سکتی۔"

"مگر ہم لوگ تو وہاں تقریباً پندرہ سال سے رہ رہے ہیں۔" خواجہ صابر علی نے کہا۔ "ہمارا گھر ہے وہاں اور۔"

"اس سے کچھ نہیں ہوتا۔" اس شخص نے کہا۔ "اس جگہ پر آپ کا قبضہ ہی غلط ہے۔ اگر آپ سو برس سے بھی وہاں رہ رہے ہوں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"وقت ضائع کرنے کے بجائے کسی دوسری جگہ کی تلاش شروع کر دیجئے۔" سامنے بیٹھے ہوئے آدمیوں میں سے ایک نے کہا اور خواجہ صابر علی اور اس کے بیٹے کو تعجب ہوا کہ انہیں بھی ساری بات معلوم تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ بھی دفتر کے ہی لوگ تھے اور تینوں خالی بیٹھے ہوئے گپیں ہانک رہے تھے۔

صابر علی اور طاہر علی کافی دیر تک اس شخص سے گفتگو کرتے رہے' اور صابر علی نے اسے "امداد باہمی" کا اشارہ بھی دے دیا لیکن اس شخص پر اس کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ آخر صابر علی نے اس سے کہا کہ وہ اس کے افسر سے بات کرنا چاہتا ہے۔

"ہاں ضرور۔" اس شخص نے کہا۔ "وہ سامنے والے کمرے میں بیٹھتے ہیں ابھی آئے نہیں ہیں۔ آپ لوگ انتظار کر لیجئے۔"

اس وقت صبح کے دس بجے تھے۔ خواجہ صابر علی اور طاہر علی افسر کے انتظار میں



بیٹھ گئے اور انہیں بیٹھے بیٹھے تقریباً دو گھنٹے گزر گئے تب کہیں جا کر افسر آیا اور اس کے بھی آدھے گھنٹے کے بعد ان دونوں کو اندر جانے کی اجازت ملی۔ جب وہ دونوں اندر پہنچے تو افسر کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔ "ہاں۔ بیس بوری وائٹ سیمنٹ پہنچا دینا اور دانہ بھی ختم ہو گیا ہے۔ کام جلد سے جلد ختم کراؤ یار۔ ہاں۔ ٹینڈر' ارے تم پہلے کام ختم کراؤ۔ وہ بات بھی ہو جائے گی۔ ہاں۔ اچھا' خدا حافظ!" اور اس نے فون بند کر دیا اس کے بعد وہ ان دونوں کی طرف متوجہ ہوا۔

"ہاں بھئی' کیا مسئلہ ہے؟" اس نے پوچھا اور جب خواجہ صابر علی نے اسے وہ نوٹس دکھایا اور اپنا مسئلہ بیان کرنا شروع کیا تو اس نے درمیان میں ہی اس کو ٹوک دیا اور کہا کہ "اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتا' اور یہ کہ وہ بلدیہ کی زمین ہے اور وہ خالی کرنی ہی پڑے گی۔

خواجہ صابر علی اور اس کے بیٹے طاہر علی نے تقریباً وہ ساری باتیں دہرائیں جو وہ باہر بیٹھے ہوئے کلرک سے کر چکے تھے لیکن افسر پر ان کی ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ مصر رہا کہ وہ جگہ ان لوگوں کو خالی کرنی ہو گی۔

"پارک کی جگہ ہے بھائی۔" افسر نے کہا۔ "وہاں پارک بنے گا۔ آپ لوگ اس جگہ کو چھوڑ دیجئے۔"

"صاحب' ہم ہر خدمت کے لئے تیار ہیں۔" خواجہ صابر علی نے کہا۔ "جو بھی خرچہ آئے..... جو نذرانہ....."

"نہیں نہیں۔" افسر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اس کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے اور نہ اس قسم کی کوئی بات ہے۔ میں آپ کو بتا رہا ہوں۔ اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ مت کیجئے گا۔ کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ آپ کو وہ جگہ چھوڑنی ہو گی۔"

دونوں باپ بیٹے سخت مایوسی اور ناامیدی کے عالم میں وہاں سے باہر نکلے۔ انہیں کوئی امید تھی کہ تصفیے کی کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی اور کچھ لے دے کر کام بن جائے گا۔ صابر علی ایک کاروباری آدمی تھا اور وسیع تجربے کا حامل' وہ جانتا تھا کہ کس طرح ناجائز قرار دی جانے والی بلند عمارتیں اِدھر اُدھر سے تھوڑی سی توڑ دیئے جانے کے بعد' دوبارہ کھڑی ہو جاتی ہیں اور قانون اپنے مقدر کو روتا رہ جاتا ہے۔ کس طرح ٹریفک پولیس کے بڑے بڑے اعلیٰ افسروں کی آئے دن کی دھمکیوں کے باوجود سارے شہر کی سڑکیں بارشر ہارن کی بھیانک اور ہلاکت خیز آواز کی گونج سے لرزا کرتی ہیں اور دھواں چھوڑنے

والی گاڑیوں کا زہریلا مواد سارے شہر کی فضا میں گھلتا رہتا ہے۔ یہاں تو سب اسی طرح چل رہا تھا۔ سب کچھ ممکن تھا۔ رشوت' بھتہ' پیسہ' یہی سب کچھ تو جزو ایمان تھا لیکن اس معاملے میں تو کلرکوں نے اور افسر نے بھی لین دین سے صاف انکار کر دیا تھا۔ یہ صورت حال خواجہ صابر علی کے طویل تجربے کی نفی کر رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ بات کچھ زیادہ ہی گہری تھی۔

خواجہ صابر علی نے طاہر علی کو گھر واپس بھیج دیا اور خود دکان پر آگیا جہاں مسعود اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ وہ نتیجے کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ خواجہ صابر علی نے اس کو سب کچھ بتا دیا۔

"پھر اب کیا کریں گے چاچا جی؟" مسعود نے سہم کر پوچھا۔ "کیا یہ جگہ واقعی خالی کرنی ہو گی؟"

"کوئی نہ کوئی راستہ نکالنے کی کوشش کریں گے بیٹا۔" خواجہ صابر علی نے کہا۔ "ایک وکیل ہیں جاننے والے برکت اللہ نام ہے ان کا۔ آج شام کو ان کے دفتر جاؤں گا۔ ان سے مشورہ کروں گا۔"

شام کو خواجہ صابر علی اپنے جاننے والے برکت اللہ ایڈووکیٹ کے دفتر گیا۔ برکت اللہ کافی بوڑھا آدمی تھا وہ صابر علی کے مرحوم سسر کے بہت اچھے جاننے والوں میں سے تھا۔ وہ صابر علی کے ساتھ بہت اچھی طرح پیش آیا۔ صابر علی نے اس کو بلدیہ کا نوٹس دکھایا اور آج کی ساری کارروائی کے بارے میں بھی بتایا۔ برکت اللہ اس نوٹس کو کافی دیر تک غور سے پڑھتا رہا۔

"کیس تو بہرحال لڑیں گے۔" برکت اللہ نے کہا۔ "پہلے تو تمہاری طرف سے ایک باقاعدہ درخواست بلدیہ کے متعلقہ دفتر میں داخل کرتے ہیں اور ساتھ ہی کورٹ سے اس آرڈر کے خلاف حکم امتناعی بھی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ معاملے کو زیادہ سے زیادہ طول دینے کی کوشش کریں گے اور ساتھ ہی خفیہ راستے کو بھی کھلا رکھیں گے۔" وہ مسکرایا۔

"میں نے بات کی تھی جناب۔" خواجہ صابر علی اس کی بات کو سمجھتے ہوئے بولا۔ "لیکن ان لوگوں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔"

"ضروری نہیں ہے کہ تمہاری پہلی ہی کوشش میں وہ لوگ سب کچھ مان لیں گے۔" تجربہ کار' ہوشیار وکیل برکت اللہ نے کہا۔ "وہ تو اس بات کی کوشش کریں گے کہ



تم سے زیادہ سے زیادہ مال کھینچ لیں اور اس غرض سے وہ تم کو زیادہ سے زیادہ دباؤ کا نشانہ بنائیں گے۔ انہیں ذرا کھلنے تو دو۔ میں دیکھوں گا کہ ہم کیا کر سکتے ہیں اور وہ کیا کر سکتے ہیں۔ بلدیہ کے لاء ڈیپارٹمنٹ میں دو ایک دوست ہیں۔ ان سے بھی صورت حال معلوم کروں گا۔"

"بس وکیل صاحب' کچھ نہ کچھ ہو جانا چاہئے۔" خواجہ صابر علی نے سخت پریشانی کے عالم میں کہا۔ "آپ تو جانتے ہیں۔ وہ صرف میرے رہنے کی جگہ نہیں ہے اس جگہ سے میرا روزگار بھی وابستہ ہے اگر وہ مجھ سے چھن گئی تو میں بے موت مارا جاؤں گا۔"

"میری تو پوری کوشش یہی ہو گی کہ بات بن جائے۔" برکت اللہ ایڈووکیٹ نے کہا۔ "آگے اللہ مالک ہے۔"

خواجہ صابر علی اس کے پاس سے چلا آیا وکیل کی باتوں سے کچھ امید تو بندھی تھی۔ اب دیکھنا تھا کہ آگے کیا ہوتا ہے۔

اگلے روز خواجہ صابر علی مسعود کو ساتھ لے کر حسب معمول دکان کے لئے روانہ ہو گیا۔ ناصر گھر پر ہی تھا اور اس کو روزانہ کی طرح گھر پر ہی کام کرنا تھا۔

دکان کھولے ہوئے کوئی دو گھنٹے گزرے ہوں گے بلدیہ کا بھتہ خور غلام اکبر آن پہنچا اور اس کی شکل دیکھ کر خواجہ صابر علی کو یاد آیا کہ آج مہینے کی پہلی تاریخ تھی۔ وہ تو اپنی پریشانی میں تاریخ بھی بھول گیا تھا۔ آج پہلی تاریخ تھی اور بھتہ خوروں کی آمد شروع ہو چکی تھی۔ بلدیہ کے آدمی کو دیکھتے ہی خواجہ صابر علی کے دماغ میں یہ خیال آیا کہ وہ اس سے بھی بات کر کے دیکھے۔ شاید اس کے ذریعے ہی کچھ کام بن جائے۔ لین دین کے معاملے میں وہ شخص بیچ کے دلال کا کام دے سکتا تھا۔

خواجہ صابر علی نے بلدیہ کے نوٹس کی کئی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں کروالی تھیں۔ اس نے ان میں سے ایک کاپی غلام اکبر کو دی اور اس کو اپنی مصیبت کا احوال سنایا۔

"کچھ کرو بھائی غلام اکبر۔" خواجہ صابر علی نے تقریباً گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ "تم تو ہمارے اپنے آدمی ہو۔ کچھ خیال کرو یار میں بال بچے دار ہوں مجھ سے وہ جگہ چھن گئی تو میں کہاں جاؤں گا؟"

"اصل میں وہ محکمہ ہمارا نہیں ہے خواجہ صابر علی۔" غلام اکبر نے کہا۔ "تم کو تو معلوم ہے ہم دوسرے محکمے کے لوگ ہیں اور اس نوٹس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن پھر بھی میں معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"چاچا غلام اکبر!" مسعود اس سے مخاطب ہوا۔ وہ ابھی ابھی دو گاہکوں کو فارغ کر کے خالی ہوا تھا۔ "اگر آپ میرے ماما یوسف علی خان کو ڈھونڈ نکالیں کسی طرح..... تو وہ ضرور اس معاملے میں ہماری مدد کریں گے۔"

"تم نے پہلے بھی یہ بات کہی تھی بیٹا۔" غلام اکبر نے نرمی سے کہا۔ "جانتے ہو، بلدیہ کے ملازمین کی تعداد بیالیس ہزار ہے اور یہ لوگ سارے شہر میں بیسیوں دفتروں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک یوسف علی خان کو کوئی تلاش کر سکتا ہے؟ کس طرح تلاش کر سکتا ہے؟"

"بیالیس ہزار!" مسعود نے دل ہی دل میں اس کے الفاظ دہرائے اور خاموش ہو گیا واقعی۔ ناممکن تھا۔ "یہ بیالیس ہزار آدمی اس شہر میں کیا کرتے ہیں؟" اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ "کیا یہ سب کے سب بھتہ کھاتے ہیں؟ تو ہر ماہ یہ لوگ کتنا بھتہ کھاتے ہوں گے؟"

غلام اکبر یہ وعدہ کر کے چلا گیا کہ وہ چند روز کے بعد دوبارہ آئے گا اور صحیح صورت حال کے بارے میں بتائے گا۔

اگلے ایک ہفتے کے اندر ساری صورت حال واضح ہو گئی اور یہ اطلاعات دو الگ الگ ذرائع سے حاصل ہوئی تھیں اور ایک دوسرے کی تصدیق کر رہی تھیں جو کچھ برکت اللہ ایڈووکیٹ نے بتایا وہی بلدیہ کے ملازم غلام اکبر نے بھی بتایا تھا۔ دونوں نے ایک ہی بات بتائی تھی۔

"پلاٹ تو وہ بلدیہ کی ہی ملکیت ہے۔" برکت اللہ ایڈووکیٹ نے خواجہ صابر علی کو بتایا۔ "اور بلدیہ کو اس پر پورا قانونی حق حاصل ہے۔ بدقسمتی سے قانونی اعتبار سے تمہارا کوئی دعویٰ اس پلاٹ پر جائز قرار نہیں پاتا اور اب بلدیہ نے اس پلاٹ کو فروخت کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"اچھا؟" خواجہ صابر علی نے بڑے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تو کتنے میں بیچ رہے ہیں بلدیہ والے اس پلاٹ کو؟ انہوں نے اس کی کیا قیمت مقرر کی ہے؟"

اور ایڈووکیٹ برکت اللہ نے اس کی جو قیمت بتائی اسے سن کر خواجہ صابر علی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "واقعی؟" اس نے سخت حیرت اور خوشی کے عالم میں کہا۔ "صرف اس قیمت پر؟"

"ہاں اور وہ بھی قسطوں میں۔" برکت اللہ نے آہستہ سے کہا۔



"تو..... تو..... وکیل صاحب، آپ کوشش کر کے یہ مجھے دلوا دیجئے۔" صابر علی نے تقریباً گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ "میں کچھ نہ کچھ کر کے اتنی رقم کا بندوبست کر لوں گا۔ مشکل تو ضرور ہو گی مگر....."

"نہیں صابر علی۔" ایڈووکیٹ برکت اللہ نے ایک لمبی اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "یہ قیمت تمہارے لئے نہیں ہے۔ یہ پلاٹ اگر مارکیٹ ریٹ پر فروخت کیا جائے تو تم اس کو خریدنے کا سوچ بھی نہیں سکو گے۔ یہ پلاٹ کوڑیوں کے مول قومی اسمبلی میں حزب اختلاف کے ایک ممبر کے ہاتھ فروخت کیا جا رہا ہے فروخت کا تو بس نام ہے۔ یوں کہو کہ مفت دیا جا رہا ہے۔"

"اچھا؟" خواجہ صابر علی نے سخت مایوسی اور ناامیدی کے ساتھ کہا۔ "قومی اسمبلی میں حزب اختلاف کے ممبر کے ہاتھ؟ مگر..... ایسا کیوں؟ حزب اختلاف....."

"حکومت کو اس ممبر کی حمایت درکار ہے۔" ایڈووکیٹ برکت اللہ نے کہا۔ "اس ایک پلاٹ کے علاوہ اسے اور بھی بہت کچھ دیا جا رہا ہو گا جس کا علم یہاں کے لوگوں کو نہیں ہے۔ بہرحال، یہاں کے متعلقہ لوگوں کو اس بات کا پوری طرح علم ہے کہ یہ اتنا سستا پلاٹ اس شخص کو اس لئے دیا جا رہا ہے کہ حکومت کو اس کی حمایت حاصل ہو جائے۔"

"تو..... تو..... اس لئے مجھ کو وہاں سے نکالا جا رہا ہے؟" خواجہ صابر علی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں صابر علی۔" ایڈووکیٹ برکت اللہ نے کہا۔ "میں نے اپنے مصدقہ ذرائع سے سب کچھ معلوم کر لیا ہے۔ یہ ساری باتیں طے ہو چکی ہیں اور اس پلاٹ کے بارے میں فیصلہ ہو چکا ہے اور میں تم کو یہاں تک بتا سکتا ہوں کہ اس رکن اسمبلی نے ایک بلڈر سے اس پلاٹ کے سودے کی بات بھی پکی کر لی۔ یہ کمرشل پلاٹ سونے کے بھاؤ بکے گا اور اس پر کثیر المنزلہ عمارت تعمیر ہو گی۔ بلڈر نے وہاں جا کر پلاٹ کو اچھی طرح سے دیکھ بھی لیا ہے۔"

"لیکن..... وہ بلدیہ کے کلرک اور افسر وغیرہ تو یہ کہہ رہے تھے کہ وہ پارک کی جگہ ہے اور وہاں پارک بنے گا۔" خواجہ صابر علی نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

"تو اور کیا کہیں گے وہ تم سے؟" ایڈووکیٹ برکت اللہ نے کہا۔ "کیا وہ تم کو بتا دیں گے کہ یہ پلاٹ سیاسی رشوت کے طور پر کسی رکن اسمبلی کو دیا جا رہا ہے۔"

"پھر کیا کریں وکیل صاحب؟" خواجہ صابر علی نے بڑی بے بسی اور ناامیدی کے

ساتھ کہا۔ ”جینا تو بہت مشکل ہو گیا ہے اور روز بروز زیادہ مشکل ہوتا جا رہا ہے..... کہاں جائیں؟ کیا کریں .....؟“

”ہاں بھائی!“ برکت اللہ نے بھی ایک لمبی اور ٹھنڈی سانس بھری۔ ”جینا تو واقعی بہت مشکل ہوتا جا رہا ہے لیکن جینے کے سوا چارہ بھی کیا ہے؟ کچھ بھی ہو کیسے بھی حالات ہوں، جینا انسان کی مجبوری ہے۔“

”پھر..... اب آپ مجھے بتائیے کہ میں کیا کروں؟“ خواجہ صابر علی کی آواز میں بڑا گہرا درد گھلا ہوا تھا۔

”ایک بات اچھی طرح سے جان لو صابر علی.....“ برکت اللہ ایڈووکیٹ نے کہا۔ ”میں اپنے ذرائع سے پوری تحقیق کر چکا ہوں، وہ پلاٹ اب تمہارے قبضے میں نہیں رہ سکتا، جب اعلیٰ ترین سطح پر ایک فیصلہ ہو جائے تو پھر نیچے والے کچھ نہیں کر سکتے۔ پھر تو کچھ دینے دلانے سے بھی بات نہیں بن سکتی، میں یہ نہیں کہتا کہ ہمیں اپنی کوششیں ترک کر دینی چاہئیں اور لڑائی ختم کر دینی چاہئے، یہ سلسلہ تو اسی طرح چلتے رہنا چاہئے لیکن ساتھ ہی ساتھ ہمیں متبادل جگہ کے لئے بھی کوشش شروع کر دینی چاہئے۔ اس میں بہت وقت لگے گا اگر متبادل جگہ مل جائے تو غنیمت سمجھو اور جہاں تک ایک ماہ کے نوٹس کا تعلق ہے تو اس کے خلاف تو میں حکم امتناعی حاصل کر ہی لوں گا۔“

”ٹھیک ہے وکیل صاحب۔“ صابر علی نے خالی خالی اور کھوکھلی آواز میں کہا۔ ”جیسا آپ کہیں، میں نے تو سب کچھ آپ پر ہی چھوڑ دیا ہے۔“

اس سے اگلے دن غلام اکبر دکان پر صابر علی کے پاس آیا اور اس نے بھی صابر علی کو تقریباً وہی سب کچھ بتا دیا جو صابر علی کو برکت اللہ ایڈووکیٹ کی زبانی پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا۔

”وہ تو بہت اونچا معاملہ ہے بھائی۔“ غلام اکبر نے اس سے کہا۔ ”اس میں کوئی کچھ نہیں کر سکتا، تم اس پلاٹ کا خیال چھوڑ دو، اس کا فیصلہ ہو چکا ہے۔“

”کیا فیصلہ ہوا ہے یار؟ کچھ بتاؤ تو سہی۔“ صابر علی نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

”وہ پلاٹ قومی اسمبلی کے ایک رکن کو دیا جا رہا ہے بلکہ یوں سمجھو کہ دیا جا چکا ہے۔“ غلام اکبر نے کہا۔ ”اب وہ کسی اور کو نہیں دیا جا سکتا تمہیں تو اس کو خالی کرنا ہی ہو گا؟“

غلام اکبر نے کچھ اور تفصیلات بھی بتائیں جن میں کوئی بھی بات غلط نہیں تھی البتہ



اس نے پلاٹ کی قیمت وغیرہ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا شاید اس کی رسائی وہاں تک نہیں تھی اور وہ یہ سب کچھ معلوم نہیں کر سکا تھا۔

”مجھے افسوس ہے بھائی صابر علی کہ میں اس معاملے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکا۔“ غلام اکبر نے کہا اور صابر علی کو اس کے لہجے میں خلوص کی جھلک نظر آئی۔ شاید اس نے سنجیدگی کے ساتھ اس کی مدد کرنے کے بارے میں سوچا تھا۔

آنے والے دن صابر علی اور اس کے خاندان کے لئے بہت صبر آزما اور مشکل دن تھے، ان لوگوں کی زندگی کی بنیادیں ہل گئی تھیں اور جمی جمائی زندگی منتشر اور تتر بتر ہوتی نظر آ رہی تھی سب کچھ چھینا جا رہا تھا۔

خواجہ صابر علی زیادہ تر اکیلا اور کبھی کبھی اپنے بیٹے طاہر علی کے ساتھ دن بھر سرکاری دفتروں میں اِدھر سے اُدھر دھکے کھاتا پھرتا تھا، دیر سے آتے والے ”میٹنگوں“ میں مصروف رہنے والے اور فون پر لمبی لمبی گفتگو کرنے والے سرد مہر، بے مروت اور بے حس افسروں کے انتظار میں ان کے کمروں کے باہر گھنٹوں بیٹھا رہتا، صرف پانچ سات منٹ کی گفتگو کے لیے لمبے انتظار کی ساعتیں گزارنی پڑتیں اور اس کا کاروبار بری طرح متاثر ہو رہا تھا، دکان پر وہ بہت کم وقت دے پا رہا تھا اور خدا کا شکر ادا کرتا تھا کہ اس کو مسعود جیسا ملازم ملا ہوا تھا جس پر وہ بالکل اپنے بیٹے کی طرح بھروسہ کر سکتا تھا، مسعود پر پوری دکان چھوڑ کر وہ بے فکر ہو جاتا تھا، اگر مسعود نہ ہوتا تو ان دنوں شاید اس کو دکان بالکل ہی بند رکھنی پڑتی اور پھر تو بس خسارہ ہی خسارہ تھا۔

برکت اللہ ایڈووکیٹ اس کی بہت مدد کر رہا تھا اس نے بھاگ دوڑ کر کے عدالت کے ذریعے ایک ماہ کے نوٹس کو معطل کروا کے عارضی حکم امتناعی حاصل کر لیا تھا لیکن ساتھ ہی صابر علی پر یہ واضح کر دیا تھا کہ اس حکم امتناعی میں توسیع ممکن نہیں یہ پلاٹ فوراً خالی کرنا پڑے گا۔

صابر علی، حنیفہ اور طاہر علی نے گھر کے سامان کی چھٹائی شروع کر دی تھی، ان سب کو یہ تو معلوم ہو چکا تھا کہ اب اس گھر سے جانا ہو گا۔ کہاں.....؟ یہ تو انہیں خود بھی نہیں معلوم تھا۔

سارا معاملہ اب متبادل جگہ کی فراہمی کا تھا۔ صابر علی اس بات کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا کہ کسی قریب کے علاقے میں ہی متبادل جگہ مل جائے لیکن قریب کے علاقے میں تو ممکن عنقا تھی، ایک ایک انچ زمین پر کسی نہ کسی کے نام کی مہر لگ چکی تھی اور جس پر

ابھی مہر نہیں لگی تھی اس کو مہر لگانے کے لے محفوظ کر لیا گیا تھا' قریب کے علاقے میں زمین بھلا کہاں مل سکتی تھی؟

صابر علی کی صرف مٹھائی اور دودھ' دہی کی دکان ہی نہیں تھی اس کا دودھ کا کاروبار بھی تھا اس کے پاس بھینسیں تھیں جو اس کی اصل آمدنی کا ذریعہ تھیں اور اسے ایسی جگہ چاہئے تھی جہاں وہ اپنی بھینسوں کو بھی رکھ سکے کافی بڑی جگہ کی ضرورت تھی اس کو..... اور وہ اس کے لئے کوشش کر رہا تھا۔

"بھینسوں کو شہر میں رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔" ایک سرکاری افسر نے اس کو بتایا۔ "تم کو معلوم ہے بھینسوں کو رکھنے کے لئے شہر سے باہر بھینس کالونی بنائی گئی ہے۔"

صابر علی کو یہ بات معلوم تھی کہ بھینس کالونی لانڈھی کے قریب واقع ہے جہاں ہزاروں بھینسوں کے باڑے ہیں اور جہاں سے سارے شہر کو دودھ فراہم کیا جاتا ہے اس کے کئی جاننے والے بھینس کالونی میں رہتے تھے اور دودھ کا کاروبار کرتے تھے۔ بھینس کالونی شہر سے بہت دور تھی اور یہاں زیادہ تر صرف وہی لوگ رہتے تھے جن کے پاس بھینسیں تھیں اور جو دودھ کا ہی کاروبار کرتے تھے یہ انسانوں اور بھینسوں کی بستی تھی وہ کئی بار وہاں جا چکا تھا اور ناقابل برداشت غلاظت اور تعفن سے بھری ہوئی اس بستی سے کافی حد تک واقف تھا۔

صابر علی نے اس سے پہلے تو کبھی یہ بات سوچی بھی نہیں تھی کہ وہ اپنی موجودہ جگہ چھوڑ کر بھینس کالونی میں رہائش اختیار کرے گا لیکن اب بھینسوں سمیت جانے کے لئے بھینس کالونی کے علاوہ اور کوئی جگہ ملتی نظر نہیں آتی تھی۔

کئی بار اس کے جی میں یہ خیال آیا کہ وہ بھینسوں کو فروخت کر دے اور پھر کوئی اچھی جگہ حاصل کرنے کی کوشش کرے لیکن حنیفہ نے اس کے اس خیال کی سختی کے ساتھ مخالفت کی۔

"ہماری اصل آمدنی تو دودھ' دہی سے ہے۔" اس نے کہا۔ "صرف مٹھائی اور دودھ' دہی کی دکان سے تو اتنی کمائی نہیں ہو سکتی آخر گھر چلانا ہے' طاہر کے بارے میں بھی سوچو' اس کی تعلیم ہے' شادی ہے' ابھی تو بہت خرچے ہیں۔"

خواجہ صابر علی' حنیفہ کی بات سے انکار نہیں کر سکتا تھا واقعی صرف مٹھائی کی ایک چھوٹی سی دکان سے اتنی آمدنی تو نہیں ہو سکتی تھی جتنی کہ دودھ سے ہو رہی تھی تو پھر بھینسوں کے لئے جگہ چاہئے تھی اور وہ شہر سے باہر ہی مل سکتی تھی۔



گھر کے اندر اور گھر کے باہر جو کچھ ہو رہا تھا' مسعود اور ناصر اس سے پوری طرح واقف تھے۔ خواجہ صابر علی سارا سارا دن اِدھر سے اُدھر دھکے کھانے اور خوار ہونے کے بعد جب شام کو دکان پر پہنچتا تو مسعود کو دن کی پوری روداد سنا دیتا اور مسعود خود اپنے حالات کے ذریعے اس سے سب کچھ پوچھ لیتا اور جو کچھ مسعود کو معلوم ہو جاتا' وہ ناصر کو بھی معلوم ہو جاتا ویسے بھی گھر میں برابر باتیں ہوتی رہتی تھیں' ناصر کو حامد کے ذریعے بہت سی باتیں معلوم ہوتی رہتی تھیں۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور مکان خالی کرنے کی گھڑی قریب آ رہی تھی' خالی تو کرنا ہی تھا اس کے علاوہ اور کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا صرف یہ تھا کہ آج نہیں تو کل اور کل نہیں تو پرسوں.....

خواجہ صابر علی اور حنیفہ اپنے بنے بنائے جمے جمائے مکان کو دیکھتے تو ان کا کلیجہ جیسے کٹنے لگتا۔ ایک عمر کی کمائی کا حامل تھا یہ مکان..... اس کی ایک ایک اینٹ میں ان کی محنت اور قربانیوں کا لہو شامل تھا' ایک ایک پیسہ بچا بچا کر انہوں نے اس کی تعمیر کی تھی اور اس کو اپنی ضرورت کے مطابق بنایا تھا' یہاں ہر چیز ان کی مرضی اور منشاء کے مطابق ان کی ضرورت کے مطابق تھی' وہ دونوں اس مکان کے در و دیوار سے' اس کے ایک ایک حصے سے اتنی اچھی طرح واقف تھے کہ آنکھیں بند کر کے مکان کے کسی بھی حصے میں جا سکتے تھے' اس کے در و دیوار میں ان کے گزرے ہوئے لمحوں کی' ان کی گم گشتہ خوشیوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی' کتنی یادیں وابستہ تھیں' کتنی خوشیاں بٹوری تھیں یہاں پر اور کتنے دکھ بھی جھیلے تھے' زندگی کی کتنی رنگا رنگ تصویریں دیکھی تھیں اور اب یہ سب کچھ خاک ہوتا نظر آ رہا تھا۔

برکت اللہ ایڈووکیٹ نے بھی خواجہ صابر علی کو یہی مشورہ دیا کہ وہ بھینس کالونی میں کوئی جگہ لے لے کیونکہ بھینسوں کے ساتھ کہیں اور رہنا اور کاروبار کرنا ممکن نہیں تھا۔

دشواریاں تو بہت ساری تھیں' دکان بہت دور ہو جاتی' طاہر علی کا کالج بہت دور ہو جاتا' شہر بھی بہت دور ہو جاتا' ہر چیز بہت دور ہو جاتی آنے جانے کے اخراجات بہت بڑھ جاتے اور وقت بھی لیکن اگر بڑی جگہ چاہئے تھی تو وہ صرف وہیں مل سکتی تھی۔

"نہ جانے وہ کون منحوس لوگ ہیں جو اس جگہ پر قبضہ کریں گے ہمارے گھر کو لوٹیں گے اور ہم دربدر ہو کر اِدھر اُدھر بھٹکتے پھریں گے۔" ایک رات حنیفہ نے روتے ہوئے کہا۔ اس وقت اس کے پاس اس کے شوہر اور بیٹے کے علاوہ مسعود اور ناصر بھی

موجود تھے۔

"ارے..... کوئی بھی ہوں۔" خواجہ صابر علی نے بہت ہی تھکی ہوئی اور مستحل
آواز میں کہا۔ "ہماری بلا سے جب ایک چیز ہماری نہیں رہی' ہمارے ہاتھ سے نکل گئی
پھر کسی کے پاس بھی جائے' ہمیں اس سے کیا لینا؟"

"میں بعد میں یہاں آؤں گی ضرور۔" حنیفہ نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "ایک بار تو
دیکھنے ضرور آؤں گی یہاں کیا بنتا ہے ہم نے تو اس جگہ کی مٹی کے ایک ایک ذرے کو
سمجھ کر آنکھوں سے لگایا تھا۔"

"دوسرا بھی شاید ایسا ہی کرے۔" صابر علی نے آہستہ سے کہا۔ "کوئی چیز آدمی کو
ہے وہ اسے برتتا ہے' اس کو استعمال کرتا ہے اس کے قریب رہتا ہے تو پھر اس سے
بخود لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔"

فضا میں بڑی گہری اداسی گھل گئی تھی' ہر چیز کس قدر بوجھل اور تکلیف دہ معلو
ہو رہی تھی' وہی گھر جو کچھ عرصہ پہلے مسعود اور ناصر کو جنت کا ایک ٹکڑا معلوم ہوتا
اب ایک غم کدے میں تبدیل ہو چکا تھا' اس کے در و دیوار جیسے غم کی نمی سے سیل رہ
تھے اور اس میں گونجنے والی آوازوں میں نوحوں کی سرسراہٹ محسوس ہوتی تھی۔

بالآخر بھینس کالونی میں جگہ مل گئی اور یہ کام بھی کوئی آسانی سے نہیں ہوا تھا خود
صابر علی کے ڈھلتے ہوئے جسم کی ساری چولیں ہل گئی تھیں ایک دفتر سے دوسرے دف
تک اور ایک ہی دفتر میں ایک میز سے دوسری میز تک ٹھوکریں کھاتے کھاتے' سارا بدن
دکھنے لگا تھا اور اپنے ہونے کے جرم کا احساس روح کو گھائل کئے ڈالتا تھا۔

منتقل ہونے سے پہلے اس جگہ کو کم از کم سر چھپانے کے قابل بنا لینا بھی ضروری
برکت اللہ ایڈووکیٹ کے اثر و رسوخ اور کوششوں کے نتیجے میں اس مد میں کچھ رقم
گئی تھی جس سے دیواریں کھڑی ہو سکتی تھیں اور ٹین یا سیمنٹ کی چھتیں ڈالی جا سکتی
تھیں' کام شروع ہو چکا تھا انخلاء کے لئے کچھ اور مہلت مل گئی تھی۔

پچھلے چند ماہ کے دوران گھر میں سب کچھ حالت انتشار میں آ چکا تھا اور مسعود
ناصر بھی اس کی زد میں تھے گو کہ ان دونوں سے کسی نے یہ نہیں کہا تھا کہ ان کی نوکریاں
اب ختم کر دی جائیں گی اور ان کی چھٹی ہو جائے گی اور نہ ہی گھر والوں کے رویے
ایسی کوئی بات ظاہر ہوئی تھی تاہم دونوں کے دلوں میں یہ خطرہ موجود تھا اور وہ آپس میں
چپکے چپکے اس بارے میں بات بھی کرتے تھے۔



"بزرگوں کا کہنا ہے کہ ایک در بند ہوتا ہے تو ستر در کھل جاتے ہیں۔" اس رات
ود نے ناصر سے آہستہ سے کہا۔ "اگر چاچا کو ہماری ضرورت نہیں رہے گی تو پھر ہم
ہا اور ٹھکانہ تلاش کر لیں گے لیکن اگر ایسی کوئی بات ہو گی تو چاچا ہمیں پہلے سے تو
ور بتائیں گے۔"

"ہم..... ہم خود ہی ان سے کیوں نہ پوچھ لیں؟" ناصر نے کہا۔ "وہ ہمیں بتا دیں
چاہی ہے۔"

مسعود نے اس کے خیال سے اتفاق کیا۔ "ٹھیک ہے میں کل چاچا سے پوچھ لوں گا
جب میں ان کے ساتھ سوزوکی میں دکان جا رہا ہوں گا تو اس وقت پوچھ لوں گا ویسے
ہیں تنخواہ تو برابر دے رہے ہیں اور اب تو میرے پندرہ ہزار پورے ہونے میں زیادہ
رہاتی نہیں ہے۔"

"بس' تمہارے بھی پیسے پورے ہو جائیں پھر ہم دونوں گھر چلیں گے اور حاجی کا
ہ اتار کر پوری طرح سے آزاد ہو جائیں گے۔"

"ہاں' لیکن ہم صابر چاچا کو پریشانی میں چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔" مسعود نے کہا۔
م اس وقت جائیں گے جب یہاں کے معاملات ٹھیک ہو جائیں گے' چاچا بے چارے تو
ج کل سخت پریشانی کا شکار ہیں' گزر جائے گی یہ پریشانی بھی....." اچانک اس کا لہجہ
ت سنجیدہ ہو گیا۔ "آدمی کا اچھا وقت بھی گزر جاتا ہے اور برا وقت بھی..... سب گزر
ا ہے۔"

"میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ چاچا کا اچھا وقت رہے۔" ناصر نے آہستہ سے کہا۔
ن کا وقت اچھا رہے تو ہمارا وقت بھی اچھا رہے گا۔"

اگلے روز معمول کے مطابق خواجہ صابر علی' مسعود کو اپنے ساتھ لے کر دکان کے
ے روانہ ہوا آج باڑے میں ناصر کو اکیلے ہی کام کرنا تھا کیونکہ طاہر علی اور حامد کو بھینس
نی والی جگہ پر جانا تھا جہاں تعمیراتی کام چل رہا تھا اب جلد از جلد وہاں منتقل ہونے کی
رورت تھی۔

"چاچا جی۔" مسعود نے تھوڑی ہی دیر کے بعد راستے میں بغیر کسی تمہید کے اچانک
ہا۔ "اب میرا اور ناصر کا کیا ہو گا؟"

"کیا مطلب.....؟" خواجہ صابر علی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "کیا تم
ں کو تنخواہ نہیں مل رہی ہے؟"

"وہ تو مل رہی ہے چاچاجی۔" مسعود نے جلدی سے کہا۔ "میرے پوچھنے کا مطلب یہ تھا چاچا جی کہ اب جگہ بدل رہی ہے' آپ کا سارا کاروبار بری طرح سے متاثر ہو رہا ہے' آپ سب لوگ اتنے زیادہ پریشان ہیں تو شاید آپ کے لئے ہم دونوں کو اپنے ساتھ رکھنا اب مشکل ہو' اگر ایسا ہے تو....."

"یہ تم سے کس نے کہا؟" خواجہ صابر علی نے اس سے پوچھا۔ "کیا کسی نے تم سے ایسی کوئی بات کہی؟"

"جی نہیں۔" مسعود نے جواب دیا۔ "کہا تو کسی نے بھی نہیں لیکن میں اور ناصر سوچ رہے تھے کہ آپ لوگ مشکل میں گرفتار ہیں اس وقت..... اور....."

"ہم مشکل میں گرفتار ہیں تو تم' ہم کو چھوڑ کر بھاگ جانا چاہتے ہو؟" خواجہ صابر علی نے ایک پھیکی ہنسی کے ساتھ کہا۔ "کہیں اور کام تلاش کر لیا ہے کیا.....؟"

"نہیں..... نہیں چاچاجی....." مسعود نے جلدی سے کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے' ہم نے کہیں اور کام تلاش نہیں کیا ہے اور نہ ہی ہم ایسا کوئی ارادہ رکھتے ہیں ہم تو آپ کے ساتھ ہر مصیبت میں شریک ہیں۔"

"بس تو پھر شریک رہو۔" خواجہ صابر نے کہا۔ "جہاں ہم سب جائیں گے وہیں تم دونوں بھی جاؤ گے اور میری پوری کوشش ہو گی کہ تم دونوں کو تنخواہ بھی برابر ملتی رہے لیکن اگر کبھی کچھ دن اوپر نیچے ہو جائیں تو پریشان نہ ہونے لگنا تم دونوں اس طرح ہمارے ساتھ رہو گے جس طرح اب رہ رہے ہو۔"

مسعود کے دل میں خوشی اور اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی اور وہ خلش دور ہو گئی جو گزشتہ کافی دنوں سے اس کے اور ناصر کے دل میں موجود تھی وہ اب ناصر کو یہ خوشخبری سنا سکے گا کہ ان دونوں کو فی الحال کوئی نیا ٹھکانہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

دراصل خواجہ صابر علی اور حنیفہ اس نئی پیدا ہونے والی صورت حال کے حوالے سے ان دونوں لڑکوں کے بارے میں پہلے ہی آپس میں بات کر چکے تھے اور فیصلہ کر چکے تھے۔

اب نئی جگہ جانا تھا' وہاں حالات یہاں کے مقابلے میں یقیناً زیادہ مشکل اور ناسازگار تھے۔ کتنی ایسی دشواریاں تھیں جن کے بارے میں پہلے سے علم تھا اور کتنی ہی ایسی مشکلات تھیں جن کے متعلق ابھی کچھ بھی نہیں معلوم تھا' ان سب دشواریوں پر قابو پانا اور اس کے لئے دونوں لڑکوں کا موجود رہنا ضروری تھا' دکان تو اب مسعود کے بغیر چل ہی



نہیں سکتی تھی اور ادھر سلیم چاچا نے بھی معذرت کر لی تھی کہ وہ مٹھائیاں بنانے کے لئے روزانہ بھینس کالونی نہیں آسکتے ان کے ساتھ برسہا برس کی رفاقت کا سلسلہ ختم ہو رہا تھا نہیں اس بات کا بہت افسوس بھی تھا لیکن مجبوری بھی تھی وہ روزانہ بھینس کالونی نہیں آسکتے تھے تاہم انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مہینے پندرہ دن میں ایک چکر ضرور لگا لیا کریں گے اور جو بھی مدد درکار ہو گی وہ کر دیا کریں گے لیکن اس سے زیادہ کچھ کرنا ان کے لئے ممکن نہیں تھا۔

ناصر مٹھائیاں بنانے کے فن سے بخوبی واقف ہو گیا تھا اور وہ سلیم چاچا کی کمی پوری کر سکتا تھا وہ حنیفہ کے ساتھ مل کر مٹھائیاں بنانے کا سارا کام سنبھال سکتا تھا چنانچہ خواجہ صابر علی اور حنیفہ نے موجودہ صورت حال کے تمام پہلوؤں پر اچھی طرح سے غور و خوض کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ ان دونوں لڑکوں کو نوکری سے الگ نہیں کریں گے اور انہیں اپنے ساتھ ہی رکھیں گے ان کی موجودگی ہر لحاظ سے ان کے لئے فائدے کا باعث تھی۔

"جب تک میرا کاروبار چل رہا ہے' تب تک تم دونوں کو کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔" خواجہ صابر علی نے آہستہ آہستہ کہا۔ "خدا سے دعا کرو کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے نئی جگہ جانا ہے' دکان سے گھر تک کا فاصلہ بھی کس قدر زیادہ ہو جائے گا' ایک شہر سے دوسرا شہر....."

باتیں کرتے ہوئے راستہ طے ہو گیا اور وہ دونوں دکان پر پہنچ گئے پھر سب کچھ معمول کی طرح ہوا اور دکان کھل گئی کاروبار شروع ہو گیا۔

نو بجے کے قریب صابر علی نے اس سے کہا۔ "اچھا بیٹا! اب تم سنبھالو دکان کو میں چلتا ہوں اپنی قسمت کا بھگتان بھگتنے کے لئے..... دو چالان جمع کرانے ہیں پھر کے ایم سی کے دفتر جانا ہے اور بھی کئی کام ہیں دوپہر کے کھانے تک شاید ہی واپس آسکوں۔"

"میں کھانے پر آپ کا انتظار کروں گا۔" مسعود نے کہا۔ "جب آپ آجائیں گے' تب ہی کھانا کھائیں گے۔"

خواجہ صابر علی چلا گیا اور مسعود دکانداری میں مصروف ہو گیا۔ خواجہ صابر علی سہ پہر تین بجے کے قریب واپس آیا وہ بہت تھکا ہوا نظر آرہا تھا اور اس کے چہرے پر جیسے خاک اڑ رہی تھی' اس نے ہاتھ منہ دھو کر مسعود کے ساتھ کھانا کھایا اور کھانے کے دوران ہی وہ مسعود کو اپنی آج کی کارروائی کی روداد سناتا رہا۔ مسعود ہر روز یہ جاننے کا خواہشمند رہتا

تھا کہ کاموں کے سلسلے میں کیا پیش رفت ہوئی ہے اور خواجہ صابر علی اس کو سب کچھ اس طرح بتاتا تھا جس طرح سے گھر کے کسی فرد کو بتا رہا ہو۔

"بس بیٹا! اور تھوڑے دنوں کی بات ہے۔" اس نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ "پھر تو اس گھر سے ہمارا دانہ پانی اٹھا سمجھو نئی جگہ جانا ہو گا' نئے حالات ہوں گے' نہ جانے وہاں دکانداری کیسی رہے؟" وہ کچھ دیر تک آہستہ آہستہ جیسے اپنے آپ سے باتیں کرتا رہا اور اس کے بعد وہ دکان کے اندر جا کر سو گیا۔

اس روز رات کو گھر پہنچنے کے بعد مسعود نے ناصر کو جب یہ بات بتائی کہ ان دونوں کی نوکری کو کوئی خطرہ درپیش نہیں ہے اور وہ صابر چاچا سے اس بارے میں بات کر چکا ہے' تو ناصر نے بھی سکون و اطمینان کی سانس لی۔

گھر خالی کرنے کا وقت آ گیا۔ گھر کے لوگ اور خاص طور سے حنیفہ کافی دنوں سے گھر میں سے سامان نکال کر الگ کر رہی تھی۔ بے حد فالتو سامان گھر میں بھرا ہوا تھا جسے ساتھ لے جانے کی ضرورت تھی نہ وہاں رکھنے کی جگہ' یہ طے ہو گیا کہ صرف ضروری سامان ساتھ جائے گا۔ سارا کاٹھ کباڑ اور فالتو سامان نکالا جا رہا تھا اور بیچا جا رہا تھا۔ گھر خالی کیا جا رہا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ گھر جو رستے بستے انسانوں کی خوشیوں کا ایک گہوارہ تھا۔ ایک ہولناک کباڑ خانے میں تبدیل ہو چکا تھا' جہاں ہر طرف بکھرے ہوئے سامان کی بے سرو سامانی ایک عجیب الم انگیز اور رقت آمیز منظر پیش کر رہی تھی۔

حامد اور ناصر کو پہلے ہی نئی جگہ بھیج دیا گیا اور انہوں نے بھینسوں کے رہنے کا بندوبست کر لیا تھا۔ پھر بھینسوں کو بھی ٹرک میں سوار کرا کے روانہ کر دیا گیا۔

آج منتقل ہونے کا دن تھا۔ زیادہ تر سامان بھیجا جا چکا تھا۔ صرف کچھ ضروری چیزیں باقی تھیں' جنہیں ساتھ جانا تھا اور لوگ تھے۔ خواجہ صابر علی' حنیفہ' طاہر علی' مسعود' حامد اور ناصر پہلے ہی جا چکے تھے۔

خالی مکان بھائیں بھائیں کر رہا تھا اور حنیفہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ وہ یہاں کی ایک ایک چیز کو دیکھتی تھی اور روتی جاتی تھی۔ کل تک جو سب کچھ اپنا تھا' بالکل اپنا تھا وہ اب بیگانہ ہو چکا تھا۔ سب کچھ چھن چکا تھا۔

پاس پڑوس کے بہت سارے لوگ ان لوگوں کو رخصت کرنے کے لئے موجود تھے۔ خواجہ صابر علی اور حنیفہ نے اپنے پڑوسیوں سے ہمیشہ بہت اچھے تعلقات رکھے تھے اور کسی بھی پڑوسی کو ان سے کوئی بھی شکایت نہیں ہوئی تھی۔ سب لوگوں کو ان کے یہاں



جانے کا افسوس تھا۔

حنیفہ نے ٹیکسی کے پاس کھڑے ہو کر اپنے مکان پر ایک آخری نظر ڈالی اور اس کو لگا جیسے وہ اپنے کسی بہت ہی قریبی عزیز کو قبر کے سپرد کر کے جا رہی ہے۔ آج اس کی موت واقع ہو گئی تھی۔ یہ مکان اپنے دیرینہ مکینوں کے لئے مر چکا تھا اور اب یہ نہیں تھا' مکان کا لاشہ تھا۔ حنیفہ باہر سے نظر آنے والی ایک ایک چیز کو غور سے دیکھ رہی تھی اور رو رہی تھی۔

"بیٹھئے امی!" طاہر نے اپنی ماں سے کہا۔ "دیر ہو رہی ہے۔ ہمیں بہت دور جانا ہے۔" وہ ٹیکسی کا دروازہ کھولے ہوئے کھڑا تھا۔

"سب ٹوٹ جائے گا' کچھ باقی نہیں بچے گا سوائے خالی زمین کے۔" حنیفہ دل میں کہہ رہی تھی۔ "جو کچھ میں نے ایک ایک ریزہ جوڑ جوڑ کر بنایا تھا۔ وہ سب ٹوٹ جائے گا۔ ہائے میرے مولا' یہ کیسا انصاف ہے۔" اس نے چادر کے پلو سے اپنے آنسو پونچھے اور ٹیکسی میں سوار ہو گئی۔

خواجہ صابر علی کے خاندان کے لئے نئی زندگی کا آغاز زیادہ خوش گوار نہیں تھا۔ ان سے ایک جگہ رہتے بستے اور ایک مانوس اور اپنائیت سے بھرپور فضا میں سانس لیتے تھے وہ لوگ ایک مخصوص طرز زندگی کے عادی ہو چکے تھے اور زندگی گزارنے کا ایک پیمانہ ان کے پاس موجود تھا۔ جو اچانک ٹوٹ گیا اور سب کچھ منتشر ہو گیا اب تو ہر لئے سرے سے آغاز کرنا تھا۔

بڑی ہی گندی جگہ تھی کچھ ایسی زیادہ صاف ستھری تو وہ جگہ بھی نہیں تھی جہاں وہ اب تک رہتے چلے آئے تھے لیکن موجودہ جگہ سے زیادہ گندی جگہ کا تصور بھی ان کے لئے ممکن نہیں تھا۔ ان کے چاروں طرف' دور دور تک بھینسوں کے باڑے پھیلے ہوئے تھے۔ جہاں تک نظر کام کرتی تھی بھینسوں کے باڑے ہی باڑے نظر آتے تھے۔ بھینسیں اور ان کے ساتھ انسان' یہاں دونوں کا وجود ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہو گیا تھا۔

یہاں کی فضا مویشیوں کے گوبر اور پیشاب کی اعصاب شکن بو سے بوجھل رہتی تھی۔ جب ہوا کے تیز جھکڑ چلتے تو ہوا میں ریت اور مٹی کے ساتھ سوکھے ہوئے گوبر کے ریزے بھی شامل ہوتے جو منہ پر تھپڑ لگاتے ہوئے بھاگتے چلے جاتے۔ نیا گھر ابھی بالکل ناقابل برداشت اور تکلیف دہ تھا۔ یہاں بھینسوں کے آرام کا تو پورا بندوبست کر دیا گیا تھا'

کیونکہ بھینسیں تو وسیلہ رزق تھیں اور ان کی جانب سے لاپروائی نہیں برتی جا سکتی تھی۔ لیکن انسانوں کے آرام کا ابھی بہت کم بندوبست تھا دیواریں کھڑی کر کے ان پر سیمنٹ کی چادریں ڈال دی گئی تھیں۔ پکی چھتیں بنانے کے لئے وقت چاہئے تھا۔ وقت بھی اور پیسہ بھی۔

گھر کو جمانے میں اور سب کچھ ٹھیک ٹھاک کرنے میں کئی دن لگ گئے۔ اس عرصے کے دوران نہ تو مٹھائیاں بنائی گئیں نہ دکان کھولی گئی۔ گھر کے ہی کام اس قدر زیادہ پھیلے ہوئے تھے کہ ان کو سمیٹنے کے لئے ایک مدت درکار تھی۔ ابھی تو بس اتنا کر لینا تھا کہ کام چل جاتا۔ بے سروسامانی پر پوری طرح قابو پانے کے لئے کچھ وقت چاہئے۔ بھینسوں کے دودھ کی فوری فروخت کا بندوبست کر لیا گیا تھا۔ یہاں تو دودھ کا ہول سیل کا کاروبار ہوتا تھا۔

کئی دن تک ناصر اور مسعود جنوں کی طرح کام کرتے رہے اور گھر کو ٹھیک ٹھاک کرنے میں لگے رہے۔ صبح سے کام میں لگے لگے رات ہو جاتی اور کام تھا کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتا تھا۔ دونوں ہلکان ہو جاتے تھے لیکن وہ خوش تھے۔ وہ اس لئے خوش تھے کہ ان کی پناہ گاہ ان سے نہیں چھنی تھی۔ وہ لوگ ان سے نہیں چھنے تھے جنہوں نے ان کی دست گیری اور سرپرستی کی تھی۔ انہیں کسی دوسری جگہ دھکے کھانے کے لئے جگہ کی ضرورت نہیں تھی۔

اجڑی ہوئی منتشر زندگی رفتہ رفتہ بحال ہونی شروع ہو گئی تھی۔ بھینسوں کے دودھ کی فروخت کا تو فوراً ہی بندوبست ہو گیا تھا اور یہ کوئی مسئلہ نہیں رہا تھا۔ البتہ دکان دو ہفتے تک بند رہی۔ اس سے پہلے اسے کھولنا ممکن ہی نہیں ہو سکا تھا۔ گھر میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک کرنا تھا اور اس کے بعد ہی مٹھائیاں بنانے کا کام شروع کیا جا سکتا تھا۔ مٹھائیوں کے بغیر صرف دودھ دہی کے لئے دکان کھولنا چنداں منفعت بخش نہیں تھا۔ اتنی دور سے جانا' صرف دودھ دہی کے لئے..... کوئی فائدہ نہیں تھا اور دودھ تو سارا یہاں بھینس کالونی میں ہی فروخت ہو جاتا تھا۔ مٹھائیاں تو اب ناصر اور حنیفہ کو مل کر بنانی تھیں۔ سلیم چاچا نے تو معذرت کر لی تھی۔ وہ بھینس کالونی نہیں آسکتے تھے۔

وہ اب کافی بوڑھے ہو گئے تھے اور بہت زیادہ جسمانی محنت کرنے کے لائق نہیں تھے۔ بینائی بھی روز بروز متاثر ہوتی جا رہی تھی۔ چشمہ تو وہ گزشتہ کئی سال سے لگاتے ہی آرہے تھے لیکن اس کا نمبر اب کافی بڑھ گیا تھا۔



ان لوگوں کے وہاں جانے کے کوئی ایک ہفتے کے بعد سلیم چاچا نے وہاں کا چکر لگایا تھا اور انہیں یہ جگہ بالکل پسند نہیں آئی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ جگہ انسانوں کے رہنے کے لئے قطعی موزوں نہیں ہے انہوں نے خواجہ صابر علی کو مشورہ دیا کہ وہ اس جگہ کو بیچ دے' اور بھینسوں کو بھی..... اور پھر کسی معقول سی جگہ کوئی پلاٹ خرید کر مکان بنوا لے۔

"ارے سلیم چاچا اتنا پیسہ کہاں ہے اپنے پاس؟" خواجہ صابر علی نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "جو اچھی جگہیں ہیں' وہاں ذرا زمین کی قیمتیں تو دیکھو۔ اتنی مہنگی زمین کہ اگر اس کو ہاتھ سے چھو لو تو انگلیاں جل جائیں اور پھر اوپر سے مکان کی تعمیر..... کہاں سے لائیں اتنا پیسہ چاچا۔"

"ارے اور کچھ دنوں کی بات ہے۔" سلیم چاچا نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تمہارا طاہر علی ان شاء اللہ اگلے چند برس میں پڑھ لکھ کر کوئی بڑا افسر بن جائے گا کوئی بڑی اچھی نوکری مل جائے گی اسے اور پھر تم کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اور حنیفہ آرام سے چارپائی پر بیٹھ کر کھانا۔ بیٹا کمائی کرے گا اور تم کو کھلائے گا۔"

"نہیں چاچا!" خواجہ صابر علی نے کہا۔ "ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گا میں تو خدا سے یہی دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے چلتے ہاتھ پیروں اس دنیا سے اٹھائے۔ جب تک زندہ رہوں' میرے ہاتھ پیر سلامت رہیں اور میں تو بس اپنے ہی ہاتھ پیروں کی کمائی کھانا چاہتا ہوں۔ جب سے ہوش سنبھالا ہے اپنی ہی محنت کی کمائی کھاتا چلا آرہا ہوں۔"

"خدا تمہارے ہاتھ پیر سلامت رکھے صابر علی۔" سلیم چاچا نے کہا۔ "اولاد بھی تو ہاتھ پیر ہی ہوتی ہے۔"

سلیم چاچا کو ان لوگوں نے اصرار کر کے کھانے کے لئے روک لیا اور ناصر کو یہ بہت اچھا لگا۔ نئے گھر میں کوئی تو مہمان آیا تھا' اور وہ بھی سلیم چاچا جیسا شخص جس سے ناصر نے مٹھائیاں بنانے کا ہنر سیکھا تھا اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ سیکھا تھا۔ کراچی آنے کے بعد ناصر اور مسعود کتنے ہی لوگوں کے علم اور تجربے کو اپنے وجود کے اندر جذب کرتے چلے گئے تھے جس سے ان کی شخصیتوں کو ایک نیا نکھار حاصل ہوتا گیا تھا۔

حنیفہ اپنے پرانے گھر کو یاد کر کے برابر روتی رہتی تھی' اور ان لوگوں کو کوستی اور بددعائیں دیتی تھی جنہوں نے اس کو دربدر کر دیا تھا۔ اسے نئی جگہ بالکل پسند نہیں آئی

تھی اور اگر اس کا بس چلتا تو وہ ایک دن بھی یہاں نہ رہتی لیکن مجبوری تھی۔ اب تو یہیں رہنا تھا۔ وہ اپنے گولیمار والے گھر کو یاد کرتی تھی' جو اس کے باپ کا گھر تھا اور جہاں اس نے اپنا بچپن اور نوجوانی کے ابتدائی ایام گزارے تھے۔ موجودہ جگہ سے تو وہ پرانا والا مکان ہزار درجہ بہتر تھا۔

"رفتہ رفتہ تم اس کی عادی ہو جاؤ گی اور یہ جگہ تم کو شاید اچھی لگنے لگے۔" خواجہ صابر علی اس کو سنبھالنے کی کوشش کرتا۔ "آدمی جب اپنی پرانی جگہ کو چھوڑ کر کسی نئی جگہ جاتا ہے تو اس کو وہ جگہ فوراً ہی اچھی نہیں لگنے لگتی کافی وقت درکار ہوتا ہے تب کہیں جا کر اس جگہ سے کوئی انسیت پیدا ہوتی ہے۔"

پورے دو ہفتے کے بعد مسعود اور خواجہ صابر علی' آج دکان جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ خواجہ صابر علی اور اس کی بیوی حنیفہ دونوں کو اس بات کا قوی احساس تھا کہ اگر یہ دونوں لڑکے موجود نہ ہوتے تو ان کا کام آسان نہ ہوتا اور انہیں بہت دشواری کا سامنا کرنا پڑتا۔ لے دے کے ایک حامد ان کے ساتھ تھا۔ تو وہ بھلا کتنا کام کر لیتا؟ سلیم چاچا نے تو پہلے ہی کام چھوڑ دیا تھا۔ ان دونوں لڑکوں نے تو کسی مشکل کا احساس ہونے ہی نہیں دیا تھا۔ انہوں نے سارا کام خود سنبھال لیا تھا اور بغیر کہے ہی سارا دن لگے رہتے تھے۔ ایک سال گزر چکا تھا' اس لئے ان کو بہت اچھی طرح سے معلوم تھا کہ کس کام کو کس طرح انجام دیا جانا ہے اور کیا کچھ کرنا ہے۔ انہیں کسی سے کچھ زیادہ پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں تھی اور بہت سے کام تو انہوں نے خود اپنی مرضی سے اور اپنے فیصلے کے مطابق کئے تھے اور خواجہ صابر علی اور حنیفہ نے ان پر اطمینان اور پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔

اس نئے مکان کی بھی جسے مکان سے زیادہ ایک وسیع احاطہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا' تعمیر اس انداز سے ہوئی تھی کہ اس میں دو تقریباً الگ الگ حصے تھے۔ ایک تو باہر کا حصہ تھا' جس میں بھینسوں کا باڑا تھا اور ایک اندرونی حصہ تھا جس کا دروازہ اندر سے بند کر لینے کے بعد اسے بیرونی حصے سے بالکل الگ کیا جا سکتا تھا۔ بیرونی حصے میں بھینسوں کے باڑے کے ساتھ ساتھ حامد اور دونوں لڑکوں کے رہنے کے لئے بھی جگہ بنائی گئی تھی۔ سارا بندوبست تقریباً ویسا ہی تھا جیسا کہ اس سے پہلے تھا۔ ناصر اور مسعود نے حامد کے ساتھ مل کر اپنی جگہ کو بہت اچھا اور صاف ستھرا بنا لیا تھا اور اس میں شک نہیں کہ وہ پہلے والے باڑے کے مقابلے میں زیادہ بہتر تھی۔ اس حصے کی جب تعمیر ہو رہی تھی اسی وقت ان لوگوں نے اپنے لئے کئی سہولتوں کو مدنظر رکھا تھا۔ مٹھائیاں بنانے کے لئے ایک بالکل



الگ کمرے کو مخصوص کر دیا گیا تھا۔ اگرچہ یہ چھوٹا تھا' لیکن اس میں اس کام کے لئے ضرورت کی ہر چیز فراہم کی گئی تھی۔ اس کمرے کو ناصر نے حنیفہ کے ساتھ مل کر تیار کیا تھا اور ان دونوں نے ہی اس کو سارے ضروری ساز و سامان سے لیس کیا تھا۔

گزشتہ روز یہاں مٹھائیاں بنانے کا کام شروع کر دیا گیا تھا۔ کل حنیفہ اور ناصر نے مل کر پہلی بار یہاں تھوڑی سی مٹھائیاں بنائیں۔ خواجہ صابر علی نے ان سے کہہ دیا تھا کہ مٹھائیاں تھوڑی تھوڑی سی ہی بنائیں زیادہ نہیں۔ کیونکہ کل دو ہفتے کے بعد دکان کھلے گی اور کافی وقت تو اس کی صفائی وغیرہ میں لگ جائے گا۔ اس کے بعد ہی دکان میں مٹھائیاں رکھی جا سکیں گی اور پھر گاہک تو پچھلے پندرہ دن سے دکان کو بند دیکھ رہے تھے۔ انہیں دکان کو کھلا دیکھنے میں بھی کچھ وقت لگے گا۔

سوزوکی کوئی صبح کے آٹھ بجے کے قریب ہی روانہ ہو سکی اس سے پہلے نہیں۔ بہت سارے کام کرنے تھے۔ اب تو ہر چیز کا آغاز نئے سرے سے ہو رہا تھا۔

پورے دو ہفتے کے بعد مسعود اور خواجہ صابر علی سوزوکی میں بیٹھے ہوئے دکان کی طرف جا رہے تھے۔ منزل تو وہی پرانی تھی' لیکن آغاز سفر کا مقام بدل گیا تھا' راستہ بدل گیا تھا۔

بھینس کالونی سے نکلنے کے تھوڑی دیر کے بعد وہ لوگ قومی شاہراہ پر آ گئے اور شہر کی طرف مڑ گئے۔ صبح کا وقت تھا اور نیشنل ہائی وے پر ٹریفک ابھی بہت زیادہ نہیں تھا۔ خواجہ صابر علی نے گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی۔

"چاچا جی۔ آپ مجھے ڈرائیونگ سکھا دیجئے۔" مسعود نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "پھر میں گاڑی چلایا کروں گا اور آپ آرام سے بیٹھے رہئے گا۔ اب تو راستہ بھی بہت لمبا ہو گیا ہے۔"

"ڈرائیونگ تو میں تم کو سکھا سکتا ہوں اور تم سیکھ بھی سکتے ہو۔" خواجہ صابر نے کہا۔ "لیکن تم ابھی سڑک پر گاڑی نہیں چلا سکتے۔ تمہارا ڈرائیونگ لائسنس ابھی نہیں بنے گا' کیونکہ تم کم عمر ہو۔ ویسے میں تمہیں ڈرائیونگ سکھا دوں گا۔ گھر کے آس پاس کے علاقے میں کسی ہنگامی ضرورت کے وقت تم گاڑی چلا سکو گے۔ میرے اور طاہر کے علاوہ اگر تم بھی گاڑی چلا سکو تو یہ بہت اچھا ہے۔"

مسعود کے دل میں اضطراب کی لہریں اٹھنے لگیں۔ یہ ایک بہت بڑی خبر تھی کہ چاچا اس کو گاڑی چلانا سکھانے والے تھے۔ وہ گاڑی چلا سکے گا۔ سچ مچ کی گاڑی..... اف

خدا..... کاش اس وقت ناصر بھی یہاں موجود ہوتا اور اپنے کانوں سے وہ سب کچھ سنتا جو صابر چاچا کہہ رہے تھے۔

"میں تو بہت جلدی ڈرائیونگ سیکھ لوں گا۔" مسعود نے دل ہی دل میں کہا۔ "مجھے شوق ہے گاڑی چلانے کا۔ میں گاڑی چلانا چاہتا ہوں۔ بہت جلد ہی سیکھ جاؤں گا اور پھر میں شہر کی سڑکوں پر گاڑی چلاؤں گا....."

اچانک وہ اپنے خیالات سے چونک پڑا۔ ان لوگوں نے بہت لمبا راستہ طے کر لیا تھا اور راشد منہاس روڈ سے گزر کر اب وہ نارتھ ناظم آباد کی طرف جا رہے تھے۔ فوراً ہی اس کو یہ احساس ہوا کہ پٹرول پمپ جانے کے لئے اگر لالو کھیت والا راستہ اختیار کیا جاتا تو زیادہ بہتر تھا لیکن صابر چاچا تو نارتھ ناظم آباد کی طرف جا رہے تھے۔

"چاچا..... اس طرف سے....."

"ہاں بیٹا" صابر علی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "دکان پر جانے سے پہلے ذرا ایک نظر اس اجڑے ہوئے دیار کو بھی دیکھ لیں۔" اس کی آواز میں گہری اداسی تھی۔ "جانے ظالموں نے اس جگہ کا کیا حشر کیا ہو گا۔ ہم تو جب سے وہاں سے نکلے ہیں تب سے ہم نے اس طرف کا رخ بھی نہیں کیا۔"

"اچھا۔ ہاں!" مسعود نے فوراً جلدی سے کہا۔ "ہاں چاچا' ضرور چلئے۔ دیکھیں تو ہمارا مکان اب کس حال میں ہے۔ چاچی تو بہت کہہ رہی تھی کہ وہ ایک بار وہاں ضرور آئیں گی....."

"میں ان لوگوں کو وہاں ابھی نہیں لے جانا چاہتا۔" صابر علی نے کہا۔ "جو کچھ وہاں دیکھیں گی اس سے ان کو دلی افسوس ہو گا اور میں ان کو مزید رنج نہیں دینا چاہتا۔ ان دنوں انہوں نے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ اب ایک انسان پر دکھوں کا اور کتنا بوجھ ہو گا....."

سوزوکی نارتھ ناظم آباد کی طرف بھاگی چلی جا رہی تھی اور خواجہ صابر علی بولتے بولتے خاموش ہو گیا تھا۔ مسعود بھی خاموش تھا۔ وہ دونوں اپنے اپنے خیالات میں گم تھے سب کے اپنے اپنے دکھ!

اس کے ذرا دیر کے بعد سوزوکی رک گئی۔ خواجہ صابر علی نے سوزوکی کو اپنے پرانے مکان سے کچھ فاصلے پر ہی روک لیا تھا۔ یہ فاصلہ اتنا تھا کہ یہاں سے وہ اپنے سابقہ مکان کو باآسانی دیکھ سکتا تھا۔



وہ مکان' جس کے ساتھ اس کی زندگی کے بہترین دن وابستہ تھے' وہ مکان' جس کے مسعود اور ناصر کی بھی اب تک کی زندگی کے بہترین دن وابستہ تھے۔ بڑی تیزی کے ملبے کے ایک ڈھیر میں تبدیل ہو رہا تھا۔ تقریباً آدھے سے زیادہ مکان کو ڈھایا جا چکا اور باقی آدھے کو ڈھایا جا رہا تھا اس وقت بھی مزدور لگے ہوئے تھے اور ان کے بھاری ہتھوڑوں کی آواز فضا میں گونج رہی تھی' سیمنٹ ملی ہوئی ریت کے چھوٹے اور بڑے ٹکڑے ٹوٹ کر زمین پر گر رہے تھے۔ دو ٹرک ملبے کے قریب کھڑے ہوئے تھے اور مزدور ملبہ اٹھا اٹھا کر ان میں بھر رہے تھے۔

"یہ ملبہ کبھی میرا گھر تھا۔ میرا گوشہ عافیت جسے یہ لوگ اب ٹرکوں میں ڈال کر یہاں لے جائیں گے اور کہیں ڈال دیں گے۔ یہ کسی جگہ بھرائی کے کام آجائے گا۔ میرا میرا ٹوٹا ہوا گھر کسی دوسرے بستے ہوئے گھر کی بنیاد میں بھری جانے والی مٹی' سب مٹی ہے۔" اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

مسعود درد آگیں اور حسرت آمیز نظروں سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ مکان ٹوٹ چکا اور ٹوٹ رہا تھا۔ ہتھوڑے چل رہے تھے اور مٹی ٹوٹ ٹوٹ کر' جھڑ جھڑ کر' نیچے مٹی میں مل رہی تھی' مٹی میں مل رہی تھی۔ کیا ہوتا ہے مکان؟ بس مٹی ہی نا! وہ جب سیالکوٹ تھا تو مٹی سے اینٹیں بناتا تھا اور پھر ان اینٹوں سے مکانات بنتے تھے۔ بڑے بڑے عالی شان مکانات' پُرشکوہ بنگلے اور کوٹھیاں' بلند و بالا حویلیاں.....انہی اینٹوں سے تو بنتے تھے مٹی سے اور پھر ایک دن مٹی میں ہی مل جاتے تھے۔ مسعود جب کراچی آیا تو اس نے یہاں نہ بھٹے دیکھے نہ اینٹیں۔ یہاں تو بلاکوں سے مکانات بنائے جاتے تھے اور بلاک بنانے میں سیمنٹ ملا کر بنائے جاتے تھے۔ کیسی کیسی اونچی' کثیرالمنزلہ عمارتیں اسی طریقے سے بنی ہوئی نظر آتی تھیں۔ یہی ریتی بھی تو مٹی ہی تھی۔ سب کچھ مٹی تھا اور یہ مٹی جب ایک گھر کی صورت اختیار کر لیتی تھی تو اس میں جیسے جان پڑ جاتی تھی۔ وہ سانس لینے لگتی تھی۔ ہر وہ گھر جس میں انسان رہتے تھے وہ زندہ مٹی تھا اور انسانوں سے خالی گھر مردہ مٹی۔

"سب توڑ دیا۔" اچانک خواجہ صابر علی کی ہلکی سی آواز سن کر مسعود اپنے خیالوں سے چونک پڑا۔ ایک ٹرک جس میں اوپر تک ملبہ بھرا جا چکا تھا وہاں سے روانہ ہو رہا تھا دوسرے ٹرک میں ابھی ملبہ بھرنے کا کام جاری تھا۔

"ہاں چاچا جی۔" مسعود کی زبان سے نکلا۔ "سب توڑ دیا۔ ملبہ صاف کر رہے ہیں۔

نئی عمارت بنانے کی تیاری کر رہے ہیں۔"

خواجہ صابر علی کچھ دیر تک خاموشی سے اپنے گھر کو مرتے ہوئے، دم توڑتے ہوئے، آخری سانسیں لیتے ہوئے دیکھتا رہا اور پھر اس نے سوزوکی اسٹارٹ کی اور وہاں سے چل پڑا۔ وہ گھر کے پاس نہیں رکا اور نہ ہی اس نے کسی پڑوسی سے ملاقات کرنا مناسب سمجھا۔

وہاں سے روانہ ہو کر دونوں دکان پر پہنچے جہاں لگے ہوئے تالوں پر مٹی جم گئی تھی۔ آس پاس سب کچھ ویسا ہی تھا۔ کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔

آس پاس کے دکانداروں کو خواجہ صابر علی کی پریشانی کا علم تھا وہ جانتے تھے کہ اس سے اس کا گھر چھینا جا رہا ہے اس لئے دو ہفتے تک اس کی دکان کے بند رہنے سے کسی کو غیر معمولی تشویش لاحق نہیں ہوئی تھی۔ تاہم یہ تجسس ضرور تھا کہ اب کیا ہو رہا ہے۔

دکان کھلنے سے پہلے ہی بعض پڑوسی دکانداروں نے خواجہ صابر علی کے پاس آکر اس سے اس کی خیریت دریافت کی۔ اکثر کو یہ بات معلوم تھی کہ اس کو بھینس کالونی میں جگہ ملی ہے اور وہ اپنے خاندان کے ساتھ وہی منتقل ہونے والا تھا۔

"بہت دور چلے گئے صابر علی۔" ایک دکاندار نے اس سے باتیں کرتے ہوئے کہا۔ "دکان آنے جانے میں کافی وقت لگ جایا کرے گا۔"

"مجبوری ہے بھائی ابرار حسین!" خواجہ صابر علی نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "کسی اور کچی بستی میں ہم اس لئے نہیں گئے کہ کچھ عرصے کے بعد پھر کوئی وہاں سے لات مار کر نکالے تو کیا فائدہ۔ اب یہ جگہ تو سرکار نے خود ہی ہمیں الاٹ کر دی ہے۔ ہماری اپنی جگہ ہے۔ بری بھلی، دور یا نزدیک۔ جیسی بھی ہے۔ اپنی تو ہے۔"

"ہاں یہ بات تو درست ہے۔" دکاندار ابرار حسین نے کہا۔ "بس جی خدا خوش رکھے۔ کاروبار چلتا رہے۔"

مسعود نے دکان کھول کر اس کی صفائی شروع کی۔ سوزوکی میں سامان بھی اسی طرح رکھا ہوا تھا۔ دکان کے اندر ہر چیز گرد میں اٹی ہوئی تھی۔ خواجہ صابر علی خود بھی مسعود کی مدد کرنے لگا لیکن زیادہ تر کام مسعود نے خود ہی کیا۔ تقریباً ایک گھنٹے میں جا کر دکان اس قابل ہو سکی کہ اس میں تازہ سامان رکھا جا سکے اور تب مسعود نے مٹھائیوں کے تھال سوزوکی میں سے نکال نکال کر وہاں رکھنے شروع کئے۔

فوراً ہی ایک گاہک دودھ لینے کے لئے آگیا لیکن دودھ آج نہیں تھا۔ آج تو وہ لوگ کافی دیر سے آئے تھے۔



"کل سے ملے گا۔" خواجہ صابر علی نے گاہک سے کہا۔ "کل سے دکان باقاعدگی سے ملے گی اور دودھ دہی سب کچھ ملے گا۔ آج تو ہم لوگ دیر سے آئے ہیں۔"

جتنی مٹھائی وہ لوگ اپنے ساتھ لے کر آئے تھے رات تک تقریباً ساری ختم ہو گئی۔ ن بند کرنے کا وقت آیا۔ سارے دن کی بکری اچھی رہی تھی۔

دکان وہی تھی، علاقہ وہی تھا، لوگ وہی تھے، لیکن مسعود کو بہت کچھ بدلا بدلا سا لگ ا تھا۔ دکان سے واپس نارتھ ناظم آباد نہیں جانا تھا۔ نارتھ ناظم آباد میں ان کا کوئی مکان ں تھا۔ اب لانڈھی سے آگے بھینس کالونی جانا تھا۔ آج دکان سے وہاں جانے کا پہلا دن

گھر پہنچتے پہنچتے کافی رات ہو گئی تھی۔ بہت طویل راستہ تھا اور پھر قومی شاہراہ کا ناک ٹریفک..... جگہ جگہ ٹریفک جام..... خواجہ صابر علی گھر پہنچا تو وہ خود کو کافی کا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ بہت لمبی اور اعصاب شکن ڈرائیو کرنی پڑی تھی جس نے اس کو ان کر دیا تھا۔

اس نے رات کے کھانے کے بعد حنیفہ کو بتایا کہ وہ پرانے مکان کی طرف گیا تھا۔ ہ آدھے سے زیادہ توڑا جا چکا تھا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "جو باقی بچا ہے، وہ بھی گلے چند دن میں ٹوٹ جائے گا۔"

حنیفہ کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے کسی عزیز کے مرنے کی خبر سن رہی ہو۔ اس کا یکبارگی اس تازہ صدمے سے بوجھل ہو گیا۔ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اس طرح ہو گا۔ ا کے گھر کو یوں بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا جائے گا لیکن اب تو وہ قتل ہو چکا تھا، ل ہو رہا تھا اور وہ اس کے خون کے چھینٹوں کو دور تک بکھرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

اگلے دن مسعود اور صابر علی صبح صبح روانہ ہو گئے۔ آج وہ پہلے کی طرح تقریباً سارے ہی ساز و سامان سے لیس تھے۔ سوزوکی میں مٹھائیوں کے تھالوں کے علاوہ، دودھ کے برتن تھے اور دہی کے کونڈے بھی۔ زندگی نے اپنا نیا راستہ تلاش کر لیا تھا اور ہر چیز یکبار پھر، بعض تبدیلیوں کے ساتھ، اپنی پرانی حالت پر واپس آگئی تھی۔

اس روز دکان پر سلیم چاچا آئے اور انہوں نے کہا کہ لانڈھی آنا تو ان کے لئے ت مشکل ہے لیکن ملنے کو جی چاہ رہا تھا اس لئے وہ دکان پر آگئے۔ خواجہ صابر علی اور سعود دونوں ان کی آمد پر بہت خوش ہوئے۔ سلیم چاچا سے کافی دنوں کے بعد ملاقات ئی تھی۔

"روزانہ اتنا لمبا سفر کر کے' اتنا بہت سا پٹرول پھونک کر' یہاں آتے جاتے ہو۔" گفتگو کے دوران سلیم چاچا نے خواجہ صابر علی سے کہا۔ "کسی قریبی علاقے میں دکان کیوں نہیں لے لیتے؟ مٹھائی کی دکان تو ہر جگہ چلے گی' دکان قریب ہو گی تو خرچہ کم ہو گا اور آمدنی زیادہ....."

سلیم چاچا نے جو کچھ کہا تھا' وہ اس سے پہلے بھی دو ایک بار خواجہ صابر علی کے ذہن میں تھا صبح و شام کی طویل ڈرائیونگ اور پیٹرول کے خرچے کے علاوہ کس قدر وقت لگ جاتا تھا زندگی میں دشواریاں پہلے ہی کچھ کم نہیں تھیں اب ان میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا لیکن اس نے اپنے اس خیال کے بارے میں کسی سے گفتگو نہیں کی تھی۔ حنیفہ کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا اب سلیم چاچا نے بھی وہی بات کہی تو اس کو اپنے اس خیال میں کافی وزن محسوس ہونے لگا۔

"تمہارا کیا خیال ہے مسعود؟" سلیم چاچا کے چلے جانے کے بعد اس نے مسعود سے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ سلیم چاچا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" مسعود نے گہری سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔ "پہلے ہی دکان ہمارے گھر سے کافی دور تھی اور اب تو بہت ہی زیادہ دور ہو گئی ہے۔"

"برسوں پرانی دکان ہے۔" خواجہ صابر علی نے غمزدہ آواز میں کہا۔ "سارا محلہ جانتا ہے' یہاں کے گھروں کے بچے میری نظروں کے سامنے جوان ہو گئے اور جوان ادھیڑ اور ادھیڑ بوڑھے ہو گئے' کبھی خیال بھی نہیں آتا تھا کہ ہمیں اتنی دور سے آنا پڑتا ہے' دکان اور گھر دونوں بس ایک ہی جیسے لگتے تھے لیکن اب ایسا نہیں لگتا ہے' اب فاصلہ بہت زیادہ ہو چکا ہے۔"

"بس تو چاچا جی اس طرف کوئی دکان تلاش کر لی جائے اور اس دکان کو فروخت کر دیا جائے۔" مسعود نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ مشورہ دیا۔

"رات کو تمہاری چاچی سے بات کروں گا۔" خواجہ صابر علی نے کہا۔ رات کو خواجہ صابر علی نے اپنی بیوی سے اس مسئلے پر بات کی اور اس نے فوراً ہی اس خیال سے اتفاق کیا چنانچہ یہ بات طے ہو گئی کہ ناظم آباد والی دکان کو فروخت کر دیا جائے گا اور کسی قریبی علاقے میں ایک دکان خرید لی جائے گی۔

دونوں کام ایک ساتھ شروع کر دیئے گئے۔ پرانی دکان کے لئے کسی گاہک کی تلاش



قریبی علاقے میں کسی نئی دکان کی تلاش..... پرانی دکان کی فروخت کے لئے تو خواجہ صابر علی نے اسی علاقے کے ایک پراپرٹی ڈیلر کی خدمات حاصل کیں جسے وہ پہلے بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ موقع کی چلتی ہوئی دکان تھی دو ہفتے کے اندر اندر ہی اس کا سودا ہو گیا وہ اچھے داموں بک گئی۔

جس وقت خواجہ صابر علی نے دکان کی چابیاں اس کے نئے مالک کے حوالے کیں' ان کو ایسا لگ جیسے اس پرانی' محبوب اور پسندیدہ دنیا سے اس کا رشتہ ہمیشہ کے لئے ٹوٹ رہا ہے ایک مرحلہ تھا زندگی کا جو گزر چکا ہے زندگی کے جس باب کا آغاز گولی مار سے ہوا تھا ناظم آباد اور نارتھ ناظم آباد کے پیچ و خم سے گزرتا ہوا بالآخر اپنے اختتام کو پہنچ چکا تھا۔

دکان ختم ہو گئی تھی اور دوسری دکان کا ابھی تک بندوبست نہیں ہو پایا تھا۔ خواجہ صابر علی نے آس پاس کے علاقے میں کئی دکانیں دیکھی تھیں لیکن ابھی تک اسے کوئی پسند نہیں آئی تھی بہرحال تلاش جاری تھی مٹھائیاں بنانے کا کام فی الحال رکا ہوا تھا حامد کے علاوہ باقی سب لوگوں کی مصروفیات میں کمی واقع ہو گئی تھی حامد کو بدستور کام سنبھالنا پڑ رہا تھا۔

خواجہ صابر علی چاہتا تھا کہ نئی دکان کا سلسلہ جلد سے جلد شروع ہو جائے کیونکہ جتنے دن گزر رہے تھے' وہ اس کو خسارے سے دوچار کر رہے تھے ہر گزرنے والا دن نقصان کا دن تھا۔

بالآخر اس کو ایک دکان پسند آ گئی جو ان لوگوں کے علاقے کے قریب ہی واقع تھی۔ نفع کی اچھی چلتی ہوئی دکان تھی پہلے وہاں ایک ڈاکٹر کا کلینک تھا لیکن ڈاکٹر اب ملک سے جا رہا تھا اس نے دوائیں وغیرہ تو پہلے ہی فروخت کر دی تھیں اور اب وہ دکان بھی فروخت کرنا چاہتا تھا' بازار میں مناسب جگہ پر دکان تھی' خواجہ صابر علی نے اپنی بیوی' حامد' مسعود اور ناصر کو بھی دکھائی۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ سب لوگ ایک ہی خاندان کے ہوں۔ سب ہی لوگوں نے اس دکان کو پسند کیا۔ خواجہ صابر علی نے اس دکان کو خرید اور ڈاکٹر کو رقم ادا کر دی۔ دکان میں صابر علی نے اپنا تالا ڈال دیا۔ کاغذات وغیرہ کی تکمیل طور پر عمل میں آ چکی تھی۔

خواجہ صابر علی بہت خوش تھا۔ دکان' گھر کے قریب ہی مل گئی تھی اور یہ امید کی جا رہی تھی کہ وہ کافی چلے گی۔ جس گلی میں یہ دکان واقع تھی' اس میں دودھ' دہی یا مٹھائی کی دکان اور دوسری دکان موجود نہیں تھی اس سے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ یہ دکان چلے

گی کم از کم اس گلی کے سارے لوگ تو اس دکان کے گاہک بن ہی جاتے دو گلیاں چھوڑ کر تیسری گلی میں البتہ مٹھائی کی ایک کافی بڑی دکان تھی یہاں مٹھائی کے علاوہ دودھ' دہی' لسی' انڈے' ڈبل روٹی' بسکٹ وغیرہ بھی فروخت کئے جاتے تھے۔

اس دکان کا مالک بشیر پہلوان تھا اور وہ سچ مچ کا پہلوان تھا۔ بشیر پہلوان کے چار بھائی اور بھی تھے جن میں سے دو اس دکان میں کام کرتے تھے ان کے نام سمیع اور بلال تھے دوسرے دو بھائی رفیق اور ظہیر تھے سوہ ذبیحہ کے لئے گائیوں اور بھینسوں کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتے تھے۔ پانچوں بھائی جن کا آبائی شہر سرگودھا تھا' یہاں ایک بڑے سے مکان میں ایک ساتھ رہتے تھے اور ان کی بیویاں اور بچے بھی ساتھ رہتے تھے۔

بشیر پہلوان کے وہ دونوں بھائی بھی جو اس کے ساتھ مٹھائی اور دودھ دہی کی دکان پر بیٹھتے تھے' اچھے خاصے پہلوان تھے لیکن پہلوان کی حیثیت سے مشہور صرف بشیر ہی تھا یہ تو کسی کو نہیں معلوم تھا کہ بشیر اور اس کے دونوں چھوٹے بھائی کتنی کشتیاں جیت چکے تھے اور یہ کہ آیا وہ باضابطہ قسم کے پہلوان تھے یا نہیں..... بہر حال وہ علاقے بھر میں بشیر پہلوان مشہور تھا۔

خواجہ صابر علی نے دکان کو خریدنے کے فوراً بعد اس کی صفائی ستھرائی کا کام شروع کروا دیا۔ مسعود اتنے دنوں سے تقریباً خالی تھا اور ناصر کے پاس بھی کام زیادہ نہیں تھا کیونکہ نہ تو دکان تھی اور نہ مٹھائیاں تھیں' وہ دونوں دکان کی صفائی میں جت گئے اور دونوں نے ایک دن کے اندر اندر اس کو جھاڑ پونچھ کر بالکل صاف ستھرا کر دیا۔ اس کے پکے فرش اور دیواروں کو جن پر جابجا طرح طرح کی دواؤں کے دھبے لگے ہوئے تھے' صابن سے دھو کر بالکل صاف ستھرا کر دیا۔ دکان کے اندر دواؤں کی بو بسی ہوئی تھی اس کو دور کرنے کے لئے اس میں لوبان اور اگربتیاں سلگا دی گئیں۔ آخر کھانے پینے کی چیزوں کی دکان تھی اس کو زیادہ سے زیادہ صاف ستھرا ہونا چاہئے تھا۔

ایک پینٹر سے ایک بورڈ لکھوایا گیا "صابر سویٹ مارٹ" اور اسے دکان کی پیشانی پر آویزاں کر دیا گیا دکان کے افتتاح میں ابھی چند روز باقی تھے کیونکہ الماریاں اور شوکیس وغیرہ تیار ہو رہے تھے پرانی دکان کا سامان تو پہلے ہی فروخت کر دیا گیا تھا اب نئی دکان کے لئے نیا سامان نئی ضروریات کے مطابق تیار کرایا جا رہا تھا۔

جس دن دکان کی پیشانی پر بورڈ لگایا گیا' اس سے اگلی صبح کو ان لوگوں نے دیکھا کہ رات کو کسی نے بورڈ پر کئی جگہ کالا رنگ پھر دیا تھا۔



"نہ جانے کس کمینے کی شرارت ہے۔" خواجہ صابر علی نے غصے کے ساتھ کہا۔ "اچھے خاصے بورڈ کا ستیاناس کر دیا اب سارے کا سارا پھر سے لکھوانا پڑے گا۔"

"لیکن کسی نے ایسا کیوں کیا؟" مسعود نے پریشانی کے ساتھ کہا۔ "یہاں آخر اور دکانیں بھی تو ہیں اس سے پہلے یہاں ڈاکٹر کے کلینک کا بورڈ لگا ہوا تھا اس کو تو کسی نے نقصان نہیں پہنچایا۔"

"کیا کہہ سکتے ہیں۔" طاہر علی نے اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "نیا علاقہ ہے' نئے لوگ ہیں..... ہم لوگوں کو تو یہاں آئے ہوئے ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں' ہم تو یہاں کے سارے لوگوں کو اچھی طرح سے جانتے بھی نہیں ہیں۔"

بورڈ اتار لیا گیا اور اسے ٹھیک کرنے کے لئے دوبارہ پینٹر کے حوالے کر دیا گیا چند روز کے اندر اندر دکان میں سارا ضروری ساز و سامان فراہم کر دیا گیا اور ایک دن جمعے کی نماز کے بعد مقامی مسجد کے مولوی صاحب کے ہاتھوں اس دکان کا افتتاح ہوا۔ مولوی صاحب نے دعا کرائی اور نذرانے کے طور پر دو سو روپے نقد اور ایک کلو مٹھائی کا ایک ڈبہ وصول کیا۔ دکان شروع ہو گئی پہلے کی طرح خواجہ صابر علی اور مسعود دکان پر بیٹھنے لگے گھر میں مٹھائیوں کی تیاریوں کا کام زور و شور سے شروع ہو گیا۔ ناصر اور حنیفہ ایک بار پھر پہلے کی طرح مصروف ہو گئے۔

اس وقت تک ان دونوں کو کراچی آئے ہوئے تقریباً ڈیڑھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا پچھلے دنوں کاروباری مشکلات اور مالی پریشانیوں کے باوجود خواجہ صابر علی نے ان دونوں کی تنخواہ نہیں روکی تھی اور ان دونوں کو ہر ماہ برابر ایک ایک ہزار روپے ملتے رہے تھے جنہیں وہ حنیفہ کے پاس جمع کراتے رہے تھے۔

ناصر کے پاس تو سال ختم ہونے پر ہی دس ہزار روپے جمع ہو چکے تھے اور وہ اپنے گھر جا سکتا تھا لیکن مسعود کو تو پندرہ ہزار روپے چاہئے تھے اور اسے ابھی کچھ اور رکنا تھا چنانچہ ان دونوں نے طے کیا تھا کہ وہ اکٹھے ہی اسی وقت واپس اپنے گھر جائیں گے جب مسعود کے پاس بھی پوری رقم جمع ہو جائے گی اور اب مسعود کے پاس بھی رقم تقریباً پوری ہو چکی تھی اور اگلے مہینے وہ دونوں اپنے گھر جا سکتے تھے وہ دونوں اس بات سے بہت خوش تھے کہ سارے معاملات کسی نہ کسی طرح ٹھیک ٹھاک ہو گئے تھے اور صابر چاچا کا کاروبار اب پھر چلنے لگا تھا' بھینسیں ٹھیک ٹھاک تھیں اور دودھ کی فروخت کا کوئی مسئلہ نہیں تھا' سارا دودھ بک جاتا تھا اور اب تو مٹھائی کی دکان بھی شروع ہو گئی تھی' پرانی دکان کی جگہ نئی

دکان قائم ہوگئی تھی یہاں تک آنے جانے کے لئے ہولناک سفر کرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ صابر علی نے مسعود کو ڈرائیونگ سکھانی بھی شروع کردی تھی جب تک دکان شروع نہیں ہوئی تھی' اس وقت تک تو وہ دن میں ہی اس کو ایک دو گھنٹے کے لئے گاڑی چلانا سکھاتا تھا لیکن اب جبکہ دکان شروع ہوگئی تھی تو وہ رات کے وقت کچھ دیر تک اس کو ڈرائیونگ سکھا رہا تھا۔

"بس اب انشاء اللہ اگلے مہینے گھر چلیں گے۔" دکان کے افتتاح والے دن ناصر نے رات کے وقت مسعود سے کہا۔ "اب تو تمہارے پیسے بھی پورے ہو رہے ہیں بلکہ میرے پاس تو اب زیادہ پیسے جمع ہو چکے ہیں تمہارے پاس جو بھی کمی ہے' وہ تم میرے پیسوں سے پوری کرسکتے ہو۔"

"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" مسعود نے کہا۔ "تقریباً پورے ہی ہو چکے ہیں بس اگلے مہینے گھر چلیں گے اور وہاں زیادہ دن رکیں گے نہیں' یہاں صابر چاچا کو کافی تکلیف ہوجائے گی ہمارے دم سے تو ان کا سارا کاروبار چل رہا ہے ہم چلے جائیں گے تو ان کے لئے اکیلے سب کچھ سنبھالنا دشوار ہوجائے گا۔"

"بس ایک بار گھر ہو آئیں۔" ناصر نے بڑی گہری آرزو مندی کے ساتھ کہا۔ "ڈیڑھ سال ہوگیا گھر سے نکلے ہوئے..... نہ جانے سب لوگ کیسے ہوں گے' اماں تو مجھے بہت یاد کرتی ہوں گی اور بہت ناراض بھی ہوں گی' سب ہی یاد کرتے ہوں گے' آپا بھی یاد کرتی ہوں گی' اور ناراض بھی ہوں گی۔ خیر' جب میں وہاں پہنچ جاؤں گا ان لوگوں کے پاس' تو ان سب کی ناراضگی دور ہوجائے گی' حاجی کے پیسے اس کے حوالے کروں گا پھر کسی بات کا ڈر نہیں رہے گا۔"

"میں بھی پیسے ابا کے ہاتھ پر رکھوں گا اور ان سے کہوں گا کہ اب میں آزاد ہوں۔" مسعود نے کہا۔ "اور پھر میں واپس کراچی آجاؤں گا بس' مجھ کو تو یہاں سے کہیں اور جانا ہی نہیں ہے میں تو پہلے ہی فیصلہ کرچکا ہوں کہ اب میں کراچی میں ہی رہوں گا۔"

"اور میں بھی۔" ناصر نے فوراً کہا۔ "میں بھی اب وہاں نہیں رہوں گا..... ایک بار گھر سے ہو کر واپس آجاؤں پھر تو کسی نہ کسی ذریعے سے برابر پیسے بھیجتا رہوں گا۔"

"ابھی تو تم کافی چھوٹے ہو اور ظاہر ہے اسی لحاظ سے تمہاری تنخواہ بھی کم ہے۔" مسعود نے کہا۔ "لیکن چند برسوں کے بعد جب زیادہ کمائی کرنے کے قابل ہوجاؤ گے تو پھر اپنے گھر والوں کو بھی کراچی بلوانے کی کوشش کرنا' جنت کی تو تب تک شادی ہوچکی ہوگی'



اماں کو اور چھوٹی بہنوں کو کراچی لے آنا مگر یہ تب ہی ممکن ہوسکے گا جب تم کم از کم تین چار ہزار روپے ماہانہ کمانے لگو' ان لوگوں کے لئے الگ مکان کی ضرورت ہوگی' اس کا کرایہ بھی دینا ہوگا۔"

"میں خود بھی یہی سوچتا ہوں۔" ناصر نے کہا۔ "لیکن ابھی اس میں کافی وقت لگے گا' سب سے بڑا مسئلہ تو مکان کا ہے۔"

دونوں بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ناصر جلد از جلد گھر جانے کے لئے بیتاب تھا اور اسے گھر کی یاد بھی بہت آتی تھی' مسعود میں اس معاملے میں جوش و خروش کی کمی تھی وہاں ایک باپ کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا جسے وہ پوری طرح اپنا سمجھے۔

دکان جس دن سے شروع ہوئی' اس دن سے وہ اچھی طرح چلنے لگی پہلے ہی دن کی بکری بڑی حوصلہ افزا رہی' خواجہ صابر علی کو تو اس بات کا ٹھیک سے اندازہ بھی نہیں تھا کہ یہاں بکری کیسی رہے گی۔ اس نے اس علاقے میں کبھی دکانداری کی ہی نہیں تھی اور نہ یہاں کا اس کا کوئی تجربہ تھا۔ البتہ بشیر پہلوان کی دکان کو وہ اکثر دیکھتا تھا کہ خوب چلتی تھی اور وہاں ہمیشہ گاہک موجود رہتے تھے چونکہ اس پورے علاقے میں وہ مٹھائی کی واحد دکان تھی' اس لئے وہاں گاہکوں کی خاصی بڑی تعداد موجود رہتی تھی۔

اگلے دن صبح سے ہی دکان میں گاہکوں کی آمدورفت شروع ہوگئی اور آج کے دن کے لئے جتنی بھی مٹھائیاں بنائی گئی تھیں' وہ زیادہ تر ختم ہوگئیں۔ خواجہ صابر علی نے احتیاط کے طور پر کم ہی مٹھائیاں بنوائی تھیں تاکہ وہ باسی ہوکر خراب نہ ہوں اور خریداروں کو زیادہ تر تازہ مٹھائیاں مل سکیں۔ خواجہ صابر علی کو اس بات کا تو علم نہیں تھا کہ بشیر پہلوان کی دکان کی بکری کس حد تک متاثر ہوئی ہے' لیکن وہ یہ ضرور دیکھ رہا تھا کہ اس کی اپنی دکان میں مال وقت سے پہلے ہی ختم ہوگیا تھا۔

اس رات اگلے دن کے لئے زیادہ مٹھائیاں بنوائی گئیں گھر کے سارے ہی لوگ بہت خوش تھے اور ناصر کو تو اس بات کی بھی خوشی تھی کہ اس کے ہاتھ کی بنائی ہوئی مٹھائیاں پسند کی جارہی ہیں' بک رہی ہیں وہ تو اب حنیفہ کے ساتھ مل کر ایک مکمل کاریگر کے طور پر مٹھائیاں بنا رہا تھا۔

"اگلے مہینے میں اور ناصر کچھ دنوں کے لئے گھر جائیں گے۔" اس روز رات کو مسعود نے خواجہ صابر علی سے اس وقت کہا جب حنیفہ بھی اس کے پاس موجود تھی۔ "لیکن ہم زیادہ رکیں گے نہیں' بس چند دن رک کر واپس آجائیں گے اصل کام تو یہ

ہے کہ ہم اپنے گھر والوں کو پیسے پہنچا دیں۔"

"ہاں..... تمہیں گھر سے آئے ہوئے کوئی ڈیڑھ سال کا عرصہ تو ہو ہی گیا۔" صابر علی نے کہا۔ "اور تم نے شاید ایک خط کے بعد دوسرا خط بھی وہاں نہیں بھیجا۔"

"خط تو اس لئے نہیں بھیجا چاچا جی کہ ہم خود ہی جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔" مسعود نے کہا۔ "بس مجھے رقم پوری کرنی تھی اس وجہ سے ہم لوگ رکے ہوئے تھے اب رقم پوری ہو رہی ہے تو ہم لوگ جانا چاہتے ہیں۔"

"لیکن واپس تو آؤ گے نا؟" حنیفہ نے جلدی سے کہا۔ "ایسا تو نہیں ہے کہ پھر تم دونوں وہیں کے ہو رہو۔"

"ارے نہیں چاچی۔" مسعود نے جلدی سے کہا۔ "وہاں کیا رکھا ہے ہمارے لئے نہ کام' نہ روزگار' صرف ذلت اور خواری..... یہاں تو ہم محنت کر رہے ہیں تو اس کا پھل بھی ہمیں مل رہا تھا' ہم ضرور یہیں واپس آئیں گے اب تو یہی ہمارا گھر ہے۔"

"تم دونوں کے جانے سے یہاں کے کام میں کافی رکاوٹ واقع ہو جائے گی لیکن خیر....." خواجہ صابر علی نے کہا۔ "کسی نہ کسی طرح کام چلا لیں گے لیکن تم لوگ جلدی ہی واپس آجانا۔"

وہ دونوں ہی خواجہ صابر علی کی زبان سے یہ سب کچھ سن کر بہت خوش ہوئے' صابر چاچا نے ان کو گھر جانے کی اجازت دے دی تھی یہ تو بہت ہی اچھا تھا۔

ایک ہفتے تک دکان بڑے ہی عمدہ طریقے سے چلتی رہی جو مٹھائیاں روز کے لئے تیار ہوتی تھیں' تقریباً ساری بک جاتی تھیں اور اگلے دن کے لئے نئی اور تازہ مٹھائیاں بنانی پڑتی تھیں۔ ان لوگوں نے یہ حکمت عملی اپنائی تھی کہ بہت ساری الگ الگ اقسام کی مٹھائیاں نہیں بناتے تھے بلکہ کم اقسام کی لیکن مناسب مقدار میں مٹھائیاں بناتے تھے۔

اس روز مسعود اور خواجہ صابر علی' سوزوکی میں مٹھائیوں کے تھال لاد کر دکان روانہ ہونے کی تیاری ہی کر رہے تھے کہ ایک لڑکے نے گھر آکر خواجہ صابر علی کو اطلاع دی کہ اس کی دکان میں چوری ہو گئی ہے یہ لڑکا دکان کے قریب ہی ایک گھر میں رہتا تھا اور اس کی مسعود سے خاصی دوستی ہو گئی تھی اس لڑکے کا نام یامین تھا۔ یامین نے اطلاع دی کہ دکان کے لوہے کے شٹر میں لگے ہوئے تالے ٹوٹے پڑے ہیں اور شٹر کھلا ہوا ہے۔

خواجہ صابر علی' طاہر علی' مسعود' حامد اور ناصر یعنی گھر کے سارے ہی مرد فوراً وہاں جا پہنچے خواجہ صابر علی دکان میں کیش بھی نہیں رکھتا تھا لیکن دیوار میں لگی ہوئی گھڑی



رازو' اس کے ساتھ سارے باٹ' ریڈیو اور اس کے علاوہ ایسی تمام چیزیں جنہیں لے جایا جا سکتا تھا' غائب تھیں۔ چوروں نے صرف یہی نہیں کیا تھا انہوں نے تمام الماریوں اور شوکیسوں کے شیشے توڑ دیئے تھے اور انہیں بری طرح نقصان پہنچایا تھا چوری سے کہیں زیادہ بڑا نقصان تو یہ تھا۔

پولیس کو اطلاع دے دی گئی لیکن پولیس کے پاس ایسی چھوٹی موٹی چوری کی تفتیش کرنے کا وقت نہیں تھا۔ پولیس نے تو اس واقعے کی ایف آئی آر بھی درج نہیں کی' دو تین پولیس والے دوپہر کے بعد آئے اور سرسری طور پر پوچھ گچھ کر کے چلے گئے۔

الماریوں اور شوکیسوں وغیرہ کے ٹوٹ جانے سے دکان کا بہت نقصان ہو گیا تھا ایک ہفتہ تک کوئی کاروبار نہیں ہو سکا اور ٹوٹی ہوئی چیزوں کو نئے سرے سے بنوانا پڑا۔ ایک ہفتے کے بعد اس میں کاروبار دوبارہ شروع ہو گیا پولیس والوں نے کبھی پلٹ کر خبر بھی نہیں لی۔

دکان ایک بار پھر چل پڑی اور پہلے کی طرح بکری اور آمدنی کا سلسلہ شروع ہو گیا لیکن صرف دس دن کے بعد ہی دکان کے تالے دوبارہ توڑ دیئے گئے اس بار دکان کا کوئی سامان چوری نہیں ہوا تھا نہ کوئی توڑ پھوڑ ہوئی تھی لیکن ایک صبح دکان کے شٹر کے سارے تالے کھلے ہوئے پائے گئے تھے شاید اچانک کوئی آگیا تھا اور چوروں کو دکان کے اندر گھسنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔

ان سب لوگوں نے یہ منظر دیکھا اور وہ سب کے سب تشویش اور اضطراب کا شکار ہو گئے۔ ابھی تو دکان ٹھیک سے جمی ہی نہیں تھی اور فوراً ہی اس قسم کی وارداتیں شروع ہو گئی تھیں۔

"میرا خیال ہے کہ یہ وہی پہلے والے لوگ ہیں۔" خواجہ صابر علی نے پریشانی کے ساتھ بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "اس بار ان کو یہاں سے کچھ زیادہ نہیں مل سکا تھا انہوں نے دوبارہ کوشش کی لیکن غالباً اس وقت کسی کے اچانک آجانے سے وہ اپنا کام پورا نہیں کر سکے اور جلدی سے یہاں سے بھاگ گئے وہ صرف تالے کھول پائے تھے۔"

اس وقت تک آس پاس کے کچھ اور دکاندار بھی وہاں آگئے تھے اور ان لوگوں کے ساتھ بات چیت میں شامل ہو گئے تھے۔

"عجیب بات ہے کہ آپ کی دکان میں دوسری بار چوری کی کوشش کی گئی ہے خواجہ صاحب۔" ایک پڑوسی دکاندار نے قدرے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "جبکہ عام طور

سے اس علاقے میں دکانوں میں چوریاں ہوتی نہیں ہیں میری دکان پچھلے بیس سال سے یہاں ہے۔"

"آپ لوگوں کا کسی سے کوئی جھگڑا تو نہیں ہے؟" اس دکاندار نے کہا۔ "میرا مطلب ہے اس علاقے میں کسی سے دشمنی' کوئی مخالفت وغیرہ....."

"ارے نہیں بھائی۔" خواجہ صابر علی نے جلدی سے کہا۔ "ہم تو اس علاقے میں بالکل نئے ہیں' ہم تو یہاں پہلے سے کسی کو جانتے ہی نہیں ہیں' بھلا ہمارا کسی سے کیا جھگڑا ہوگا؟ نہیں' ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دے دی گئی اور پولیس والوں نے حسب سابق کسی خاص دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ اس بار تو کسی نے آکر موقع کا معائنہ کرنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی بس شکایت نوٹ کرلی گئی' کوئی ایف آئی آر درج نہیں کی گئی۔

اس روز دکان کافی دیر سے کھولی گئی صبح کا بہت سارا وقت اسی ہنگامے میں ضائع ہوگیا تھا مسعود اور خواجہ صابر علی دکان پر تھے۔ حامد اور ناصر گھر پر اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔

اگرچہ کوئی نقصان نہیں ہوا تھا لیکن سب لوگ بہت پریشان تھے اگر بار بار اسی طرح ہوتا رہا تو دکان کا چلانا مشکل تھا' نہ جانے کون لوگ تھے جو پیچھے لگ گئے تھے جبکہ اس علاقے میں آس پاس کی دوسری دکانوں کو کسی نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا وہ سب کی سب ٹھیک ٹھاک چل رہی تھیں۔

اس رات گھر کے سارے لوگوں نے جن میں حامد کے علاوہ مسعود اور ناصر بھی شامل تھے' دکان کے سلسلے میں اس نئی صورت حال کے بارے میں بات کی' دکان کو حفاظت کی ضرورت تھی یہ تو ٹھیک تھا کہ دکان کے اندر کوئی کیش وغیرہ نہیں رہتا تھا اور چوروں کے لئے وہاں سے لے جانے کے لئے کچھ نہیں تھا لیکن وہ نقصان تو کر سکتے تھے پہلی بار انہوں نے کیسی توڑ پھوڑ مچائی تھی اور ہزاروں روپے کا نقصان کر دیا تھا ٹوٹی ہوئی چیزوں کو بنوانے کی وجہ سے دکان کو ابھی بند رکھا پڑا تھا۔

"آج کل گرمیوں کے دن ہیں۔" مسعود نے کہا۔ "میرے خیال میں کچھ دنوں تک کوئی نہ کوئی دکان کے باہر چبوترے پر سوجایا کرے۔ اس طرح رات کو دکان کی حفاظت ہوجایا کرے گی اور جب وہاں کوئی نہ کوئی موجود ہوگا تو پھر چور بھی اس طرف کا رخ نہیں کریں گے۔"



"ہاں' بات تو بہت اچھی ہے۔" حنیفہ نے فوراً ہی اس خیال سے اتفاق کیا۔

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔" حامد جلدی سے بولا۔ "میں اور مسعود سوجایا کریں گے' کیا ی پڑتا ہے جیسے یہاں سوتے ویسے ہی وہاں سوجائیں گے گرمیوں کے تو دن ہیں۔"

"اگر تم اور مسعود دونوں وہاں جاکر سونے لگو گے تو پھر باڑہ خاصا غیر محفوظ ہو جائے ۔" خواجہ صابر علی نے کہا۔ "وہاں اکیلا ناصر رہ جائے گا۔"

"تو کیا ہوا چاچا جی۔" ناصر نے ایک دم سینہ پھلا کر کہا۔ "میں کسی سے ڈرتا نہیں ں اگر میں اکیلا ہوں گا تو کوئی بات نہیں' میں ساری دیکھ بھال کرلوں گا۔"

"نہیں۔" خواجہ صابر علی نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ "ہم بھینسوں کی طرف سے ں غافل نہیں ہوسکتے۔ ایک ایک بھینس کتنی مہنگی ہے ہم یہاں کے لوگوں کو زیادہ جانتے ں تو نہیں ہیں۔"

"تو پھر ایسا کرتے ہیں خواجہ صاحب' میں تو سوتا ہوں باڑے میں' اور ناصر اور مسعود نوں دکان کے چبوترے پر سوجایا کریں گے۔" حامد نے کہا۔ "اس طرح دونوں جگہوں کی ر حفاظت ہوجایا کرے گی۔"

"ہاں' بات تو بہت اچھی ہے۔" حنیفہ نے فوراً ہی اس خیال سے اتفاق کیا۔

"ہاں یہ اچھا ہے۔" خواجہ صابر علی نے اس کی بات کو پسند کیا۔ باقی لوگوں نے بھی ں خیال کو پسند کیا اور جہاں تک ناصر اور مسعود کا تعلق تھا تو ان دنوں کو بھی یہ بات پسند ی۔

چنانچہ یہ فیصلہ ہوگیا کہ آج کی رات سے ناصر اور مسعود دکان کے باہر چبوترے پر ا کریں گے اور حامد حسب معمول باڑے میں سویا کرے گا اس طرح دکان کی بہتر اظت ہوجانے کے امکانات تھے۔

"کچھ دنوں کی بات ہے۔" خواجہ صابر علی نے کہا۔ "دکان ذرا چل نکلے تو پھر کوئی ا پارٹ ٹائم چوکیدار تلاش کرلیں گے جو رات کو وہاں جاکر سوجایا کرے' دیر سے سہی' ا یہ ہے کہ رات کو ذرا نگرانی ہوجائے کرے گی۔"

اس رات کو کھانا کھانے کے بعد جب سارے کاموں سے فرصت مل گئی تو مسعود ر ناصر دکان پر جاکر سونے کی تیاری کرنے لگے۔ خواجہ صابر علی تو یہ چاہتا تھا کہ وہ ایک ر پائی ساتھ لے جائیں اور دن کے وقت اس کو دکان کے باہر کھڑا کردیا کریں لیکن مسعود اور ناصر دونوں نے کہا کہ ان کو چارپائی کی ضرورت نہیں ہے۔

"خالی بستر کافی ہوگا چاچا۔" مسعود نے کہا۔ "چارپائی کی کوئی ضرورت نہیں ہے، چبوترہ تو بہت اچھی جگہ ہے ہم وہاں بڑے آرام سے سوجائیں گے کوئی مشکل نہیں ہوگی۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔" خواجہ صابر علی نے کہا۔ "صبح کو اٹھ کر بستر کو تہہ کرکے دکان میں ہی اندر رکھ دینا روز روز بستر لانے لے جانے کی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔"

وہ دونوں جب سونے کی غرض سے دکان پر جانے کے لئے روانہ ہوئے تو خواجہ صابر علی طاہر علی اور حامد تینوں ان کے ساتھ تھے حامد نے دو موٹے موٹے ڈنڈے بھی ساتھ لے لئے تھے ان دونوں کے بستر کو بھی حامد اپنے ہی کاندھے پر لادے ہوئے تھا حالانکہ ان دونوں نے اس سے بہت اصرار کیا تھا کہ وہ بستر کو ان کے حوالے کردے۔

ذرا دیر میں یہ مختصر سا قافلہ بند دکان کے چبوترے پر پہنچ گیا چبوترہ کافی چوڑا تھا اور اس پر بوقت ضرورت دو سے زائد آدمی بھی بڑے آرام سے سوسکتے تھے اور وہ دونوں تو دبلے پتلے سے لڑکے ہی تھے۔ "تم دونوں کو ڈر تو نہیں لگے گا؟" طاہر علی نے ان سے پوچھا۔

"ڈر.....؟" مسعود نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ارے نہیں طاہر بھائی ہم ڈرنے والوں میں سے نہیں ہیں، ہم دکان کے دروازے پر موجود ہیں تو مجال ہے کسی کی جو دکان کو ہاتھ بھی لگا کر دیکھ لے، نہیں طاہر بھائی۔ آپ اس کی فکر نہ کریں ہم نہیں ڈرتے ہیں۔"

"آج کی رات سو کر دیکھ لو۔" خواجہ صابر علی نے کہا۔ "اگر ڈر لگے تو پھر کل سے مت سونا گھر پر ہی سونا۔"

"نہیں چاچا جی۔" ناصر نے جلدی سے کہا۔ "کوئی ڈر نہیں لگے گا، ہم لوگ اطمینان سے سوجائیں گے۔"

"کچھ عرصہ پہلے تک اس پوری مارکیٹ کا ایک چوکیدار تھا۔" حامد نے کہا۔ "وہ رات کو آتا تھا اور آس پاس کی ساری گلیوں میں گشت کرتا رہتا تھا، سب دکان والے اس کو پیسے دیتے تھے لیکن پھر بعد میں اسے بعض دکانداروں نے پورے پیسے نہیں دیئے اور وہ پریشان ہو کر یہاں سے چلا گیا۔ اس کے بعد سے کوئی دوسرا چوکیدار یہاں نہیں آیا۔"

"اب ہم کوشش کریں گے کہ رات کو گشت کرنے کے لیے کسی چوکیدار کا مشترکہ طور پر بندوبست کرلیں۔" خواجہ صابر علی نے کہا۔ "میں دوسرے دکانداروں سے بات کروں گا یہ بہت ضروری ہے۔"



مسعود اور ناصر نے چبوترے پر بستر بچھایا اس وقت وہاں آس پاس کچھ اور لوگ بھی موجود تھے ان میں سے بعض نے قریب آکر بات چیت بھی کی اور اس خیال کو سراہا کہ لڑکے دکان کے باہر سویا کریں گے۔

مسعود کا دوست یامین بھی وہاں آن پہنچا تھا وہ قریب ہی رہتا تھا اور اسی نے آج صبح کو تالے ٹوٹنے کی اطلاع دی تھی وہ اتفاق سے ادھر آنکلا تھا یہاں دکان کے سامنے مجمع دیکھ کر رک گیا۔

"میرا گھر تو بالکل قریب ہی ہے۔ اگر رات کو کسی وقت بھی میری ضرورت ہو تو آکر بلا لینا میں فوراً ہی آجاؤں گا۔ ویسے یہ تم لوگوں نے اچھا کیا کہ رات کو یہاں سونے کا فیصلہ کرلیا۔"

وہ لوگ کچھ دیر تک ان دونوں کے ساتھ رہے، یامین بھی بیٹھا رہا اور باتیں کرتا رہا، اب رات زیادہ ہوگئی تھی سب لوگ ایک ایک کرکے وہاں سے چلے گئے، مسعود اور ناصر اکیلے رہ گئے، گلی کی چہل پہل بھی رفتہ رفتہ ختم ہوگئی تھی اور گہرا سناٹا پھیل گیا تھا، دکان سے کچھ فاصلے پر بجلی کا کھمبا تھا جس کے اوپر لٹکا ہوا ایک کمزور سا بلب جل رہا تھا جس کی مریل، پھیکی روشنی بے رونق گلی کی اداسی میں اور زیادہ اضافہ کررہی تھی۔

دونوں بہت رات گئے تک آپس میں گھر کے بارے میں اور اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں باتیں کرتے رہے، گلی میں بالکل سناٹا تھا، دور تک کوئی آواز نہیں سنائی دیتی تھی، اپنی باتوں کے دوران وہ جیسے اس بات کو بھول گئے تھے کہ وہ گھر میں نہیں بلکہ گلی میں دکان کے چبوترے پر لیٹے ہوئے ہیں اور پھر اسی عالم میں ان کو نیند آگئی پھر صبح تک ان کو کچھ ہوش نہیں رہا۔

علی الصبح ان کی آنکھ کھل گئی گلی میں سناٹا تھا، قریب کی مسجد سے ابھی ابھی اذان کی آواز آنی شروع ہوئی تھی، مسعود نے آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا۔ اسے یہ یاد کرنے میں کچھ وقت لگا کہ وہ گھر میں نہیں بلکہ دکان کے چبوترے پر سویا ہوا تھا اس کے چہرے پر خود بخود ایک مسکراہٹ نمودار ہوگئی تھی، اس نے دکان کے تالوں پر نظر ڈال لی تھی تالے بند تھے۔

"سب کچھ ٹھیک ہے۔" ناصر نے اس سے کہا۔ "تالے ٹھیک سے بند ہیں۔"

"ہاں۔" مسعود نے کہا۔ "سب کچھ ٹھیک ہے، خدا کرے آئندہ بھی سب کچھ ٹھیک ہی رہے۔"

وہ دونوں کچھ دیر تک اسی طرح بستر پر لیٹے رہے اور اپنے اردگرد پھیلے ہوئے دھندلکے کو دیکھتے رہے' فضا میں بڑی ہی راحت افزا خنکی تھی' گرمی کا نام ونشان نہیں تھا اور نرم ہوا کے جھونکے بڑی لطافت کے ساتھ جسم کو چھوتے ہوئے گزرے جارہے تھے' ہر شے میں تازگی اور زندگی کا احساس ہو رہا تھا۔

ذرا سی دیر میں گلی میں سے اکا دکا لوگ گزرتے ہوئے دکھائی دینے لگے یہ وہ نمازی تھے جو اپنے اپنے گھروں سے نکل کر مسجد کی طرف جارہے تھے' نماز کا وقت ہو رہا تھا۔

"چلو..... اٹھ جاؤ۔" مسعود نے کہا۔ "تمہیں بھی جاکر اپنا کام شروع کرنا ہے۔"

اور وہ دونوں اٹھ گئے' انہوں نے اپنا بستر تہہ کرکے وہیں چبوترے پر رکھ دیا اور گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔

دن معمول کے مطابق گزرا۔ مسعود سارا دن دکان پر رہا خواجہ صابر علی دوپہر تک دکان میں رہا تھا پھر اس کے بعد کسی کام سے شہر چلا گیا تھا' سینکڑوں جنجال تھے' طرح طرح کی مصروفیت تھی' پرانی جگہ چھوڑ کر نئی جگہ آنے میں مصروفیت کا دائرہ بھی تو کتنا زیادہ وسیع ہوگیا تھا' بے چارہ خواجہ صابر علی تو طرح طرح کے کاموں کے بوجھ تلے دبا رہتا تھا۔

مسعود کے لئے وہ دن بہت اچھا گذرا' دکان میں بکری بہت اچھی رہی۔ نہ صرف اس گلی کے لوگ بلکہ آس پاس کی دوسری گلیوں کے لوگ بھی اب اسی دکان سے مٹھائی وغیرہ خرید رہے تھے اور دکان خوب چل رہی تھی آج صبح کو جتنی مٹھائیاں دکان میں لائی گئی تھیں' رات ہونے تک وہ تقریباً ساری کی ساری ختم ہوگئی تھیں اور کئی مٹھائیوں کے گاہک تو واپس بھی لوٹ گئے تھے۔

رات کو دن بھر کی صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد خواجہ صابر علی نے دلی اطمینان اور خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "اگر دکان اسی طرح چلتی رہی تو پھر بہت جلد ہم یہاں اپنے قدم جمانے میں کامیاب ہوجائیں گے اور پھر ہم آہستہ آہستہ دکان کو اور زیادہ پھیلاتے جائیں گے۔ میرا مطلب ہے ہم اس میں مٹھائی کے علاوہ اور دوسری چیزیں بھی رکھنا شروع کردیں گے۔"

"جیسا کہ بشیر پہلوان کی دکان میں ہے۔" مسعود نے فوراً کہا۔ "وہ اپنی دکان میں مٹھائیوں کے علاوہ اور بہت ساری چیزیں رکھتا ہے اور ان ساری چیزوں کی بکری بھی خوب ہوتی ہے۔"

"ہم انشاء اللہ اس سے زیادہ چیزیں رکھیں گے۔" خواجہ صابر علی نے کہا۔ "بلکہ



ہیں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ دکان ذرا چل نکلے تو پھر برابر والی دکان کو خریدنے کی بھی بات کروں گا اس کا مالک ظفر علی چند روز پہلے مجھ سے کہہ رہا تھا کہ شاید کچھ دنوں کے بعد وہ اس دکان کو فروخت کرکے واپس ملتان چلا جائے وہ ملتان کا رہنے والا ہے اور واپس وہیں چلا جانا چاہتا ہے۔"

"ارے..... اگر ایسا ہوجائے تب تو بہت اچھا ہے چاچا جی۔" ناصر نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "اگر ایک دکان اور ہوجائے گی تو بہت اچھا ہوگا پھر تو دونوں دکانیں مل کر ایک بہت بڑی دکان بن جائے گی۔"

"مٹھائیوں کی دکان کے ساتھ ایک پورا جنرل اسٹور بن جائے گا۔" طاہر علی نے کہا۔ اس کے لہجے میں مسرت کی جھلک تھی۔ "ہم اس جنرل اسٹور میں کچھ تھوڑی بہت دوائیں بھی لاکر رکھ لیں گے اس علاقے میں کوئی میڈیکل اسٹور نہیں ہے' دوائیں خریدنے کے لئے لوگوں کو یہاں سے خاصے فاصلے پر جانا پڑتا ہے۔"

کافی دیر تک دکان کی توسیع کے منصوبے پر باتیں ہوتی رہیں۔ سب ہی لوگوں نے اس خیال کو بہت پسند کیا تھا لیکن جیسا کہ خواجہ صابر علی نے کہا' اس منصوبے کی تکمیل کا انحصار اسی امر پر تھا کہ ظفر علی دکاندار کب اپنی دکان فروخت کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔

آنے والا ایک ہفتہ بغیر کسی خاص واقعے کے گزر گیا۔ سارے کام معمول کے مطابق چل رہے تھے۔ مسعود اور ناصر اسی طرح اپنا اپنا کام کررہے تھے اور رات کو وہ دونوں دکان کے چبوترے پر بستر بچھاکر سوجاتے تھے دکان بالکل محفوظ تھی اور اس روز کے بعد سے نہ تو کسی نے شٹر توڑا تھا اور نہ تالے کھولنے کی کوشش کی تھی وہ سب لوگ رفتہ رفتہ اس بات کو بھولتے جارہے تھے۔ ناصر اور مسعود کے وہاں رات کو سونے کا تجربہ بہت کامیاب رہا تھا اور دکان پوری طرح محفوظ رہی تھی۔

مسعود اور ناصر جب رات کو سونے کے لئے دکان کے چبوترے پر جاتے تو اکثر یامین بھی ان کے پاس آجاتا اور وہاں بیٹھ کر کچھ دیر تک ان کے ساتھ باتیں کرتا رہتا۔ وہ ایک یتیم اور بے سہارا لڑکا تھا اور کچھ دور کے عزیزوں کے ساتھ رہتا تھا۔ یامین کی زبانی ہی مسعود اور ناصر کو یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ بشیر پہلوان ان کی اس دکان سے خوش نہیں ہے اس علاقے میں ابھی تک تو مٹھائی کی صرف اس کی دکان تھی اور اسے ایک طرح سے یہاں اجارہ داری حاصل تھی لیکن اب ایک دوسری دکان اور بھی کھل گئی تھی جس کی وجہ سے اس کی اپنی دکان کی بکری متاثر ہوگئی تھی۔ مسعود نے یہ بات خواجہ صابر علی کو

اگلے ہی دن بتا دی تھی۔

"ہر آدمی اپنے اپنے نصیب کا کھاتا ہے بیٹے۔" خواجہ صابر علی نے اس کی بات سننے کے بعد بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "جس کے مقدر میں جتنا لکھا ہے' وہ اس کو ضرور ملے گا چاہے جس طرح سے بھی ملے اور جو نہیں لکھا ہے' وہ ہرگز نہیں ملے گا چاہے وہ اس کے لئے لاکھ سر پھوڑتا رہے۔"

"لیکن..... لیکن یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے چاچا کہ کس کے مقدر میں کتنا لکھا ہے اور کیا لکھا ہے؟" مسعود نے سوال کیا۔ "اور یہ کہ آدمی کو کیا کچھ مل سکتا ہے اور کیا نہیں مل سکتا ہے؟"

"اگر یہ بات پہلے سے معلوم ہو جائے تو پھر رونا ہی کس بات کا ہے؟" خواجہ صابر علی نے آہستہ سے کہا۔ "انسان کو پہلے سے کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے' اس کی تقدیر میں کیا لکھا ہے بس ایک دم سے کوئی چیز ہو جاتی ہے جب ہو جاتی ہے تب پتہ چلتا ہے بس سب تقدیر کے الٹ پھیر ہیں بیٹا..... مگر ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا کبھی ہمت نہ ہارنا آدمی کا کام ہے محنت اور کوشش کرتے رہنا آگے جو تقدیر کا لکھا۔"

ان دونوں کو دکان کے چبوترے پر سوتے ہوئے کوئی دس دن کا عرصہ گزر گیا تھا اور اب تو وہ اس کے اتنے عادی ہو گئے تھے جیسے ہمیشہ سے مکان کے باہر گلی میں دکان کے چبوترے پر ہی سوتے چلے آئے ہوں۔

وہ دونوں دکان کے چبوترے پر بیٹھ گئے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔

"سنا ہے چاچا صابر علی اپنے برابر والی دکان بھی خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟" دوران گفتگو یامین نے ان دونوں سے پوچھا۔

"تم کو کون بتا رہا تھا؟" مسعود نے سوال کیا۔

"میں نے یہ بات بشیر پہلوان کی دکان پر سنی تھی۔" یامین نے کہا۔ "چند روز پہلے میں وہاں سے کچھ سامان خرید رہا تھا تو میں نے بشیر پہلوان کو ایک آدمی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے سنا تھا' وہ اس سے کہہ رہا تھا کہ خواجہ صابر علی' ظفر علی کی دکان بھی خرید رہا ہے اور وہ اس میں ایک جنرل اسٹور کھولے گا۔"

"ہاں..... چاچا کا ارادہ تو ہے۔" مسعود نے کہا۔

"اور انہوں نے شاید ظفر علی سے بات بھی کی ہے لیکن ظفر علی دکان اسی وقت بیچے گا جب وہ ملتان جانے کا پکا ارادہ کر لے گا' ابھی اس کو جانے میں کچھ وقت لگے گا'



....."

"اگر دوسری دکان بھی تم لوگوں کے پاس آجائے گی تو بہت اچھا ہو گا۔" یامین نے ...

"بڑی دکان ہو جائے گی پھر تو صابر چاچا کو شاید ایک اور آدمی کی بھی ضرورت ہو' ...کہ ایک طرح سے دو دکانیں ہو جائیں گی۔"

"ہاں۔" مسعود نے کہا۔ "دو دکانیں تو ہو جائیں گی اور شاید چاچا کو کسی اور آدمی کی ...رورت بھی ہو۔"

"تو پھر میرے لئے بات کرنا۔" یامین نے فوراً بڑی عاجزی سے کہا۔ "اگر چاچا راضی ...ں تو میں شروع میں دوپہر کے بعد سے رات تک دکان پر بیٹھ جایا کروں گا اور اگر چاچا ...رے کام سے مطمئن ہو جائیں گے تو میں دن بھر کی نوکری کر لوں گا' مجھے دکان پر کام کرنا ...لگتا ہے' تم ذرا خیال رکھنا۔"

"میں ضرور خیال رکھوں گا' بلکہ پہلے ہی صابر چاچا سے بات کر لوں گا۔" مسعود نے ... "لیکن ابھی تو اس سارے کام میں وقت لگے گا' دکان کی خریداری ابھی فوراً تو نہیں ...ہی ہے۔"

"بس جب بھی....." یامین نے کہا۔ "میری بات کو یاد رکھنا۔"

رات کافی ہو گئی تھی' یامین ان دونوں سے رخصت ہو کر اپنے گھر چلا گیا' مسعود اور ...اس کے جانے کے بعد کچھ دیر تک آپس میں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے اور اس ...بعد وہ بھی سو گئے۔

وہ گزشتہ دس روز سے یہاں سو رہے تھے' شروع کے چند دنوں میں تو وہ ڈرے ...ے اور محتاط تھے لیکن پھر جیسے جیسے دن گزرتے گئے' ویسے ویسے ان کے دل سے خوف ...احتیاط کا عنصر نکلتا گیا اور اب تو وہ بڑے اطمینان اور آرام کے ساتھ یہاں سوتے تھے ...اس رات بھی وہ پورے اطمینان اور آرام سے سو رہے تھے۔

رات کا نہ جانے کون سا وقت تھا' جب اچانک ناصر کی آنکھ خود بخود نہیں بلکہ کسی ...ے' کسی آہٹ سے کھلی' گلی کے نکڑ پر کھمبے میں لگا ہوا مریل سا بجلی کا بلب جل رہا ...اور اس کی پھیکی' نیم مردہ روشنی گلی میں پھیل رہی تھی' یہ روشنی بس اتنی تھی کہ اس ...سے دور کی چیزیں سائے جیسی نظر آتی تھیں۔

ناصر ابھی اس بات پر غور کر ہی رہا تھا کہ اس نے کون سی آواز سنی ہے کہ اچانک ...گلی سی ٹوٹ پڑی۔

وہ تین آدمی تھے ان تینوں کے ہاتھوں میں بھاری بھاری لاٹھیاں تھیں' مضبوط اور توانا جسموں کے ان تین آدمیوں نے ایک دم ناصر اور مسعود پر حملہ کر دیا۔

ناصر کے حلق سے ایک بھیانک چیخ نکلی اور اس نے تیزی سے چبوترے سے چھلانگ لگا دی اور جب وہ نیچے کود رہا تھا تو اس وقت ان میں سے ایک آدمی نے اس کی ٹانگ پر کئی لاٹھیاں برسا دیں' ناصر کو ایسا لگا جیسے کوئی اس کی ٹانگوں میں آگ بھر رہا ہو' اس کے حلق سے بڑی دردناک چیخیں نکل رہی تھیں' اس نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی لیکن اس کی تو ٹانگیں ہی نہیں تھیں' ٹانگوں کی جگہ پر تو آگ جل رہی تھی' وہ زمین پر گر گیا اور چلانے لگا۔

لاٹھیاں' مسعود کے جسم پر بھی برس رہی تھیں اور وہ بھی بری طرح چیخ رہا تھا' وہ چارپائی پر سے اٹھ گیا تھا اور حملہ آوروں میں سے ایک سے الجھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ اس سے لاٹھی چھین نہیں پا رہا تھا۔

مسعود اور ناصر دونوں شدید اذیت اور وحشت کے عالم میں چلا رہے تھے' ان کے جسموں پر لاٹھیاں برس رہی تھیں' یہ حملہ ان پر سوتے میں اور اچانک کیا گیا تھا' انہیں اس بات کا موقع ہی نہیں مل سکا کہ وہ ان ڈنڈوں کو اٹھا سکیں اور استعمال کر سکیں جو رات کو ان کے پاس موجود رہتے تھے۔

اسی وقت گلی کے دوسرے کونے پر کسی مکان کا دروازہ کھلا۔ "ارے کون ہے.....؟ کیا ہے.....؟" دور سے آتی ہوئی ایک بھاری بھرکم مردانہ آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی حملہ آوروں نے وہاں سے راہِ فرار اختیار کی اور جب حملہ آور بھاگ رہے تھے تو ان میں سے ایک کے چہرے پر سے چادر ہٹ گئی' چادر صرف چند لمحوں کے لئے ہٹی تھی اور پھر بھاگتے ہوئے حملہ آور نے جلدی سے اسے دوبارہ اپنے چہرے کے اوپر منڈھ لیا تھا لیکن ان چند لمحوں کے دوران جبکہ اس کا چہرہ چادر کے بغیر تھا' ناصر نے اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھوں اور بجھتی ہوئی نظروں سے اس کو دیکھ لیا اور پہچان لیا وہ بلال تھا' بشیر پہلوان کا بھائی..... اور اس کے ساتھ ہی ناصر کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور اسے کچھ ہوش نہیں رہا۔

گلی کے آخری نکڑ والے مکان کا دروازہ کھلنے اور وہاں سے ایک آواز بلند ہونے کے ساتھ ہی کئی اور مکانوں کے دروازے بھی کھلنے لگے اور آوازیں آنے اور مکانوں کی روشنیاں جلنے لگیں۔



تینوں نقاب پوش حملہ آور وہاں سے بھاگ گئے' مکانوں سے نکل نکل کر آنے والے لوگ جب تک ناصر اور مسعود کے پاس پہنچے' اس وقت تک وہ تینوں نقاب پوش حملہ آور رات کی تاریکی کا حصہ بن کر غائب ہو چکے تھے' کچھ لوگوں نے ان کو سایوں کی طرح بھاگتے ہوئے تو دیکھا لیکن ان کا تعاقب کرنے کی کوشش نہیں کی' ہر کسی کو اپنی جان عزیز تھی۔

لوگ جب ناصر اور مسعود کی چارپائی کے پاس پہنچے تو انہوں نے ان دونوں کو چبوترے کے فرش سے بھی نیچے گلی کے فرش پر پڑے ہوئے پایا' دونوں کے جسم خون میں لت پت ہو رہے تھے اور دونوں بے ہوش تھے اور اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ زندہ بھی ہیں یا مر گئے ہیں۔

گھروں سے باہر نکلنے والوں میں یامین بھی شامل' تھا اس نے جیسے ہی ان دونوں کی حالت دیکھی' فوراً ہی خواجہ صابر علی کے گھر کی طرف بھاگا۔

☆=========☆=========☆

زور زور سے دروازہ پیٹے جانے کی آواز سن کر حامد ہڑبڑا کر اٹھا۔ اس کے چاروں طرف رات کا گہرا سناٹا پھیلا ہوا تھا اور اپنے تجربے کی بنیاد پر وہ یہ کہہ سکتا تھا کہ صبح ہونے میں تو ابھی بہت دیر تھی۔ پھر رات کے اس حصے میں کون آیا تھا؟

دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے جھروکے سے جھانک کر باہر دیکھا۔ "کون ہے؟" اس نے باہر کسی سائے کو کھڑا دیکھ کر زور سے آواز دی۔

"حامد چاچا' میں ہوں یامین۔" یامین نے جلدی جلدی بولتے ہوئے کہا۔ حامد اس کی آواز پہچان رہا تھا اور اس کی آواز میں شامل وحشت اور تشویش کا بھی بڑی حد تک اندازہ لگا سکتا تھا۔ "جلدی سے صابر چاچا کو خبر کر دو' مسعود اور ناصر پر چوروں نے حملہ کر کے انہیں زخمی کر دیا ہے۔"

"کیا؟" حامد نے سخت گھبراہٹ کے ساتھ کہا اور جلدی سے دروازہ کھول کر اس کو اندر بلا لیا۔ یامین جلدی جلدی' پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ اس کو مختصراً بتانے لگا۔ اس کے پاس بتانے کے لئے زیادہ کچھ نہیں تھا' کیونکہ وہ فوراً ہی وہاں سے بھاگ کر ادھر آ گیا تھا۔

ذرا سی دیر کے بعد خواجہ صابر علی' طاہر علی اور حامد یامین کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ گھر سے نکلنے سے پہلے خواجہ صابر علی نے حنیفہ کو تاکید کر دی تھی کہ وہ سب دروازے

اچھی طرح بند کرلے اور جب تک اس کو معلوم نہ ہو جائے کہ دروازے پر کون ہے اس وقت تک کسی کی دستک یا آواز کے جواب میں دروازہ نہ کھولے۔

حنیفہ بہت زیادہ سہمی ہوئی تھی۔ "یااللہ خیر۔ یااللہ خیر!" اس کی زبان سے خوف اور پریشانی کے عالم میں یہ الفاظ بار بار ادا ہو رہے تھے اور اس کی آواز تھر تھرا رہی تھی۔

وہ سب لوگ جب وہاں پہنچے تو اس وقت تک پڑوس کے کسی گھر سے ایک چارپائی آچکی تھی اور ان دونوں کے خون میں لت پت جسموں کو گلی کے فرش پر اٹھا کر اس چارپائی پر ڈالا جا چکا تھا۔

"میں نے تھانے فون کردیا ہے" وہاں موجود ماسٹر حمید اللہ نے کہا۔ ماسٹر حمید اللہ کوئی اسکول ٹیچر نہیں تھا۔ وہ ٹیلر ماسٹر تھا اور محلے میں ماسٹر حمید اللہ کے نام سے مشہور تھا اس کے گھر میں ٹیلیفون بھی موجود تھا۔ "پولیس ابھی پہنچنے ہی والی ہے۔"

"ارے ہوا کیا؟" خواجہ صابر علی نے بھرائی ہوئی آواز میں تقریباً روتے ہوئے کہا اس کی آنکھوں کے سامنے بڑا ہی دلدوز اور المناک منظر تھا۔ دونوں لڑکوں کے جسم اور لباس خون میں تر بتر تھے اور ان کی آنکھیں بند تھیں۔ ان کے چہرے مسخ کردیئے تھے۔

"ارے کیا ہوا؟" خواجہ صابر علی نے جلدی سے مسعود کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اپنی بات کو دہرایا۔ ان دونوں کی حالت دیکھ کر تو اس کو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے دونوں مرچکے ہوں۔

"چوروں نے مارا ہے صابر علی!" ایک آدمی نے کہا۔ "جو شاید دکان کا تالا توڑنا چاہتے ہوں گے اور یہ دونوں جاگ اٹھے۔ انہوں نے ان کو روکنے کی کوشش کی ہوگی۔"

"بہت بری طرح مارا ہے بے چارے بچوں کو۔" کسی اور شخص نے کہا۔ "نہ جانے وہ زندہ بھی بچیں گے یا۔"

"خدا کے لئے ایسی بری باتیں زبان سے مت نکالو۔" حامد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "خدا ان کی حفاظت کرے گا۔ اب کیا کریں؟ ان کو اسپتال لے جائیں یا پولیس کے آنے کا انتظار کریں؟"

"طاہر تم جلدی سے جاؤ اور سوزوکی لے کر آجاؤ۔" خواجہ صابر علی نے اپنے بیٹے سے کہا۔ "ہمیں ان کے ساتھ تو جانا ہوگا چاہے پولیس کے ساتھ یا پولیس کے بغیر۔"

پولیس والوں نے وہاں پہنچنے میں بہت زیادہ دیر نہیں لگائی اور پھر جلدی جلدی ابتدائی کارروائی کے بعد خواجہ صابر علی کی سوزوکی میں ہی ان کو اسپتال روانہ کردیا۔ د



پولیس والے سوزوکی میں ساتھ بیٹھے تھے۔ خواجہ صابر علی خود سوزوکی چلا رہا تھا اور حامد ان کے ساتھ تھا۔ طاہر کو خواجہ صابر علی نے گھر پر اس کی ماں کے ساتھ چھوڑ دیا تھا جو بالکل اکیلی رہ گئی تھی۔

پولیس دونوں لڑکوں کا بیان نہیں لے سکی تھی کیونکہ وہ دونوں بے ہوش تھے اور وہاں موجود لوگوں میں سے کوئی بھی شخص ایسا نہیں تھا جس نے حملہ آوروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو اور جو ان کے بارے میں کچھ بتا سکے۔ بعض لوگوں نے کچھ سایوں کو بھاگتے ہوئے ضرور دیکھا تھا لیکن وہ ان کے بارے میں کچھ بتا نہیں سکتے تھے کہ وہ کون تھے۔

ناصر اور مسعود دونوں بہت بری طرح زخمی ہوئے تھے اور اسپتال میں بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔ پولیس نے خواجہ صابر علی کی شکایت پر نامعلوم حملہ آوروں کے خلاف رپورٹ درج کرلی تھی مگر اس واقعے کی بھی فوری طور پر کوئی باقاعدہ ایف آئی آر درج نہیں کی تھی۔ پولیس والوں کا کہنا تھا کہ انہوں نے تفتیش شروع کردی ہے۔

تمام لوگوں کا اور خود خواجہ صابر علی کا بھی یہی خیال تھا کہ یہ حرکت چوروں کی ہی ہے اور چوروں کے اسی گروہ نے یہ واردات کی ہے جو اس سے پہلے بھی دوبار اس نئی دکان کو اپنا نشانہ بنا چکا ہے۔ قرین قیاس یہی معلوم ہوتا تھا کہ چور واردات کی نیت سے وہاں پہنچے تھے مگر اس اثناء میں لڑکوں میں سے کسی کی آنکھ کھل گئی اور اس نے شور مچا دیا اور شاید ان کو پکڑنے کی کوشش کی۔ جس پر چوروں نے جو لاٹھیوں سے مسلح تھے' ان پر حملہ کردیا اور انہیں شدید زخمی حالت میں چھوڑ کر فرار ہوگئے۔

پولیس والے تو ان دونوں کو اسپتال میں داخل کروا کر اور اپنی کاغذی کارروائی مکمل کرکے وہاں سے چلے آئے تھے لیکن خواجہ صابر علی اور حامد ان دونوں کے ساتھ تھے۔ دونوں لڑکے بے ہوش تھے اور ڈاکٹر ان کی دیکھ بھال کررہے تھے ان کے ایکسرے بھی نکلوائے گئے تھے۔

"دونوں کو کافی چوٹیں لگی ہیں۔" ڈاکٹر نے خواجہ صابر علی سے کہا۔ "ہڈیاں بھی کئی جگہ سے ٹوٹی ہیں۔ اب کل دن میں ہڈیوں والے ڈاکٹر صاحب ان کو دیکھیں گے اور پھر ہم ان کا علاج کریں گے۔"

"یہ۔ یہ دونوں ٹھیک تو ہو جائیں گے ڈاکٹر صاحب؟" خواجہ صابر علی نے پوچھا۔

"امید تو یہی ہے۔" ڈاکٹر نے مختصر اور غیر واضح جواب دیا۔ "آگے اللہ مالک ہے۔"

ویسے کل ہڈیوں والے ڈاکٹر صاحب دیکھنے کے بعد بالکل صحیح طور پر کچھ بتا سکیں گے۔"

رات کے آخری پہر میں خواجہ صابر علی حامد کو ان دونوں کے پاس چھوڑ کر کچھ دیر کے لئے گھر واپس آ گیا۔ وہ بے حد پریشان اور خوف زدہ تھا۔ ان دونوں کو ابھی تک ہوش نہیں آیا تھا ان کی حالت ٹھیک نہیں نظر آتی تھی۔ خواجہ صابر علی صرف ان کی طرف سے ہی فکر مند نہیں تھا بلکہ اپنے کاروباری مستقبل کی جانب سے بھی بہت فکر مند تھا۔

اس دن دکان بند رہی۔ دودھ کا کاروبار بھی متاثر رہا۔ بند دکان کے در و دیوار سے گہری اداسی برس رہی تھی بہت سارے گاہک خریداری کے لئے آئے اور جب انہیں اس سانحے کے بارے میں معلوم ہوا تو افسوس کا اظہار کرتے ہوئے چلے گئے۔ خواجہ صابر علی کی دکان بند تھی تو پھر دوسری متبادل دکان بشیر پہلوان ہی کی تھی جو کھلی ہوئی تھی۔

دوپہر کے وقت خواجہ صابر علی اپنے بیٹے طاہر علی کو لے کر پھر اسپتال پہنچا تاکہ حامد کو جو وہاں مستقل موجود تھا گھر واپس بھیج دے۔

جب دونوں باپ بیٹا اسپتال پہنچے تو حامد نے ان کو بتایا کہ دونوں لڑکوں کو ہوش آ گیا ہے اور ان کے زخموں کی مرہم پٹی ہو رہی ہے۔

"ہڈیوں کا بڑا ڈاکٹر آیا تھا۔" حامد نے کہا۔ "اور وہ ابھی کچھ دیر پہلے ان کو دیکھ کر گیا ہے دوسرے ڈاکٹر سے ابھی میری بات نہیں ہوئی ہے۔ بہت مصروف ہے۔ اب موقع ملے تو بات کرتے ہیں۔ ویسے ناصر کے زیادہ چوٹیں آئی ہیں۔"

"جان کا خطرہ تو نہیں ہے؟" صابر نے پوچھا۔

"ایسا تو نہیں معلوم ہوتا۔" حامد نے کہا۔ "پولیس والا آیا تھا۔ وہ ان دونوں کے بیانات بھی لے گیا ہے۔"

"اچھا!" خواجہ صابر علی نے کہا۔ "ان لوگوں نے پولیس کو بیان دے دیا؟"

"ہاں خواجہ صاحب!" حامد نے غور سے خواجہ صابر علی کے چہرے کو دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "وہ تین آدمی تھے۔ تینوں نے اپنے چہرے چادروں میں چھپا رکھے تھے اور جب وہ بھاگ رہے تھے تو ناصر نے ان میں سے ایک کا چہرہ دیکھ لیا تھا وہ بشیر پہلوان کا بھائی بلال تھا۔"

"واقعی؟" طاہر علی نے سخت حیرت اور اضطراب کے عالم میں کہا۔ "بشیر پہلوان کا بھائی بلال؟ اس کا مطلب ہے۔"

"مجھے پہلے ہی اس بات کا شبہ تھا۔" خواجہ صابر علی نے بہت تھکی ہوئی مضمحل اور



آواز میں کہا۔ "جب سے یہ چوریوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا تب سے مجھے شبہ تھا کہ کے پیچھے کوئی نہ کوئی خاص بات ہے اور کسی نہ کسی کا ہاتھ ہے۔ ورنہ چور کبھی بھی ایسی جگہ ہاتھ نہیں مارتا جہاں سے اسے کوئی بھی قیمتی شے ملنے کی امید نہ ہو۔ میرا خیال غلط نہیں نکلا۔ اچھا تو ناصر نے بلال کی شکل دیکھ لی تھی؟ اور مسعود نے؟"

"مسعود کسی کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا۔" حامد نے اس کو بتایا۔ "اس نے مقابلہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن پھر وہ زخمی ہو کر بے ہوش ہو گیا تھا اور اس نے کسی کی بھی شکل نہیں دیکھی تھی۔ ان دونوں نے پولیس کو اپنے اپنے بیانات میں یہی بتایا ہے۔"

"گویا ناصر نے پولیس کو یہ بتایا ہے کہ اس نے بلال کی شکل دیکھی تھی۔" صابر علی نے پوچھا۔

"ہاں۔" حامد نے جواب دیا۔ "میرے سامنے ہی پولیس والے نے ان کے بیانات لئے تھے اور بیان لے کر وہاں سے چلا گیا تھا۔"

"تو پھر پولیس والوں کو اس بیان کی بنیاد پر بلال کو فوراً گرفتار کر لینا چاہئے۔" طاہر علی نے کہا۔

"بالکل گرفتار کرنا چاہئے۔" حامد نے کہا۔ "لیکن اب دیکھو کہ پولیس والے کیا کرتے ہیں۔ پہلی دو وارداتوں کے بعد تو انہوں نے کوئی بھی کارروائی نہیں کی تھی۔"

کچھ دیر کے بعد ڈاکٹر سے ان لوگوں کی ملاقات ہو گئی اور اس نے بتایا کہ مسعود کے جسم کی کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی اور اسے صرف اوپری چوٹیں آئی ہیں اسے چند روز کے بعد اسپتال سے چھٹی مل جائے گی۔

"لیکن ناصر کے بہت زیادہ چوٹیں آئی ہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "اس کی ایک ٹانگ میں فریکچر ہے جس کا آپریشن کرنا ہو گا اور آپریشن کے بعد اس کو تقریباً ایک ہفتے تک تو اسپتال میں رہنا ہو گا اور پھر تین چار مہینے تک اس کو گھر پر آرام کرنا ہو گا۔ اس کے بعد ہی وہ پوری طرح چلنے پھرنے کے قابل ہو سکے گا۔"

"لیکن اس کی ٹانگ تو بچ جائے گی ڈاکٹر صاحب؟" خواجہ صابر علی نے جلدی سے پوچھا۔ اس کے لہجے میں بڑی تشویش شامل تھی۔

"ابھی آپریشن ہونے دیجئے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "ویسے امید ہے کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا' دو دن بعد آپریشن ہو گا۔"

خواجہ صابر علی اور طاہر علی نے دونوں لڑکوں سے ملاقات کی' دونوں بہت ہی نڈھال

مضمحل اور شکستہ نظر آرہے تھے۔ دونوں کے جسموں میں جگہ جگہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور ان کی شکلیں نہیں پہچانی جا رہی تھیں۔ کیونکہ ان کے سر بھی پٹیوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔

"میں نے خود اپنی آنکھوں سے بلال کو دیکھا تھا چاچا جی۔" ناصر نے کمزور آواز میں کہا۔ "اس کے چہرے پر سے چادر سرک گئی تھی اور میں نے بالکل صاف طور پر اس کو دیکھا تھا۔ وہ بلال ہی تھا اور مجھے سب سے زیادہ لاٹھیاں تو اس نے ہی ماری تھیں۔ میں نے پولیس والے کو بھی بتایا ہے کہ ان لوگوں میں بلال شامل تھا۔"

"یامین بتا رہا تھا چاچا جی' کہ اس نے بشیر پہلوان کو کسی آدمی سے یہ بات کرتے سنا تھا کہ آپ ظفر علی کی دکان خریدنے والے ہیں" مسعود نے آہستہ آہستہ بولتے ہوئے کہا۔ "یامین نے خود ان دونوں کو باتیں کرتے سنا تھا اور..... چاچا جی..... وہ لوگ نہیں چاہتے کہ آپ..... آپ کی دکان چلے..... اور آپ دوسری دکان بھی کریں۔"

"تم ابھی ان باتوں کے بارے میں مت سوچو اور اپنے دماغ کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کرو۔" خواجہ صابر علی نے اس سے کہا۔ "تم دونوں کو مکمل آرام کی ضرورت ہے۔"

خواجہ صابر علی کچھ دیر کے بعد جب اسپتال سے واپس ہوا تو وہ سیدھا علاقے کے تھانے پہنچا اور اس نے تھانیدار سے ملاقات کی۔ اس نے اس سے پوچھا کہ ناصر کے بیان کے بعد پولیس نے بلال کے خلاف کارروائی کی ہے؟

"ناصر کا بیان تو لکھ لیا گیا ہے جی....." تھانیدار نے کہا۔ "ہم تفتیش کر رہے ہیں انشاء اللہ مجرم بچ کر نہیں جاسکیں گے۔"

"مجرم تو آپ کے سامنے موجود ہیں۔" خواجہ صابر علی نے کہا۔ "ناصر کے بیان کے بعد اب شک کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے؟ آپ کو ان لوگوں کے خلاف اقدام قتل کا مقدمہ درج کرکے کم از کم بلال کو گرفتار کرلینا چاہئے۔ اس کو تو ناصر نے پہچان لیا ہے سیدھی سی بات ہے یہ لوگ نہیں چاہتے ہیں کہ میں اس علاقے میں اپنی دکان چلاؤں۔ دو چار بار میری دکان کے تالے تڑوا دیئے اور اب انہوں نے میرے آدمیوں پر قاتلانہ حملہ کیا ہے۔"

"آپ اطمینان رکھیں خواجہ صاحب!" تھانیدار نے کہا "ضرور کارروائی کریں گے۔ پولیس معاملے کی تفتیش کر رہی ہے۔"



"لیکن آپ نے تو ابھی تک اس واقعہ کی باقاعدہ ایف آئی آر بھی درج نہیں کی ہے۔" خواجہ صابر علی نے کہا۔

"کرلیں گے بھائی جان' کرلیں گے۔" ایس ایچ او نے کہا۔ "اس قسم کے جھگڑے فساد اور مارپیٹ کے واقعات تو ہوتے ہی رہتے ہیں ذرا تفتیش سے کوئی بات سامنے تو آنے دیجئے۔"

"یہ جھگڑے فساد اور مارپیٹ کا واقعہ تو نہیں تھا۔" صابر علی نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "ان لوگوں نے سوئے ہوئے بچوں پر قاتلانہ حملہ کیا۔ یہ تو اقدام قتل کا معاملہ ہے جناب۔"

"وہ جو کچھ بھی ہے۔" تھانیدار نے قدرے بے رخی کے ساتھ کہا۔ "ہم ضروری کارروائی کر رہے ہیں اور کریں گے۔"

خواجہ صابر علی وہاں سے چلا آیا۔ پولیس کا رویہ پہلے بھی اس کے لئے حوصلہ افزا نہیں تھا اور اب بھی مایوس کن تھا۔ بعد میں بھی پولیس نے بلال کو گرفتار کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔

تھانے سے خواجہ صابر علی گھر واپس آیا' جہاں حنیفہ بڑی بے چینی کے ساتھ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے جب حنیفہ کو ساری بات بتائی تو وہ خوف زدہ ہوگئی۔

"تو..... تو..... یہ بدمعاش پیچھے لگ گئے ہیں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "یہ نہیں چاہتے کہ اس علاقے میں کوئی اور مٹھائی کی دکان کھولے۔ مگر یہ تو بڑا اندھیر ہے۔ ان لوگوں نے بچوں کو اتنا مارا۔"

"ان میں سے کوئی مر بھی سکتا تھا۔" خواجہ صابر علی نے کہا۔ "دونوں بُری طرح زخمی ہوئے ہیں اور پولیس کے رویے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان بدمعاشوں کو بچانے کی کوشش کر رہی ہے۔"

"ظاہر ہے۔" حنیفہ نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ "ان لوگوں کے منہ کو حرام لگا ہوا ہے۔ بشیر پہلوان نے پہلے ہی ان کی مٹھی گرم کردی ہوگی۔ تبھی تو وہ سب کے سب اس طرح دندناتے پھر رہے ہیں۔ خدا غارت کرے ان لوگوں کو۔ ہیضہ ہو کم بختوں کو۔ کوڑھ پھوٹے ان کے جسموں سے۔ انہوں نے ہمیں پریشان کیا ہے۔"

"دکان کو بھی فی الحال بند ہی رکھنا ہوگا۔" خواجہ صابر علی نے اداسی کے ساتھ کہا۔ "مٹھائیاں بنانے والا بھی کوئی نہیں ہے اور میرے علاوہ دکان کو سنبھالنے والا بھی کوئی

نہیں ہے اور اتنے بہت سارے کام....."

"نہیں نہیں۔" حنیفہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے جلدی سے کہا۔ "ابھی دکان مت کھولو بند ہی رہنے دو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ بدمعاش پھر کوئی کارروائی کریں۔"

دکان کھولنا تو ویسے بھی ممکن نہیں تھا۔ دونوں لڑکے اسپتال میں پڑے تھے پریشانی ہی پریشانی تھی سارے کام الٹ پلٹ ہو کر رہ گئے تھے اور کاموں میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

دو دن کے بعد ناصر کا آپریشن ہو گیا۔ آپریشن کے وقت خواجہ صابر علی خود بھی اسپتال میں موجود تھا ڈاکٹر نے اس کو یہ بات پہلے ہی بتادی تھی کہ یہ ایک پیچیدہ اور خطرناک آپریشن ہو گا کیونکہ ٹانگ کی ہڈی ایک جگہ سے نہیں بلکہ کئی جگہوں سے ٹوٹی تھی اور اس کو جوڑنا بہت نازک کام تھا۔

مریض کے ساتھ صرف ایک آدمی کو آپریشن تھیٹر کے باہر موجود رہنے کی اجازت تھی اور خواجہ صابر علی خود ہی موجود رہا تھا اور جب اس کو یہ اطلاع دی گئی کہ ناصر کا آپریشن کامیاب ہوا ہے اور اس کی ٹانگ ٹھیک ہو جائے گی تو اس کے دل سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔ وہ دل ہی دل میں خود کو ان دونوں لڑکوں کی اس حالت کا ذمہ دار سمجھتا تھا۔ اگرچہ وہاں جاکر سونے کی تجویز تو مسعود کی ہی تھی لیکن اگر وہ ان دونوں کو اس کی اجازت نہ دیتا تو وہ وہاں نہ جاتے۔ اجازت تو اس نے ہی دی تھی۔ بلکہ اس تجویز کو سراہا بھی تھا۔

اسپتال کے ہڈی وارڈ میں مسعود اور ناصر کے بیڈ ایک دوسرے کے برابر برابر تھے۔ صبح جب ناصر کو آپریشن کے لئے لے جایا جارہا تھا تو مسعود اپنے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کررہا تھا۔ مسعود کو معلوم تھا کہ یہ ایک بہت بڑا نازک اور پیچیدہ آپریشن ہے اور اس کی ناکامی کی صورت میں ناصر کی ٹانگ ضائع بھی ہو سکتی تھی لیکن ناصر کو کسی تسلی کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ غیر معمولی بہادری اور جرأت کا مظاہرہ کررہا تھا گزشتہ رات سے ہی اس کا کھانا پینا بند کر دیا گیا تھا اور اس نے مسعود سے کہہ دیا تھا کہ وہ بالکل نہیں ڈر رہا ہے۔

"میرے پیسے تو حنیفہ چاچی کے پاس جمع ہیں نا۔" اس نے مسعود سے کہا۔ "اگر مجھے کچھ ہو جائے۔ اگر میں زندہ نہ بچ سکوں تو تم وہ پیسے میری ماں جی کو لے جاکر دے دینا' میں رہوں یا نہ رہوں ماں جی کا قرضہ تو اتر جائے گا۔"

"تم ایسی فضول باتیں کیوں کرتے ہو؟" مسعود نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔



"انشاء اللہ تم بالکل ٹھیک ہو کر آؤ گے۔ اپنے پیروں سے چل کر اپنے گھر جاؤ گے اور اپنے گھر والوں سے ملو گے۔ خود ہی اپنے ہاتھ سے اپنی اماں کو پیسے دینا۔"

پھر وہ لوگ ناصر کو لے گئے تھے اور مسعود اپنے بستر پر اکیلا رہ گیا تھا اپنے سارے دکھوں اور محرومیوں کے ساتھ وہ خود کو بہت تنہا محسوس کر رہا تھا۔ تنہائی کا ایسا شدید احساس تو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا اور نہ یہ احساس ہوا تھا کہ ناصر کے بغیر وہ کس قدر نامکمل ہے۔ ناصر تو جیسے اس کے وجود کا حصہ بن کر رہ گیا تھا۔

اس کا اور ناصر کا گزشتہ ڈھائی سال سے زیادہ عرصے کا ساتھ تھا۔ اس عرصے کے دوران انہوں نے اکٹھے بہت سارے دکھ جھیلے تھے۔ خطرات مول لئے تھے۔ خوشیاں سمیٹی تھیں اور امیدوں' آرزوؤں اور امنگوں کی فصلیں بوئی تھیں اور دونوں ایک سال تک بھٹے میں کام کرتے رہے تھے اور فخرو کی گالیاں اور لاتیں اور گھونسے کھاتے رہے تھے۔ دونوں مشترکہ طور پر ان ساری ذلتوں کو برداشت کرتے رہے تھے جو اس بھٹے پر ان کا مقدر تھیں اور پھر طرح طرح کی مہمات سے بھرپور گزشتہ ڈیڑھ سال سے کچھ زائد عرصہ انہوں نے کراچی میں ایک ساتھ گزارا تھا۔ خوف' امید' تڑپ' لگن' جدوجہد کامیابی ان سارے جذبوں اور مرحلوں سے وہ ایک ساتھ گزرے تھے۔ بس وہ دو ہی تھے جو ایک دوسرے سے اپنی ہر بات کہہ سکتے تھے۔ اپنے سارے دکھ بانٹ سکتے تھے اور ساری خوشیاں بھی بانٹ سکتے تھے۔ پردیس میں دیار غیر میں' وہ آپس میں ایک دوسرے کے رازداں اور یار و غم گسار تھے۔ ان کے درمیان درد کا گہرا رشتہ موجود تھا۔

ناصر کے آپریشن تھیٹر میں لے جائے جانے کے بعد سے مسعود ایک ایک پل اضطراب و ہیجان کے عالم میں گزار رہا تھا۔ اس کی اپنی طبیعت اب پہلے کے مقابلے میں کافی بہتر تھی اور وہ تھوڑا بہت چل پھر بھی سکتا تھا۔ وہ ناصر کے اسٹریچر کے ساتھ ساتھ چند قدم چلا بھی تھا لیکن پھر نرس نے اس کو ڈانٹتے ہوئے کہا تھا کہ وہ واپس اپنے بیڈ پر جائے اور وہ واپس آگیا تھا' اور تب سے اس کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے وقت کی نبض تھم گئی ہے اور زمین کی گردش رک گئی ہے۔ ہر چیز جیسے اپنی جگہ پر ساکت ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک ایک لمحہ ایک ایک صدی کے برابر لگ رہا تھا۔ اس کی نظریں بار بار دروازے کی طرف اٹھ جاتی تھی گو کہ اس کو یہ بات معلوم تھی کہ آپریشن میں کافی وقت لگے گا۔ کئی گھنٹے لگیں گے لیکن اس نے ناصر کے جانے کے کوئی دو گھنٹے بعد سے اس کی واپسی کا انتظار شروع کر دیا تھا اور پھر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا تھا ویسے ویسے انتظار کی شدت اور

اس کے کرب میں اضافہ ہوتا گیا اور پھر تو اس کو ایسا لگ رہا تھا کہ انتظار کرتے کرتے اس کی آنکھیں پتھرا جائیں گی۔

پھر جب خدا خدا کر کے گھنٹوں کے بعد وہ لوگ ناصر کو وارڈ میں لے کر آئے اور مسعود کو اس بات کا علم ہوا کہ اس کا آپریشن کامیاب ہوگیا ہے۔ تو اس کے اعصاب میں تناؤ کی وہ کیفیت ختم ہوگئی جس کا وہ گذشتہ کئی گھنٹوں سے شکار تھا۔ اس کو اپنے سارے جسم میں ٹھنڈک کی لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی اور اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ اس تمام وقت کے دوران اس نے ناصر کے بارے میں سوچا تھا' ناصر کی اماں کے بارے میں جو اپنے شوہر اور اکلوتے بیٹے سے محروم طرح طرح کے عذابوں اور صدموں سے بوجھل زندگی گزار رہی تھی' اور ناصر کی بہنوں کے بارے میں سوچا تھا جن کے سر پر ہاتھ رکھنے والا کوئی فرد گھر پر موجود نہیں تھا۔ اگر ان لوگوں کو کسی طرح سے اس بات کا علم ہو جائے کہ ناصر اس وقت زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے' تو ان کے دلوں پر کیا بیتے گی' اس نے لرز کر سوچا۔ "اچھا ہی ہے کہ انہیں اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہے۔"

ناصر کا آپریشن کامیاب ہوگیا تھا اور ڈاکٹروں نے ایک ہفتے کے بعد اس کو گھر جانے کی اجازت دے دی تھی۔ مسعود کو اس سے پہلے ہی اسپتال سے فارغ کردیا تھا۔ وہ اب ٹھیک تھا چلنے پھرنے اور کام کرنے کے قابل تھا۔ صرف کمزوری تھی جو آہستہ آہستہ رفع ہو رہی تھی۔ مسعود اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد بھی اپنا زیادہ تر وقت اسپتال میں ہی گزارتا رہا اور ناصر کے ساتھ اس کے تیماردار کے طور پر یوں اس سے خواجہ صابر علی کو بہت آسانی ہوگئی۔ ان لوگوں کو اتنی دور سے بار بار اسپتال آنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ مسعود سے زیادہ بہتر طور پر بھلا ناصر کی دیکھ بھال اور کون کرسکتا تھا۔

سرکاری اسپتال تھا۔ آپریشن اور ڈاکٹر وغیرہ کی کوئی فیس نہیں تھی لیکن دواؤں اور دیگر بہت ساری چیزوں کے اخراجات تو بہرحال خود ہی دینے ہوتے تھے۔ یہ سارے اخراجات خواجہ صابر علی نے برداشت کئے ایک ہفتے کے بعد ناصر اسپتال سے گھر آیا۔ مسعود جو اب تک اس کے ساتھ تھا۔ وہ بھی واپس گھر آگیا۔ ناصر ابھی چلنے پھرنے کے بالکل قابل نہیں تھا۔ اس کو تو ابھی کئی ماہ تک بستر پر ہی پڑا رہنے کی ضرورت تھی۔

"شکر ہے کہ اس کی ٹانگ بچ گئی۔" ڈاکٹر نے مسعود سے کہا تھا۔ "ہڈی اس بری طرح سے ٹوٹی ہوئی تھی کہ اس کو جوڑنا بہت مشکل تھا بس یہ ایک معجزہ ہی سمجھو کہ اس



کی ٹانگ بچ گئی۔ ورنہ اگر اس کی ٹانگ کاٹ دی جاتی تو یہ عمر بھر کے لئے معذور ہو جاتا۔"

مسعود کے پورے جسم پر رعشہ دوڑ گیا تھا۔ "الٰہی۔ خدانخواستہ اگر کہیں ایسا ہوتا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو پھر کیا ہوتا؟ ناصر کو ایک ٹانگ کے سہارے زندگی گزارنی پڑتی اُف خدایا۔ ایک ٹانگ والا ناصر۔ بیساکھی کے سہارے۔ اچک اچک کر' اچھل اچھل کر چلنے والا ناصر۔" اس کے دماغ کی رگیں جیسے پھٹنے لگیں۔

ناصر اور مسعود دونوں اپنے اپنے وجود کی توانائیوں کے ایک خاص حصے کو اسپتال کی نذر کرنے کے بعد واپس گھر آگئے اور یہاں اب زندگی ایک مختلف رنگ اختیار کرچکی تھی۔

ان دونوں کے زخمی ہونے کے بعد سے دکان ایک دن کے لئے بھی نہیں کھلی تھی۔ وہ اسی طرح بند پڑی تھی کیونکہ ایک اور کام کرنے والا رہ گیا تھا۔ تو اب باڑے کا سارا کام بھی اکیلے حامد کے سر پر آن پڑا تھا۔ اس کو پورا کرنا اس کے لئے مشکل ہو جاتا تھا پھر وہ دوسرا کوئی کام بھلا کیا کرسکتا تھا۔ دکان کے بند ہونے کی صورت میں روزانہ کا خاصا بڑا نقصان ہو رہا تھا۔

خواجہ صابر علی تھانے کے چکر لگا لگا کر تھک چکا تھا لیکن پولیس نے اصل ملزموں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔ بلال آزاد گھوم رہا تھا اور کسی نے اس کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ خواجہ صابر علی نے تھانیدار سے بار بار کہا تھا کہ ناصر کے بیان کے مطابق بلال حملہ آوروں میں سے ایک تھا۔ اس کو گرفتار کیا جانا چاہئے لیکن پولیس نے اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ پولیس نے اس معاملے کے سلسلہ میں کسی ایک شخص کو بھی گرفتار نہیں کیا تھا۔ ایک ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔

خواجہ صابر علی اس صورت حال سے بہت زیادہ بددل تھا پہلے تو سیاستدانوں نے اس کو دربدر کردیا تھا اور اس کے ہنستے بستے گھر کو اجاڑ کر اس کو وہاں سے میلوں دور لا کر پھینکا تھا اور اب علاقے کے بدمعاش اس کے پیچھے لگ گئے تھے وہ اس کو کاروبار نہیں کرنے دے رہے تھے اور ان لوگوں کو علاقے کی پولیس کی مکمل پشت پناہی حاصل تھی وہ اپنی جگہ سے اکھڑ چکا تھا اور اس کا کاروبار بری طرح تباہ ہو رہا تھا۔ دکان بند پڑی تھی ناصر صاحبِ فراش تھا اور مسعود اس کی دیکھ بھال میں لگا رہتا۔

سارے ہی معاملات گڑبڑ ہوگئے تھے۔ خواجہ صابر علی نے مسعود کو اب حامد کے

ساتھ باڑے کے کام میں لگا دیا تھا دکان کا کام تو فی الحال تھا نہیں اور مٹھائیاں بنانے کا کام بھی نہیں تھا۔ مسعود' حامد کے ساتھ باڑے میں کام کرنے لگا اور دل میں سوچتا تھا کہ یہ ایک طرح سے اس کے لئے اچھا ہی ہوا ہے کیونکہ اس طرح اس کو سارا دن ناصر کے قریب رہنے کا اور اس کی دیکھ بھال کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔ اگر وہ دکان پر چلا جاتا تو پھر اس کا سارا دن ناصر سے الگ گزرتا اور ناصر کی دیکھ بھال صرف مسعود ہی کر سکتا تھا۔ جس کو پہلے ہی بہت کام تھا۔ ناصر سارا وقت بستر پر پڑا رہتا تھا اور اسے اس تکلیف دہ صورت حال سے سخت الجھن اور کوفت ہوتی تھی۔ وہ تو پہلے کی طرح چلنا' پھرنا' دوڑنا' بھاگنا' کام کرنا اور مصروف رہنا چاہتا تھا لیکن اس کی حالت تو یہ ہوگئی تھی کہ وہ اپنی ٹانگوں پر کھڑا بھی نہیں ہو سکتا تھا اور ابھی تو کافی عرصہ اس کو بستر پر پڑے رہنے کی ضرورت تھی۔ وہ بہت دبلا اور کمزور ہوگیا تھا اور اگر اس حالت میں اس کے گھر والے اس کی شکل دیکھتے تو شاید وہ اس کو پہچان بھی نہیں سکتے تھے۔ وہ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا تھا۔

"ہمارے گھر جانے میں تو پھر دیر ہوگئی۔" اس رات ناصر نے بڑی حسرت اور اداسی کے ساتھ مسعود سے کہا جو ابھی ابھی اس کے کھانے کے برتن دھو کر واپس آیا تھا اور اس کے پاس چارپائی پر بیٹھ گیا تھا۔ "ہم تو سوچ رہے تھے کہ ہم اب جلد ہی یہاں سے اپنے گھر کے لئے روانہ ہو جائیں گے' لیکن میں تو اب چلنے پھرنے کے قابل بھی نہیں رہا۔"

"تھوڑی بہت دیر سویر سے کیا فرق پڑتا ہے۔" مسعود نے اس کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ "خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرو کہ تمہاری جان بچ گئی اور تمہاری ٹانگ بچ گئی۔ اگر خدانخواستہ کچھ اونچ نیچ ہو جاتی تو کیا ہوتا۔ کیا تم صرف ایک ٹانگ کے ساتھ گھر جانا پسند کرتے اور کیا حال ہوتا تمہاری ماں کا اور تمہاری بہنوں کا تمہیں اس حال میں دیکھ کر؟"

"اگر ایسا ہوتا تو پھر میں کبھی بھی گھر واپس نہ جاتا۔" ناصر نے بجھے ہوئے مضمحل لہجے میں کہا۔ "میں کبھی کبھی سوچتا ہوں تو مجھ کو احساس ہوتا ہے کہ میں نے ان لوگوں کو بہت دکھ دیئے ہیں۔ اب میں انہیں اس سے زیادہ دکھ نہیں دے سکتا تھا۔ میں تو پھر گھر جاتا ہی نہیں۔ کبھی نہ جاتا' بس تمہارے ہاتھ پیسے بھجوا دیتا تاکہ حاجی کا قرضہ ادا ہو جائے اور اماں اطمینان کا سانس لے سکیں۔ میں تو جیسے بھی ہوتا' جو بھی ہوتا' میں کراچی میں ہی رہتا اور گزارے کی کوئی نہ کوئی صورت نکال لیتا۔ آدمی کوشش کرے تو گزر بسر کی کوئی نہ کوئی صورت تو پیدا ہو ہی جاتی ہے یار۔" اس کے لہجے میں بڑی بے بسی تھی۔

"شکر ہے' ایسا کچھ نہیں ہوا۔" مسعود نے کہا۔ "تم تیزی سے صحت یاب ہو رہے



ہو اور انشاء اللہ جلد ہی بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔ بس پھر دونوں ساتھ ساتھ گھر چلیں گے۔"

خواجہ صابر علی کی دکان کی مصروفیت اس سے چھن گئی تھی۔ وہ اب زیادہ تر وقت گھر پر رہتا تھا اور باڑے کے کاموں میں یا گھر کے دوسرے کاموں میں مصروف رہتا تھا۔ بگڑے ہوئے حالات ابھی تک اس کے قابو میں نہیں آسکے تھے اور اس کو سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے دو ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ ہر دن اس کے لئے کاروباری خسارے کا دن ہوتا تھا' کیونکہ آمدنی کا ایک اہم ذریعہ بند ہوگیا تھا اور پولیس نے تو ابھی تک اس سارے معاملے میں کوئی عملی کارروائی نہیں کی تھی۔ خواجہ صابر علی اپنے آپ کو بالکل غیر محفوظ تصور کر رہا تھا۔

اس روز شام کو درزی ظفر علی اس سے ملاقات کے لئے اس کے گھر آیا۔ وہ اب اپنی دکان کا سودا کر کے ملتان جانا چاہتا تھا۔ وہ خواجہ صابر علی کے پاس اس لئے آیا تھا کہ اس سے دکان بیچنے کی بات کر سکے۔

"میں کیا کروں بھائی ظفر علی....." خواجہ صابر علی نے برہمی آمیز اداسی کے ساتھ کہا۔ "میری اپنی دکان بھی اب تک بند پڑی ہے۔ پولیس کو ملزموں کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے' باوجود اس کے ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرتی۔ ناصر نے اپنی آنکھوں سے بلال کو دیکھا تھا۔"

"پولیس ان کے خلاف کوئی کارروائی کرے گی ہی نہیں۔" ظفر علی نے کہا۔ "بشیر پہلوان اس علاقے کا چھٹا ہوا بدمعاش ہے اور اس کے پولیس والوں سے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ مال کھلاتا ہے پولیس والوں کو۔ وہ بھلا اس کے بھائیوں کے خلاف کوئی کارروائی کیوں کرنے لگے۔ صاف ظاہر ہے کہ پہلے بھی دو مرتبہ تمہاری دکان کے ساتھ جو کچھ ہوا انہی لوگوں نے کروایا تھا۔ یہ لوگ نہیں چاہتے کہ اس علاقے میں ان کے علاوہ کوئی اور مٹھائیوں کی دکان کھولے اور انہیں پولیس کی پوری سرپرستی حاصل ہے اس مسئلے کا تو بس ایک ہی حل میری سمجھ میں آتا ہے۔"

"وہ کیا؟" خواجہ صابر علی نے جلدی سے پوچھا۔

"ڈی آئی جی کو ایک درخواست دو۔" ظفر علی نے کہا۔ "اس میں یہ سارے واقعات لکھ دو' مقامی تھانے کے عملے کے رویے کے بارے میں بھی سب کچھ صاف صاف لکھ دو اور یہ لکھ دو کہ پولیس جان بوجھ کر ملزموں کو گرفتار نہیں کر رہی ہے اور

اس نے ان کو کھلی چھوٹ دے رکھی ہے۔ انشاء اللہ درخواست پر ضرور کارروائی ہوگی۔"

ظفر علی چلا گیا اور خواجہ صابر علی نے گھر میں آکر حنیفہ اور طاہر علی سے اس بارے میں گفتگو کی۔ حنیفہ نے اس معاملے میں قدرے تذبذب کا اظہار کیا۔ "اور اگر کچھ نہیں ہوا' کوئی کارروائی نہیں ہوئی' تو خواہ مخواہ کی دشمنی بڑھے گی' پولیس والوں سے بھی اور بدمعاشوں سے بھی۔"

"تو اب کون سی دوستی ہے ان لوگوں سے؟" خواجہ صابر علی نے کہا۔ "نقصان تو وہ ہم کو اب بھی پہنچا رہے ہیں آج اتنے دن ہوگئے ہیں دکان بند پڑی ہوئی ہے۔ لڑکے الگ مرتے مرتے بچے۔ آخر ہم یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے تو نہیں بیٹھے رہ سکتے۔"

"کوشش کرکے دیکھ لو۔" حنیفہ نے دبی زبان سے کہا۔ "لیکن مجھے کوئی زیادہ امید نہیں ہے' کون سنتا ہے۔ یہاں لوگوں کے ساتھ کیسی کیسی زیادتیاں ہو رہی ہیں اور کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔"

خواجہ صابر علی نے طاہر علی سے کہا کہ وہ واقعات کی تفصیل کو ذرا ٹھیک سے لکھ دے اور طاہر علی نے ایک مسودہ تیار کردیا جس میں اب تک کے سارے واقعات کی تفصیل درج تھی اور پھر اگلے دن صابر علی وہ مسودہ لے کر ظفر علی کے گھر پہنچا۔ ظفر علی نے اس کی ملاقات اپنے پڑوسی منشی سے کرا دی۔ منشی کے پاس اس وقت کچھ اور لوگ بھی بیٹھے تھے۔ منشی نے اس مسودے کو غور سے پڑھا اور کہا کہ اس کو ٹھیک طریقے سے دوبارہ لکھ کر ایک اور درخواست کی شکل دے دے گا۔

اسی دن بلال نے حامد کو باڑے سے باہر بلوا کر اس سے تنہائی میں بات کی۔

"میں نے سنا ہے کہ خواجہ صابر علی میرے خلاف ڈی آئی جی کو کوئی درخواست دے رہا ہے!" اس نے آنکھیں نکال کر درشت لہجے میں حامد سے پوچھا۔ حامد کو اس بارے میں سب کچھ معلوم تھا گھر کے سب لوگوں کو سب کچھ معلوم تھا خواجہ صابر علی کے گھر میں کوئی بھی بات ڈھکی چھپی نہیں رہتی تھی۔ یہاں پر جو کچھ بھی ہو رہا تھا وہ حامد کے علاوہ مسعود اور ناصر کو بھی معلوم رہتا تھا۔ پھر بھی حامد نے محتاط رویہ اختیار کیا اور بلال سے کہا۔ "تم خواجہ صاحب سے خود کیوں نہیں بات کر لیتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور کیا نہیں کر رہے ہیں مجھے اس بارے میں کیا معلوم؟"

"اس کو سمجھا دینا۔" بلال نے اس کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے کہا۔ "اچھی طرح سمجھا دینا اس قسم کی کوئی حرکت نہ کرے اگر اس نے ایسی کوئی حرکت کی تو اس کے



اکلوتے بیٹے کی جان کی خیر نہیں۔ چھوکرا ناصر خواہ مخواہ میرا نام لے رہا ہے۔ بھلا میرا اس معاملے سے کیا تعلق۔ ہمیں کیا معلوم وہ حملہ آور کون تھے لیکن اگر ہمیں اس معاملے میں الجھانے کی کوشش کی گئی تو پھر ہم بھی منہ توڑ جواب دیں گے۔ پولیس تو خیر ہمارا کیا بگاڑ لے گی لیکن صابر علی پھر زندگی بھر اپنے بیٹے کے لئے روتا رہے گا۔ اس کو اچھی طرح سے سمجھا دینا اور یہ بھی سمجھا دینا کہ دکان اب وہ بھول ہی جائے تو اچھا ہے۔"

بلال کے لب و لہجے میں مکمل بے خوفی تھی۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے اور اپنے بھائیوں کے تمام جرائم کا برملا اعتراف بھی کر رہا تھا اور ان کی منافقانہ تردید بھی۔ اور وہ اس یقین اور اعتماد کے ساتھ بات کر رہا تھا کہ کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس کے لب و لہجے کی کرختگی چہرے کی درشتی' آنکھوں سے نکلنے والے شعلوں اور باچھوں سے بہنے والے کف سے اس کی خفیہ طاقت کا اظہار ہو رہا تھا۔

بلال' حامد کو اچھی طرح دھمکیاں دے کر چلا گیا اور جاتے جاتے یہ کہہ گیا کہ وہ خواجہ صابر علی کو اچھی طرح سمجھا دے کہ اوپر جانے کی کوشش نہ کرے ورنہ اس کے نتائج ہی خطرناک نتائج اس کو بھگتنے ہوں گے۔

حامد نے اس کی ساری بات جوں کی توں' خواجہ صابر علی کو پہنچا دی۔ حنیفہ اور طاہر علی بھی وہاں موجود تھے۔

"میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ ان لوگوں سے الجھنا ٹھیک نہیں ہے....." حنیفہ نے سہم کر کہا۔ "یہ خطرناک لوگ ہیں اور پولیس بھی ان سے ملی ہوئی ہے۔ یہ ہم کو سخت نقصان پہنچائیں گے....."

"عجیب بات کرتی ہو تم۔" خواجہ صابر علی نے برہمی کے ساتھ کہا۔ "کیا مطلب ہے تمہارا میں ڈر کر بیٹھ جاؤں اور ان لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کروں جو کھلم کھلا بدمعاشی اور غنڈہ گردی کرتے پھر رہے ہیں؟ میں ان کے خلاف درخواست ضرور دوں گا۔ ورنہ یہ لوگ....."

"نہیں صابر علی!" حنیفہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "خاک ڈالو دکان پر اور اس قصے پر' میں اپنے اکلوتے بیٹے کی جان کو خطرے میں نہیں ڈالنے دوں گی۔ ہرگز نہیں' میں سب کچھ چھوڑ سکتی ہوں' لیکن اپنے بیٹے کی جان کے لئے خطرہ مول نہیں لے سکتی۔" اور اس کے ساتھ ہی وہ زار و قطار رونے لگی۔ صابر علی خاموش تھا۔ طاہر علی بھی خاموش تھا۔ حامد بھی خاموش تھا۔

"وہ۔ وہ تو اتنے سارے ہیں۔" حنیفہ نے روتے ہوئے کہا۔ "چھ چھ سنڈے مشٹنڈے بھائی ہیں اور ان کے ساتھ اور بھی نہ جانے کتنے لوگ ہیں' یہاں کون ہے؟ لے دے کر ایک باپ اور ایک بیٹا۔ اگر خدانخواستہ تم دونوں میں سے کسی کو کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گی۔ میرا تو اس دنیا میں اور کوئی بھی نہیں۔"

کافی سوچ بچار کے بعد خواجہ صابر علی نے ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کر لیا اس کی بیوی ٹھیک کہتی تھی۔ اسے اپنے اکلوتے بیٹے کی جان کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہئے تھا۔ کاروبار کے تو اور بھی طریقے تھے کچھ اور بھی کیا جا سکتا تھا۔ دنیا بہت وسیع تھی' کچھ دن تک خسارہ بھی برداشت کیا جا سکتا تھا لیکن بیٹا تو دوبارہ نہیں مل سکتا تھا۔ لے دے کے ایک ہی تو سہارا تھا بڑھاپے کی لاٹھی' ماں باپ کی آنکھوں کا تارا۔ اسے ضائع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اسے کچھ بدمعاشوں کی بدمعاشی کی بھینٹ نہیں چڑھایا جا سکتا تھا۔

حنیفہ اپنے شوہر کے اس فیصلے سے نہال ہو گئی۔ "ہم دکان کو بیچ دیں گے۔ اس دکان کو بیچ کر کسی دوسری جگہ دکان لیں گے یا کچھ اور کام کر لیں گے۔ ابھی دودھ کا کاروبار تو چل ہی رہا ہے۔ دکان کے بغیر ہم کوئی بھوکے تو نہیں مر جائیں گے۔"

چنانچہ دکان کو فروخت کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا..... اور یہ بھی فیصلہ کر لیا گیا کہ اس علاقے میں کوئی دکان نہیں کی جائے گی۔ فی الحال کسی دوسری جگہ بھی دکان کا منصوبہ نہیں بنایا گیا۔ حنیفہ تو یہاں تک کہتی تھی کہ اگر صحیح پیسے مل جائیں تو اس جگہ کو بھی بیچ دیں اور کسی دوسری جگہ پلاٹ لینے کی کوشش کریں۔ جب برسوں پرانا گھر چھوٹ گیا تو پھر تو کہیں بھی رہا جا سکتا تھا۔

خواجہ صابر علی اور اس کی بیوی کے اس فیصلے نے گھر کے حالات کو بالکل بدل ڈالا اور مسعود اور ناصر کو زندگی نے ایک بار پھر ایک حیران کن اور اذیت ناک موڑ پر لا کر کھڑا کر دیا۔ جہاں سے بے سروسامانی کا لباس پہنے ہوئے کئی وحشتیں ان کی منتظر تھیں۔

دکان کے ختم ہو جانے کی صورت میں مسعود کا پورا اور ناصر کا تقریباً آدھا کام بھی ختم ہو گیا تھا۔ اب نہ مسعود کو سارا دن دکان پر بیٹھنے کی ضرورت تھی اور نہ ناصر کو مٹھائیاں بنانے کی' ویسے تو ناصر ابھی صاحبِ فراش ہی تھا اور اس کے پوری طرح ٹھیک ہونے میں ابھی وقت باقی تھا۔

"اب ہم یوں کرتے ہیں کہ مسعود کو حامد کے ساتھ باڑے کے کام پر لگا دیں گے۔" خواجہ صابر علی نے تازہ ترین صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی بیوی حنیفہ



سے کہا۔ "وہ باڑے کا کام کرے گا اس کے علاوہ گھر کے اور دوسرے کام کاج بھی۔ اس طرح فی الحال کچھ دنوں تک اس کو تو اپنے پاس کھپا سکتے ہیں اور جہاں تک ناصر کا تعلق ہے تو ابھی فی الحال ہمارے پاس اس کے لئے کوئی کام نہیں ہے لیکن جب تک وہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہوتا اس وقت تک اس کو یہاں رہنے دیتے ہیں ٹھیک ہو جانے کے بعد تو وہ خود ہی گھر جانے کے لئے تیار بیٹھا ہے۔"

"ہاں۔" حنیفہ نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔ "وہ دونوں بھی اب جانے والے ہیں۔ مسعود تو جب تک یہاں ہے باڑے میں کام کرے گا۔ وہ ہمارے لئے فالتو بوجھ نہیں ہے گا۔ البتہ ناصر بے چارہ تو ابھی مجبور ہے جب تک وہ چلنے پھرنے کے قابل نہ ہو جائے اس وقت تک وہ کہیں نہیں جا سکتا لیکن..... کیا ہم اب اس کی تنخواہ دیں گے؟"

خواجہ صابر علی کے چہرے پر تھکن کے آثار پیدا ہوئے۔ بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ رویے بدل رہے تھے۔ بدلتی ہوئی ضروریات کے ساتھ جذبے بدل رہے تھے۔

"تنخواہ؟" اس نے آہستہ سے کہا۔ "ہم اس کو کھانا وغیرہ تو دے رہے ہیں۔ رہنے کے لئے جگہ بھی اس کو دے رکھی ہے لیکن تنخواہ بغیر کام کے کس طرح دی جا سکتی ہے؟ اب کوئی کام تو کر نہیں رہا ہے....."

"ہاں میں بھی یہی سمجھتی ہوں۔" حنیفہ نے فوراً اپنے شوہر کی بات سے اتفاق کیا۔ "اب جب تک وہ ٹھیک ہو کر اپنے گھر جانے کے قابل نہیں ہو جاتا' اس وقت تک وہ یہاں رہ سکتا ہے۔ کھانے پینے کی کوئی بات نہیں ہے۔ مسعود بھی اس کے ساتھ موجود ہے وہ اس کی دیکھ بھال کرتا رہے گا لیکن اب ہم اس کو تنخواہ تو نہیں دے سکتے۔"

"ہمارے حالات بھی تو اتنے زیادہ خراب ہو گئے ہیں۔" خواجہ صابر علی نے آہستہ سے کہا۔ "اگر اس وقت میرے پاس کچھ زیادہ پیسے ہوتے تو بھی اس کو دے دیتا۔ لیکن ہاتھ تو آج کل خود تنگ ہو رہا ہے۔"

"اور کتنے پیسے اس کے علاج وغیرہ کے سلسلے میں خرچ ہو چکے ہیں۔" حنیفہ نے کہا۔ "ہم نے اس کے پیسوں میں سے تو کچھ بھی نہیں لیا۔ اپنے ہی پاس سے خرچ کرتے رہے۔"

"چلو' جو ہو گا سو ہو گا....." خواجہ صابر علی نے کہا۔ "اب تو اسی طرح کرنا ہے۔"

"تو تم ان دونوں کو یہ بات بتا دو۔" حنیفہ نے کہا۔ "انہیں معلوم ہو جانا چاہئے کہ

اب کیا صورتِ حال ہے۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔" خواجہ صابر علی نے کہا۔ "میں ان کو بتا دوں گا۔" اور اگلے دن اس نے ان دونوں کو یہ بات بتا دی۔

"ٹھیک ہے چاچا....." مسعود نے اس کی بات سن کر کہا۔ "جیسا آپ چاہیں آپ کے بہت احسانات ہیں ہم لوگوں پر۔ بس ناصر ذرا چلنے پھرنے کے لائق ہو جائے پھر ہم لوگ یہاں سے جائیں گے..... اور....."

"اور پھر تم کو واپس بھی آنا ہے۔" خواجہ صابر علی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تب تک ہم شاید کوئی ایسی صورت نکال لیں کہ ہمارے پاس ناصر کے لئے کوئی گنجائش نکل آئے اور جہاں تک تمہارا تعلق ہے تو تمہارے لئے تو ہمارے پاس کام ہے۔"

خواجہ صابر علی کچھ دیر ان کے ساتھ رہا اور پھر چلا گیا۔ دونوں بہت افسردہ تھے لیکن انہیں صابر علی سے کوئی شکایت نہیں تھی اس کے حالات ہی ایسے ہو گئے تھے کہ وہ مجبور تھا اس نے دکان ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا تو پھر اس کے پاس کام کہاں سے آتا؟

"جب تک تم ٹھیک نہیں ہو جاتے' تب تک ہم یہاں ہیں۔" مسعود نے ناصر سے کہا۔ "اس کے بعد گھر چلیں گے' اور پھر وہاں سے واپس آ کر نئے سرے سے کوئی کام تلاش کر لیں گے کسی ایسی جگہ کام ڈھونڈ لیں گے جہاں ہم دونوں ساتھ رہ سکیں۔ اگر صابر چاچا کے ہاں نہ سہی تو کہیں اور کہیں نہ کہیں تو کام مل ہی جائے گا۔"

"ہاں یار۔" ناصر نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "آدمی کو کام کرنے کے قابل ہونا چاہئے تو کام کی کمی نہیں ہے یہاں' ہو سکتا ہے صابر چاچا کے حالات ہی بہتر ہو جائیں....."

مسعود کو اس بات کا بڑا ملال تھا کہ وہ اپنے دوست یامین کی کوئی مدد نہ کر سکا۔ خواجہ صابر علی سے اس کی بات ہو گئی تھی اور صابر علی نے یامین کو کام دینے پر آمادگی بھی ظاہر کر دی تھی لیکن پھر کچھ گڑبڑ ہو گئی ناصر کی نوکری ختم ہو گئی اور خود اس کی اپنی نوکری بھی ٹھیک نہیں رہی۔ اس نے یامین کو سب کچھ بتا دیا۔ یامین کو خود بھی سارے حالات کا علم تھا۔

"کوئی بات نہیں یار۔" اس نے مسعود سے کہا۔ "اصل بات یہ ہے کہ صابر چاچا ان بدمعاشوں سے ڈر گئے۔ اگر وہ ذرا ہمت سے کام لیتے تو کچھ دوسرے لوگ بھی ان کا ساتھ دیتے اور ان کا کاروبار تباہ نہ ہوتا۔ مگر..... خیر۔"



"وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی وجہ سے ڈرتے ہیں۔" مسعود نے کہا۔ "وہ نہیں چاہتے کہ اس کو کوئی نقصان پہنچے۔"

تقریباً دو ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ ناصر اب کھڑا ہونے لگا تھا اور تھوڑا بہت چل بھی سکتا تھا۔ پچھلے ہفتے مسعود اسے چیک اپ کے لئے اسپتال لے گیا تھا اور ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ایک ماہ کے بعد وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا' ایک عام آدمی کی طرح چلنے لگے گا اس دوران خواجہ صابر علی نے دکان تو فروخت کر دی تھی لیکن ابھی کوئی متبادل کام شروع نہیں کیا تھا۔ یامین نے مسعود کو بتایا تھا کہ عنقریب اسے کوئی بہت اچھی نوکری ملنے والی ہے۔ اس نے تفصیل نہیں بتائی تھی۔ "جب مل جائے گی تو بتاؤں گا۔" اس نے کہا تھا۔

اس رات یامین مسعود کے پاس آیا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ "دوبئی چلو گے؟" اس نے خوشی سے سرشار لہجے میں پُراسرار سرگوشی کے انداز میں مسعود سے پوچھا اور مسعود آنکھیں پھاڑ کر اس کی شکل دیکھنے لگا۔

"کیا کہا۔" مسعود نے بمشکل اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "دوبئی؟" ناصر بھی حیرت اور مسرت کے عالم میں یامین کو دیکھ رہا تھا۔

"ہاں دوبئی!" یامین نے چہکتے ہوئے کہا۔ "بات یہ ہے کہ مجھ کو دوبئی میں نوکری مل گئی ہے۔ میں عنقریب جانے والا ہوں۔ اتنے پیسے کماؤں گا اتنے پیسے کماؤں گا کہ یہاں والے تو اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ جو لوگ دوبئی جاتے ہیں وہ تو وہاں اس قدر کماتے ہیں کہ کچھ نہ پوچھو میں بھی بہت کماؤں گا اور اگر تم چاہو تو تم بھی میرے ساتھ چل سکتے ہو۔ میں ایک لڑکے کو اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ تم چلو۔ تم سے زیادہ اچھا میرے لئے بھلا اور کون ہو سکتا ہے؟"

مسعود اور ناصر دونوں کو کراچی آنے کے بعد یہ بات اچھی طرح معلوم ہو چکی تھی کہ کراچی کے آگے سمندر پار کوئی جگہ دوبئی ہے' کوئی سعودی عرب ہے' کوئی مڈل ایسٹ ہے' جہاں زمین سے پیسہ اگتا ہے اور آسمان سے پیسہ برستا ہے اور پاکستان سے لاکھوں لوگ ان جگہوں پر جا جا کر نوکریاں کرتے ہیں' محنت کرتے ہیں اور ذرا سے عرصے میں بیحد مالدار بن جاتے ہیں۔ ان کے پاس اتنا بہت سا پیسہ آ جاتا ہے کہ ان کی سات پشتوں نے بھی کبھی نہ دیکھا ہو گا لیکن ہر شخص کے لئے وہاں جانا ممکن نہیں تھا اور اس کے لئے پتہ نہیں کیا کیا کرنا پڑتا تھا اور کس کس قسم کے پاپڑ بیلنے پڑتے تھے۔ اب جو مسعود نے یہ سنا کہ یامین کو دوبئی میں نوکری مل رہی ہے اور وہ اس کو بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے تو

اس کے سارے وجود میں مسرت ہیجان' اضطراب اور سرور کی لہریں دوڑنے لگیں۔

"مگر..... مگر..... تم کس طرح دوبئی جا رہے ہو؟" اس نے جلدی جلدی گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "میں نے تو سنا ہے کہ وہاں صرف آدمیوں کو نوکری دیتے ہیں۔ میرا مطلب ہے بچوں اور لڑکوں کو نوکری نہیں دیتے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" یامین نے کہا۔ "لیکن وہاں پہنچ جانے کے بعد سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ بڑے بڑے شیخ ہیں وہاں' جن کے محلوں میں سونے کی اینٹیں لگی ہوئی ہیں اور ہیرے جواہرات کے دروازے ہیں۔ ان محلوں میں لڑکوں کو نوکری مل جاتی ہے اور پھر وہ ساری زندگی عیش کرتے ہیں۔ جب تک جی چاہے نوکری کریں اور ڈھیروں روپے کما کما کر اپنے گھر والوں کو بھیجتے رہیں اور جب کمانے سے جی بھر جائے تو واپس اپنے گھر چلے جائیں۔ مجھے ایک آدمی اپنے ساتھ لے جائے گا۔ اس کے پاس ایک اور لڑکے کی گنجائش ہے۔ اگر تم راضی ہو تو میں اس سے کہوں کہ تم کو ساتھ لے لے۔"

"چلے جاؤ مسعود۔" ناصر نے فوراً کہا۔ "اس سے اچھا موقع پھر نہیں ملے گا۔ یہاں صابر چاچا کے پاس تو اب زیادہ کام بھی نہیں ہے۔ صرف باڑے کا ہی تو کام رہ گیا ہے۔ حامد چاچا کر لیتے ہیں اور صابر چاچا خود بھی سنبھال لیں گے۔ روزانہ دو چار گھنٹے کے لئے کسی لڑکے کو ملازم رکھ لیں گے۔ تم چلے جاؤ۔"

"اور..... اور تم.....؟" مسعود نے الجھتے ہوئے کہا۔ "تم کیا کرو گے؟"

"میں بھی کچھ نہ کچھ کر لوں گا یار۔" ناصر نے ایک پھیکی ہنسی کے ساتھ کہا۔ "ابھی تو مجھے ٹھیک ہونے میں وقت لگے گا پھر گھر جانا ہے پھر دوبارہ یہاں واپس آؤں گا۔ اگر وہاں جانے کے بعد کوئی صورت نکلے تو مجھ کو بھی بلا لینا۔ ورنہ یہاں کہیں نہ کہیں تو کام تلاش کر ہی لوں گا بس خدا کرے میری ٹانگ ٹھیک ہو جائے۔"

"وہ انشاء اللہ ضرور ٹھیک ہو جائے گی۔" مسعود نے کہا اور پھر وہ یامین سے مخاطب ہو کر بولا۔ "جانا کب ہو گا؟ اور اس کے لئے مجھے کیا کرنا ہو گا؟ ہم لوگ تو اس بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔"

"تمہیں کچھ کرنا بھی نہیں ہو گا۔" یامین نے کہا۔ "سوائے اس کے کہ جب تم کو پہلے مہینے کی تنخواہ ملے تو وہ ساری کی ساری چاچا سکندر خان کو دے دینی ہو گی۔ یہ گویا اس کا محنتانہ ہو گا۔ بس پھر اس کے بعد آرام سے نوکری کرتے رہو اور کماتے کھاتے رہو۔"

"چاچا سکندر خان کون ہے؟" مسعود نے پوچھا۔



"یہ وہ آدمی ہے جو مجھے لے جا رہا ہے اور اس نے وہاں میرے لئے نوکری کا بندوبست کیا ہے۔" یامین نے کہا۔ "وہی تمہارے لئے بھی نوکری کا بندوبست کر دے گا اور ہماری ایک ایک ماہ کی تنخواہ اپنے معاوضے کے طور پر لے لے گا۔ وہی ہمیں ساتھ لے جانے کا سارا بندوبست کرے گا۔ ویزا' پاسپورٹ' جہاز کا ٹکٹ سب کچھ وہی کرے گا بس کوئی مہینے بھر کے بعد روانگی ہے۔ اگر تم تیار ہو تو میں تم کو چاچا سکندر خان کے پاس لے چلوں گا اور اس سے تمہاری بات کرا دوں گا۔ اس نے خود بھی مجھ سے کہا تھا کہ میں تم سے بات کروں۔"

"اچھا؟" مسعود نے حیرت سے کہا۔ "کیا وہ مجھ کو جانتا ہے۔؟"

"بہت سارے لوگ تم کو جانتے ہیں جن کو تم نہیں جانتے کیونکہ تم تو دکان پر بیٹھتے تھے۔" یامین نے کہا۔ "وہاں کتنے بہت سارے لوگ آیا کرتے تھے اور تم دونوں کے بارے میں بہت سارے لوگوں کو معلوم ہے کہ چاچا صابر علی کے پاس کام کرتے ہو۔"

"تم سکندر چاچا سے فوراً مل لو مسعود۔" ناصر نے کہا۔ "ایسا نہ ہو کہ وہ تمہاری جگہ کسی اور لڑکے کو لے لے۔"

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔" یامین نے کہا۔ "چاچا سکندر خان نے مجھ سے وعدہ کیا ہے اگر مسعود راضی ہو جائے تو وہ مسعود کو بھی ساتھ لے جائے گا لیکن بہتر ہو گا کہ تم کل ہی اس سے مل لو۔ میں تم کو اپنے ساتھ لے چلوں گا۔"

یامین کے جانے کے بعد کچھ دیر تک تو وہ دونوں حیرت' مسرت' ہیجان اور اضطراب کی ایک ایسی کیفیت کا شکار رہے کہ ان سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ گفتگو کا سلسلہ کہاں سے شروع کریں۔ پھر جب ان کے مزاجوں میں کچھ ٹھہراؤ کی کیفیت پیدا ہوئی تو انہوں نے اس تازہ صورتِ حال کے بارے میں بات چیت شروع کی۔

ان دونوں ہی کو اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ خواجہ صابر علی اور اس کے گھر والوں کا رویہ اب ان کی جانب وہ نہیں رہا تھا جو کہ پہلے تھا۔ اس رویے میں اب خشکی اور سرد مہری آ گئی تھی اور اس کی وجہ تلاش کرنا کوئی دشوار نہ تھا۔ خواجہ صابر کو اب ان لوگوں کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ ناصر تو اب بالکل ایک مدِ فاضل تھا اور جہاں تک مسعود کا تعلق تھا' تو اس کی بھی انہیں کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ وہ مسعود کے بجائے کسی جز وقتی ملازم سے بھی کام چلا سکتے تھے جس کو کم پیسے دینے پڑتے اور قیام و طعام کی سہولتیں بھی نہ فراہم کرنی پڑتیں۔ وہ لوگ ان دونوں کو ابھی تک اس لئے رکھے ہوئے

تھے کہ وہ دونوں عنقریب خود ہی وہاں سے جانے والے تھے۔ صرف ناصر کی ٹانگ کے ٹھیک ہو جانے کا انتظار تھا۔ جب تک ناصر کی ٹانگ پوری طرح سے ٹھیک نہ ہو جاتی وہ اور کہیں جا بھی تو نہیں سکتا تھا۔ ان دونوں کے پاس اس شہر میں کوئی دوسرا ٹھکانہ نہیں تھا۔

"ہمیں اب ان لوگوں پر بوجھ بن کر نہیں رہنا چاہئے مسعود۔" ناصر نے کہا۔ "یہ تو بہت ہی اچھا ہوا ہے کہ تم کو دوبئی جانے کا موقع مل رہا ہے اس موقع کو ہاتھ سے کھونا مت فوراً ہی سکندر خان سے مل لو۔ دیکھو وہ کیا کہتا ہے۔ اگر بات بن جاتی ہے تو تم ضرور چلے جاؤ۔ زندگی بن جائے گی یار' لوگ تو وہاں جا کر ڈھیروں روپے کما رہے ہیں اور وہاں جانے کے لئے ہزاروں روپے خرچ کرتے ہیں۔"

"میں بھی سوچتا ہوں کہ چلا جاؤں۔" مسعود نے کہا۔ "صابر چاچا کے حالات بھی ٹھیک نہیں ہیں۔ ہم کیوں خواہ مخواہ ان کے سر پر سوار رہیں۔ دیکھو میں کل یامین کے ساتھ سکندر خان کے پاس جاتا ہوں۔ میں اس سے کہوں گا کہ تم کو بھی ساتھ لے چلے۔ اگر تمہاری ٹانگ اس وقت تک پوری طرح ٹھیک ہو جائے۔"

"تم میری بات ابھی چھوڑ دو۔" ناصر نے کہا۔ "مجھے ابھی ٹھیک ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔ ہو سکتا ہے سکندر خان جلد ہی روانہ ہو جائے۔ چلے جاؤ یار۔ بہت کما لو گے۔ پھر تو تم اتنے مالدار ہو جاؤ گے کہ حاجی کا اینٹوں کا بھٹہ خرید لو گے۔" دونوں ہنسنے لگے۔

اگلے روز یامین مسعود کو اپنے ساتھ سکندر خان سے ملانے کے لئے لے گیا۔

سکندر خان کا تعلق بچوں کو بیرون ملک' خاص طور سے خلیجی ریاستوں میں اسمگل کرنے والے ایک مضبوط اور بااثر گروہ سے تھا جس کو اعلیٰ حکام کی سرپرستی حاصل تھی۔

سکندر خان ان دنوں لانڈھی میں رہتا تھا اور وہ کراچی اور اس کے نواح سے بچوں کو خلیجی ریاستوں میں اسمگل کرتا تھا سکندر خان نے ایک نو سالہ لڑکا لانڈھی کے ایک غریب مزدور سے حاصل کر لیا تھا اس نے مزدور کو خاصی رقم دی تھی اور مزید رقم کا یہ کہہ کر لالچ دیا تھا کہ اس کا بیٹا سکندر خان کے ساتھ دوبئی جا کر وہاں محنت مزدوری کرے گا اور بھاری رقم کمائے گا اور چند سال کے بعد واپس آجائے گا۔ غریب' مفلوک الحال' نیم فاقہ کش' سادہ لوح اور پسماندگی کے مارے ہوئے والدین نے اس کی ساری باتیں مان لی تھیں اور اسے اجازت دے دی تھی کہ وہ ان کے بیٹے یوسف کو اپنے ساتھ دوبئی لے جائے اور اب سکندر خان کو دو اور لڑکوں کی تلاش تھی۔ وہ ان تینوں کو سگے بھائیوں اور



اپنے بیٹوں کے طور پر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔

سکندر خان کی گِدھ جیسی حریص اور چیل جیسی تیز اور شکاری آنکھیں اس علاقے میں دور دور تک اپنے شکار کی تلاش میں لگی ہوئی تھیں یوسف کے بعد اس نے یامین نامی اس لڑکے کو تاڑا اور یامین کو تیار کر لینے کے بعد اب سکندر خان کو صرف ایک اور لڑکے کی ضرورت تھی۔

اگلے روز مسعود سکندر خان کے سامنے موجود تھا اور سکندر خان کی تیز اور عیار آنکھیں اس کا بغور جائزہ لے رہی تھیں۔

"تو تم نوکری کرنا چاہتے ہو دوبئی میں؟" اس نے مسعود سے پوچھا۔

"جی۔ جی ہاں۔" مسعود نے فوراً جواب دیا۔ "مجھے یامین نے بتایا تھا۔"

"دیکھو' ویسے تو نابالغ افراد کو وہاں نوکری کے لئے جانے کی اجازت نہیں ہے۔" سکندر خان نے اس کو بتانا شروع کیا۔ "اور نابالغ افراد بیرون ملک سفر نہیں کر سکتے۔ اس لئے میں تم لوگوں کو اپنے ساتھ اپنے بیٹوں کے طور پر لے جاؤں گا۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟ یعنی سفر کے دوران تم میرے بیٹے ہو گے۔ اگر کوئی پوچھے گا تو تم کو یہی بتانا ہو گا کہ تم میرے بیٹے ہو اور آپس میں سگے بھائی ہو۔ پھر جب ہم وہاں پہنچ جائیں گے تو کوئی دشواری نہیں ہو گی۔ نوکریاں تو پہلے سے تیار ہیں۔ وہاں جاتے ہی تم لوگوں کو کام سے لگا دوں گا بس پھر رات دن دولت میں کھیلتے رہنا۔" اس کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز ہنسی نمودار ہوئی۔ "لیکن پہلے مہینے کی تنخواہ میرے حوالے کرنی ہو گی۔ آخر میں جو اتنی محنت اور بھاگ دوڑ کروں گا تو اسی لئے نا کہ دو پیسے کا فائدہ مجھ کو بھی ہو۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"جی۔ بالکل ٹھیک ہے۔" مسعود نے خوشی سے سرشار لہجے میں کہا۔ "آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ بالکل ٹھیک ہے۔"

"اچھا تو پھر ایک بات اور سمجھ لو۔" اس نے کہا۔ "ابھی اس بات کا کسی سے ذکر مت کرنا۔ بہتر ہو گا کہ اپنے چاچا صابر علی سے بھی اس کا ذکر مت کرنا جب چلنے کا وقت آئے گا تب جس کو جی چاہے بتا دینا اس کی وجہ جانتے ہو؟ اگر زیادہ لوگوں کو اس بات کا پتہ چل گیا کہ میں تم لوگوں کو دوبئی میں نوکری دلوا رہا ہوں تو میرے پیچھے اتنے بہت سارے لوگوں کی لائن لگ جائے گی کہ میرا ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔ ہر شخص یہ چاہے گا کہ میں اس کو دوبئی میں نوکری دلوا دوں تو بھلا میں کس کس کو نوکری دلوا سکتا ہوں؟ یہ تو محض ایک اتفاق ہے کہ تم لوگوں کا کام بن گیا۔"

"آپ اطمینان رکھیں چاچا سکندر خان۔" مسعود نے کہا۔ "میں سوائے ناصر کے اور کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔ چاچا' ناصر کے لئے کچھ نہیں ہو سکتا؟"

"ابھی نہیں۔" سکندر خان نے اپنی تیز اور چبھتی ہوئی نظروں سے اس کو گھورتے ہوئے کہا۔ "پہلے تم چلے جاؤ وہ ابھی بیمار ہے کچھ عرصے کے بعد جب وہ پوری طرح سے صحتمند ہو جائے' پھر اس کے لئے تم خود بھی کوشش کر سکتے ہو۔ آدمی ایک جگہ خود بیٹھا ہوا ہو تو وہ بہت کچھ کر سکتا ہے۔"

"جیسا آپ کہیں چاچا سکندر خان۔" مسعود نے بڑی عاجزی اور نیازمندی کے ساتھ کہا۔ "میں تو بس یہ چاہتا تھا کہ اس کے لئے بھی کوئی راستہ نکل آتا۔ میری طرح وہ بھی غریب اور پریشان حال لڑکا ہے اور....."

"صبر سے کام لو۔" سکندر خان نے اس کی بات کاٹی۔ "وقت آنے پر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

مسعود جب سکندر خان کے پاس سے واپس آیا تو وہ جیسے ہواؤں میں اُڑ رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے آج اس کو ایک نئی زندگی مل گئی ہے۔ اس نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اس کو ملک سے باہر جا کر نوکری کرنے کا اور ڈھیروں پیسے کمانے کا موقع ملے گا۔

اس نے ناصر کے پاس پہنچ کر اس کو ساری باتیں تفصیل کے ساتھ بتا دیں۔ ناصر بڑی بے چینی کے ساتھ اس کی واپسی کا منتظر تھا اور اس کی زبانی یہ ساری باتیں سن کر وہ بہت ہی خوش ہوا۔ زندگی کی ایک نئی شکل ابھر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک نئی دنیا' خوش گوار و خوش حال مستقبل کی دنیا روشن ہو رہی تھی۔ اس کو پورا یقین تھا جب مسعود دوبئی جا کر وہاں کام کرنے لگے گا اور وہاں اس کے لئے سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا تو پھر وہ اس کو بھی دوبئی بلوا لے گا اور پھر وہ دونوں وہاں بھی ساتھ ساتھ رہیں گے اور کام کریں گے۔

"زیادہ سے زیادہ ایک ماہ کا وقت باقی ہے روانگی میں۔" مسعود نے ناصر کو بتایا۔ "میرے سلسلے میں ہی کچھ تیاریاں کرنی ہیں سکندر خان کرے گا اور اس کے بعد ہم لوگ یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔"

"ایک مہینہ کا وقت تو مجھ کو بھی پورے طور پر ٹھیک ہونے میں لگ جائے گا۔" ناصر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم دونوں ایک ساتھ گھر نہیں جا



سکیں گے۔ تم دوبئی جانے سے پہلے گھر ہو آؤ میں پھر بعد میں چلا جاؤں گا۔"

"نہیں یار!" مسعود نے کہا۔ "میں تنہا نہیں جاؤں گا۔ اگر جاتے تو دونوں ساتھ ہی جاتے۔ اب میں اکیلا جا کر کیا کروں گا؟ اور پھر اب وقت بھی زیادہ نہیں ہے۔ ہم یوں کریں گے کہ میں پیسے تم کو دے دوں گا تم ٹھیک ہونے کے بعد گھر چلے جانا اور میرے پیسے میرے ابا کو دے دینا۔ ان کو بتا دینا کہ مجھے دوبئی میں نوکری مل گئی ہے اور میں دوبئی چلا گیا ہوں اور وہاں سے بہت سارے پیسے کما کر ان کو بھیج دوں گا پیسہ ہی تو چاہئے نا ان کو اور کیا چاہئے یار۔"

کافی دیر کی گفتگو کے بعد ان کے درمیان یہ بات طے ہو گئی کہ مسعود اب گھر نہیں جائے گا بلکہ وہ سکندر خان کے ساتھ سیدھا دوبئی چلا جائے گا اور ناصر تنہا گھر جائے گا اور مسعود کے پیسے بھی ساتھ لیتا جائے گا جنہیں وہ مسعود کے ابا کے حوالے کر دے گا۔

"اور ہاں' ابھی یہاں کسی کو کچھ نہیں بتانا ہے۔" مسعود نے اس سے کہا۔ "سکندر خان نے منع کیا ہے اگر زیادہ لوگوں کو معلوم ہو جائے گا تو وہ اس کو پریشان کریں گے۔ وہ بھلا کتنے لوگوں کو دوبئی بھجوا سکتا ہے۔؟"

"ہاں' یہ بات تو ٹھیک ہے۔" ناصر نے کہا۔

"میرے جانے کے بعد تم گھر چلے جانا۔" مسعود نے کہا۔ "اور پھر کچھ دن وہاں رہ کر واپس یہیں صابر چاچا کے پاس ہی آنا۔ میرے جانے کے بعد سے باڑے میں تو ایک آدمی کی جگہ خالی ہو جائے گی۔ صابر چاچا تم کو دوبارہ رکھ سکتے ہیں اور اگر وہ نہ رکھیں تو یہیں آس پاس کسی جگہ کام تلاش کر لینا۔ یہاں تو اب سارے ہی لوگ ہم کو جان گئے ہیں۔ تم کو آسانی سے کام مل جائے گا۔ ویسے اچھا تو یہی ہو گا کہ تم کو صابر چاچا کے پاس ہی کام مل جائے کیونکہ میں وہاں سے جو خط وغیرہ بھیجوں گا وہ صابر چاچا کے پتے پر ہی بھیجوں گا اور کوئی پتہ تو ہے ہی نہیں میرے پاس۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔" ناصر نے کہا۔ "تم انہی کے پتے پر بھیجنا مجھے یہاں اگر کام نہیں بھی ملا تو بھی میں یہاں چکر لگاتا رہوں گا۔ ان لوگوں سے کہہ دوں گا کہ اگر میرا کوئی خط آئے تو مجھ دے دیں۔ مگر تم اس بات کی پوری کوشش کرنا کہ مجھے وہاں بلوا لو۔ اگر میں بھی وہاں پہنچ جاؤں تو کتنا اچھا ہو۔"

"بس ایک بار مجھے وہاں پہنچنے دو۔" مسعود نے خوشی اور کامرانی کے نشے میں ڈوب کر کہا۔ "وہاں پہنچتے ہی میں تمہارے لئے کوشش شروع کر دوں گا جس قدر جلد ممکن ہو

سکے گا میں تم کو بھی بلا لوں گا مگر فی الحال تو تم گھر جانے کے بارے میں سوچو۔ کتنا خوش ہوں گے وہ سب لوگ تم کو دیکھ کر۔ اور پھر تم اتنے بہت سارے پیسے اپنے ساتھ لے کر جاؤ گے۔ اب تو تمہارے پاس حاجی کے قرضے سے کافی زیادہ پیسے موجود ہیں۔"

"ہاں۔" ناصر نے کہا۔ "اور اگر پچھلے چند مہینوں سے میری تنخواہ بند نہ ہو جاتی تو اور بھی زیادہ پیسے ہوتے۔ مگر خیر۔ ٹھیک ہے صابر چاچا کی بھی اپنی مجبوری ہے۔ کتنا عرصہ ہو گیا گھر سے نکلے ہوئے۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ ہم لوگوں نے اگر ایک دو خط اور بھیج دیئے ہوتے اپنے گھر تو اچھا تھا۔ ہم بس ایک ہی خط بھیج کر رہ گئے۔ وہ لوگ کب سے ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" مسعود نے کہا۔ "اصل میں ہمیں اس بات کا خیال ہی نہیں آیا کہ ہم ایک آدھ خط اور بھیج دیں اگر بھیج دیتے تو اچھا تھا اور اب تو بھیجنا بے کار ہے۔ اب تو تم جانے ہی والے ہو۔"

"ہاں اب بھیجنے سے کوئی فائدہ نہیں۔" ناصر نے کہا۔ "اب تو میں خود ہی وہاں پہنچنے والا ہوں۔"

دن تیزی سے گزرتے گئے اور پھر سکندر خان نے یامین کے ذریعے مسعود کو اپنے پاس بلا کر بتایا کہ اگلے ہفتے ان کی روانگی ہے۔ اس نے مسعود کو ساری باتیں اچھی طرح سمجھا دیں۔

"ہمارے ساتھ ایک لڑکا اور ہو گا۔" اس نے کہا۔ "اس کا نام یوسف ہے۔ تم تینوں کو میں اپنے بیٹوں کے طور پر اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ کوئی بھی اگر تم سے پوچھے گا تو تم یہ بتاؤ گے کہ تم میرے بیٹے ہو۔ تمہارے باپ کا نام سکندر خان اور تمہاری ماں کا نام سکینہ ہے۔" اور وہ ان دونوں کو ہی ضروری تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔

"اور اب میں صابر چاچا کو بتا دوں؟" مسعود نے محتاط انداز میں پوچھا۔ "صرف ایک ہفتے کے بعد تو جانا ہی ہے۔"

"ہاں، اگر جی چاہے تو بتا دو۔" سکندر خان نے کہا۔ "لیکن یہ ضرور بتانا کہ میں اخراجات کی ساری رقم کے علاوہ تمہاری پہلے مہینے کی تنخواہ تم سے اپنے معاوضے کے طور پر وصول کروں گا اور یہ سب کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں تم کو اور دوسرے لڑکوں کو اپنے بیٹوں کے طور پر لے جا رہا ہوں۔ میں کس طرح سے لے جا رہا ہوں، یہ میرا کام ہے۔ میں جانوں اور میرا کام سمجھ گئے نا؟"



"جی ہاں چاچا سکندر خان، سمجھ گیا۔" مسعود نے کہا۔

"اور یہ جان لو کہ اگر عین وقت پر تمہاری وجہ سے کوئی گڑبڑ ہو گئی تو تم جانے سے رہ جاؤ گے۔" اس نے کہا۔ "سارا نقصان تمہارا ہی ہو گا میں تو کسی اور کو لے کر چلا جاؤں گا۔"

"نہیں نہیں، میں کوئی گڑبڑ نہیں ہونے دوں گا۔" مسعود نے گھبرا کر اس کو یقین دلایا۔

خواجہ صابر علی اور اس کے گھر والوں کے لئے یہ خبر انتہائی غیر متوقع اور حیران کن تھی کہ مسعود کو کسی آدمی کے ذریعے دوبئی میں نوکری مل گئی ہے اور وہ اگلے ہفتے دوبئی جا رہا ہے۔ تاہم انہوں نے مسعود کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ مسعود نے ان کو بہت محتاط انداز میں سب کچھ بتاتے ہوئے یہ کہا تھا کہ اگلے ہفتے وہ یہاں سے چلا جائے گا اور یہ کہ وہ آدمی اس کے علاوہ یامین کو بھی اپنے ساتھ لے جا رہا ہے اور ان دونوں سے وہ اس کام کا معاوضہ وصول کرے گا۔

"میرے جانے کے بعد ناصر بھی گھر چلا جائے گا۔" مسعود نے ان لوگوں سے کہا۔ "وہ میرے پیسے میرے گھر والوں کو پہنچا دے گا۔ اس کے بعد تو پھر میں دوبئی سے ان کو برابر پیسے بھیجتا رہوں گا۔ ناصر جب اپنے گھر سے واپس آئے گا تو اگر آپ لوگ چاہیں تو اس کو میری جگہ باڑے میں کام پر رکھ لیجئے گا اور اگر یہاں جگہ نہ ہو تو....."

"نہیں نہیں۔" حنیفہ نے جلدی سے کہا۔ "ناصر کو یہیں واپس آنے دو۔ ہم انشاء اللہ اس کے لئے جگہ نکالیں گے تمہارے چاچا اب ایک دوسرے کام کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔"

اس روز تنہائی میں حامد نے بڑی رازداری اور حسرت کے ساتھ مسعود سے کہا۔ "او یار تم تو بڑے چھپے رستم نکلے۔ چپکے چپکے سارا بندوبست کر لیا اور کسی کو کچھ خبر ہی نہیں یار، ذرا بات تو کرو اس سکندر خان سے کچھ میرا معاملہ بھی بنا دے۔ ساری زندگی بھینسوں کا گوبر اٹھاتے ہوئے گزری جا رہی ہے۔ کوئی نوکری مل جائے تو میں بھی باہر نکل جاؤں۔"

"یہی بات تھی۔ بالکل یہی بات تھی۔" مسعود نے دل ہی دل میں سکندر خان کی "سچائی" کا اعتراف کیا۔ "اس نے مجھ کو منع کیا تھا کہ میں اس بات کا زیادہ چرچا نہ کروں۔"

"میں۔ اس سے کہوں گا حامد چاچا۔" مسعود نے کہا۔ "لیکن شاید ابھی اس کے لئے

ممکن نہ ہو سکے۔ صرف ایک ہفتے کے بعد تو ہم لوگ جا ہی رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جانے کے انتظامات میں تو وقت لگتا ہے۔"

"پھر بھی تم اس سے بات تو کرنا۔" حامد نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔ "وہ مجھے نوکری دلا دے۔ پھر جو بھی معاوضہ وغیرہ وہ مانگے گا میں اس کو اپنی تنخواہ میں سے دے دوں گا۔ جتنا بھی مانگے گا۔ بلکہ تم مجھ کو اس سے ملا دو۔"

مسعود نے اگلے ہی دن سکندر خان سے حامد کے بارے میں بات کی اور وہ بڑے زور سے ہنسا۔ "ساری دنیا دوبئی جانا چاہتی ہے۔ ہر کوئی پیسہ کمانے کے لئے باہر جانا چاہتا ہے میں بھلا کس کس کو باہر بھیج سکتا ہوں؟ نہیں بھائی نہیں۔ اس سے کہہ دینا کہ جب میں کچھ عرصے کے بعد دوبئی سے واپس آؤں گا پھر اس سے ملاقات کروں گا۔"

اب روانگی کا وقت قریب آتا جا رہا تھا۔ مسعود کو کون سی تیاری کرنی تھی؟ بس چند جوڑے کپڑے اور کچھ دوسری عام استعمال کی چیزیں تھیں جنہیں ایک تھیلے میں ڈال لیتا تھا جو سکندر خان نے خود بازار سے خرید کر اس کو دیا تھا۔

رخصت ہوتے وقت مسعود اور ناصر' دونوں کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ دونوں اپنے جذبات پر قابو پانے کی اور خود کو رونے سے روکنے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔ دونوں کے سینوں میں ایک زبردست تلاطم برپا ہو رہا تھا جو ان کی اب تک کی زندگیوں کی ساری محرومیوں اور خوشیوں کو ساری ناکامیوں اور کامیابیوں کو اپنے اندر چھپائے ہوئے تھا۔ گھر کے سب لوگوں نے مسعود کو رخصت کیا۔

"میں خط بھیجوں گا چاچا۔" مسعود نے بھرائی ہوئی آواز میں خواجہ صابر علی سے کہا۔ "میرے خط سنبھال کر رکھ لیجئے گا۔ ناصر جب اپنے گھر سے واپس آئے گا تو اس کو دے دیجئے گا۔"

"بالکل فکر مت کرو۔" خواجہ صابر علی نے کہا۔ "ناصر جب اپنے گھر سے واپس آئے گا تو وہ یہیں رہے گا انشاء اللہ۔"

مسعود اور یامین دونوں سکندر خان کے پاس پہنچ گئے اور وہاں انہوں نے اپنے "تیسرے بھائی" یوسف کو پہلی بار دیکھا' جو ان دونوں سے عمر میں کافی چھوٹا تھا۔ سکندر نے ان تینوں کو ایک بار پھر اچھی طرح سمجھا دیا کہ ان سب لوگوں کے درمیان آپس میں کیا رشتہ ہے ان کے والدین کے نام کیا ہیں پتہ کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔

اس کے چند گھنٹوں کے بعد مسعود' ہوائی جہاز میں بیٹھا ہوا ظلم' محکومی اور غلامی کی



اس اندھی اور تاریک دنیا کی جانب سفر کر رہا تھا جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا اور جس کے بارے میں وہ ابھی کچھ نہیں جانتا تھا۔

مسعود کے جانے کے کوئی دس دن کے بعد ناصر بھی سیالکوٹ کے لئے روانہ ہو گیا۔ اس کی ٹانگ اب تقریباً بالکل ٹھیک ہو چکی تھی اور وہ کسی سہارے کے بغیر ایک عام آدمی کی طرح چل سکتا تھا۔ اس کے پاس اپنی جمع شدہ رقم کے علاوہ مسعود کی دی ہوئی وہ رقم بھی موجود تھی جو اسے مسعود کے والد کے حوالے کرنی تھی۔

☆==========☆==========☆

جب سے جنت اپنی سسرال آئی تھی تب سے وہ محبت اور نفرت کے ایک ملے جلے' دہرے تجربے سے گزر رہی تھی۔ ایک طرف تو مراد تھا جس کا وجود اس کے لئے بے پایاں محبت اور لازوال لطف و عنایت کا ایک ایسا پیکر تھا جس کی قربت میں وہ خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھنے لگتی تھی۔ مراد کی محبت کا موجیں مارتا ہوا سمندر اس کی ہستی کو اپنے اندر جذب کر لیتا تھا اور وہ اس کی گہرائیوں میں گم ہو کر سارے دکھ بھول جاتی تھی۔ اس نشاط افزا کیفیت میں کھو کر اس کو یوں لگتا تھا جیسے دنیا میں خوشیوں کے علاوہ اور کچھ ہے ہی نہیں لیکن پھر جب یہ سحر ٹوٹتا اور وہ اپنی ساس منظوراں کے سامنے ہوتی تو اس کو یوں لگتا جیسے منظوراں کی آنکھوں سے' اس کی زبان سے' اس کے ہر ہر طرز عمل سے ٹپکتا ہوا نفرت کا یہ زہر اس کو ہلاک کر ڈالے گا۔

مراد' جنت کے لئے سراپا محبت تھا اور مراد کا باپ محمد یونس بھی اپنی بہو پر مہربان تھا اور اس سے کوئی پُرخاش نہیں رکھتا تھا اور جب تک وہ دونوں گھر میں موجود رہتے تھے تب تک منظوراں قدرے خاموشی اختیار کئے رہتی لیکن اپنی پیہم ناراضگی' ناپسندیدگی اور برہمی کا برملا اظہار کرنے سے باز نہیں رہتی تھی۔ بعض اوقات تو یوں بھی ہوتا تھا کہ محمد یونس کو بہو کی حمایت میں کچھ نہ کچھ بولنا پڑتا تھا اور جواب میں تلخ و ترش باتیں سننی پڑتی تھیں اور اگر مراد کچھ بولتا تھا تو منظوراں اس کے لتے لینے پر تل جاتی تھی۔ یہاں تک تو جنت کے لئے کسی نہ کسی طرح قابل برداشت تھا لیکن جب وہ دونوں چلے جاتے اور گھر میں ساس بہو اکیلی رہ جاتیں تو پھر منظوراں کو دل کے پھپھولے پھوڑنے کا خوب موقع ملتا۔ وہ اپنے وجود کی پوری شدتوں کے ساتھ جنت سے اظہارِ نفرت کرتی۔ اس کے ساتھ غلاموں جیسا' کتوں جیسا' سلوک کرتی اور اپنی زبان کی کاٹ سے اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کرتی رہتی۔ وہ اس سے نوکرانیوں کی طرح سارے گھر کا کام لیتی اور اس

کے ہر ہر کام میں عیب نکال کر اس کو سینکڑوں باتیں سناتی اور بے زبان جنت کسی مار کھائے ہوئے پالتو جانور کی طرح اس کی ساری ذلت آمیز اور اذیت ناک باتیں سنا کرتی، اور زبان سے اف نہ کرتی۔ بڑی مشکل سے تو یہ سب کچھ مل سکا تھا۔ مراد کا لاکھ لاکھ احسان تھا اس کے اوپر بھی' اس کی ماں پر بھی اور اس کی چھوٹی بہنوں پر بھی کہ اس نے حاجی کا قرضہ ادا کرکے ان سب کو کتنے ہی نادیدہ عذابوں سے بچایا تھا۔ اماں کو اگر اپنا سب کچھ جمع جتھا حاجی کے حوالے کر دینا پڑتا تو پھر باقی کیا بچتا اور پھر زندگی کہاں سے شروع کرنی پڑتی؟ وقت کو واپس تو نہیں لایا جاسکتا تھا۔ گزری مدتوں ناکام ساعتوں پر تو صرف آنسو بہائے جاسکتے تھے۔ مردہ لمحوں کو زندہ تو نہیں کیا جاسکتا تھا وہ خود کو اور اپنے سارے گھر والوں کو مراد کے احسان کے بوجھ تلے دبا ہوا پاتی تھی اور یہ اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ احسان دراصل اس غیر معمولی محبت کا کرشمہ ہے جو مراد کے دل میں اس کے لئے نہ جانے کب سے موجود تھی اور جس کو کامران بنانے کے لئے اس شخص نے کیا کیا جتن نہ کئے وہ مراد سے صرف ٹوٹ کر محبت ہی نہیں کرتی تھی وہ اس کی عزت بھی کرتی تھی اس کی احسان مند بھی تھی اور اس لئے وہ کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتی تھی جس سے مراد کو تکلیف ہو یا اس کے اور مراد کے درمیان محبت اور یگانگت کے نازک شیشے میں کوئی ہلکا سا بال بھی آجائے۔ وہ سب کچھ بچانا چاہتی تھی۔ اپنی اور مراد کی خوشیوں کو' اپنی اور مراد کی محبت اور اپنی ماں اور اپنی بہنوں کے سکون اور عافیت کو' اور اس لئے وہ غیر معمولی قوتِ برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بے بسی اور لاچاری کے عالم میں منظوراں کی ساری زیادتیوں کو برداشت کرلیتی تھی۔ اس کے ساتھ ساس بہو کے روایتی تیز و تند جھگڑوں میں ملوث نہیں ہوتی تھی۔ اگرچہ کبھی کبھی غم و غصے کے عالم میں اس کا جی چاہتا کہ وہ ایک بھاری پتھر اٹھا کر منظوراں کے سر پر دے مارے لیکن وہ اپنے دل میں اٹھنے والی قہر و غضب کی اس لہر کو کوشش کرکے وہیں دفن کردیتی' وہیں دبا دیتی۔ "یہ کون سا ہمیشہ زندہ رہے گی۔" وہ دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہتی۔ "آخر مجھے اور مراد کو تو ہمیشہ ساتھ ہی رہنا ہے۔ مراد تو میرا ہی ہے اس نے تو اس کی مرضی کے خلاف اس کو دھتکار کر مجھ سے شادی کی ہے پھر یہ میرا کیا بگاڑ لے گی؟ کتیا کی طرح بھونکتی ہے تو بھونکا کرے۔ آخر ایک دن خود ہی تھک ہار کر چپ ہو کر بیٹھ جائے گی اور پھر جب بچے ہوں گے تو....." اس کے دل میں اچانک ایک ان جانی خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔

لیکن وہ مسلسل ایک اعصاب شکن کیفیت سے دوچار رہتی تھی اپنے آپ کو تسلی



ے اور پرسکون رہنے کی تمام تر کوششوں کے باوجود وہ ایک ایسی آگ میں جلتی رہتی جس کو بجھانے کا کوئی طریقہ اس کے پاس موجود نہیں تھا اس کی صحت تیزی سے گر تھی وہ بہت دبلی اور کمزور نظر آنے لگی تھی۔

خود مراد کو بھی اس صورتِ حال کا پورا احساس تھا اور وہ اس سے پریشان رہتا تھا فی الحال اس کا کوئی حل اس کے پاس موجود نہیں تھا۔ تاہم اس نے اب اس انداز سوچنا شروع کردیا تھا کہ اس کو جنت کے ساتھ علیحدہ گھر میں منتقل ہو جانا چاہئے مگر اس ابھی اپنے اس خیال کا کسی کے سامنے اظہار نہیں کیا تھا۔ جنت کے ساتھ بھی نہیں' یونکہ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اول تو اماں اور ابا کو اس کے لئے راضی کرنا ہی خاصا شکل تھا اور پھر دوسرے گھر کے اخراجات کا بھی مسئلہ تھا۔ دو گھروں کی صورت میں چہ بھی بڑھ جاتا تھا اور مراد یہ نہیں چاہتا تھا کہ جنت کو روپے پیسے کی کوئی تکلیف ہو۔ اس کو خوش حالی اور فارغ البالی کی زندگی دینا چاہتا تھا۔ جنت نے غربت اور مفلوک لی کے بہت مصائب جھیلے تھے مراد چاہتا تھا کہ وہ اب ان دکھ بھرے دنوں کو ہمیشہ کے ے بھول جائے اور خوش و خرم زندگی گزارے۔ اس لئے دوسرا گھر لینے سے پہلے وہ نے پیسے کما لینا چاہتا تھا کہ اگر ابا اس کو کاروبار سے علیحدہ بھی کردیں تو بھی وہ اپنا الگ وبار جما کر مطمئن زندگی گزار سکے۔ گو کہ اس کو اس بات کی توقع نہیں تھی کہ ابا اس ے ساتھ ایسا کریں گے ابا تو ہمیشہ سے اس پر مہربان رہے تھے اور وہ جنت پر بھی مہربان ے۔ انہوں نے تو کبھی ایک لمحے کے لئے بھی جنت سے نفرت نہیں کی تھی۔

ان دنوں جنت کو فلو ہو رہا تھا وہ سخت نزلے اور زکام کا شکار تھی بخار کی وجہ سے م ٹوٹا جا رہا تھا اور وہ بہت بے چینی محسوس کر رہی تھی لیکن اس کے باوجود وہ گھر کا سارا م کاج اسی طرح کر رہی تھی جس طرح کہ پہلے کرتی تھی منظوراں اس کو بیماری کی کوئی لت دینے کے لئے تیار نہیں تھی۔

شام کا وقت تھا اور سب لوگ صحن میں بیٹھے ہوئے تھے جنت ابھی کچھ دیر پہلے تو ب کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ پھر برآمدے میں چلی گئی تھی اور وہاں پڑی ہوئی ٹی پر لیٹ گئی تھی۔ اس کے سر میں اور سارے جسم میں سخت درد ہو رہا تھا کچھ دیر اس نے باورچی خانے میں چولہے پر ہانڈی رکھی تھی اور اس کا ارادہ تھا کہ ذرا دیر کے اٹھ کر ہانڈی کو دیکھ لے گی۔ وہ برآمدے میں آکر پلنگ پر لیٹی تو درد کی شدت کے ہاتھ پیروں میں جیسے جان نہ رہی اور وہ خود کو بہت مضمحل محسوس کرنے لگی۔

"ارے۔ چولہے پر کچھ جل رہا ہے۔" اچانک مراد نے اپنے دونوں نتھنے پھڑپھڑاتے ہوئے کہا۔ "چولہے پر کچھ رکھا ہے اماں؟" اس نے قریب بیٹھی ہوئی منظوراں سے پوچھا۔ "جلنے کی بو آ رہی ہے۔"

"رکھا کیوں نہیں ہے۔" منظوراں نے چیخ کر بڑے زور سے کہا۔ "وہ بیگم صاحبہ تو ہانڈی چڑھا کر بڑے آرام سے جا کر لیٹ گئیں بستر پر اب ان کی بلا سے گوشت جلتا ہے تو جل جائے کون سا ان کے باپ کا مال ہے۔"

جنت ایک دم ہڑبڑا کر اٹھی اور باورچی خانے کی طرف بھاگی۔ "میری ناک بند ہے نزلے کی وجہ سے۔" اس نے منظوراں کے بے رحمانہ اور ظالمانہ حملے کی کمزور انداز میں مدافعت کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے بو نہیں آتی گوشت جلنے کی۔" اور اس کے ساتھ ہی اس نے جلدی سے باورچی خانے میں جا کر ہانڈی کو چولہے پر سے اتار دیا۔ اتنی دیر میں جلے ہوئے گوشت کی تیز بو سارے گھر میں پھیل چکی تھی۔

"ارے خاک کر دیا جلا کر سب کم بخت نے۔" منظوراں بڑے زور سے چیخی۔ "کسی بات کا ہوش تو رہتا ہی نہیں ہے۔ پروا ہی نہیں ہے کسی چیز کے نقصان کی۔ مفت کی مل جاتی ہے نا کھانے کو۔ ابھی اپنی اماں کی طرح دوسروں کے گھروں میں جھاڑو برتن کر رہی ہوتی تو پتہ چلتا کہ پیسہ کس طرح کمایا جاتا ہے..... یہاں آ کر تو مفت کے عیش کر رہی ہے۔ روٹیاں لگ گئی ہیں روٹیاں....."

"چپ بھی ہو جاؤ اماں۔" مراد نے سخت غصے اور برہمی کے عالم میں اپنی ماں سے کہا۔ "کیوں ایک زبان میں ستر باتیں کرتی ہو؟ جب تم کو معلوم ہے کہ اس کی طبیعت خراب ہے زکام ہے اس کو' ناک بند ہے۔ تو تم نے ہی ہانڈی دیکھ لی ہوتی اٹھ کر۔"

"ہاں ہاں تو اس کی طرف داری نہیں کرے گا تو اور کون کرے گا؟" منظوراں ایک دم ہتھے سے اکھڑ گئی۔ "میں تو اس گھر میں بس اب نوکرانی بن کر ہی رہ سکتی ہوں اور وہ رانی بن کر رہے گی ارے آگ لگے اس رانی کو۔"

"کیوں پاگلوں کی سی باتیں کرتی ہو اماں؟" مراد نے سخت ناپسندیدگی کے ساتھ کہا۔ "یہ کوئی طریقہ ہے بھلا۔"

"کیا کہا تو نے ذلیل؟" منظوراں غیظ و غضب کے عالم میں دھاڑی۔ "مجھے پاگل کہا تو نے؟ ارے شرم نہیں آئی تجھ کو؟ اس دو ٹکے کی چھوکری کے پیچھے تو مجھ کو پاگل کہہ رہا ہے؟ ارے کل کو اس کے کہنے سے مجھ کو جوتے بھی مارے گا۔ ہائے میری تو اب کوئی



عزت ہی نہیں رہی اب اس گھر میں اس سے تو خدا مجھے موت دے دے۔" اور وہ زور زور سے رونے اور مراد اور جنت کو برا بھلا کہنے اور اپنی قسمت کو کوسنے لگی۔ اس نے ایک زبردست ہنگامہ کھڑا کر دیا۔

جنت نے اپنی ساس کو پلٹ کر کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح خاموش رہی۔ وہ مراد کی ماں کو کوئی جواب نہیں دینا چاہتی تھی۔ یہ صرف مراد کا حوصلہ تھا جو اس کو بے زبان مویشی کی طرح سب کچھ برداشت کرنے پر مجبور کئے ہوئے تھا ورنہ بات کا کچھ نہ کچھ جواب تو وہ بھی دے سکتی تھی۔ وہ خاموشی سے باورچی خانے میں بیٹھی ہوئی ہانڈی میں سے گوشت کی جلی ہوئی بوٹیاں نکال کر الگ کرتی رہی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔ نزلے' سر کے درد اور سارے جسم کے درد کے مارے اس کا برا حال تھا اس کی ناک بالکل بند تھی اور گلا بھی بیٹھا ہوا تھا۔ اگر اسے گوشت جلنے کی ذرا سی بھی بو آتی تو وہ فوراً باورچی خانے میں آ جاتی لیکن منظوراں کو تو بس ایک بہانہ چاہئے تھا۔

اگرچہ منظوراں کے اس رویے میں کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن مراد کو اس وقت یہ سب کچھ بہت ہی برا لگا۔ اماں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ جنت کی طبیعت اتنی زیادہ خراب ہے اور اس کے باوجود اس قدر بدسلوکی پر آمادہ تھیں۔ وہ تو ہر وقت لٹھ لے کر اس کے پیچھے پڑی رہتی تھیں۔ انہوں نے اس کا جینا دشوار کر دیا تھا۔

اس رات مراد نے دل میں یہ طے کر لیا کہ وہ اگلے دن تنہائی میں اپنے باپ سے بات کرے گا اور پھر باپ کی مرضی اور منظوری سے ہی جنت کو لے کر کسی الگ مکان میں چلا جائے گا کیونکہ اس مسئلے کا حل اس کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔

اگلے روز اس نے منڈی سے واپس آتے ہوئے ایک جگہ رک کر اپنے باپ سے تنہائی میں اس بارے میں بات کی۔

"ابا۔ تم جنت کی جانب اماں کا رویہ دیکھ رہے ہو۔" اس نے کہا۔ "یہ سب کچھ بالکل ٹھیک نہیں ہے وہ جنت کے ساتھ بہت زیادتی کر رہی ہیں اس کا....."

"میں نے کبھی نہیں سنا کہ جنت نے پلٹ کر تمہاری ماں کو کوئی جواب دیا ہو۔" محمد یونس نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اور میں ڈرتا ہوں اس دن سے' اس وقت سے' جب جنت پلٹ کر تمہاری ماں کو جواب دینا شروع کر دے گی۔ اس وقت اس گھر میں ایسی ایسی قیامتیں برپا ہونے لگیں گی کہ کوئی ان کو روک نہیں سکے گا۔"

"پھر تم ہی بتاؤ ابا کہ میں کیا کروں۔" مراد نے کہا۔ "اماں تو ہمیں جینے نہیں دیں گی

ہم اس طرح تو نہیں جی سکتے۔"

"پھر کس طرح جینا چاہتے ہو؟" محمد یونس نے آہستہ سے اس سے پوچھا۔ "جو کچھ تمہارے دل میں ہے وہ صاف صاف کہہ ڈالو۔"

"میری سمجھ میں تو بس ایک ہی طریقہ آتا ہے ابا۔" مراد نے باپ کی طرف سے حوصلہ پاتے ہوئے کہا۔ "اور وہ یہ کہ میں جنت کو لے کر الگ ہو جاؤں۔"

"ایک مہینہ بھر صبر کر جاؤ۔" محمد یونس نے کہا۔ "وہ اپنا رشید حسن ہے نا' وہ اگلے مہینے اپنا گھر خالی کر کے لاہور جا رہا ہے اور گھر کرائے پر اٹھا دینا چاہتا ہے۔ میں کل ہی اس سے بات کر لوں گا کہ گھر اور کسی کو نہ دے۔ ہمارے گھر سے بالکل قریب ہے وہ گھر۔ جب رشید حسن جانے لگے گا تب ہم تمہاری ماں کو بتا دیں گے کہ رشید حسن اپنا گھر خالی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا اس لئے ہم نے فی الحال اس گھر کو لے لیا ہے اور تم اور جنت اس گھر میں رہو گے۔ اس طرح تمہاری ماں یہ نہیں سمجھے گی کہ تم اپنی بیوی کو لے کر اس گھر سے الگ ہو رہے ہو بلکہ وہ اس کو ایک عارضی بندوبست سمجھے گی اور جب تم دونوں ایک بار الگ ہو جاؤ گے تو پھر سارے معاملات خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"ہاں ابا....." مراد نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "یہ تو بہت ہی اچھا ہو گا۔ اگر ہم رشید حسن والا مکان کرایہ پر لے لیں تو پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ ہمارے گھر سے بہت زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ تم رشید حسن سے کل ہی بات کر لو۔"

"ہاں میں اس سے بات کر لوں گا۔" محمد یونس نے کہا۔

مراد نے سکون و اطمینان کی ایک گہری سانس لی اس کے اعصاب پر مہینوں سے لدا ہوا بوجھ ایک دم سے اتر گیا تھا اور وہ اپنے آپ کو یکبارگی ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کے باپ نے' اس کی توقع کے عین مطابق اس کے دکھ کو سمجھا تھا اور اس کا مداوا تلاش کرنے میں اس کی مدد کی تھی۔

اس روز جب مراد گھر واپس آیا تو بہت خوش تھا بہت دنوں کے بعد اس کو ایسی خوشی نصیب ہوئی تھی اور اب وہ فوری طور پر جنت کو یہ خوش خبری سنا دینا چاہتا تھا کہ اس کی مصیبتوں کے دن ختم ہو رہے ہیں اور وہ دونوں عنقریب اس گھر سے چلے جائیں گے۔

"میں نے تو تم سے کبھی نہیں کہا کہ تم اس گھر کو چھوڑ دو۔" اس کی بات سننے کے بعد جنت نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "میں تو اس حال میں بھی راضی تھی میں



نے تو کبھی نہیں چاہا کہ میں تمہارے لئے مشکلات پیدا کروں میں جانتی ہوں کہ تمہاری اماں مجھ سے ناخوش رہتی ہیں اور وہ ناخوش ہی رہیں گی وہ مجھ سے کبھی خوش نہیں رہ سکتیں۔"

"ہم ان کی خوشی اور ناخوشی کے جھگڑے سے دور جا رہے ہیں اب۔" مراد نے مسکرا کر کہا۔ "بس تم ابھی یہ بات کسی کو بتانا مت۔ اماں کو اس وقت بتائیں گے جب رشید حسن مکان خالی کر کے جانے لگے گا جس پر ہم دونوں اس مکان میں منتقل ہو جائیں گے۔ ابا سے تو میں نے بات کر لی ہے خود انہوں نے ہی اس مکان کے بارے میں مجھ کو بتایا ہے۔"

جنت نے بھی دل ہی دل میں سکھ کا سانس لیا۔ اس جہنم سے نکل جانے کی خوشی تھی لیکن ابھی تو ایک اور خوشی ایک بہت بڑی خوشی اس کی منتظر تھی۔

اس کے چند ہی روز بعد جب وہ ماسی خیراں کے ساتھ ڈاکٹرنی کے پاس گئی تھی۔ ڈاکٹرنی نے اس کو یہ بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہے اور وہ حیرت اور سرخوشی کے عالم میں ڈاکٹرنی کی شکل دیکھنے لگی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا اور پھر جب اس نے اس بات کو پوری طرح سمجھ لیا اور اسے اس کا یقین آ گیا تو اس کو ایسا لگا جیسے آج اس کے وجود نے ایک نئی معنویت حاصل کر لی ہے اس نے ایک نیا جنم لیا ہے اور وہ نئے سرے سے زندگی شروع کر رہی ہے۔

جنت کے لئے اور مراد کے لئے یہ ان کی زندگی کی سب سے بڑی خبر تھی' شادی کے بعد ان کے لئے سب سے بڑی خوش خبری۔ ان کے اپنے وجود سے تشکیل پانے والا ایک تیسرا وجود' ان کے جسم و جاں کا ایک حصہ عالم وجود میں آنے والا تھا۔ زندگی نے ایک نئی کروٹ لی تھی۔ محمد یونس کے لئے بھی یہ ایک بہت بڑی اور مسرت انگیز خبر تھی۔

زمین کے لئے بھی یہ اتنی بڑی خبر تھی کہ اسے سن کر خوشی کے مارے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جنت ماں بننے والی تھی اور شاید اس کے بعد اس کے لئے اس گھر کے حالات بہتر ہو جائیں۔ شاید اس کی ساس اس پر مہربان ہو جائے۔

لیکن منظوراں کے لئے یہ ایک بہت بڑی بدخبری تھی۔ اسے اس خبر سے نہ صرف یہ کہ کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ بلکہ اس کو سن کر اس کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا۔ جنت اس کے بیٹے کی اولاد کو جنم دینے والی تھی۔

"نہیں' ہرگز نہیں۔" اس نے دانت پیس کر اپنے آپ سے کہا۔ "میں جنت کے

بچے کو نہیں کھیلاؤں گی۔ جنت کا بچہ کبھی میری گود میں نہیں آئے گا۔"

☆=========☆=========☆

منظوراں کسی قیمت پر جنت کے وجود کو گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں تھی اور یہ معلوم ہونے کے بعد تو وہ اس کو بالکل ہی برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تھی کہ جنت ماں بننے والی ہے' اس کے گھر کے آنگن میں جنت کا بچہ کھیلے! نہیں یہ کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔

دونوں باپ بیٹے علی الصبح منڈی چلے جاتے تھے' ان کے جانے سے پہلے ہی جنت چولہا جلا کر گرم گرم روٹیاں ڈال دیتی تھی اور رات کا سالن یا ترکاری وغیرہ گرم کر دیتی تھی' وہ دونوں کھانا کھا کر گھر سے چلے جاتے تھے' ان کے جانے کے بعد جنت اور منظوراں صبح کو الگ الگ اوقات میں باورچی خانے میں بیٹھ کر ناشتہ کر لیتی تھیں' شروع شروع کے دنوں میں جنت نے بہت چاہا کہ وہ اور منظوراں' مردوں کے جانے کے بعد ایک ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کر لیا کریں' جنت اپنی طرف سے تو مفاہمت اور خیر سگالی کی فضاء پیدا کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی لیکن اپنی ساس کی جانب سے اس کی کبھی بھی حوصلہ افزائی نہیں ہوئی اور اس کو کوئی مثبت جواب نہیں ملا پھر رفتہ رفتہ اس کا جذبہ خیر سگالی سرد ہوتے ہوتے بالکل بجھ گیا اور اس کی جگہ ایک مجہول قسم کی بیزاری نے لے لی۔

دوپہر کے لئے تازہ کھانا پکایا جاتا تھا' تازہ سالن یا سبزی' دال وغیرہ اور گرم گرم روٹیاں اس وقت تیار کی جاتیں جب دونوں باپ بیٹے دوپہر کے بعد گھر آ جاتے۔ باورچی خانے میں کھانا پکانے کا سارا کام جنت کرتی تھی۔ مراد کی شادی کے بعد سے منظوراں نے گھر کے بیشتر کاموں سے ہاتھ کھینچ لیا تھا اور وہ زیادہ تر محلے پڑوس کے گھر میں جا کر آج کل کی نافرمان اور سرکش اولاد کی زیادتیوں کا رونا روتی اور اپنی بہو کے خلاف جو ایک چور اور ہیرو پنچی کی اولاد تھی' زہر اگلتی رہتی یا اگر گھر میں ہوتی تو جنت کے کام میں کیڑے نکالتی اور اس کو لعنت ملامت کرتی رہتی۔

اس روز منظوراں کافی دنوں کے بعد اپنی بہن شاداں کے گھر گئی۔ مراد کی شادی کے بعد سے دونوں بہنوں میں تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے شاداں نے تو تقریباً ملنا جلنا ہی چھوڑ دیا تھا البتہ منظوراں کبھی کبھار اپنی چھوٹی بہن کے گھر کا چکر لگا لیتی تھی شاداں نے تو مراد اور اس کی بیوی کو اپنے گھر بلایا تک نہیں تھا۔ اس روز بھی جب منظوراں اپنی بہن شاداں کے گھر گئی تو شاداں نے اس کی آمد پر کسی خاص خوشدلی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ منظوراں کے



اس کی یہ سرد مہری کوئی نئی اور غیر متوقع بات نہیں تھی۔ شاداں کو بھی کسی ذریعے یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ جنت ماں بننے والی ہے ایسی باتیں بھلا کہاں چھپتی تھیں' زبان سے دوسری زبان تک' ایک گھر سے دوسرے گھر تک سفر کرتی ہوئی' کہاں سے کہاں پہنچ جاتی تھیں۔

"مبارک ہو آپا' تم تو اب دادی بننے والی ہو!" شاداں نے بڑے کٹیلے اور زہریلے انداز میں کہا۔ منظوراں اس کے لہجے کی جھلاہٹ' مایوسی' ترشی اور کڑواہٹ کو بخوبی محسوس کر سکتی تھی۔ "ارے دفع کرو منحوس کو..... میری بہو تو شمینہ ہے۔" منظوراں نے استوار لہجے میں کہا۔ "تم دیکھنا میں شمینہ کو اپنی بہو بنا کر دکھاؤں گی۔"

"رہنے ہی دو آپا۔" شاداں نے بیزاری کے ساتھ کہا۔ "جب بنانے کا وقت تھا' تب بنایا نہیں اب کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ میں اپنی بیٹی کو سوت بنا کر تمہارے گھر بھیج دوں گی؟ یہ دھور کھو آپا..... ایسا کبھی نہیں ہو گا۔"

"کیوں.....؟ اس میں خرابی کیا ہے؟" منظوراں نے کہا۔ "کیا مراد دوسری شادی نہیں کر سکتا؟ وہ تو چار کر سکتا ہے۔"

"ضرور کر سکتا ہے۔" شاداں نے کہا۔ "لیکن مراد بھلا کیوں کرے گا؟ وہ تو قیامت تک نہیں کرے گا اس پر تو اس چھوکری کا جادو ایسا چلا کہ اس نے دس ہزار روپے خرچ کر کے اس کو خریدا....."

"ارے تم دیکھنا میں اس کا کیسے جادو اتارتی ہوں۔" منظوراں کی آنکھوں سے جیسے آگ نکلنے لگی۔ "وہ کنجر کی اولاد میرے کلیجے کا ٹکڑا نوچ کر لے گئی ہے' میں اسے اس سے واپس لوں گی۔"

"چھوڑو آپا....." شاداں نے برہمی کے ساتھ کہا۔ "ہماری شمینہ کے لئے رشتوں کی کمی نہیں ہے۔"

اس وقت شمینہ وہاں آن پہنچی اور دونوں بہنوں کے درمیان ہونے والی گفتگو ختم ہو گئی۔ منظوراں کچھ دیر تک اپنی بہن کے گھر رہی اور پھر وہاں سے چلی گئی۔

مراد اس رات بہت خوش تھا ایک سودے میں اس کو کافی بڑا فائدہ ہو گیا تھا اور کچھ خاصی رقم ہاتھ آ گئی تھی اور رات کو وہ جنت کو یہ خوشخبری سنا رہا تھا۔

"یہ اس کی قسمت سے ہے جو ابھی اس دنیا میں نہیں آیا ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے جنت سے کہا۔ "ہمیں اس کے خیر مقدم کی تیاریاں ابھی سے شروع کر دینی

چاہئیں۔"

"مجھے تو سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ میں تمہارے ساتھ اور اپنے بچے کے ساتھ ایک علیحدہ گھر میں رہوں گی۔" جنت نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کتنا اچھا اور کتنا خوبصورت ہو گا یہ سب کچھ..... ہم دونوں' ہمارا بچہ اور ہمارا گھر....."

اس رات جنت بڑے ہی خوبصورت اور سہانے خواب دیکھتی رہی اور پھر اگلے دن علی الصبح بیدار ہو کر روز مرہ کے معمولات میں مصروف ہو گئی۔ گھر کے مرد منڈی چلے گئے اور وہ کاموں میں لگ گئی۔ روز کی طرح آج بھی اس نے ناشتہ اکیلے ہی کیا' پھر گھر کے دوسرے کاموں میں لگ گئی' دوپہر سے پہلے اس نے باورچی خانے میں جا کر کھانا پکانے کا کام شروع کر دیا۔

منظوراں آج صبح سے ہی گھر پر تھی' وہ بڑی خاموشی لیکن ہوشیاری کے ساتھ جنت کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھی جب جنت باورچی خانے کے اندر موجود نہیں تھی تو اسی وقت منظوراں نے کچھ ضروری تیاریاں کر لی تھیں۔

جب جنت کھانا پکانے کے لئے چولہے کے پاس بیٹھ گئی تو منظوراں نے سب سے پہلے تو اس بات کا اطمینان کر لیا کہ گھر کا دروازہ اندر سے بند ہے اور اس کے کچھ دیر کے بعد وہ باورچی خانے میں داخل ہو گئی اس نے جنت سے کوئی بات نہیں کی۔ جنت اس وقت باورچی خانے کے فرش پر ایک چھوٹی سی پیڑھی پر بیٹھی ہوئی ہانڈی کی دیکھ بھال کر رہی تھی جو اس کے سامنے چولہے پر رکھی تھی۔ منظوراں' جنت کے پیچھے تھی' اس طرح کہ وہ باورچی خانے کے دروازے اور جنت کے درمیان حائل تھی۔

جنت نے ایک نظر پلٹ کر اپنی ساس کی طرف دیکھا۔ وہ اس کے پیچھے کھڑی ہوئی لکڑی کی چھوٹی سی الماری کے اوپر سے کوئی برتن اٹھا کر اس کو ایک کپڑے سے صاف کر رہی تھی۔ جنت نے اس سے نہیں پوچھا کہ وہ کیا کر رہی ہے اور خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہی۔ اس کی اپنی کوشش یہ ہوتی تھی کہ منظوراں سے کم سے کم بات کرے کیونکہ کوئی بات ایک بار شروع ہونے کے بعد پھر توہین' تذلیل پر ہی ختم ہوتی تھی۔

جنت کو اپنے کام میں مصروف پا کر منظوراں نے ماچس کی ایک تیلی جلائی اور اس سے ایک موم بتی روشن کی' جلتی ہوئی موم بتی اس نے پیچھے سے جنت کی نائیلون کی قمیض میں لگا دی۔

جنت کو یکبارگی گرمی' تپش اور جلن کا احساس ہوا اور وہ ایک دم اچھل پڑی' چیخ



اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا اور درد کی ایک تیز اور ناقابل برداشت لہر اس کی پشت پر سرعت کے ساتھ دوڑتی ہوئی اس کی دائیں بغل کی جانب بڑھنے لگی' اس کے حلق سے ایک کربناک چیخ نکلی اور اس نے تیزی سے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی' عین اس وقت منظوراں نے مٹی کے تیل سے بھرا کٹورا جو لکڑی کی اس چھوٹی سی الماری کے اوپر پہلے سے رکھا ہوا تھا' تیزی سے اٹھا کر جنت کے اوپر الٹ دیا' منظوراں نے ساری چیزوں کا انتظام پہلے سے کر رکھا تھا۔

جلتی پر تیل کے گرتے ہی آگ ایک دم بھڑک اٹھی اور لمحوں کے اندر خوفناک شکل اختیار کر گئی' جنت بری طرح چیختی ہوئی باورچی خانے کے دروازے کی طرف بھاگی لیکن منظوراں اس سے پہلے ہی باہر نکل کر دروازے کو باہر سے بند کر چکی تھی۔

باورچی خانے سے جنت کی نہایت درجہ درد انگیز اور فلک شگاف چیخیں بلند ہو رہی تھیں اور منظوراں دروازے کو باہر سے بند کئے ہوئے دروازے سے لگی کھڑی تھی' اس کا چہرہ سیاہ ہو رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں' ان چنگاریوں کی بجھتی ہوئی راکھ اس کے چہرے پر گر گر کر اس کو اور زیادہ سیاہ کر رہی تھی۔

کرب ناک چیخوں کا سلسلہ زیادہ دیر جاری نہ رہا اور ایک دو منٹ کے بعد ہی ختم ہونے لگا' اس کے ساتھ ہی منظوراں نے باورچی خانے کا دروازہ کھول دیا' دروازے کے قریب ہی شعلوں میں لپٹا ہوا جنت کا جسم زمین پر پڑا ہوا پھڑک رہا تھا۔

منظوراں نے بہت زور کی چیخ ماری اور گھر کے دروازے کی طرف بھاگی۔ "ارے دوڑو..... دوڑو..... مدد..... مدد....." وہ دروازہ کھول کر بری طرح چلانے لگی اور پھر بھاگتی ہوئی باورچی خانے کی طرف آئی اور پانی ڈال ڈال کر جنت کے جسم میں لگی ہوئی آگ کو بجھانے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ بہت تھوڑا تھوڑا پانی ڈال رہی تھی۔

گھر میں سب سے پہلے داخل ہونے والی عورت کا نام نسیم بی بی تھا۔

نسیم بی بی سامنے والے گھروں میں سے ایک میں رہتی تھی اور ماسی خیراں سے اس کے بہت قریبی تعلقات تھے' یہاں اس گھر میں منظوراں' جنت کے ساتھ جو سلوک کرتی تھی' اس کے بارے میں نسیم بی بی کو بہت کچھ معلوم تھا اور وہ ماسی خیراں کو اکثر اس کے بارے میں بتاتی رہتی تھی۔

نسیم بھاگتی ہوئی باورچی خانے میں داخل ہوئی جہاں سے چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور یہاں پہنچتے ہی اس نے ایک دل دہلا دینے والا اور ہوش اڑا دینے والا منظر دیکھا۔

جنت شعلوں کا کفن پہنے ہوئے فرش پر پڑی تھی' اس کا جسم بری طرح تڑپ رہا تھا اور منظوراں جلدی جلدی پانی ڈال کر اس کے جسم میں لگی ہوئی آگ کو بجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ارے میں تو ادھر کمرے میں تھی۔" منظوراں نے زور زور سے روتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو کچھ پتہ ہی نہ چلا بس میں نے اس کے چیخنے کی آوازیں سنیں۔"

"پانی مجھے دو۔" نسیم بی بی نے جلدی سے پانی سے بھرا ہوا لوٹا منظوراں کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔ "جلدی سے ایک دو موٹی چادریں یا کمبل وغیرہ لے آؤ..... جلدی کرو۔"

منظوراں تیزی سے وہاں سے بھاگی لیکن آگے جا کر اس کے قدم خود بخود دھیمے پڑ گئے۔ "اسپتال پہنچتے پہنچتے ختم ہو جائے گی۔" اس نے دل ہی دل میں کہا۔ "بالکل ہی جل کر ختم ہو گئی ہے' ختم ہو رہی ہے۔"

"جنت..... بیٹی جنت..... جنت....." نسیم بی بی آگ بجھانے کی کوششوں کے ساتھ ساتھ جنت کو آوازیں بھی دے رہی تھی۔

"ام..... ماں....." اچانک جنت کے ہونٹ ہلے اور اس نے بہت ہلکے سے آواز نکالی۔ "ام..... ماں نے جلایا۔" نسیم بی بی نے ایک ایک لفظ صاف طور پر سنا۔

"ام..... م..... مجھے اماں نے جلایا..... ام..... ماں نے....." جنت کے ہونٹ خاموش ہو گئے اور نسیم بی بی کے سارے جسم میں جیسے موت کی ٹھنڈک اترنے لگی۔

اس وقت گھر کے کھلے ہوئے دروازے میں سے کچھ اور عورتیں اندر داخل ہو گئیں اور ایک شور مچنے لگا۔ اسی وقت منظوراں چادریں لئے ہوئے باورچی خانے میں داخل ہوئی اس وقت تک جنت کے جسم کو آگ سے تقریباً بجھایا جا چکا تھا۔

"ارے جلدی سے ہسپتال لے چلو..... اسپتال لے جانے کا بندوبست کرو۔" کوئی عورت چلا چلا کر کہہ رہی تھی۔ جنت کا جسم بالکل ساکت و جامد تھا اس کے ہونٹ بھی خاموش تھے اور اب کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔

محلے کے کچھ مرد بھی جو اس وقت اپنے گھروں میں موجود تھے' فوراً ہی آن پہنچے اور انہوں نے مل جل کر جنت کو اسپتال لے جانے کا بندوبست کیا' ایک آدمی منڈی کی طرف بھاگا تاکہ مراد اور اس کے باپ کو اس سانحہ کی خبر کر دے' نسیم بی بی سیدھی ماسی خیراں کی



طرف بھاگی۔

مراد اور محمد یونس وحشت' سراسیمگی کے عالم میں منڈی سے اسپتال کی طرف روانہ ہوئے انہیں یہی بتایا گیا تھا کہ جنت کو اسپتال لے جایا گیا ہے اور جب وہ دونوں اسپتال پہنچے تو اس وقت جنت کو اندر کمرے میں ڈریسنگ کے لئے لے جایا گیا تھا۔ کمرے کے باہر منظوراں اور محلے کی چند دیگر عورتیں موجود تھیں جو منظوراں کے ساتھ آئی تھیں۔

"کیا ہوا اماں؟ کیا ہوا؟" مراد نے بے تابانہ انداز میں اپنی ماں کا شانہ ہلاتے ہوئے پوچھا۔

"میں..... میں تو اندر کمرے میں تھی۔" منظوراں نے وہی اچھی طرح سے تیار کردہ کہانی شروع کر دی جو وہ محلے کی دوسری عورتوں کو سنا چکی تھی اور اس بات کا خاص طور سے خیال رکھا کہ بیان میں سرِمو کوئی فرق نہ ہو۔ وہ باورچی خانے میں کام کر رہی تھی' میں نے اچانک اس کی چیخیں سنی اور میں بھاگتی ہوئی باورچی خانے کی طرف گئی' وہاں میں نے اس کو دروازے کے پاس زمین پر گرا ہوا دیکھا' اس کے کپڑوں میں آگ لگ گئی تھی اور شعلے نکل رہے تھے' میں نے جلدی سے اس کے پاس پہنچ کر اس کے جسم پر پانی ڈالنا شروع کر دیا اور پھر میری اور اس کی چیخوں کی آوازیں سن کر دوسری عورتیں بھی وہاں آن پہنچیں' اس وقت تک وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔"

"کیا وہ بہت زیادہ جل گئی ہے اماں؟" مراد نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "ڈاکٹر کیا کہتا ہے؟"

"جلی تو بہت بری طرح ہے بیٹا۔" منظوراں کے بجائے ایک دوسری پڑوسی عورت بولی۔ "سارا بدن جھلس گیا ہے' بس اللہ اپنا رحم کرے' ڈاکٹر نے ابھی تو کچھ کہا نہیں۔"

مراد کا دل بیٹھا جا رہا تھا' اس کے سر میں چکر آ رہے تھے' آنکھیں دروازے کی طرف لگی ہوئی تھیں اور دماغ نہ جانے کون کون سے بھیانک مناظر کو دیکھنے میں محو ہو گیا تھا۔

کافی دیر گزر گئی اور اس بند دروازے کے پیچھے سے نکل کر کوئی نہیں آیا۔ مراد کبھی تو بینچ پر بیٹھ جاتا' کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتا' کبھی بند دروازے کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا اور کبھی اپنی ماں کے پاس آ کر بیٹھ جاتا اور اس سے نئے سرے سے اس واقعہ کی تفصیل پوچھنے لگتا۔ منظوراں کو خوب اچھی طرح یاد تھا کہ اس کو کیا کیا کہنا ہے' ماں سے گفتگو کے

دوران بھی مراد کی نظریں بند دروازے پر ہی لگی رہتیں اور وہ اپنی نگاہوں سے دروازے میں سوراخ کر کے اس کے پیچھے دیکھنے کی کوشش کرتا۔

بالآخر دروازہ کھل گیا' ایک نرس اور ایک وارڈ بوائے ایک اسٹریچر کو دھکیلتے ہوئے کمرے سے باہر نکلے' ان دونوں کے چہرے پتھر کی طرح سخت اور بے جان ہو رہے تھے' اس اسٹریچر کے اوپر جو جسم تھا' وہ سر سے پاؤں تک سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا' اسٹریچر کے پیچھے پیچھے دو ڈاکٹر بھی آ رہے تھے' ان میں سے ایک عورت تھی۔

پہلے پہل تو مراد کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہوا ہے وہ ان ڈاکٹروں کو نہیں پہچانتا تھا جب جنت کو اس کمرے میں لے جایا گیا تھا' اس وقت وہ خود یہاں موجود نہیں تھا لیکن منظوراں اور دوسری عورتیں جو جنت کو لے کر آئی تھیں' ان ڈاکٹروں کو پہچانتی تھیں۔ منظوراں تیزی سے اٹھ کر ڈاکٹروں کی طرف لپکی اور اس کے ساتھ ہی مراد بھی جلدی سے ان کی طرف بڑھا۔

"کیا ہوا ڈاکٹر صاحب؟" منظوراں نے اسٹریچر پر پڑے ہوئے سفید چادر سے ڈھکے ہوئے بدن کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہمیں افسوس ہے بی بی....." ڈاکٹر نے دھیمے لہجے میں تاسفانہ انداز میں کہا۔ "ہم مریضہ کو نہیں بچا سکے' وہ بہت بری طرح جل گئی تھی' ہم نے کوشش تو بہت کی لیکن جو خدا کو منظور....."

مراد' ڈاکٹر کی شکل دیکھ رہا تھا' اس کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ کو سن رہا تھا اور اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ الفاظ جنت کے لئے نہیں کسی اور کے لئے کہے جا رہے ہوں۔ نہیں' اس کی جنت تو نہیں مر سکتی تھی' وہ کیوں مرنے لگی بھلا؟ وہ تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھی' اس کو کوئی بیماری نہیں تھی' وہ تو آج صبح کو اسے بالکل ٹھیک ٹھاک اور خوش و خرم چھوڑ کر گیا تھا۔

لیکن لمحوں کے اندر خود فریبی کا یہ طلسم ٹوٹ گیا تھا' ڈاکٹر جس عورت کے مرنے کی اطلاع دے رہا تھا' وہ جنت کے علاوہ اور کوئی نہیں تھی' وہ جنت تھی ..... ہاں وہ جنت تھی جو اب اس دنیا میں نہیں رہی تھی۔ جنت دنیا سے چلی گئی تھی۔

"ہے ربا....." منظوراں گلا پھاڑ کر چلائی اور اپنی چھاتی پیٹ پیٹ کر رونے لگی۔

"صبر کرو اماں....." ڈاکٹر نے جو شاید اس قسم کے مناظر کا بہت زیادہ عادی تھا'



سپاٹ لہجے میں روایتی انداز میں کہا۔ "لاش ابھی فوراً نہیں ملے گی' کچھ تھوڑا سا وقت لگے گا' پولیس تفتیش کرے گی اور اپنی کارروائی کرے گی پھر لاش کو گھر لے جانا پولیس والے بس ابھی آتے ہی ہوں گے۔"

مراد کو جیسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا' اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا تھا اور کان سائیں سائیں کر رہے تھے' وہ اپنے گرد و پیش کی آوازوں کو بھی نہیں سن رہا تھا' اس کے چاروں طرف یکبارگی موت کا سناٹا طاری ہو گیا تھا۔

وہ لوگ اسٹریچر کو دھکیلتے ہوئے کسی اور طرف لے گئے' مراد کے لئے جیسے ہر چیز یکبارگی ختم ہو گئی تھی' دنیا ختم ہو گئی تھی' وقت ختم ہو گیا تھا' وقت کی گردش ختم ہو گئی تھی' ساری روشنیاں' ساری زندگی ختم ہو گئی تھیں' ایک بے نام' گمنام تاریک سناٹا تھا جو مردہ وقت کو اپنے گلے لگائے ہوئے رو رہا تھا۔

منظوراں دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی اور اس کے ساتھ آنے والی عورتیں بھی اس کے ساتھ شامل ہو کر رو رہی تھیں' محمد یونس پتھر کے مجسمے کی طرح خاموش اپنے بیٹے کے پاس کھڑا رو رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد پولیس آ گئی اور اس نے ان لوگوں کے بیانات لے لئے' منظوراں نے وہی سب کچھ کہا جو وہ اب تک کہتی چلی آئی تھی' پھر جنت کی لاش ان لوگوں کے حوالے کر دی گئی اور وہ لاش کو لے کر گھر آ گئے۔

نسیم بی بی' منظوراں کے گھر سے سیدھی ماسی خیراں کے پاس چلی گئی تھی' منظوراں نے بیان دیتے وقت نسیم بی بی کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا' اس نے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی' نسیم بی بی کی اس سارے معاملے میں کوئی اہمیت نہیں تھی اور منظوراں اس کو بھول بھی چکی تھی اور منظوراں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ جنت نے مکمل طور پر بے ہوش ہونے سے پہلے نسیم بی بی سے کچھ کہا بھی تھا۔

نسیم بی بی کو معلوم تھا کہ زمین تو اس وقت گھر پر ہو گی نہیں..... وہ کام پر گئی ہو گی تاہم ماسی خیراں کو تو جنت کے جل جانے کی اطلاع دی جا سکتی تھی اور فوری طور پر دی جانی چاہئے تھے چنانچہ وہ سیدھی ماسی خیراں کے پاس پہنچی۔

ماسی خیراں کے پاس پہنچ کر اس نے جب اس کو جنت کے جل جانے کی اطلاع دی تو ماسی خیراں پر سخت خوف اور گھبراہٹ طاری ہو گئی' نسیم بی بی نے اس کو بتایا تھا کہ جنت تو بہت ہی بری طرح جل گئی ہے۔

"خدا خیر کرے..... اس حالت میں..... اس حالت میں جلی ہے وہ....."

"اب تو کچھ بچا نہیں ہو گا۔" نسیم بی بی نے درد بھری سرگوشی میں کہا۔ "وہ تو بہت بری طرح جلی ہے' اس کی اپنی جان ہی بچ جائے تو بڑی بات ہے اور خیراں..... وہ جلی نہیں ہے اس کو جلایا گیا ہے۔"

"کیا.....؟" ماسی خیراں نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "جلایا ہے؟ کس نے؟ کیا منظوراں نے.....؟"

"ہاں۔" نسیم بی بی نے کہا۔ "جنت نے خود یہ الفاظ کہے تھے۔" اور اس نے جنت کے الفاظ دہرا دیئے۔

"چلو نسیم بی بی۔" ماسی خیراں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "سب سے پہلے تو زمین کے پاس چلتے ہیں' اس کو فوراً بتا دینا ضروری ہے' اسے جنت کے پاس پہنچنا چاہئے' میں اس کو ساتھ لے کر ہسپتال جاؤں گی۔"

وہ دونوں وہاں سے چوہدریوں کے گھر پہنچیں جہاں زمین کام کر رہی تھی' زمین ان دونوں کو دیکھ کر بہت حیران ہوئی' ان کی شکلیں ہی بتا رہی تھیں کہ وہ کوئی بہت خوفناک خبر لے کر آئی ہیں۔

اور جب ماسی خیراں نے اس کو جنت کے جل جانے کے بارے میں بتایا تو زمین پر سراسیمگی طاری ہو گئی' اس نے فوراً ہی سارا کام چھوڑ دیا اور زارو قطار روتے ہوئے بڑی چوہدرائن سے کہا کہ اس کو اسی وقت چھٹی چاہئے کیونکہ اس کی بیٹی جل گئی ہے اور لوگ اسے ہسپتال لے گئے ہیں۔ بڑی چوہدرائن نے اسے چھٹی دے دی۔

جنت نے مکمل طور پر بے ہوش ہونے سے پہلے جو کچھ نسیم بی بی سے کہا تھا' وہ نسیم بی بی نے زمین کو بتانے کے بعد کہا۔ "خدا کرے کہ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہو جائے' جب وہ بات کرنے لگے گی تو خود ہی تم کو سب کچھ بتا دے گی' تم بس اس کا خیال رکھنا کہ میرا نام بیچ میں نہ آئے کیونکہ اگر کوئی پولیس تھانے کا چکر ہوا تو میں اپنے آپ کو اس میں نہیں الجھانا چاہتی تم کو تو معلوم ہے بیٹے اور بہو کے در پر پڑی ہوں اور بہو کا بس چلے تو آج مجھے کان سے پکڑ کر باہر نکال دے۔ اب اگر میں کسی ایسے ویسے معاملے میں الجھ گئی تو وہ دونوں ہی میرا جینا دو بھر کر دیں گے اللہ نے چاہا تو جنت ٹھیک ہو جائے گی۔"

"منظوراں نے جلا دیا اس کو..... ہائے..... خدا اس کو جہنم کی آگ میں جلائے۔" زمین نے زار و قطار روتے ہوئے کہا۔ "اے میری پھول سی بچی....."



"صبر کرو زمین حوصلہ رکھو۔" نسیم بی بی نے اس کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ "خدا نے چاہا تو وہ ٹھیک ہو جائے گی' وہ لوگ اسے ہسپتال لے جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔"

وہ تینوں عورتیں افتاں و خیزاں ہسپتال پہنچیں اور وہاں پہنچ کر ان کو یہ معلوم ہوا کہ جنت زوجہ مراد علی نامی جو جل جانے والی نوجوان لڑکی کو ہسپتال لایا گیا تھا' اس کی موت واقع ہو چکی ہے اور اس کے گھر والے اس کی لاش لے جا چکے ہیں۔

"زمین....." نسیم بی بی نے خوف و دہشت کے عالم میں کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میرا نام..... میرا نام..... نہ لینا..... خدا کے لئے....."

زمین کے حلق سے نکلنے والی کرب ناک چیخیں ساری فضا میں گونج رہی تھیں' اس پر بے ہوشی سی طاری ہو رہی تھی اور بری طرح رو رہی تھی۔ ماسی خیراں اور نسیم بی بی اس کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"چلو..... گھر چلو زمین۔" ماسی خیراں کہہ رہی تھی اور زمین کو اس کی آواز بہت دور کسی اندھے کنویں سے آتی ہوئی لگ رہی تھی۔ "پہلے گھر چل کر بچیوں کو ساتھ لو' پھر جنت کے گھر چلیں گے۔"

ماسی خیراں اور نسیم بی بی نے زمین کو سنبھالا اور اسے گھر لے آئیں۔ بچیاں ماں کو اس وقت گھر پر دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ جنت کی شادی کے بعد سے نصرت' جس کی عمر اس وقت تقریباً نو سال کی تھی' اپنی دونوں چھوٹی بہنوں صغرا اور کلثوم کی نگہداشت کرتی تھی' ماں کے کام پر چلے جانے کے بعد سے وہ سارے گھر کا کام بھی سنبھالتی تھی اور دونوں بچیوں کی دیکھ بھال بھی کرتی تھی' وہ اس وقت کا منظر دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ماسی خیراں اور نسیم بی بی ماں کو پکڑے ہوئے' سنبھالے ہوئے ہیں اور ماں بلک بلک کر رو رہی تھی۔

کچھ ہی دیر کے بعد ماتم گساروں کا ایک لٹا پٹا قافلہ مراد کے گھر میں داخل ہوا' اس قافلے کے آگے زمین تھی' اس کے ساتھ نصرت تھی صغرا تھی اور کلثوم تھی۔ خون کے آنسو روتا ہوا' بلک بلک کر بین کرتا ہوا یہ قافلہ جب مراد کے گھر میں داخل ہو گیا تو وہاں سارے لوگوں کی نظریں ان لوگوں کی طرف اٹھ گئیں۔

جنت مر چکی تھی اور زمین اب ہر مصلحت سے آزاد ہو گئی تھی' جنت کو کوئی مزید تکلیف نہیں دے سکتا تھا' وہ ہر تکلیف سے آزاد تھی اور زمین بھی سب کچھ کہنے کے لئے آزاد تھی' اسے اب اپنی زبان کو روکنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

"ارے مار دیا میری بچی کو....." وہ وحشت کے عالم میں اپنا منہ اور سینہ پیٹ

رہی تھی۔ "ارے یہ ڈائن کھا گئی اس کو' ارے اس نے میرے بچی کو جلا ڈالا' ہائے اس نے جلا ڈالا میری بچی کو..... ارے منظوراں خدا تجھے دوزخ میں جلائے گا تُو نے میری بچی کو جلا کر مارا ہے' خدا تجھے جلائے گا' ارے قیامت کے دن تک تُو جلتی رہے گی۔"

زمین کے بین عرش کے کنگروں کو ہلائے ڈال رہے تھے اور سننے والے حیرت اور خوف کے عالم میں سن رہے تھے۔ یہ بات تو کسی کے بھی دماغ میں نہیں تھی کہ جنت کو کسی نے جلا دیا ہے۔ شدید صدمے سے زمین کے ذہن کی یہ حالت ہو گئی تھی۔

"ارے کیوں پاگل ہو گئی ہے زمین۔" ایک بوڑھی عورت نے آگے بڑھ کر اس کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔ "ایسی بُری بُری باتیں نہیں کرتے' وہ بہو تھی منظوراں کی ....."

"ہائے وہ میرے لئے تو بیٹی کی طرح تھی۔" منظوراں دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ "میری تو کوئی بیٹی نہیں ہے' میں نے اس کو ہمیشہ اپنی بیٹی کی طرح سمجھا ارے وہ تو میرے اکلوتے بیٹے کی بیوی تھی' ارے میرا تو گھر اجڑ گیا۔"

مراد نے اپنی ساس کے ہولناک' روح فرسا' لرزہ خیز اور دل کو ہلا دینے والے بین سنے اور وہ بات جو اب تک اس کے ذہن کے کسی گوشے میں نہیں آئی تھی' کسی گھناؤنے کیڑے کی طرح اس کے دماغ میں رینگنے لگی۔

زمین نے اپنی تینوں بیٹیوں کے ساتھ جنت کی لاش کا چہرہ دیکھا اور ان کی چیخوں سے زمین کانپ اٹھی اور آسمان رونے لگا' اس حشر انگیز اور تلاطم خیز شورِ گریہ سے گھر کے در و دیوار جیسے گرے جا رہے تھے۔

مراد نے سارے راستے کاندھا نہیں بدلا۔ جنازے کے تابوت کے ایک طرف کے ڈنڈے کو وہ قبرستان پہنچنے تک اپنے ہی کاندھے پر رکھے رہا' بہت سے لوگوں نے اس سے کاندھا بدلنے کی کوشش کی لیکن اس نے تابوت کا ڈنڈا نہیں چھوڑا۔

جنت کو اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچایا گیا اور اس کے سوختہ و برشتہ وجود کو مٹی کے سپرد کر دیا گیا' یہ ایک وجود نہیں تھا' یہ دو وجود تھے' جنت کے وجود کے اندر ایک اور وجود کی کونپلیں بھی تو پھوٹ رہی تھیں جنہیں پوری طرح سے سر اٹھانے سے پہلے ہی آگ میں جلا کر ختم کر دیا گیا تھا۔

مراد گھر واپس آیا تو اتنے بہت سے لوگوں کے گھر میں موجود ہونے کے باوجود اس کو یہاں بالکل سناٹا محسوس ہو رہا تھا' اس کے دل میں کتنے ہی بے صورت و صدا طوفان اٹھ



رہے تھے' نہ جانے کیا ہو گیا تھا اور آگے نہ جانے کیا ہونے والا تھا۔

جنت کے قل میں زمین نہیں آئی' اس کی بیٹیاں بھی نہیں آئیں' ماسی خیراں بھی نہیں آئی' کئی عورتوں نے زمین کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے اس کے بارے میں پوچھا بھی۔

"زمین بے چاری تو صدمے کے مارے پاگل ہو گئی ہے۔" کسی نے کہا۔ "اس کے ہوش و حواس بھی ٹھکانے نہیں رہے ہیں اور وہ تو بہکی بہکی باتیں کرنے لگی ہے' کہتی ہے ساس نے اس کی بیٹی کو جلا کر مار ڈالا ہے۔"

"خدا اس کے حال پر رحم کرے۔" پوچھنے والی نے کہا۔ "اس پر تو صدموں کا بوجھ بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔"

قل کے دن مراد کی نگاہیں زمین اور اس کی بچیوں کو بہت تلاش کرتی رہیں لیکن ان میں سے کوئی نہیں آیا تھا' چند روز کے بعد جب مراد کا دل کچھ ٹھہرا تو وہ ماسی خیراں کے پاس پہنچا۔ خوفناک الزامات کی آلودگی سے بوجھل زمین کے نوحے اور بین اس کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح بہہ رہے تھے' وہ اپنے اندر زمین کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں پا رہا تھا' اس لئے اس نے ماسی خیراں کے پاس جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

"ماسی خیراں' یہ چاچی کیسے الزامات لگا رہی ہیں؟" اس نے بڑے محتاط انداز میں ماسی خیراں سے سوال کیا۔

ماسی خیراں کچھ دیر تک زخمی نظروں سے اس کو دیکھتی رہی۔ "وہ ٹھیک کہتی ہے بیٹا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

مراد کا دل ڈوبنے لگا' کاش یہ جھوٹ ہوتا لیکن اس کو پہلے ہی اس بات کا اندازہ تھا کہ یہ سچ ہو سکتا تھا' وہ ابھی تک اس بھیانک حقیقت سے منہ چرانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اب وہ حقیقت پوری طرح کھل کر اس کے سامنے آ رہی تھی اور وہ خود کو مرتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

"جنت کے جلنے کے بعد اس کے پاس سب سے پہلے پہنچنے والی محلے کی عورت نسیم بی بی تھی۔" ماسی خیراں جیسے خواب میں بول رہی تھی اور مراد جیسے خواب میں سن رہا تھا۔ "اس وقت جنت کو ذرا ذرا ہوش تھا' نسیم بی بی نے منظوراں کو چادریں لینے کے لئے بھیج دیا تھا اور اس وقت جنت نے نسیم بی بی کو بتایا تھا کہ اس کو منظوراں نے جلایا ہے۔" ماسی خیراں نے نسیم بی بی کی پوری بات دہرا دی۔

"لیکن نسیم بی بی نے خود....."

"نہیں....." ماسی خیراں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ اس کا نام ہرگز نہ لیا جائے کیونکہ وہ پولیس کچہری کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتی، زیبن تو پولیس کے پاس جانے کے لئے مُصر تھی لیکن نسیم بی بی کو جب یہ معلوم ہوا تو اس نے اس کو سختی کے ساتھ منع کر دیا اور کہہ دیا کہ وہ پولیس کو کوئی بیان نہیں دے گی، اس پر زیبن خاموش ہو گئی۔ میں نے بھی زیبن کو سمجھایا کہ ان سب باتوں سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا اور وہ اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دے وہی سب سے بڑا انصاف کرنے والا ہے۔"

ماسی خیراں خاموش ہو گئی، مراد بھی خاموش ہو گیا۔ "تم..... تم چاہو تو نسیم بی بی سے خود بات کر لو۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ماسی خیراں نے کہا۔ "بشرطیکہ وہ تم سے اس بارے میں بات کرنے پر تیار ہو جائے۔"

"نہیں ماسی خیراں....." مراد نے کہا۔ "اس کی ضرورت نہیں ہے، مجھے تمہاری بات کا پورا یقین ہے، میں یہ بات تو اچھی طرح جانتا تھا کہ اماں نے کبھی بھی جنت کو پسند نہیں کیا، وہ ہمیشہ اس سے نفرت کرتی رہیں لیکن اس بات کا مجھے کبھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس قدر ظالم بھی ہو سکتی ہیں کہ اس کو جلا کر مار ڈالیں۔" مراد کی آواز بھرا گئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ماسی خیراں بھی اپنے دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھیں پونچھنے لگی۔

"اچھا ماسی خیراں میں چلتا ہوں۔" مراد نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا، اس کی ٹانگیں ہولے ہولے کانپ رہی تھیں۔

گھر کی فضا میں قبرستان کا سناٹا رہنے لگا تھا مراد کسی سے بات نہیں کرتا تھا، وہ گھر میں بھی نہیں رہتا تھا اور منڈی بھی نہیں جاتا تھا، وہ زیادہ تر وقت قبرستان میں جنت کی قبر کے پاس، بیری کے گھنے درخت کے سائے میں بیٹھ کر گزارتا تھا، اس نے اپنی ماں سے اس الزام کے بارے میں اب تک کوئی بات نہیں کی تھی جو زیبن نے اس پر لگایا تھا لیکن جب بھی وہ اپنی ماں کے چہرے کی طرف دیکھتا تھا، اسے وہاں خوف کی تحریر صاف نظر آ جاتی تھی۔ منظوراں اس سے واقعی خوف زدہ رہتی تھی، وہ اس کے پاس بھی زیادہ نہیں آتی تھی، محمد یونس، بیٹے کو دلاسہ دینے کی کوشش کرتا رہتا تھا، اس کو اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ شدید صدمے کی اس کیفیت سے نکلنے میں مراد کو ابھی کچھ وقت لگے گا اور تب تک



کے لئے اس کو اس کے حال پر چھوڑ دینا ہی بہتر ہو گا اور جہاں تک زیبن کے لگائے ہوئے الزام کا تعلق تھا تو محمد یونس کی اس کے بارے میں کسی سے گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ محمد یونس ان دنوں خود بھی پابندی سے منڈی نہیں جا رہا تھا، کسی کسی دن چلا جاتا تھا اور مراد نے تو بیوی کی موت کے بعد سے منڈی میں قدم بھی نہیں رکھا تھا۔

اس روز صبح کو جب منظوراں نے ناشتہ تیار کر کے برآمدے میں چارپائی پر لا کر رکھا تو اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ مراد وہاں ایک بیگ ہاتھ میں لئے ہوئے بیٹھا تھا، اس کا چہرہ کسی مردہ پتھر کی طرح سخت ہو رہا تھا اور اس کی نظروں میں ایک عجیب قسم کی کڑواہٹ تھی، اسی وقت محمد یونس بھی وہاں آن پہنچا۔

"آؤ جلدی سے ناشتہ کر لو۔" منظوراں نے ان دونوں سے کہا لیکن مراد اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوا، وہ اسی طرح بیٹھا رہا، محمد یونس اور منظوراں دونوں اس کو قدرے حیرت سے دیکھنے لگے، اس کے ہاتھ میں بیگ تھا۔

"اماں..... تم نے آخر جنت کو مار ڈالا نا.....؟" یکایک مراد اپنی ماں سے مخاطب ہو کر بھاری آواز میں بولا۔ اس کا گلا جیسے بیٹھا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ "اب تو تمہارے کلیجے میں ٹھنڈک پڑ گئی نا.....؟"

"اے ہے کیا بکتے ہو؟" منظوراں نے سخت خوف زدگی کے عالم میں اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کا لہجہ کمزور تھا اور اس کی آواز اور الفاظ توانائی سے خالی تھے۔ "بھلا میں کیوں اس کو مار ڈالتی؟"

"مجھے سب معلوم ہے اماں۔" مراد نے نگاہوں کے شعلے اس کے اوپر برساتے ہوئے کہا۔ "مجھے سب معلوم ہے، تم نے اس کو جلا کر مار ڈالا اماں..... کاش..... میں تم کو پولیس میں دے سکتا..... کاش میں تمہارے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگوا سکتا۔ میں یہ سب کچھ نہیں کر سکتا کیونکہ تم میری ماں ہو، میں صرف یہ کر سکتا ہوں کہ اب آئندہ کبھی تمہاری شکل نہ دیکھوں.....!" اس کے ساتھ ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ارے..... ارے پاگل ہو گئے ہو کیا؟" منظوراں نے لرز کر کہا۔ "یہ کس نے میرے خلاف تمہارے کان بھرے ہیں؟ کس نے زہر گھول دیا ہے تمہارے دماغ میں..... تم مجھے....."

مراد کے علاوہ محمد یونس بھی بغور منظوراں کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ وہاں انکار کی بے خوفی اور جرأت مندی کا قطعی فقدان محسوس ہوتا تھا، صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اس

اچانک انکشاف سے حیران اور اپنے جرم کو چھپانے کی کوشش میں مصروف تھی۔

"میرے دماغ میں زہر کسی نے نہیں گھولا ہے اماں۔" مراد نے اس کو خونی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "زہر گھولنے والی تو صرف تم ہو' تم زہر گھولتی رہی ہو' سارا وقت اور تمہیں شاید یہ بات نہیں معلوم تھی کہ جنت نے نسیم بی بی کو خود یہ بتا دیا تھا کہ اس کو تم نے جلایا ہے' تم نے میری بیوی کو بھی مار دیا اور میرے بچے کو بھی جو ابھی پیدا نہیں ہوا تھا۔"

منظوراں کے چہرے پر یکبارگی موت کی سی زردی چھا گئی یہ بات تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ جنت نے عالم ہوش میں کسی کو اس بارے میں بتایا بھی ہو گا اور فوراً ہی اس کو یاد آ گیا کہ وہ نسیم بی بی کو ذرا سی دیر کے لئے جنت کے پاس چھوڑ کر چادریں لینے کے لئے گئی تھی' ایک لمحے کے اندر اندر ہر بات بالکل واضح ہو گئی' زیبن کے لگائے ہوئے الزام کا ماخذ فوراً معلوم ہو گیا۔

"ن..... ن..... نسیم بی بی.....!" اس نے بوکھلا کر کہا مزید کچھ کہنے کے لئے اس کو الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

"ہاں اماں نسیم بی بی۔" مراد نے کہا۔ "جنت کو اللہ میاں نے اتنی مہلت دے دی تھی کہ وہ مرنے سے پہلے کسی کو اپنے قاتل کا نام بتا دے اور میں اب تمہاری صورت نہیں دیکھنا چاہتا' اماں آج سے تم میرے لئے مر گئیں اور میں تمہارے لئے مر گیا۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے ایک جھٹکے سے اپنا بیگ اٹھایا اور تیزی سے دروازہ کی طرف بڑھ گیا۔

"ارے ٹھہرو....." منظوراں کمزور آواز میں چلاتی ہوئی اس کی طرف دوڑی' اس کی ٹانگیں بری طرح کانپ رہی تھیں اور وہ ٹھیک سے چل بھی نہیں پا رہی تھی۔

"ٹھہرو..... میری بات تو سنو بیٹا۔"

لیکن مراد کچھ نہیں سن رہا تھا' وہ دروازہ کھول کر تیزی سے باہر جا رہا تھا۔

"ارے تم اس کو روکتے کیوں نہیں؟" منظوراں نے وحشت کے عالم میں اپنے شوہر سے کہا جو دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑے ہوئے خاموش بیٹھا تھا۔ "جلدی سے اسے روکو..... روکو..... وہ کہاں جا رہا ہے۔"

محمد یونس جیسے کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا تھا' یہ سب کچھ اس کے علم میں نہیں تھا' اس کے ہوش و حواس پر تو جیسے بجلی گر گئی تھی' اس کا دماغ ماؤف ہوا جا رہا تھا۔ اس نے



اپنا چہرہ اٹھا کر منظوراں کی طرف دیکھا' اس کی آنکھیں خونِ کبوتر کی طرح سرخ ہو رہی تھیں اور چہرے پر ویرانی برس رہی تھی۔

"تو خود ہی روک لے۔" اس نے اپنے وجود کی ساری نفرت اور کراہیت کو اپنے الفاظ میں سمو کر انہیں منظوراں کی طرف اچھال دیا اور خود اٹھ کر تیزی سے دروازے سے باہر نکل گیا۔

جنت کی المناک موت کے بعد کتنے داغ تھے جو زیبن کے بدن پر لگتے چلے گئے تھے' شوہر غائب ہوا' پھر بیٹا غائب ہوا اور اب بیٹی ہمیشہ کے لئے داغِ مفارقت دے گئی۔ زندگی کی نامہربانیوں کی بھلا کوئی انتہا تھی لیکن وہ پھر بھی زندہ تھی اور جدوجہد کر رہی تھی' اسے زندہ رہنا تھا' اپنے لئے اپنی ان تین معصوم بچیوں کے لئے جن کا اس دکھ بھری دنیا میں آنے میں اپنا کوئی قصور نہیں تھا۔

شورِ گریہ اور نوحہ خوانی کے ایک مختصر سے وقفے کے بعد زندگی ایک بار پھر اسی ڈگر پر چل پڑی تھی' چوہدریوں کے ہاں اس کے کام کا سلسلہ جاری تھا اور جنت کی موت کے بعد نصرت جیسے ایک دم سے بہت بڑی ہو گئی تھی' اس کی ذمہ داریاں بڑھ گئی تھیں' اس کے فرائض بڑھ گئے تھے' اب اس گھر کو' چھوٹی بہنوں کو اسی کو تو سنبھالنا تھا۔

زیبن جب جنت کو یاد کرتی تھی تو اس کے کلیجے میں ہوک اٹھتی تھی' منظوراں کے لئے اس کے دل سے صرف بددعائیں نکلتی تھیں اور وہ دامن پھیلا پھیلا کر اس کی تباہی اور بربادی کی دعائیں مانگا کرتی تھی۔

پھر کچھ دنوں کے بعد ہی اس کو یہ معلوم ہوا کہ مراد اپنا گھر چھوڑ کر کسی دوسرے شہر چلا گیا ہے اور اس کے جانے کے دوسرے ہی دن اس کے باپ محمد یونس پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ صاحبِ فراش ہو گیا۔

"مراد میرے پاس آیا تھا۔" ماسی خیراں نے گہری اداسی کے ساتھ زیبن کو بتایا۔

"میں نے تم سے جان بوجھ کر اس کے آنے کا ذکر نہیں کیا تھا اور وہ خود تمہارے پاس اس لئے نہیں آیا کہ وہ تمہارا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

"وہ تمہارے پاس آیا تھا؟" زیبن نے تعجب سے کہا۔ "کب؟ کب آیا تھا؟ کیا کہتا تھا؟"

"وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ تم نے اس کی ماں کے خلاف جنت کو جلانے کا الزام کس بنیاد پر لگایا تھا۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "اور میں نے اس کو سب کچھ بتا دیا۔ اس کو نسیم بی بی کے

بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا' وہ بے چارہ یہ سب کچھ سن کر بہت دکھی ہو گیا اور اس کے بعد ہی اس نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کر لیا۔"

"وہ چلا گیا اور محمد یونس مفلوج ہو گیا۔" زیبن نے آہستہ سے کہا۔ "منظوراں اب کیا کرے گی؟ خیر کچھ بھی کرے' میری مردہ بیٹی تو اب واپس نہیں آ سکتی۔"

"مُردے کبھی واپس نہیں آتے زیبن۔" ماسی خیراں نے آہستہ سے کہا۔

ہر واقعہ خواہ وہ کسی انسان کی زندگی کا کتنا ہی اہم اور غیر معمولی واقعہ کیوں نہ ہو' آخر کار ماضی کا حصہ بن جاتا ہے اور ماضی کے دھندلکوں میں لپٹ جانے کے بعد آہستہ آہستہ دھندلانے لگتا ہے' زیبن کی زندگی میں بھی پچھلے برسوں کے دوران پیش آنے والے تیز و تند اور المناک واقعات ماضی کا حصہ بنتے جا رہے تھے۔ گامو ماضی کا حصہ بن چکا تھا' ناصر ماضی کا حصہ بننے کے ساتھ ساتھ حال میں بھی زندہ تھا اور جنت تو مکمل طور پر ماضی کا حصہ بن چکی تھی' وہ تو وقت کے سارے رشتے توڑ کر چلی گئی تھی۔ مراد کا کوئی پتہ نہیں تھا اور اس کا مفلوج باپ بستر پر پڑا ہوا زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔

اس روز زیبن چوہدریوں کے گھر سے ذرا جلدی واپس آ گئی تھی۔ سب لوگوں کو کہیں جانا تھا اور وہ جانے کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے' وہ چاہتے تھے کہ زیبن ان کے جانے سے پہلے کام ختم کر کے' رخصت ہو جائے۔ زیبن بھی جلدی جلدی ہاتھ چلا رہی تھی اور پھر وہ کام ختم کر کے گھر واپس آ گئی' آنے کے ساتھ ہی وہ نہانے چلی گئی' کئی دن سے نہانے کا موقع نہیں ملا تھا' نہا دھو کر اس نے کپڑے بدل لئے' بالوں میں کنگھی کی اور کمرے میں رکھے ہوئے ایک آئینے میں اپنے چہرے کو دیکھنے لگی' سر میں اگرچہ کچھ سفید بال موجود تھے لیکن وہ مہینے میں دو ایک بار مہندی لگایا کرتی تھی اور اس طرح سفید بال کھچی ہو کر غائب ہو جاتے تھے۔

یکایک کسی نے دروازے پر دستک دی۔ اس نے نصرت کو آواز دے کر کہا کہ باہر جا کر دیکھے کون آیا ہے۔ نصرت چلی گئی اور پھر ذرا دیر کے بعد واپس آ گئی۔

"اماں۔ ایک آدمی آیا ہے۔" واپس آ کر اس نے کہا۔ "وہ تم سے ملنا چاہتا ہے۔"

"مجھ سے.....؟" زیبن نے سخت حیران ہو کر پوچھا۔ "مجھ سے ملنا چاہتا ہے؟ کون ہے وہ؟"

وہ دروازے تک آئی اور اس نے وہاں ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کو کھڑے پایا۔

"کون ہو بھائی تم؟" زیبن نے نرم لہجے میں دروازے کے پیچھے سے ہی اس سے



پوچھا۔ "کس سے ملنا ہے؟"

مہر علی نے اپنے سامنے کھڑی ہوئی دراز قد' چھریرے اور متناسب جسم اور تیکھے نقوش والی اس درمیانہ عمر کی عورت کو ایک نظر دیکھا اور پھر بولا۔ "مجھے زیبن سے ملنا ہے زیب النساء زوجہ غلام محمد عرف گامو سے۔"

"کہاں سے آئے ہو؟" زیبن نے متجسسانہ انداز میں اس کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا کام ہے زیبن سے؟"

"میں اسپتال سے آیا ہوں۔" اس شخص نے کہا۔ "مہر علی میرا نام ہے' وہاں اسپتال میں ایک آدمی داخل ہے وہ بہت زیادہ بیمار ہے' اس کا نام غلام محمد عرف گامو ہے اس نے مجھے اپنی زیبن کے پاس بھیجا ہے' وہ زیبن سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔"

زیبن پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی' اس شخص کی زبان سے نکلے ہوئے ان الفاظ نے آن کی آن میں زیبن کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا' اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس بات پر خوش ہو یا آنسو بہائے' اپنے اندر محبت کے جذبے کو ابھارے یا نفرت کو..... گامو یہ تو ایک ایسا نام تھا جس نے اس کی زندگی میں پہلے تو شہد گھولا تھا لیکن پھر بعد میں زہر..... اور پھر تو بس زہر ہی زہر باقی رہ گیا تھا اور یہ خوفناک زہر زیبن کے وجود کو آج تک چاٹ رہا تھا۔

"مگر تم..... کون ہو؟" زیبن نے اس سے پوچھا۔ "کیا تم اسپتال میں کام کرتے ہو؟"

"نہیں۔" مہر علی نے جواب دیا۔ "میں اسپتال میں کام نہیں کرتا ہوں' میرا ایک عزیز اسپتال میں داخل ہے میں اس کے ساتھ تیماردار کے طور پر رہ رہا ہوں' میرے عزیز کا نام شوکت حسین ہے اور اس کا بستر گامو کے بستر کے ساتھ ہی ہے گامو کے ساتھ تو کوئی بھی نہیں ہے' میں ہی اس کی دیکھ بھال کرتا رہتا ہوں' اس نے مجھ کو اس گھر کا پتہ بتایا اور تمہارا اور اپنے بیٹے کا نام بھی..... اور مجھ سے کہا کہ میں جا کر تم کو اس کا پیغام دے دوں کہ ایک بار آ کر اسے مل لو وہ بہت بیمار ہے۔"

یکایک' ایک زبردست طوفانِ گریہ زیبن کے سینے میں جوش مارنے لگا جس کو باہر پھٹ پڑنے سے اس نے بمشکل روکا' اس کے سارے وجود کی جیسے طنابیں کھنچ رہی تھیں اور یوں لگ رہا تھا جیسے سب کچھ چیخ کر ٹوٹ جائے گا۔

"میں تمہیں اس کے وارڈ کا اور بستر کا نمبر بتائے دیتا ہوں اور پتہ بھی سمجھائے دیتا

ہوں۔" مہر علی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "تم کسی وقت آ کر اس سے مل لینا اپنی اور بچوں کی خیریت سے اس کو مطلع کر دینا' خوش ہو جائے گا بے چارہ۔" اور وہ زمین کو اس کے پتے کے بارے میں بتانے لگا۔

"ٹھیک ہے بھائی۔" زمین نے بڑی مشکل سے کہا۔ اس کی آواز اس کے حلق میں پھنس رہی تھی اور اس کے لئے بولنا مشکل تھا۔ "میں اس سے مل لوں گی۔"

مہر علی کے نظروں سے اوجھل ہو جانے کے بعد ہی زمین کو پورے طور پر اس معاملے کی شدت کا احساس ہو سکا۔ گامو زندہ تھا بیمار تھا' اسپتال میں تھا' اس سے ملنا چاہتا تھا' اس کی اور بچوں کی خیریت معلوم کرنا چاہتا تھا۔

یکایک' سارے پرانے زخموں کے ٹانکے کھل گئے اور ان میں سے خون نکل نکل کر زمین کے وجود کو تر کرنے لگا' رفتہ رفتہ خون کا ایک پورا دریا وجود میں آ گیا اور زمین اس میں ڈبکیاں کھانے لگی۔

"کون آیا تھا اماں؟" نصرت نے اپنی ماں کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اور تب زمین کو اس بات کا احساس ہوا کہ بچوں کو ابھی اس بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے تو پھر بہتر یہی ہو گا کہ ابھی ان کو کچھ معلوم بھی نہ ہو' اس نے دل میں سوچا۔

"ایک آدمی تھا بیٹا۔" اس نے بڑی نرمی اور آہستگی کے ساتھ کہا۔ "کچھ کام سے آیا تھا۔"

نصرت دوبارہ باورچی خانے میں چلی گئی اور زمین اچانک چارپائی پر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "دروازہ اندر سے بند کر لو بیٹی۔" اس نے باورچی خانے کے پاس جا کر نصرت سے کہا۔ "میں ذرا ماسی خیراں کے پاس جا رہی ہوں' ابھی تھوڑی دیر میں واپس آ جاؤں گی۔"

"اچھا۔" نصرت نے کہا اور ماں کے ساتھ چلتی ہوئی دروازے تک آئی۔ زمین باہر نکل گئی اور نصرت نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ زمین سیدھی ماسی خیراں کے گھر پہنچی۔

"ماسی خیراں!" اس نے اس کے پاس بیٹھ کر لرزتی ہوئی رقت بھری آواز میں سرگوشی کی۔ "ماسی خیراں گامو زندہ ہے' وہ اسپتال میں ہے اور اس نے مجھے بلایا ہے۔"

ماسی خیراں حیرت اور بے یقینی کے عالم میں اس کو گھورنے لگی۔

"کیا.....؟" ماسی خیراں نے بمشکل کہا۔ "تم کیا کہہ رہی ہو؟ تم کو کیسے معلوم ہوا یہ سب؟"

"ابھی ابھی ایک آدمی آیا تھا ماسی۔" زمین شکستہ لہجے میں اس کو بتانے لگی۔ "اس



کو گامو نے یہاں بھیجا تھا۔" اور اس نے مہر علی کی ساری بات ماسی خیراں کو بتا دی۔

"واہ میرے مولا تیری شان۔" زمین کی پوری بات سننے کے بعد ماسی خیراں نے ایک لمبی اور گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"معلوم نہیں وہ کس حال میں ہے' ماسی خیراں۔" زمین نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "جی تو نہیں چاہتا اس کی شکل بھی دیکھوں پھر سوچتی ہوں نہ جانے کتنا بیمار ہے وہ..... کیسی حالت ہے۔"

"نہیں نہیں.....۔" ماسی خیراں نے جلدی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تمہیں جانا چاہئے اس نے تم کو بلایا ہے' اس کا مطلب ہے وہ اپنے کئے پر نادم ہے' تم کو اس سے ضرور ملنا چاہئے۔"

اگلے دن زمین ماسی خیراں کے ساتھ اسپتال پہنچی۔ مہر علی ان کو اسپتال کے برآمدے میں ہی مل گیا۔ وہ ان دونوں کو اپنے ساتھ لے کر اندر وارڈ میں گیا۔ زمین کی نظروں کے سامنے اسپتال کے وارڈ بستر پر ایک ہڈیوں کا نیم مردہ ڈھانچہ پڑا ہوا تھا' اس میں وہ کسی کھوئے ہوئے آدمی کے خدوخال کو تلاش کر رہی تھی جس کی ہلکی سی' معمولی سی جھلک یہاں موجود تھی لیکن باقی تو سب کچھ غائب ہو چکا تھا' وہ آدمی تو نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ ڈھانچے کی آنکھوں سے زمین اور ماسی خیراں کو دیکھتے ہی آنسو بہنے لگے تھے جو اس کے سوکھے ہوئے' پچکے ہوئے' بے رنگ' بے رونق رخساروں پر ڈھلک رہے تھے' جن میں پڑے ہوئے گڑھوں کے باعث جبڑوں کی ہڈیاں اور بھی زیادہ نکیلی نظر آنے لگی تھیں۔

گامو رو رہا تھا' زمین رو رہی تھی اور ان کے ساتھ ساتھ ماسی خیراں بھی رو رہی تھی۔ مہر علی کچھ فاصلے پر کھڑا ہوا خاموشی سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔

بڑی دیر تک نہ تو زمین نے کچھ کہا نہ گامو نے کچھ کہا۔ شاید دونوں ہی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ گفتگو کا آغاز کہاں سے کریں اور ایک دوسرے سے کیا کہیں' جدائی کے ان طویل برسوں کے دوران ایک دوسرے پر کیا گزری تھی' وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے اور شاید جاننا بھی نہیں چاہتے تھے کیونکہ دونوں کو ہی اس بات کا بخوبی علم تھا کہ ان کے پاس ایک دوسرے کو بتانے کے لئے اور ایک دوسرے سے سننے کے لئے کوئی خوشگوار' راحت فزا اور مسرت بخش بات نہیں ہے۔ گامو کے پاس محرومی' ندامت' پچھتاوے اور احساسِ ذلت کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا اور زمین بے پناہ صدموں اور

دکھوں کے بوجھ تلے دب کر ٹوٹی جارہی تھی۔

"بچے کیسے ہیں؟" بڑی دیر کے بعد گامو کی زبان سے نکلا۔ اس کی آواز بہت کمزور، ہلکی، اور شکستہ تھی۔

"ٹھیک ہیں۔" زمین نے دھیرے سے جواب دیا۔ جھوٹ بولتے وقت اس کا دل کس قدر شدت کے ساتھ تڑپا تھا۔ "سب بچے ٹھیک ہیں۔" وہ اپنے شوہر کو مردہ بیٹی اور لاپتہ بیٹے کی خیریت کی اطلاع دے رہی تھی۔

"میں..... میں بہت بیمار ہوں زمین....." اچانک گامو نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا اور وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ "ایک بار بچوں کو لے آنا میں ان کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"لے آؤنگی۔" زمین نے کہا اور شدت غم سے اس کا کلیجہ پھٹنے لگا۔ وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پارہی تھی، وہ ان لوگوں کو کہاں سے لائے گی جو اس کی دنیا سے بہت دور چلے گئے تھے؟

گامو نے کئی سال کا یہ عرصہ کہیں نہ کہیں تو گزارا ہی ہوگا، خواہ سڑکوں پر، گلیوں میں، محتاج خانوں میں، کہیں نہ کہیں تو گزارہ کرتا ہوگا تو پھر جب سہولت ہوگی، تو وہ اس سے پوچھ لے گی۔ وہ وقت تو گزر ہی گیا تھا، اب صرف پوچھنا اور اس کے بارے میں جاننا ہی رہ گیا تھا تو اس کی کیا جلدی تھی اور اس کی کیا اہمیت تھی، گزرنے والے دن تو گزر چکے تھے۔ گامو اور زمین کے درمیان بہت کم بات چیت ہوئی۔ زمین نے اس سے کوئی گلہ شکوہ نہیں کیا، اس کو کوئی لعنت ملامت نہیں کی، اگر گامو کا کوئی بدترین جانی دشمن بھی ہوتا تو بھی اس حالت میں گامو کو دیکھ کر اس کو لعنت ملامت کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا، بھلا ایک زندہ لاش سے کوئی کیا جھگڑا کر سکتا تھا۔

ماسی خیراں نے البتہ گامو سے کچھ زیادہ باتیں کیں۔ اس سے پوچھا کہ وہ کب سے بیمار ہے اور سپتال کیسے پہنچا۔ گامو سے ٹھیک سے بولا نہیں جارہا تھا، اس کی آواز بھی بہت ہلکی اور کمزور تھی جو کچھ اس نے کہا، اس سے صرف یہ سمجھا جاسکا کہ کسی فلاحی تنظیم کے ورکر اسے کہیں سے لاکر اسپتال میں ڈال گئے تھے یوں لگتا تھا کہ گامو کو خود بھی اپنے بارے میں کچھ زیادہ نہیں معلوم تھا، وہ جیسے ایک عالم بے خبری میں رہا تھا۔

ماسی خیراں اور زمین جب اس کے پاس سے رخصت ہونے لگیں تو گامو ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رونے لگا تھا۔ "پھر آنا زمین....." اس نے سسکتے



ہوئے کہا۔ "جنت کو لانا، ناصر کو لانا اور چھوٹیوں کو بھی..... میں سب کو دیکھ لوں ایک دفعہ..... میرے پاس وقت بہت کم ہے زمین....."

زمین سر سے پاؤں تک کانپ اٹھی، وہ خود بھی اس بات کو محسوس کرسکتی تھی کہ گامو کے پاس وقت واقعی بہت کم تھا۔

"ہاں ہاں..... میں آؤں گی اور بچوں کو بھی لاؤں گی۔" اس نے اس کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ کیسی کیسی بھیانک حقیقتیں تھیں جن کو اس سے چھپانا ضروری تھا اور یہ سب کچھ کس قدر اذیت ناک تھا، اگر گامو نے وہ سب کچھ نہ کیا ہوتا تو شاید آج جنت بھی زندہ ہوتی اور ناصر بھی گھر میں موجود ہوتا۔ چند لمحوں کے لئے اس کے دل میں گامو کے لئے نفرت کی ایک لہر دوڑ گئی لیکن پھر اس نے اس لہر کو دبا دیا، ایک مرتے ہوئے انسان کو رحم کی ضرورت تھی، نفرت کی نہیں..... ان لمحوں میں زمین کا دل گامو کے لئے خون کے آنسو رو رہا تھا، گامو نے سب کچھ تباہ کردیا تھا، اس کو اور اس کے بچوں کو دربدر کردیا تھا اور وہ اس سے اس کے سیاہ کرتوتوں کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔

مہر علی ان دونوں کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا اسپتال کے گیٹ تک آیا اور ان سے باتیں کرتا رہا اس نے ان دونوں کو بتایا۔ "ڈاکٹروں نے گامو کو جواب دے دیا ہے، خود گامو سے تو ڈاکٹر نے کچھ نہیں کہا تھا لیکن میں نے ڈاکٹر سے پوچھا تھا، مجھے ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ اس مریض کے بچنے کا کوئی امکان نہیں ہے اور پہلے تو وہ کچھ بھی بتانے پر راضی نہیں تھا لیکن جب میں نے بہت اصرار کیا تب اس نے بتایا کہ اس کے بیوی بچے یہیں ایک نواحی بستی میں موجود ہیں اور میں اس سے پتہ پوچھ کر تمہارے پاس پہنچا۔"

"میرے لائق کوئی بھی خدمت ہو تو بتاؤ۔" مہر علی نے ان دونوں سے ہی مخاطب ہو کر کہا۔ "میں تو ہر خدمت کے لئے تیار ہوں۔"

"بس بھائی، گامو کا ذرا خیال رکھنا۔" زمین نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "وہ یہاں بالکل اکیلا ہے۔" اور اس کے ساتھ ہی زمین کے کلیجے پر ایک زور کا گھونسا لگا گامو تو پچھلے کئی سالوں سے اکیلا تھا اور اس اکیلے پن میں نہ جانے کہاں کہاں کے دھکے کھاتا پھرا تھا مگر اب تو اس کو کہیں کے دھکے کھانے کی ضرورت نہیں تھی، اب تو بس اس کو ایک آخری دھکے کی ضرورت تھی۔

اگلے دن شام کو زمین تینوں بچیوں کو ساتھ لے کر اسپتال آئی۔ اس نے بچیوں کو پہلے ہی اچھی طرح سے سمجھا دیا تھا کہ وہ اپنے بیمار باپ سے جنت اور ناصر کے بارے کوئی

تذکرہ نہ کریں کیونکہ بے حد بیمار باپ کو ان کے بارے میں کچھ نہیں بتانا ہے۔ بچیوں نے گمشدہ باپ کی بازیابی پر کسی خاص مسرت آمیز ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ گامو کی گمشدگی کو تقریباً چار سال کا عرصہ گزر چکا تھا' اس وقت سب سے زیادہ سمجھ دار نصرت ہی تھی جو تقریباً چھ سال کی تھی' گھر میں باپ کا وجود ان کے لئے کوئی خوشگوار معنویت نہیں رکھتا تھا' عرصہ پہلے گامو نے گھر میں اور بیوی بچوں میں دلچسپی لینا چھوڑ دی تھی۔

ماسی خیراں آج اس کے ساتھ نہیں تھی۔ زمین تینوں بچیوں کو لے کر اکیلی وہاں پہنچی تو مہر علی اس کو برآمدے میں ملا۔ زمین نے اسے اپنی تینوں بچیوں سے ملوایا اور ان کے نام بتائے۔

"لو گامو تمہارے بچے آگئے۔" مہر علی نے زور سے آواز دیتے ہوئے گامو سے کہا جو آنکھیں بند کئے ہوئے نیم غنودگی کے عالم میں پڑا ہوا تھا۔ مہر علی کی آواز سن کر گامو نے آنکھیں کھول دیں اور اپنے سامنے زمین کو اور تین بچیوں کو دیکھا اس نے باری باری بچیوں کو سینے سے لگا کر پیار کیا' اس کی گدلی گدلی زرد' نحیف اور نیم روشن آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔

بچیوں کے لئے وہ محض ایک بیمار آدمی تھا' اسپتال کے میلے کچیلے بستر پر پڑا ہوا ایک میلا کچیلا بیمار آدمی..... جس کو دیکھ کر ان کے دل میں کوئی مسرت آمیز اور نشاط آفریں جذبہ بیدار نہیں ہوا تھا' وہ محض متجسس نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے' کتنا کمزور اور دبلا پتلا تھا یہ آدمی..... بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ..... اس کو تو چھوتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا۔

"جنت اور ناصر کہاں ہیں؟" گامو نے بڑی مشکل سے کہا۔ اس کو بولنے میں بھی تکلیف ہوتی تھی اور اس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلتی تھی۔ کینسر اندر ہی اندر اس کے گلے کو کھا رہا تھا' وہ محض چند روز کا مہمان رہ گیا تھا۔ زمین بہت بروقت وہاں پہنچی تھی۔

"جنت اپنی سسرال میں ہے اور ناصر کام پر گیا ہوا تھا۔" زمین نے پہلے سے سوچا سمجھا جواب دیا۔ "وہ دونوں پھر کسی وقت آجائیں گے۔"

"پھر کسی وقت..... پھر کسی وقت....." گامو نے بڑی مشکل سے ان الفاظ کو دہرایا اور خاموش ہوگیا۔

مہر علی نے یہ بات زمین کو پہلے ہی بتا دی تھی کہ گامو سوائے دودھ یا دلیہ وغیرہ کے



کچھ کھا بھی نہیں سکتا اس لئے وہ اس کے لیے کھانے کی کوئی چیز لے کر نہ آئے' سوائے دودھ یا دلیے کے..... چنانچہ آج زمین اس کے لئے تھوڑا سا دلیہ لے کر آئی تھی جو اس نے گامو کو کھلانے کی کوشش کی لیکن گامو سے چند چمچوں سے زیادہ نہ کھایا گیا' اس کے حلق میں سخت تکلیف ہو رہی تھی' کچھ بھی تو نگلا نہیں جا رہا تھا' کچھ دیر کے بعد وہ سب لوگ جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ زندگی کتنے بہت سارے الگ الگ خانوں میں بٹی ہوئی تھی' صبح سے شام تک طرح طرح کے کام اور اب پھر گھر جانا تھا جہاں اور بہت سارے کام اپنی باری کے انتظار میں تھے۔

گزشتہ رات کی طرح وہ رات بھی زمین نے بڑے کرب کے عالم میں گزاری' وہ اپنی زندگی کے ان انمول ماہ و سال کو یاد کرتی رہی تھی جو وقت کے لامحدود صحرا میں نہ جانے کہاں گم ہوگئے تھے' وہ شادی کے بعد کی زندگی جب ہر چیز کس قدر خوبصورت تھی اور روز و شب کی سختیاں بھی محبت کی قوت کے آگے نرم پڑ جاتی تھیں اور پھر سب کچھ ختم ہوگیا تھا..... کیسے بھیانک سناٹے اور کیسی خوفناک محرومیاں زندگی میں در آئی تھیں' سب کچھ تباہ ہوتا چلا گیا تھا' ایک کے بعد ایک عذاب۔

اگلے دن اس نے بچوں سے صبح ہی کہہ دیا تھا کہ وہ کام پر سے سیدھی اسپتال جائے گی اور پھر وہاں سے گھر واپس آئے گی' اس لئے اس کو دیر ہو جائے گی' اس نے ماسی خیراں سے بھی کہہ دیا تھا کہ ذرا بچوں کا خیال رکھے۔

اس روز وہ بالکل اکیلی اسپتال گئی جب وہ گامو کے بستر کے پاس پہنچی تو اس نے مہر علی کو وہاں موجود پایا جو گامو کو چمچے سے پانی پلا رہا تھا۔ گامو کی طبیعت کل کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی خراب معلوم ہوئی تھی۔

"جنت اور ناصر نہیں آئے؟" گامو نے بڑی مشکل سے زمین سے پوچھا اور زمین نے آہستہ سے نفی میں گردن ہلا دی۔ "وہ آجائیں گے کسی وقت....."

اس کی آواز میں بے بسی کا ایسا درد گھلا ہوا تھا جس کی تہہ تک پہنچنا گامو کے لئے ممکن نہیں تھا۔ مہر علی زمین کو بتاتا رہا کہ آج گامو کی طبیعت زیادہ خراب رہی۔

زمین اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتی تھی کہ اس کے پاس کچھ زیادہ دیر تک بیٹھ جائے۔ وہ رات کو یہاں نہیں رہ سکتی تھی یہ مردانہ وارڈ تھا اور یہاں رات کے وقت کسی عورت کو رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ "اگر ناصر ہوتا..... اگر ناصر ہوتا....." زمین کا دل کسی زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑا کر رہ گیا۔ زیادہ دیر تک رکنے

سے بھی کیا فائدہ تھا؟ گھر پر بچیاں اکیلی تھیں' وہ زیادہ توجہ کی مستحق تھیں۔

وہ جانے لگی تو مہر علی اس کے تھ ساتھ چلنے لگا۔ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اسپتال کے گیٹ تک پہنچے اور اس دوران ان کے درمیان باتیں ہوتی رہیں۔ مہر علی نے آج پہلی بار اس سے گامو کے بارے میں پوچھا کہ وہ اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر کیوں اور کہاں چلا گیا تھا اور زمین نے بتایا کہ وہ گھر سے پیسے لے کر چلا گیا تھا۔

"بس اس دن کے بعد سے میں نے پھر اس کو نہیں دیکھا۔" زمین نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "اس کے جانے کے بعد ناصر بھی بھٹے کا کام چھوڑ کر اپنے کسی دوست کے ساتھ گھر سے چلا گیا۔"

"اور..... تمہاری وہ بیٹی..... جنت.....؟" مہر علی نے پوچھا۔

"اس کی شادی ہوگئی تھی۔" زمین جیسے کسی قبر کے اندر سے بول رہی تھی۔ "اس کی ساس نے اس کو جلا کر مار ڈالا۔"

"اف خدایا....." مہر علی نے آہستہ سے کہا۔ "کس قدر دکھ اٹھائے ہیں تم نے زمین..... اور کس قدر دکھ اٹھا رہی ہو تم۔"

"اور نہ جانے کب تک اٹھاتی رہوں گی۔" زمین نے کہا۔ "بس بھائی' اپنی اپنی قسمت ہے۔"

"رات بہت ہوگئی ہے' زمین میں تم کو گھر تک چھوڑ آؤں؟" مہر علی نے کہا۔

"ارے نہیں۔" زمین نے کہا۔ "میں چلی جاؤں گی اس کی ضرورت نہیں ہے' تمہاری بڑی مہربانی..... بہت شکریہ تمہارا..... تم کتنا خیال کر رہے ہو گامو کا بھی اور میرا بھی۔"

"ارے نہیں زمین!" مہر علی نے ایک افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "دنیا میں انسان ہی انسان کے کام آتا ہے' پتھر تو انسانوں کے کام نہیں آتے' میں تو ہمیشہ دوسروں کی مدد کر کے خوش ہوتا ہوں۔"

زمین گھر پہنچی تو کافی رات ہو چکی تھی' ماسی خیراں بچیوں کے پاس موجود تھی' زمین نے اس کو گامو کی طبیعت کے زیادہ خراب ہونے کے بارے میں بتایا۔ بچیاں اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دے رہی تھیں۔

محلے کے دوسرے لوگوں کو بھی یہ بات معلوم ہوگئی تھی کہ گامو زندہ ہے اور اسپتال میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے لیکن کوئی اس کو دیکھنے کے لئے اسپتال نہیں



گیا۔ گامو کا کوئی دوست نہیں تھا' اس کے مرنے اور جینے سے کسی کو کوئی دلچسپی نہیں تھی البتہ بعض عورتیں زمین کے پاس آکر گامو کی صحت کے بارے میں پوچھ لیتی تھیں۔

اس سے اگلے دن جب زمین اسپتال گئی تو مہر علی نے اس کو بتایا کہ اس کے عزیز شوکت حسین کی طبیعت اب کافی بہتر ہوگئی ہے اور اگلے دو تین دن میں اس کی چھٹی ہو جائے گی اور پھر میں بھی یہاں سے چلا جاؤں گا۔

زمین کا دل ایک دم بیٹھنے لگا لیکن وہ یہ نہیں سمجھ پا رہی تھی کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ مہر علی کے یہاں سے جانے کا دکھ گامو کے تنہا رہ جانے کی وجہ سے ہو رہا تھا یا یہ خود اپنی تنہائی کا احساس تھا؟ پچھلے چند روز کی ملاقات میں بھی مہر علی نے اس کے دل میں اپنے لئے ایک جگہ بنالی تھی۔ مہر علی کو اس سے' اس کے بیمار شوہر سے اور اس کی بچیوں سے ہمدردی تھی۔

اگلے روز دوپہر کا وقت تھا اور زمین چوہدریوں کے گھر میں ابھی کچھ دیر پہلے دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد باورچی خانے میں جھوٹے برتنوں کے ڈھیر سے نبرد آزمائی کر رہی تھی کہ ماسی خیراں وہاں آن پہنچی۔ زمین اس کو دیکھ کر متعجب بھی ہوئی اور ڈر بھی گئی ماسی خیراں کا آنا خالی از علت نہیں ہو سکتا تھا' کوئی نہ کوئی بہت اہم بات ہوگی' وہ ماسی خیراں کے چہرے کی تحریر پڑھ سکتی تھی' اس تحریر میں کسی تازہ صدمے کا احوال صاف نظر آرہا تھا۔

"زمین.....!" ماسی خیراں نے رک رک کر' سنبھل سنبھل کر' آہستہ اور تھکے ہوئے لہجے میں اسے بتایا۔ "ابھی کچھ دیر پہلے مہر علی آیا تھا اس نے اطلاع دی ہے کہ اسپتال میں گامو کا انتقال ہوگیا ہے اور اب کچھ دیر کے بعد وہ وہاں سے گامو کی لاش لے کر آنے والا ہے' وہ گھر پر اطلاع دینے کے لیے اور یہ پوچھنے کے لئے کہ آیا کہ لاش کو گھر پر لائے..... میں نے اس سے کہہ دیا کہ لاش کو گھر پر لے آئے' میں گھر میں پڑوس کے کچھ لوگوں کو بٹھا کر آئی ہوں' تم چلو۔"

اگرچہ زمین کی زندگی میں اب گامو کا وجود کسی بھی معنویت کا حامل نہیں تھا تاہم یہ اس کے شوہر کی موت تھی جس پر اسے رونا بھی چاہئے تھا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی آج وہ سچ مچ بیوہ ہوگئی تھی اور اس کے بچے سچ مچ یتیم ہوگئے تھے' ایک موہوم سی امید' ایک کمزور سا بندھن' ایک بے نام سی آس جو پچھلے چار سال سے اس کے دل کے کسی دور دراز گوشے میں پڑی ہوئی تھی' آج خاموشی سے ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی۔

زمین روتی پیٹتی ماسی خیراں کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوگئی' چوہدریوں کے گھر کے

لوگوں کو اس نے گامو کے بارے میں پہلے ہی بتا دیا تھا اور اب ان کو اس کی موت کی اطلاع بھی دے دی۔

ماسی خیراں اور زیبن جب گھر پہنچیں تو اس وقت گامو کا جنازہ اسپتال سے آچکا تھا' لاش آنگن میں ایک چارپائی پر رکھی ہوئی تھی اور تینوں بچیاں' چارپائی کے پاس خاموش بیٹھی تھیں' گھر کے صحن میں بہت سی عورتیں بیٹھی ہوئی اپنی باتوں میں مصروف تھیں۔ زیبن کے وہاں پہنچتے ہی جیسے ایک کہرام مچ گیا' انہی عورتوں نے جن کی آنکھوں میں ابھی چند لمحے پہلے ایک آنسو بھی نہیں تھا اور جو بڑے اطمینان کے ساتھ مزے مزے میں ایک دوسرے سے باتیں کررہی تھیں' زیبن کو دیکھتے ہی چلا چلا کر زارو قطار رونا اور بین کرنا شروع کردیا اور زیبن خود بھی ان بین کرنے والیوں میں شامل ہوگئی۔

مہر علی گھر کے باہر دوسرے مردوں کے ساتھ موجود تھا' کچھ دیر کے بعد جب گھر کے اندر بپا ہونے والے طوفان کی شدت میں کمی آئی تو اس نے زیبن کو بلوا کر اس سے تدفین وغیرہ کے بارے میں پوچھا اور اپنی مدد کی پیشکش کی لیکن ماسی خیراں کے بیٹے وغیرہ اور محلے کے دوسرے لوگ تدفین کا بندوبست کررہے تھے۔ لوگ زندگی میں تو چاہے پاس کھڑے ہونے کے روادار نہ ہوں' لیکن مرنے کے بعد تدفین کا بندوبست ضروری ہوتا ہے اور پھر یہ تو آخری کام ہوتا ہے اس کے بعد تو مردہ کسی سے کچھ مانگنے نہیں آتا۔

گامو مرگیا اور زیبن کے دل میں اس کی گمشدگی اور مفقود الخبری کا جو کانٹا برسوں سے کھٹک رہا تھا' وہ ہمیشہ کے لئے نکل گیا۔ اب یہ غم کسی تیرِ نیم کش کی طرح نہیں تھا' یہ ایک تکمیل شدہ غم تھا' بس کچھ دنوں تک برداشت کرو اور پھر بھول جاؤں کیونکہ کسی ممکنہ مداوے کی صورت موجود نہیں تھی۔

مہر علی رات گئے تک وہاں رہا' وہ تدفین میں بھی شریک ہوا اور قبرستان سے واپس بھی زیبن کے گھر آیا' اسے دلاسہ' تسلی دیتا رہا اور اگلے دن دوبارہ آنے کا وعدہ کرکے وہاں سے چلا آیا۔

اگلے دن جب مہر علی آیا تو وہ کافی دیر تک زیبن کے ساتھ رہا' گھر میں صرف بچیاں اور زیبن تھی' محلے کی عورتیں وقتاً فوقتاً آتی رہیں اور جاتی رہیں۔ مہر علی زیادہ تر گامو کے بارے میں باتیں کرتا رہا اور زیبن کو یہ بتاتا رہا کہ کل اچانک کس طرح اس کی طبیعت خراب ہوگئی تھی اور وہ ختم ہوگیا تھا' اس روز اس کو زیبن نے اپنی اور گامو کی پچھلی زندگی کے بارے میں بھی بہت ساری باتیں بتائیں اور اپنی موجودہ زندگی کے دکھوں کے



بارے میں بھی بہت کچھ بتایا۔ مہر علی نے گہری توجہ انہماک اور دردمندی کے ساتھ اس کی باتیں سنیں اور زیبن کو اس سے باتیں کرکے کافی سکون حاصل ہوا۔

اس سے اگلے دن گامو کا قل بھی ہوگیا۔ مہر علی نے قل میں بھی شرکت کی' اس نے قرآن شریف تو نہیں پڑھا کیونکہ اسے پڑھنا نہیں آتا تھا لیکن وہ سارا وقت وہاں موجود رہا تھا۔

"کل شوکت حسین کی اسپتال سے چھٹی ہوجائے گی اور وہ یہاں سے چلا جائے گا۔" اس نے رخصت ہوتے وقت زیبن سے کہا۔ "اس کا بیٹا اس کو ساتھ لے جانے کے لئے آرہا ہے۔"

"اور تم.....؟" زیبن کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

"میں ایک دن رک کر جاؤں گا۔" مہر علی نے کہا۔ "مجھے شہر میں کچھ کام ہے' میں پرسوں جاؤں گا۔"

"تو..... تم جانے سے پہلے ملنے آؤ گے نا؟" زیبن نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں..... زیبن۔" مہر علی نے کہا۔ اس کے لہجے میں بڑی نرمی اور مٹھاس تھی۔ "میں آؤں گا بھلا تم سے ملے بغیر میں یہاں سے کس طرح جاسکتا ہوں؟ تم سے اور بچیوں سے مل کر ہی جاؤں گا۔"

زیبن کے وجود میں ایک نامعلوم سی سنسناہٹ پیدا ہوئی' کوئی تو تھا جو اس کو اہمیت دے رہا تھا' کوئی تو تھا جس نے اس کو توجہ کے قابل سمجھا تھا۔ "تو..... دوپہر کا کھانا ہم لوگوں کے ساتھ ہی کھانا۔" زیبن نے کہا۔

"جیسی تمہاری مرضی۔" مہر علی نے کہا اور پھر وہاں سے رخصت ہوگیا۔

کتنا زمانہ گزر گیا تھا' کتنے برس بیت گئے تھے کہ زیبن نے اپنے گھر پر کسی کو کھانے کے لئے نہیں بلایا تھا' اس کے ہاں کوئی دعوت نہیں ہوئی تھی سوائے اس ایک دعوت کے جو کہ جنت کی شادی کے موقع پر ہوئی تھی اور وہ تو ایک بڑی دعوت تھی جس میں بہت سارے مہمان شریک تھے' کتنے زمانے سے زیبن نے کسی آنے والے مہمان کے لئے کھانا نہیں پکایا تھا اگلے دن اس نے بڑے ذوق و شوق اور ایک سرخوشی کے سے عالم میں صبح سے ہی کھانے کی تیاریاں شروع کردیں' وہ مہر علی کو اپنے ہاتھ کا پکایا ہوا بہت اچھا کھانا کھلانا چاہتی تھی' نصرت باورچی خانے میں اس کا ہاتھ بٹا رہی تھی' گامو ایک فراموش شدہ داستان بن چکا تھا۔

مہر علی کافی جلدی آگیا اور پھر کھانے سے پہلے' کھانے کے دوران اور کھانے کے بعد ان کے درمیان بہت ساری باتیں ہوتی رہیں' مہر علی نے پہلی بار اپنے بارے میں بتایا' اس سے پہلے نہ تو زمین نے اس سے پوچھا تھا اور نہ اس نے بتایا تھا' ان مختصر سی ملاقاتوں میں جن میں گامو کی موت کا درد بھی شامل تھا' اس کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔

مہر علی وزیر آباد کا رہنے والا تھا' جہاں اس کی تھوڑی سی زمین تھی' اس کی بیوی کا آج سے چھ سال پہلے انتقال ہوگیا تھا' پھاتاں دس سال تک اس کا ساتھ نبھانے کے بعد اس کو اکیلا چھوڑ کر اس دنیا سے سدھار گئی تھی' ان کی اس دس سالہ رفاقت کے دوران ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی' انہوں نے سارے جتن کرکے دیکھ لئے تھے لیکن پھاتاں کی گود ہری نہیں ہوئی تھی' مہر علی کی ماں اور اس کے دوست احباب نے اس پر بہت زور دیا کہ وہ دوسری شادی کرلے کیونکہ اولاد کے بغیر اگر عورت نامکمل ہوتی ہے تو مرد بھی نامکمل ہوتا ہے اور بڑھاپے میں کوئی سہارا دینے والا نہیں ہوتا لیکن مہر علی نے پھاتاں کے ساتھ شادی سے پہلے ہی جو پیمانِ وفا باندھا تھا' اس کو توڑنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا' وہ خود کو مرتے دم تک اس پیمان کا پابند سمجھتا تھا' یہ پابندی خود اس نے اپنے اوپر عائد کرلی تھی' ایک وقت وہ آیا کہ لوگوں کے دل شکن طعنوں اور خون کے آنسو رلا دینے والی اذیت ناک باتوں سے تنگ آکر پھاتاں خود اس سے یہ کہنے لگی کہ وہ دوسری شادی کرلے لیکن مہر علی نے اس پر واضح کردیا کہ وہ زندگی بھر بے اولاد رہنا پسند کرلے گا لیکن پھاتاں کو نہیں چھوڑے گا۔

پھر آج سے چھ سال پہلے پھاتاں اپنی کوئی نشانی چھوڑے بغیر اس دنیا سے اٹھ گئی تھی۔ مہر علی کے لئے اس کی موت اس کی اب تک کی زندگی کا سب سے بڑا صدمہ تھا۔ اس کی تو زندگی بالکل ہی ویران' سنسان اور خالی ہوگئی تھی' پھاتاں تھی تو اس کی زندگی کے ہر لمحے میں شریک رہتی تھی اور اب وہ نہیں تھی تو کچھ بھی نہیں رہا تھا' کوئی بھی نہیں تھا جس کو وہ اپنی تنہا زندگی کے نرم و گرم لمحوں میں شریک کرسکے۔

"بس' تب سے اب تک اسی طرح جی رہا ہوں زمین۔" مہر علی نے اپنی زندگی کی داستان ختم کرتے ہوئے ایک لمبی اور ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ "دنیا میں اپنا کوئی نہیں ہے' ماں باپ عرصہ ہوا گزر گئے' ایک بہن تھی' وہ اپنے میاں کے ساتھ کراچی چلی گئی اور پھر وہاں سے وہ لوگ سعودی عرب چلے گئے' پھاتاں کو اللہ میاں نے اپنے پاس بلا لیا اور میں دنیا سے جانے والوں کا' بچھڑنے والوں کا دکھ سہنے کے لئے اکیلا رہ گیا اور خدا جانے کب



ی اس طرح اکیلا رہوں گا۔"

"پھاتاں کی موت کے بعد تم نے دوسری شادی کیوں نہیں کرلی؟" زمین نے چھا۔

"بس' سوچا تو کئی بار لیکن سچ تو یہ ہے زمین کہ پھاتاں کے مرنے کے بعد اور کوئی بھی ہی نہیں لگی۔" مہر علی نے کہا اور زمین کی طرف کچھ ایسی نظروں سے دیکھا کہ زمین کانپ کر رہ گئی۔

الگ الگ ٹکڑوں میں زمین اپنے بارے میں مہر علی کو سب کچھ بتا چکی تھی اور اس کی داستانِ حیات کا اب کوئی ورق ایسا نہیں تھا' جس کی تحریر سے مہر علی ناواقف ہو اور آج مہر علی نے بھی اپنے دکھوں کی کتاب اس کے سامنے کھول کر رکھ دی تھی اور زمین نے اس کو پوری طرح سے پڑھ لیا تھا۔

"بہت دنوں سے سوچتا تھا کہ کوئی ایسا مل جائے جس کا ہاتھ تھام کر زندگی کا باقی سفر سکون کے ساتھ کاٹ لوں لیکن بس کوئی ایسا نہیں ملا' میرا مطلب ہے کمی تو کوئی نہیں تھی مگر دل نے کسی کو قبول نہیں کیا۔"

مہر علی بڑی گہری نظروں سے زمین کو دیکھ رہا تھا اور زمین ان نظروں کی حلاوت اور حرارت کو اپنے رگ و پے میں اترتے ہوئے محسوس کررہی تھی' آج نہ جانے کتنے عرصے کے بعد اس کے دل میں اپنے ہونے کا احساس جاگ اٹھا تھا ورنہ وہ تو ایک عرصے سے جیسے اپنے وجود کی نفی کرچکی تھی۔

"میں ایک بات کہوں زمین۔" اچانک مہر علی کی آواز ایک بالکل ہلکی اور پُراسرار سرگوشی میں تبدیل ہوگئی۔ "عدت کی مدت گزر جانے کے بعد مجھ سے نکاح کرلو' مجھے تمہاری ہی جیسی ایک عورت کی تلاش تھی' وہ جو دکھ سہنا جانتی ہو اور میرے دکھ کو سمجھ سکے اور میں اس کے دکھ کو سمجھ سکوں اور دونوں ایک دوسرے کے دکھ اور سکھ کو بانٹ سکیں' میرے پاس کچھ زمین ہے جو ہمارے گزارے کے لئے بہت کافی ہوگی' تمہیں چوہدریوں کے ہاں نوکری کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی' تمہاری تینوں بیٹیاں میری اپنی بیٹیاں ہوں گی' میری تو کوئی اور اولاد ہے نہیں یہی میری اولاد ہوں گی' ہم دونوں مل کر ان کی پرورش کریں گے۔"

مہر علی بول رہا تھا' بہت آہستہ آہستہ' بڑے پُر اعتماد' نرم اور مہربان لہجے میں اور زمین کو اس کی آواز افق کے اس پار کسی دوسری دنیا سے آتی ہوئی لگ رہی تھی' اسے

ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی خواب کا سحر ٹوٹ جائے گا اور اپنے دکھوں اور محرومیوں کے ساتھ زندگی کے اجاڑ صحرا میں تنہا کھڑی ہوئی ہوگی..... اپنی تینوں یتیم بچیوں کے ساتھ۔

"وزیر آباد میں میرا اپنا گھر ہے' اچھا خاصا بڑا ہے' ہم سب لوگوں کے لئے بہت کافی ہے' گھر کے ساتھ ہی کچھ اور فالتو زمین بھی ہے اگر ضرورت ہوگی تو اور بنالیں گے' زمین میرے ساتھ وزیر آباد چلو....."

"یہ..... یہ تم کیا کہہ رہے ہو مہر علی؟" زمین نے بڑی مشکل سے اپنی تمام تر قوت کو مجتمع کرتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "ابھی تو میرے شوہر کی قبر کی مٹی بھی خشک نہیں ہوئی اور پھر بھلا میری عمر تو دیکھو..... کیا میں اب شادی کے لائق ہوں؟ تم تو مرد ہو۔ مرد تو کسی بھی عمر میں شادی کر سکتا ہے ستر برس کا بھی ہو تو کر سکتا ہے اور کوئی اس پر ہنستا نہیں..... لیکن میں..... پانچ بچوں کی ماں....."

"تمہاری سب سے بڑی بیٹی تو جنت ہی تھی نا؟" مہر علی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اور وہ اگر زندہ ہوتی تو اس وقت چودہ پندرہ سال سے زیادہ کی نہ ہوتی اور تمہاری اپنی شادی بھی بہت کم عمری میں ہوئی تھی تو پھر کہاں سے تمہاری عمر اتنی زیادہ ہوگئی؟ نہیں زمین تمہیں عمر نے نہیں تمہیں دکھوں نے مارا ہے' عمر آدمی کو اتنا نہیں مارتی جتنا دکھ انسان کو مارتے ہیں' یہ دکھ ہی ہوتے ہیں زمین جو جوانی میں بھی آدمی کے بالوں کو سفید کردیتے ہیں اور اگر کوئی دکھ بانٹنے والا آجائے تو دکھ کمزور جاتے ہیں زمین..... میں جانتا ہوں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے دکھوں کو کمزور کردیں گے..... اور جہاں تک تمہارے مرحوم شوہر کی قبر کی مٹی کے خشک ہونے کا سوال ہے تو میں کب کہہ رہا ہوں کہ آج ہی سب کچھ ہو جائے؟ جو بھی ہوگا' پانچ چھ مہینے کے بعد ہی ہوگا۔"

"مگر..... دنیا کیا کہے گی؟ سب لوگ کیا کہیں گے؟" زمین نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا۔ "بھلا اس عمر میں....."

"کیا کہے گی دنیا؟" مہر علی نے ایک تلخ ہنسی کے ساتھ کہا۔ "دنیا نے تم کو کیا دیا ہے زمین؟ تمہارا بیٹا بھاگ گیا' تمہاری بیٹی کو اس کی ساس نے زندہ جلا دیا' دنیا نے تمہارے ان دکھوں کی کیا تلافی کی زمین؟ دنیا کی بات چھوڑو اپنی زندگی کی بات کرو زمین کیا تمہیں اپنی زندگی جینے کا حق نہیں ہے؟"



زمین کا سارا وجود اندر ہی اندر کسی خشک پتے کی طرح لرز رہا تھا' اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ایک ایسے طوفان میں گھر گئی ہو جہاں اس کے چاروں طرف شعلے ہی شعلے بھڑک رہے ہوں اور وہ ان شعلوں کے حصار سے نکل نہ پا رہی ہو' اس کی کمر جھکی ہوئی جھکی جا رہی تھی۔

"فیصلہ کرنے میں جلدی کی ضرورت نہیں ہے زمین۔" مہر علی نے قدرے توقف کے بعد اپنی بات جاری رکھتے ہوئے ہولے ہولے کہا۔ "اچھی طرح سے سوچ لو' میں کل صبح یہاں سے جا رہا ہوں لیکن آتا جاتا رہوں گا شاید ایک مہینے کے بعد پھر چکر لگاؤں' تمہاری عدت کی پوری مدت ابھی باقی ہے' مرنے والا تو چلا گیا وہ اب واپس نہیں آئے گا۔"

"وہ اگر زندہ بھی ہوتا تو میرے کس کام کا تھا۔" زمین نے ایک لمبی اور گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "میرے لئے تو وہ اب سے بہت پہلے ہی مر چکا تھا۔"

کچھ دیر کے بعد مہر علی جانے کے لئے تیار ہوگیا۔ اسے کچھ ضروری کام تھے۔ اس نے اپنی پیشکش کے بارے میں پھر کچھ اور نہ کہا۔

"پھر..... کب آؤ گے؟" زمین نے آنکھیں جھکا کر دھیمی آواز میں اس سے پوچھا۔

"تقریباً ایک مہینے کے بعد چکر لگاؤں گا۔" اس نے کہا۔ "تم اپنا اور بچیوں کا خیال رکھنا۔"

مہر علی چلا گیا اور زمین کو ایک ایسی کڑی آزمائش میں ڈال گیا جو اس کی جان نکالے لے رہی تھی' اس نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے' کوئی اسے اس نظر سے بھی دیکھ سکتا ہے اس نے تو عرصہ ہوا اپنے اوپر توجہ دینا ہی چھوڑ دی تھی' کئی کئی دن گزر جاتے تھے اور وہ آئینے کی صورت نہیں دیکھتی تھی' وہ تو یہ بھی بھول گئی تھی کہ ہاتھوں میں مہندی اور آنکھوں میں کاجل کس طرح لگایا جاتا ہے اور آج مہر علی نے اس کو جیسے پھر سے زندہ کردیا تھا' اس نے اس کو اپنانے کی خواہش کا اظہار کرکے اس کے بدن میں نشاط زندگی کی ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ کوئی تو تھا جس نے اس سے ہمدردی کے دو بول کہے تھے' کوئی تو تھا جس نے اس کے دکھوں میں شریک ہونے کی پیشکش کی تھی' کتنا زمانہ گزر گیا تھا' کتنے برس بیت گئے تھے' کسی نے یوں ہمدردی اور دردمندی کا اظہار نہیں کیا تھا اور اب اس کو بڑی شدت کے ساتھ یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ کس قدر خشک'

ویران، بنجر اور روکھی زندگی گزارتی رہی ہے، سب کچھ لٹادینے کے بعد بالکل خالی ہاتھ..... مگر..... کیا جو کچھ مہر علی نے کہا تھا، وہ کرنا مناسب ہوگا؟ ناصر..... وہ کبھی تو لوٹ کر آئے گا..... اور نصرت بھی اب دس سال کی ہو رہی تھی، ان بچوں کے لئے تو اس نے اپنے آپ کو پورے کا پورا خرچ کرڈالا تھا، اب کیا کرے؟

اس رات زمین کو بمشکل ہی نیند آسکی، ایک نئی زندگی اس کے دروازے پر دستک دے رہی تھی، کیا وہ اس کو واپس لوٹا دے؟ تقدیر اس پر پھر اس طرح مہربان نہیں ہوسکتی تھی۔ "ہائے مہر علی..... تُو نے مجھے کس عذاب میں ڈال دیا، میں کیا کروں۔" اس کے دل کی گہرائیوں سے آواز نکلتی تھی۔ دل و دماغ سائیں سائیں کررہے تھے، کبھی جنت کا جلا ہوا مُردہ چہرہ نظروں کے سامنے ابھرتا، کبھی گامو کی کفن میں لپٹی ہوئی لاش اور کبھی ناصر کا مردانہ چہرہ جس کو اس نے ایک عرصے سے نہیں دیکھا تھا، بیٹے کا چہرہ..... مرد بچے کا چہرہ..... اور یہ سب تصور کرکے وہ خود کو کسی ناکردہ کے سمندر میں ڈوبتا ہوا محسوس کرتی اور پھر اس کی نظروں کے سامنے مہر علی کا چہرہ ابھرتا..... مہر علی سراپا مہر..... سراپا چاہت..... محبت، ہمدردی اور درد مندی اور خلوص کا پیکر..... کون سی خوبی ایسی تھی جو اس کو مہر علی میں نظر نہیں آتی تھی۔

آزمائش کی گھڑی میں اور کوئی مشکل فیصلہ کرنے میں زمین کی مدد کرنے والی ایک ہی ہستی تھی جس پر اس نے ہمیشہ اعتماد کیا تھا اور جس کی بے ریا اور پُرخلوص محبت پر اسے پورا بھروسہ تھا اور وہ تھی ماسی خیراں..... زمین کو اپنی زندگی میں اب تک جو سب سے زیادہ قابل اعتماد اور مضبوط سہارا ملا تھا، وہ ماسی خیراں کا ہی تھا، کوئی بات ایسی نہیں تھی جسے وہ ماسی خیراں سے چھپاتی ہو اور ماسی خیراں اس کے ہر چھوٹے بڑے فیصلے میں شریک ہوتی تھی۔

اگلے دن رات کو اس نے ماسی خیراں کو مہر علی کی پیشکش کے بارے میں بتایا۔ ماسی خیراں اس کی بات سن کر دنگ رہ گئی۔ اس کو یقین نہیں آرہا تھا کہ زمین سچ کہہ رہی ہے اور جب اس کو یقین آگیا تو وہ جیسے خوشی سے دیوانی ہوگئی۔

"اری پاگل، تو اس میں سوچنے کی کیا بات ہے؟" ماسی خیراں نے خوشی میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم نے کہیں اس کو منع تو نہیں کردیا؟"

"نہیں ماسی خیراں۔" زمین نے کہا۔ "میں نے اسے منع تو نہیں کیا ہے۔ ابھی....." اور پھر اس نے ماسی خیراں کو پوری تفصیل کے ساتھ وہ سب کچھ بتا دیا جو مہر



علی نے اس سے کہا تھا اور وہ بھی جو اس نے مہر علی سے کہا تھا۔

"وہ ایک مہینے بعد جب آئے تو اس کو ہاں میں جواب دینا زمین۔" ماسی خیراں نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "تمہیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ تم کو ایک بہت اچھا موقع مل رہا ہے، اس کو ہاتھ سے مت جانے دو۔"

"مگر ماسی خیراں، مجھے تو یہ بات سوچ کر بہت ڈر لگتا ہے۔" زمین نے کہا۔ "میں پانچ بچوں کی ماں ہوں، اگر جنت زندہ ہوتی تو میں نانی بننے والی ہوتی..... سب لوگ مجھ پر ہنسیں گے نہیں۔"

"ہنستے ہیں تو ہنسنے دو زمین۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "لوگ تو صرف ہنس ہی سکتے ہیں، دکھ بانٹنے تو نہیں آسکتے نا؟ اب دیکھ لو نسیم بی بی کو جنت نے مرنے سے پہلے اس سے صاف کہا تھا کہ اس کو اس کی ساس نے جلایا تھا مگر نسیم بی بی کسی طرح بھی پولیس کے سامنے یہ بات کہنے پر تیار نہیں ہوئی۔ مہر علی تم کو اپنانا چاہتا ہے، تمہارے سارے دکھوں کے ساتھ..... اس سے شادی کرلو زمین..... تمہاری بچیوں کو ایک باپ مل جائے گا اور تم کو ایک شوہر مل جائے گا آخر تمہارا بھی تو اپنے اوپر کوئی حق ہے۔"

"مجھے..... مجھے رہ رہ کر ناصر کا خیال آتا ہے ماسی خیراں۔" زمین نے شکستہ لہجے میں کہا۔ "وہ جب کبھی واپس آئے گا اور اس کو معلوم ہوگا تو....."

"تو کیا ہوگا؟" ماسی خیراں نے کہا۔ "تم اس سے پوچھ سکتی ہو کہ خود اس نے تم لوگوں کا کون سا خیال کیا؟ وہ تم لوگوں کو قرضے کے بوجھ تلے دبا چھوڑ کر یہاں سے چلا گیا، اس نے جانے کے بعد پلٹ کر یہ خبر بھی نہ لی کہ اس کی غریب ماں پر اور بے سہارا بہنوں پر کیا گزری، اس نے کہیں اور جاکر اپنی الگ دنیا آباد کرلی، سب کو بھول گیا وہ اور تم تو حاجی کا قرضہ اتارنے کے لئے اپنا سارا جمع جتھا دے دینے کو تیار تھیں وہ تو خدا بھلا کرے بے چارے مراد کا کہ اس نے یہ مشکل آسان کردی، ناصر جہاں کہیں بھی ہے، خدا کرے کہ وہ زندہ سلامت ہو، زمین تمہاری بچیوں کی قسمت سنور جائے گی، مہر علی اچھا آدمی ہے، اس کے دل میں مروت اور انسانیت ہے اور دیکھو زمین وہ اگر چاہے تو اس کو تو شادی کے لئے سولہ سال کی لڑکی بھی بڑی آسانی سے مل جائے گی، اس کے پاس گھر ہے، زمین ہے اور پہلی بیوی سے کوئی اولاد بھی نہیں ہے، بالکل اکیلا ہے وہ..... لیکن اس سب کے باوجود اس نے تم کو چنا ہے، یہ بڑی بات ہے زمین..... تم کو یہ سمجھنا چاہیئے۔"

اس دن کے بعد سے زیبن' مہر علی کی آمد کے دن گنتی رہی۔ مہینہ تھا کہ پورا ہونے میں نہیں آتا تھا یوں لگتا تھا جیسے ایک مہینہ پھیل کر ایک صدی پر محیط ہو گیا ہے اور صدی ختم نہیں ہوتی' انتظار کی یہ عجیب و غریب کیفیت تھی' زیبن کی زندگی میں انتظار کو بڑا دخل تھا' عرصے تک وہ اپنے شوہر کا انتظار کرتی رہی تھی جو گھر سے پیسے لے کر بھاگ گیا تھا اور آج تک یہ انتظار جاری تھا لیکن مہر علی کا انتظار تو ایک بالکل الگ کیفیت کا انتظار تھا' اس انتظار میں تعین اور یقین کو دخل تھا' اس کو بھروسہ تھا کہ مہر علی اپنے وعدے کے مطابق ضرور آئے گا۔

اور پھر ایک دن مہر علی آگیا۔ وہ پورے ایک ماہ کی مدت کے بعد واپس آیا تھا اور خالی ہاتھ نہیں آیا تھا' وہ زیبن اور بچیوں کے لئے بہت ساری چیزیں لے کر آیا تھا۔

زیبن کی بچیوں نے تو ایسی خوشی کبھی نہیں دیکھی تھی' ان کے لئے تو کوئی بھی کبھی ایسی چیزیں لے کر نہیں آیا' وہ بہت ہی خوش تھیں۔ "چاچا مہر علی" بہت اچھا آدمی تھا' وہ ان کے لئے اپنے گھر سے وزیر آباد سے ڈھیروں چیزیں لے کر آیا تھا اور خود زیبن کس قدر خوش تھی..... اس ایک ماہ کے دوران کبھی کبھی تو اس کے دل میں یہ خوف ابھرنے لگتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مہر علی اپنا ارادہ بدل دے۔ وہ اس کے پاس کبھی دوبارہ واپس نہ آئے اور اس سارے قصے کو ختم کردے اور یہ سوچ کر وہ ایک دم بہت اداس ہو جاتی اور زندگی کا بوجھ اس کو ناقابل برداشت معلوم ہونے لگتا' اگر سب کچھ پہلے کی طرح ہی چلتا رہتا تو ٹھیک تھا لیکن مہر علی نے اس کی زندگی میں آکر اچانک جو ایک ہلچل پیدا کردی تھی' اس کے بعد دوبارہ سب کچھ ویسا ہی نہیں ہو سکتا تھا اور جب مہر علی آگیا تو زیبن اچانک اپنے آپ کو جیسے ہر دکھ سے آزاد محسوس کرنے لگی۔

مہر علی شام کو اس وقت آیا تھا جب زیبن کام پر سے واپس آچکی تھی' اس کو معلوم تھا کہ اس سے پہلے زیبن گھر پر نہیں ملے گی۔ اس نے بتایا کہ وہ اپنے کسی جاننے والے کے پاس ٹھہرا تھا اور دو دن کے بعد واپس چلا جائے گا۔

"اب کھانا کھا کر جانا۔" زیبن نے جلدی سے اس سے کہا۔ "اور کل رات بھی کھانا ادھر ہی کھانا۔"

مہر علی نے اپنے سوال کا جواب معلوم کرنے میں جلدی نہیں کی' اسے اپنے سوال کا جواب تقریباً مل چکا تھا' زیبن کا دمکتا ہوا چہرہ' اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں' اس کی آواز کی غیر معمولی نرمی و شیرینی اور اس کے لہجے کی کھنک' مہر علی کے سوال کا جواب دے رہی



تھی' زیبن کا سارا وجود کسی اندرونی خوشی کے نشے سے سرشار معلوم ہوتا تھا اور نشے کی یہ لہریں زیبن کے وجود سے گزرتی ہوئی مہر علی کے وجود میں سرایت کر رہی تھیں۔

کھانے کے بعد دونوں کافی رات گئے تک باتیں کرتے رہے' زیبن نے بچیوں کو دوسرے کمرے میں بھیج دیا تھا' مہر علی نے زیبن سے اپنے سوال کا جواب نہیں مانگا' اس نے خود ہی یہ بات فرض کرلی کہ اس کے سوال کا جواب اثبات میں ہے اور وہ اسے مل چکا ہے اور اس نے گفتگو کا رخ اس طرف موڑ دیا۔ وہ وزیر آباد میں اپنے گھر کی باتیں کرنے لگا اور آنے والے دنوں کی باتیں کرنے لگا جب زیبن اور اس کی بچیاں اس کے ساتھ چل کر اس گھر میں رہیں گی۔

زیبن کی عدت کی مدت گزرنے تک مہر علی نے سیالکوٹ کے کئی چکر لگائے اور ماسی خیراں کی مدد اور شمولیت سے اس کے اور زیبن کے درمیان سارے معاملات طے پاگئے۔ وزیر آباد میں مہر علی کا خالی گھر' زیبن اور اس کی بچیوں کا منتظر تھا۔

ماسی خیراں کے علاوہ اور کسی کو بھی اس معاملے کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا اور زیبن کے محلے والوں کو نکاح سے صرف دو دن پہلے اس امر کی اطلاع ملی کہ زیبن دوسری شادی کر رہی ہے اور اس کے ساتھ ہی سارے محلے میں زبردست سنسنی پھیل گئی۔ ایک نہایت دلچسپ' پُرکشش اور تجسّس آمیز موضوع گفتگو لوگوں کے ہاتھ آگیا تھا اور وہ اس پر طرح طرح سے طبع آزمائی کر رہے تھے جو کچھ کہا جا رہا تھا' اس کا بڑا حصہ زیبن تک بھی پہنچ رہا تھا لیکن وہ اس سب کو برداشت کرنے کے لئے ذہنی طور پر تیار تھی' اسے تیار کرنے میں اس کے ہونے والے شوہر کے علاوہ ماسی خیراں کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔

نکاح کی تقریب بالکل سادگی کے ساتھ لیکن علی الاعلان منعقد ہوئی' مہر علی اپنے ساتھ آٹھ دس آدمیوں کو لے کر آیا تھا جو اس کے بہت قریبی دوست تھے' گواہوں کی گواہی اور وکیلوں کی وکالت کے ساتھ' مہر علی اور زیبن کا نکاح ہو گیا اور وہ دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ زیبن کے ہزار منع کرنے کے باوجود ماسی خیراں اور محلے کی دوسری عورتوں نے زیبن کو دلہن بنا دیا تھا اور زیبن اپنے آپ کو آئینے میں دیکھ کر ٹھٹک کر رہ گئی تھی' کیا یہ واقعی وہ خود ہی تھی۔

زیبن نے زندگی کے نئے سفر پر پہلا قدم رکھ دیا تھا اور اس کے چند دنوں کے بعد ہی ان لوگوں نے سیالکوٹ کی اس نواحی بستی سے رختِ سفر باندھ لیا۔ گھر کا جو بالکل بیکار

اور بے قیمت سازو سامان تھا' اسے ٹھکانے لگا دیا گیا' کچھ چیزیں کچھ ضروری سامان گھر میں چھوڑ دیا گیا' مکان میں تالا ڈال دیا گیا۔ زمین مکان کو فروخت نہیں کرنا چاہتی تھی۔ "میں کبھی کبھی یہاں آیا کروں گی۔" اس نے بہ چشم نم ماسی خیراں سے کہا۔ "خود بھی آؤں گی اور بچیوں کو بھی لاؤں گی جب بھی آؤں گی تو اسی گھر میں رہوں گی' اتنا پرانا ٹھکانہ ہے' اس کو اپنے سے الگ کیسے کردوں؟"

مہر علی نے کسی بھی بات کے لئے اس پر زور نہیں دیا تھا' اگر زمین اس مکان کو رکھنا چاہتی تھی تو یہ اس کی مرضی تھی اور اگر وہ اس کو بیچ دینا چاہتی تھی تو بھی مہر علی کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

روانگی سے ایک دن قبل زمین ماسی خیراں کو ساتھ لے کر بستی کے قبرستان گئی۔ پہلے تو وہ جنت کی قبر پر گئی۔ مراد نے جنت کی قبر کو پختہ کروا دیا تھا اور اس پر کتبہ بھی لگوا دیا تھا' جنت کی قبر کے پاس بیٹھ کر زمین بہت روئی اور دیر تک روتی رہی' جنت کا بھولا بھالا اور معصوم چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا' کیسی بے زبان بچی تھی' کیسے کیسے بھیانک مظالم کا نشانہ بنی اور کیسی اذیت کے ساتھ مری۔ زمین وہ ساری باتیں یاد کررہی تھی اور اس کا کلیجہ منہ کو آرہا تھا۔

"چلو اب اٹھو زمین۔" ماسی خیراں نے ہاتھ پکڑ کر اس کو اٹھایا۔ "جو چلا گیا' سو چلا گیا' اب وہ دوبارہ واپس تو نہیں آسکتا چلو۔" زمین اٹھ گئی اور ماسی خیراں اس کو گامو کی قبر پر لے گئی۔

گامو کی قبر پر بہانے کے لئے زمین کے پاس آنسوؤں کا زیادہ خزانہ نہیں تھا۔ اس کی داستان تو آج سے بہت پہلے ہی ختم ہوچکی تھی' آخری باب کے اوراق ہوا کے دوش پر اڑتے اڑتے کہیں سے یہاں آگئے تھے اور پھر منتشر ہو گئے تھے۔

سامان تانگے میں رکھا جا رہا تھا اور زمین خالی خالی آنکھوں سے اپنے اس مکان کو دیکھ رہی تھی جس میں اس نے اپنی شادی شدہ زندگی کے بہترین اور بدترین دن گزارے تھے' اسی گھر میں گامو نے اس پر اپنی ہزارہا محبتیں نچھاور کی تھیں اور اس کے دامن کو خوشیوں سے بھر دیا تھا اور پھر اسی گھر سے نشے کا مارا گامو قرضے کی رقم چرا کر بھاگا تھا اور اسی گھر سے گامو کا جنازہ اٹھا تھا..... کتنے واقعات کا امین اور رازداں تھا یہ مکان..... اس کے خاموش اور بے جان در و دیوار سے کتنی کہی اور ان کہی داستانیں وابستہ تھیں۔



تینوں بچیاں حیران اور خوف زدہ سی تھیں' وہ کبھی ایک دن کے لئے بھی اپنے گھر سے باہر نہیں رہی تھیں اور اب وہ گھر سے بہت دور نہ جانے کہاں جا رہی تھیں۔

"ماسی خیراں۔" زمین نے روتے ہوئے ماسی خیراں سے کہا۔ "اگر کبھی ناصر آجائے تو....."

"تم اس کی فکر مت کرو۔" ماسی خیراں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "خدا اسے خیر سے گھر لائے جب بھی وہ یہاں آئے گا' میں اس کو تمہارے پاس بھیج دوں گی' تمہارا پتہ تو میں نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے' میں تو کئی بار وزیر آباد جا چکی ہوں' میری نند کی سسرال وہیں ہے' میں آسانی سے مہر علی کے گھر پہنچ سکتی ہوں۔"

تانگے سے وہ سب بسوں کے اڈے تک پہنچے اور پھر بس میں بیٹھ کر وزیر آباد کی طرف روانہ ہوگئے۔ زمین پر شدید ہیجانی کیفیت طاری تھی' اس نے تو اپنا سب کچھ چھوڑ دیا تھا اور ایک اجنبی کے ساتھ ایک اجنبی سفر پر روانہ ہوگئی تھی۔

☆=========☆=========☆

زمین کبھی سیالکوٹ سے باہر نہیں نکلی تھی اور اب وہاں سے اس طرح سے نکل رہی تھی کہ اس شہر کو' اس کے نواح میں واقع اپنی بستی کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ رہی تھی' وہ خوشی خلجان اور خوف کی ملی جلی کیفیت کا شکار تھی' دل میں طرح طرح کے وسوسے بھی اٹھتے تھے' مہر علی اس کے لئے اجنبی تھا' بالکل اجنبی..... وہ اس کے یا اس کے خاندان کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی اور وہ خود تین بچیوں کے ساتھ تھی' یہی تینوں بچیاں تو اب اس کا سرمایہ تھیں' اس نے ایک بالکل ہی اجنبی شخص پر بھروسہ کرکے ایک بہت بڑا قدم تو اٹھایا تھا لیکن اب اس کے انجام سے خوف زدہ تھی۔ لیکن کیا مہر علی واقعی اس کے لئے اجنبی تھا؟ خیالات اور جذبات کی رو جب دوسرا رخ اختیار کرتی تو اس کو مہر علی سے زیادہ قابل اعتماد اور سچا آدمی کوئی دوسرا نظر نہیں آتا تھا' بھلا مہر علی جیسا آدمی بھی کبھی دھوکا دے سکتا تھا؟

بچیاں بس کے اس طویل سفر سے خوش اور لطف اندوز ہو رہی تھیں' ان کا خوف کافی حد تک کم ہو چکا تھا' وہ کھڑکی کے باہر بدلتے ہوئے مناظر کو دیکھ رہی تھیں اور خوش ہو رہی تھیں۔

ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ' زمین اپنے پرانے گھر سے دور اور نئے گھر سے نزدیک ہوتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس کی اضطرابی کیفیت میں بھی اضافہ ہوتا جا

رہا تھا مہر علی نے اس کو بتایا تھا کہ اس کی ایک دور کی رشتہ دار چاچی نصیراں اس وقت گھر میں موجود ہے جسے اس نے خاص طور سے بلوایا ہے تاکہ زمین کو وہاں جاتے ہی کام کاج کا بوجھ نہ اٹھانا پڑے اور "دلہن" کے خیر مقدم کے لئے گھر میں کوئی نہ کوئی عورت موجود ہو۔ "چاچی نصیراں چند دن رہے گی اور پھر چلی جائے گی۔" مہر علی نے اس سے کہا تھا۔ "اس کے بعد تو بس تم کو ہی اس گھر کو سنبھالنا ہے۔"

وزیر آباد آ گیا اور بس اپنے اڈے پر جا کر رک گئی' سارے مسافر اس میں سے اترنے لگے' بڑا شور مچا ہوا تھا' زمین تینوں بچیوں کو سنبھالے ہوئے تھی' مہر علی سامان اتروا رہا تھا' بچیاں حیران ہو ہو کر چاروں طرف دیکھ رہی تھیں۔

پھر وہ لوگ مہر علی کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے اور جب وہ وہاں پہنچے تو چاچی نصیراں "دلہن" کے خیر مقدم کے لئے موجود تھی' دونوں عورتوں نے ایک دوسرے کو تنقیدی نظروں سے دیکھا اور پھر چاچی نصیراں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی' اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر زمین کو گلے لگا لیا۔

مہر علی کا گھر' زمین کے گھر کے مقابلے میں کافی بڑا تھا' اس میں کئی کمرے تھے' وسیع صحن میں ایک جانب مویشیوں کے لئے ایک بڑا سائبان بنا ہوا تھا جس میں کچھ مویشی بندھے ہوئے تھے' ایک بکری بڑے زور زور سے ممیا رہی تھی' پہلی ہی نظر میں سارا گھر سامان سے بھرا ہوا نظر آ رہا تھا۔

"اب یہ تمہارا گھر ہے۔" مہر علی نے مسکرا کر زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس گھر میں جو کچھ بھی ہے' وہ تمہارا ہے۔"

"گھر والی مبارک ہو مہر علی۔" چاچی نصیراں نے زمین کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"خیر مبارک چاچی۔" مہر علی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اس کے روئیں روئیں سے خوشی پھوٹ پڑ رہی تھی۔

اگلے چند روز کے اندر اندر زمین نے اس نئی زندگی کو اس قدر تیزی کے ساتھ اپنایا کہ وہ اور اس کی بچیاں جیسے اس میں ضم ہو کر رہ گئیں۔ مہر علی اس پر پروانہ وار نثار تھا اور اس کے اور اس کی بچیوں کے لئے سراپا محبت تھا۔ اس نے گھر کا خرچ چلانے کے لئے کافی رقم بھی زمین کو دے دی تھی اور زمین نے شاید پہلی بار ایسی خوشحالی اور فارغ البالی کا منہ دیکھا تھا' اتنے بہت سے روپے گھر کے خرچ کے لئے..... اور مہر علی نے



اس سے کہا تھا کہ وہ خرچ میں کنجوسی نہ کرے اور کھلے ہاتھ سے خرچ کرے۔

نصیراں چاچی چند روز کے قیام کے بعد سارے گھر کا انتظام و انصرام زمین کے سپرد کر کے وہاں سے رخصت ہو گئی اور زمین کا اب اس گھر پر پوری طرح اختیار تھا' سامان سے بھرا پڑا' بڑا سا مکان تھا اور زمین اس کی ایک ایک چیز کو دیکھ کر خوش ہوتی تھی' یہ سب کچھ اس کا تھا' اس کی بچیوں کا تھا' اب اس کو چوہدریوں کے جھوٹے برتن نہیں دھونے پڑتے تھے' جھاڑو لگاتے لگاتے اپنی کمر نہیں ٹیڑھی کرنی پڑتی' اب تو وہ اس بڑے سے گھر میں مالکن کی طرح رہتی تھی' اس گھر کا خرچ چلانے کے لئے اس کو محنت مزدوری کرنے کی ضرورت نہیں تھی وہ کٹھن زمانہ گزر گیا تھا' گھر کا خرچ چلانے کے لئے اس کا شوہر موجود تھا' مہر علی اس کا گھر والا' جس نے ایک مدت کے بعد اسے ایک پُرسکون زندگی دی تھی۔

زمین کے دل سے خوف' شبہات اور بے اعتمادی کا تقریباً خاتمہ ہو گیا تھا' وہ خود کو کافی حد تک مسرور و مطمئن محسوس کرتی تھی' تینوں بچیاں بھی نئی فضا کی عادی ہو گئی تھیں' زمین اور مہر علی نے ایک باہمی فیصلے کے تحت بچیوں کو یہ سکھایا تھا کہ وہ مہر علی کو "بابا" کہا کریں' یہ ایک بہت محفوظ لفظ تھا' باپ سمیت کسی بھی بڑے کے لئے استعمال کیا جا سکتا تھا۔

زمین نے بہت کچھ کھونے کے بعد بہت کچھ پا لیا تھا اور اب وہ اس کو بہت سنبھال کر' سمیٹ کر رکھنا چاہتی تھی' ایک چھوٹی سی نئی دنیا وجود میں آ گئی تھی' جو مر گئے تھے' ان کے غموں کے ساتھ' جو بچھڑ گئے تھے' ان سے دوبارہ ملنے کی امید کے ساتھ..... اور آنے والے دنوں کی معلوم اور نامعلوم خوشیوں کے ساتھ..... زمین اپنے ان سارے اثاثوں کے ساتھ زندہ رہنا چاہتی تھی' اس کے دماغ میں بہت سارے خیالات گڈمڈ ہوتے رہتے تھے اور ہلچل مچاتے رہتے تھے۔ "کاش' جنت آج زندہ ہوتی!" وہ اکثر سوچتی لیکن پھر فوراً ہی اس کے دل میں خیال آتا کہ اگر جنت زندہ ہوتی اور ایک بچے کی ماں بن چکی ہوتی تو کیا وہ مہر علی سے شادی کر سکتی تھی؟ کیا ایک "نانی" دوسرا نکاح کر سکتی تھی؟ اور وہ ایک دم سے گھبرا کر آگے سوچنا بند کر دیتی۔

مہر علی کے ساتھ اس کے تعلقات میں نوجوانی کی وہ جذباتی شوریدہ سری تو نہیں تھی جو شادی کے بعد ابتدائی برسوں میں گامو کے ساتھ تھی' لیکن ایک طمانیت آمیز ٹھہراؤ تھا۔ زمین کو رفاقت کی ضرورت تھی اور مہر علی کو بھی رفاقت کی ضرورت تھی اور ان

دونوں نے ایک دوسرے کو پالیا تھا' ان کے درمیان ہونے والا سمجھوتہ ایک مضبوط بنیاد پر قائم تھا' وہ دونوں ایک دوسرے کی ضرورت بن گئے تھے اور اس طرح سے دونوں کے اجڑے ہوئے گھر ایک بار پھر آباد ہو گئے تھے۔

کچھ ہی دنوں کے بعد ماسی خیراں کو اپنی نند کی سسرال میں ایک شادی میں وزیر آباد آنا پڑا اور وزیر آباد پہنچنے کے فوراً بعد اس نے پہلا کام یہ کیا کہ وہ زبین سے ملنے اس کے گھر پہنچی۔

مہر علی اس وقت گھر پر ہی موجود تھا' جب ماسی خیراں وہاں آئی اور زبین اور بچیاں تو گھر پر تھیں ہی..... وہ سب لوگ ماسی خیراں کو یوں اچانک دیکھ کر بہت حیران اور خوش ہوئے۔ مہر علی نے تو بڑی ہی گرم جوشی کے ساتھ ماسی خیراں کا خیر مقدم کیا اور زبین کی خوشی کا تو ٹھکانہ نہیں تھا' اس کے "میکے" سے کوئی اس سے ملنے آیا تھا۔

ماسی خیراں اور زبین میں تنہائی میں بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں اور زبین نے اس کو بتایا کہ وہ اپنی موجودہ زندگی سے خوش اور مطمئن ہے اور مہر علی ایک اچھا آدمی ثابت ہوا ہے۔

"جو دکھ میری قسمت میں لکھے ہیں' ماسی..... انہیں بھلا کون مٹا سکتا ہے؟" زبین نے ایک لمبی اور گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "جتنے آنسو ہر آدمی کے حصے میں آتے ہیں وہ تو بہانے ہی پڑتے ہیں..... کیا کرے آدمی جو ٹھہرا..... بس کسی طرح ناصر واپس آ جائے..... یہی ایک فکر ہے جو رات دن مجھے کھائی جاتی ہے نہ جانے کہاں ہو گا' کس حال میں ہو گا' کیا کر رہا ہو گا۔"

"خدا پر بھروسہ رکھ زبین۔" ماسی خیراں نے آہستہ سے کہا۔ "ناصر ایک نہ ایک دن ضرور آئے گا۔"

ان دونوں کے درمیان باتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا تھا' زبین اس کو اپنی موجودہ زندگی کے بارے میں بتا رہی تھی اور اس سے اپنے "میکے" کا حال بھی پوچھ رہی تھی۔

زبین نے ماسی خیراں کو کھانا کھائے بغیر نہیں جانے دیا اور اس کے بعد جتنے دن تک ماسی خیراں وزیر آباد میں رہی' زبین سے اس کی برابر ملاقات ہوتی رہی۔ اس نے اپنی نند کے خاندان میں ہونے والی شادی میں بھی زبین کو مدعو کیا اور زبین نے اس شادی میں بڑی خوش قسمتی سے شرکت کی۔



"بہت اچھا لگا' بہت ہی اچھا لگا تھا' ماسی خیراں کہ تم آئیں۔" آخری دن زبین نے ماسی خیراں سے کہا۔ "بچیاں بھی تم سے مل کر کسی قدر خوش ہوئی ہیں' کوشش کر کے جلد ہی پھر چکر لگانا ماسی..... ہماری مہمان بن کر آنا ہمارے گھر رہنا....."

"موقع ملے گا تو ضرور آؤں گی۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "تم بھی بچیوں کو لے کر کبھی دو چار دن کے لئے سیالکوٹ آ جاؤ' بہت اچھا رہے گا۔"

"ہاں ماسی۔" زبین نے افسردگی کے ساتھ کہا۔ "میرے لئے تو اب بھی وہاں بہت کچھ ہے' ضرور آؤں گی کبھی....."

☆=====☆=====☆

ٹرین فراٹے بھرتی ہوئی اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی اور ناصر ایک سیٹ پر آنکھیں بند کئے ہوئے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے سر کو سیٹ کی پشت سے لگا رکھا تھا اور اس کے دماغ میں خیالات و افکار کا ایک زبردست ہجوم تھا جس نے اس کو سختی کے ساتھ اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔

تین سال سے کچھ زیادہ کا عرصہ کراچی میں گزارنے کے بعد اب وہ ایک بار پھر اپنے شہر واپس جا رہا تھا' اس کے پاس اس وقت بہت ساری رقم تھی' مسعود کے دیئے ہوئے پیسے بھی اس کے پاس تھے جنہیں اس کو مسعود کے والد کے حوالے کرنا تھا اور خود اس کے اپنے پیسے بھی تھے' حاجی کی قرض کی رقم کے پورے دس ہزار روپے اس نے الگ رکھے تھے اور ان کے علاوہ بھی اچھی خاصی رقم تھی' یہ سارے پیسے اس نے اماں کو دے دینے تھے۔

"کس قدر خوش ہوں گی' اماں اتنے بہت سارے پیسے دیکھ کر....." اس کے ہونٹوں پر خود بخود ایک نرم مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ "اماں بھی اور آپا بھی..... اتنے بہت سارے پیسے۔"

یہ سب کچھ سوچتے سوچتے اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ خود بخود گہری ہوتی جا رہی تھی۔ "کتنا تعجب ہو گا ان سب لوگوں کو مجھے اچانک دیکھ کر..... کسی کو بھی نہیں معلوم کہ میں آنے والا ہوں..... بس اچانک ہی میں وہاں جا پہنچوں گا' خط بھی تو کوئی پھر نہیں لکھا ہم لوگوں نے ..... بس ایک ہی خط بھیجا اور اس کے بعد کوئی خط نہیں بھیجا' اچھا ہوتا اگر ہم لوگوں نے ایک آدھ خط اور بھجوا دیا ہوتا۔ خیر..... کوئی بات نہیں اب تو میں خود ہی پہنچ رہا ہوں' خط کی ضرورت کیا ہے اور مسعود کے گھر والوں کو

جب یہ معلوم ہو گا کہ وہ دوبئی چلا گیا ہے تو انہیں بھی ضرور خوشی ہو گی' ڈھیروں پیسے کما کما کر بھیجے گا وہاں سے..... مسعود کے ابا نے تو کبھی اتنے بہت سارے پیسوں کی شکل بھی نہیں دیکھی ہو گی۔"

وہ زندگی میں دوسری بار ٹرین کا سفر کر رہا تھا تین سال سے کچھ زیادہ عرصہ گزرا جب اس نے پہلی بار ٹرین کا سفر کیا تھا اور وہ سیالکوٹ سے کراچی آیا تھا' اس پہلے سفر کی تمام ساعتیں خوف' بے اعتمادی' بے یقینی اور وحشتوں کی گرد میں لپٹی ہوئی تھیں لیکن یہ موجودہ سفر اس سابقہ سفر سے بہت مختلف تھا' وہ ایک فتح مند و کامراں' پُرامید اور پُرعزم انسان کی حیثیت سے یہ سفر کر رہا تھا۔ کراچی میں رہ کر کمائے ہوئے روپوں سے اس کی جیبیں بھری ہوئی تھیں اور اس کمائی کے آگے وہ ان سارے دکھوں اور مصیبتوں کو بھول گیا تھا جو اس نے کراچی آنے سے پہلے اور کراچ آنے کے بعد جھیلی تھیں' وہ اب اپنے دامن میں خوشیوں کے خزانے بھر کر لے جا رہا تھا جو اسے اپنے گھر والوں کے اوپر لٹانے تھے۔

سیالکوٹ ریلوے اسٹیشن..... اس کی آنکھوں کی روشنی جیسے ایک دم بڑھ گئی' سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا وہ چند برس پہلے چھوڑ کر گیا تھا' کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ وہ اپنا سامان اٹھائے ہوئے اسٹیشن سے باہر نکلا' اس اٹیچی کیس کو اس نے بہت سنبھال کر رکھا تھا جس میں اس نے اپنے گھر والوں کے لئے سوغاتیں خرید کر رکھی تھیں' ایک کماؤ پوت کی حیثیت سے وہ اتنے دنوں کے بعد گھر واپس جا رہا تھا تو خالی ہاتھ تو نہیں جا سکتا تھا اور پھر جب اس کے پاس اچھے خاصے پیسے بھی تھے۔ اس نے سب لوگوں کے لئے کچھ نہ کچھ خریدا تھا۔

تانگے میں بیٹھ کر وہ اپنی بستی کی طرف روانہ ہوا' اس کے پاس چونکہ سامان تھا' اس لئے اس نے تانگے سے جانے کا فیصلہ کر لیا' اگر وہ بس سے جاتا تو بس اسے اس کے گھر سے کافی دور اتارتی۔

تانگہ اس نے اپنی گلی کے باہر رکوایا اور پھر نیچے اتر کر سامان اتارنے لگا' دن کا وقت تھا' محلے میں اس وقت عام طور پر سناٹا ہوتا تھا' زیادہ تر مرد اپنے اپنے کام پر چلے جاتے تھے اور عورتیں بھی یا تو اِدھر اُدھر کام پر گئی ہوئی ہوتی تھیں اور یا پھر گھروں کے اندر گھر کے کاموں میں مصروف ہوتی تھیں' اس وقت تیز دھوپ پڑ رہی تھی اور آوارہ بچوں کے لشکر بھی گلیوں میں نظر نہیں آ رہے تھے۔



ناصر اپنا سامان سنبھالے ہوئے اپنے گھر کی تپلی سی گلی میں داخل ہوا تو ہیجان اور مسرت کے عالم میں اس کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے' وہ قدم رکھا کہیں تھا اور پڑتا کہیں تھا۔ وہ اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ گیا لیکن وہاں اس کو تالا نظر آیا' تالے پر جمی ہوئی گرد کی موٹی تہہ اس بات کا پتہ دے رہی تھی کہ یہ تالا بہت دنوں سے پڑا ہوا ہے۔

ماں کے بارے میں تو ناصر کو پہلے ہی خیال تھا کہ وہ اس وقت گھر پر نہیں ہو گی بلکہ چوہدریوں کے ہاں کام پر گئی ہو گی' ماں سے تو شام کو ہی ملاقات ہو سکتی تھی لیکن آپا' نصرت' صغرا اور کلثوم کہاں تھیں؟ شاید آپا ان تینوں کے ساتھ لے کر کہیں گئی تھیں..... مگر..... مگر..... تالے پر جمی ہوئی گرد..... یہ تالا یہاں شاید کافی دنوں سے پڑا ہوا تھا۔

وہ کچھ دیر تک وہاں کھڑا ہوا اس تالے کو بڑے غور سے دیکھتا رہا' آس پاس کوئی موجود نہیں تھا جس سے وہ اپنی ماں اور بہنوں کے بارے میں پوچھ سکے۔

اچانک اس کے مکان سے دو مکان چھوڑ کر محفوظ چاچا کے مکان کا دروازہ کھلا' ناصر تیزی سے آگے بڑھا لیکن پھر ٹھٹک کر رہ گیا۔ محفوظ چاچا کے گھر کے ایک ایک فرد کو بہت اچھی طرح پہچانتا تھا۔ "شاید..... کوئی مہمان ہو۔" اس نے دل میں سوچا اور تیزی سے آگے بڑھ کر اس شخص کے پاس پہنچا کراچی میں اتنے عرصے تک قیام کے بعد اس کے اندر ایک خاص قسم کا حوصلہ اور خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی اور وہ کسی بھی اجنبی سے بلا جھجک بات کر سکتا تھا۔

"کیا..... کیا محفوظ چاچا گھر پر نہیں ہیں؟" اس نے آگے بڑھ کر اس اجنبی سے پوچھا۔ اجنبی نے اس کو غور سے دیکھا۔

"انہیں مرے ہوئے تو دو سال ہو گئے۔" اس نے کہا۔ ان کے گھر والوں نے یہ مکان بیچ دیا ہے' اب اس میں' میں رہتا ہوں' محفوظ چاچا کے گھر والے اب سیالکوٹ شہر میں رہتے ہیں' تم کو ان کا پتہ چاہئے؟"

"نہیں....." ناصر نے کہا۔ "میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس مکان کے لوگ کہاں چلے گئے۔" اس نے اپنے مکان کے دروازے میں لگے ہوئے تالے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ..... زمین۔" اس شخص نے فوراً کہا۔ "زمین اب یہاں نہیں رہتی' وہ تو اپنی بچیوں کے ساتھ وزیر آباد چلی گئی ہے..... وہ اب وہیں رہتی ہے۔ اس کا پتہ مجھے

نہیں معلوم۔ کسی اور سے پوچھ لو۔" اور اس کے ساتھ ہی وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ وہ بہت جلدی میں معلوم ہوتا تھا۔

ناصر نے فوراً ہی ماسی خیراں کے گھر کا رخ کیا۔ بھلا ماسی خیراں سے زیادہ بہتر طور پر ان لوگوں کے بارے میں اور کون جان سکتا تھا؟ اپنے گھر سے ماسی خیراں کے گھر تک جانے کے دوران ان گنت خیالات تھے جو بجلی کی طرح کوند کوند کر ناصر کے دل و دماغ پر حملہ کرتے رہے۔ اماں وزیر آباد کیوں چلی گئی تھیں؟ وزیر آباد میں تو ان لوگوں کا کوئی نہیں تھا' کیا ابا کا پتہ چل گیا تھا؟ کیا وہ وزیر آباد میں تھے اور انہوں نے پھر سے کوئی کام دھندا شروع کر دیا تھا؟ کیا آپا کی شادی ہو گئی تھی' وزیر آباد میں کسی سے.....اور اماں سب کو لے کر آپا کے ساتھ رہنے چلی گئی تھیں؟ تو پھر آپا کی شادی مراد کے ساتھ نہیں ہوئی؟ مراد کا تو وزیر آباد میں کوئی بھی نہیں تھا..... آخر اماں وزیر آباد میں کس کے پاس رہ رہی تھیں؟ ہاں.....ایک بات اور بھی ہو سکتی تھی شاید چوہدریوں نے انہیں وزیر آباد بھیج دیا ہو کسی اپنے ہی جیسے مالدار عزیز کے ہاں رہنے سہنے اور کام کرنے کے لئے..... پیسے اچھے مل رہے ہوں تو اماں نے وزیر آباد جانے کا فیصلہ کر لیا ہو..... خیالات کی بجلیاں ایک کے بعد ایک لپکتی جا رہی تھیں اور اس کا وجود بے تحاشہ جلنے لگا تھا۔

ماسی خیراں کے گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور ناصر بے دھڑک اندر داخل ہو گیا۔ یہ ماسی خیراں کا گھر تھا جہاں کا ایک ایک بچہ ناصر کو جانتا تھا اور یہاں کے ایک ایک بچے کو ناصر جانتا تھا۔ اس مکان میں داخل ہونے کے لئے دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت نہیں تھی۔

"کون؟ کون ہے؟" اس نے ماسی خیراں کی گھبرائی ہوئی آواز سنی اور اسے فوراً ہی پہچان لیا۔ اسے ماسی خیراں کی آواز پہچاننے میں چند لمحوں سے زیادہ کا وقت نہیں لگا۔

"کون ہو تم؟" اس بار ماسی خیراں نے سامنے آتے ہوئے ڈپٹ کر کہا اور ناصر کو فوراً خیال آیا کہ وہ اس وقت پتلون اور بشرٹ پہنے ہوئے ہے جبکہ اس بستی میں کوئی ایک بھی شخص ایسا نہیں تھا جو پتلون اور بش شرٹ پہنتا ہو' یہاں سارے مردوں کے جسم پر یا تو شلوار قمیض یا کرتا اور یا پھر تہبندیں اور ان کے ساتھ بنیان' کرتا یا قمیض.....

"ماسی خیراں یہ میں ہوں' ناصر....." ناصر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور جلدی سے آگے بڑھ کر ماسی خیراں سے لپٹ گیا۔

"ہائے میں مرجاواں....." ماسی خیراں کی چیخ سارے گھر میں گونجتی چلی گئی۔ اس نے ناصر کو اپنے سینے سے لگا لیا اور اس کے سر اور پیشانی کو بوسے دینے لگی۔



"ناصر..... ناصر..... ارے تُو اتنا بڑا ہو گیا..... تُو تو بالکل جوان ہو گیا' یہاں سے گیا تھا تو بچہ تھا..... اب تو اتنا بڑا ہو گیا۔" ہیجان و اضطراب کے عالم میں اس کی زبان سے الفاظ ٹھیک سے نہیں نکل رہے تھے۔

"میں آ گیا ہوں ماسی خیراں۔" ناصر گلو گیر آواز میں کہہ رہا تھا' اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ "میں آ گیا ہوں' ماسی خیراں..... میں آ گیا ہوں' سب لوگ کہاں ہیں ماسی خیراں؟ گھر میں تالا کیوں پڑا ہوا ہے؟"

"ارے تُو کہاں چلا گیا تھا؟" ماسی خیراں نے اس کے سوال کا فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ ناصر کا سوال تو بہت چھوٹا سا تھا۔ "سب لوگ کہاں ہیں؟" لیکن اس سوال کے جواب میں جو ایک پوری المناک داستان پوشیدہ تھی' اس کا بیان اتنا آسان نہیں تھا اور نہ ہی دو چار لفظوں میں سب کچھ بتایا جا سکتا تھا' اگر صرف چار لفظوں میں سب کچھ بتا دیا جاتا تو ناصر کے ہوش و حواس پر بجلی گر جاتی۔

"تم بیٹھو تو سہی بیٹا۔" ماسی خیراں نے اس کو اپنے سے الگ کرتے ہوئے چارپائی پر بٹھایا۔ "سانس تو لو' سب سے ملاقات ہو جائے گی' یہ بتاؤ کہ تم رہے کہاں اتنے دنوں تک؟ کوئی خط بھی نہیں بھیجا..... کوئی اطلاع نہیں دی..... کوئی خبر نہیں..... کچھ نہیں....."

"خط.....؟" اس نے چونک کر کہا۔ "خط تو بھیجا تھا ماسی..... مسعود کے گھر کے پتے پر..... مسعود کے ابا کے نام....."

"نہیں....." ماسی خیراں نے جواب دیا۔ "یہاں کوئی خط نہیں آیا' تم لوگوں کا بھیجا ہوا کوئی خط یہاں نہیں ملا..... نہ یہاں نہ مسعود کے گھر..... مجھے اچھی طرح معلوم ہے اگر مسعود کے گھر کوئی خط آیا ہوتا تو ہم لوگوں کو ضرور معلوم ہوتا..... مسعود کے گھر والے تو خود برابر پوچھتے رہتے تھے۔"

"اوہ....." ناصر ایک دم بجھ سا گیا۔ وہ اب ان لوگوں کے کرب اور صدمے کو بخوبی محسوس کر سکتا تھا جو اتنے عرصے تک اس کی جانب سے بالکل بے خبر رہے تھے اور جنہیں اس کے بارے میں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ زندہ بھی ہے یا مر گیا۔ "تو ہمارا خط یہاں نہیں آیا؟"

"نہیں بیٹا۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "یہاں کوئی خط نہیں آیا' تم لوگوں کے بارے میں یہاں کسی کو کچھ نہیں معلوم..... تم دونوں کو کتنا ڈھونڈا گیا مگر تمہارا تو کوئی پتہ نہیں چلا

صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ تم دونوں کو بسوں کے اڈے کی طرف جاتے دیکھا گیا تھا' اور بس..... اس کے علاوہ تمہاری اور کوئی خیر خبر نہیں ملی۔"

"میں اور مسعود کراچی میں تھے ماسی خیراں۔" ناصر نے کہا۔ "ہم نے وہاں رہ کر کافی پیسے کمائے ہیں' میں حاجی کے قرضے کی رقم ساتھ لے کر آیا ہوں' اس کے منہ پر مار دوں گا' میں اب اس کا غلام بن کر نہیں رہوں گا' اس کے دس ہزار روپے دینے کے بعد بھی میرے پاس کافی روپے ہیں' وہ سب میں اماں کو دے دوں گا انہی کے لئے تو لایا ہوں' اماں کہاں ہیں ماسی خیراں؟"

"کیا مسعود بھی ساتھ آیا ہے؟" ماسی خیراں اس کے سوال کا جواب دینے سے گریز کر رہی تھی۔

"مسعود تو دوبئی چلا گیا ہے ماسی خیراں۔" ناصر نے کھنکتی ہوئی آواز میں کہا۔ "وہ وہاں اتنے پیسے کمائے گا کہ اس کے ابا نے کبھی خواب میں نہیں دیکھے ہوں گے' اس نے میرے ہاتھ پیسے اپنے گھر بھیجے ہیں پورے پندرہ ہزار تو حاجی کے قرضے کے ہیں اور اوپر سے کافی پیسے ہیں' سب اس کے گھر والوں کے لئے ہیں..... اماں کہاں ماسی؟ اماں' آپا اور سب لوگ.....؟ وہ محفوظ چاچا کے گھر میں رہنے والا ایک آدمی کہہ رہا تھا کہ اماں وزیر آباد میں رہ رہی ہیں وہ سب کو لے کر وزیر آباد چلی گئی ہیں۔"

"ہاں زمین وزیر آباد چلی گئی ہے۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "میں تمہیں اطمینان سے سب کچھ بتاؤں گی تم ذرا ہاتھ منہ دھو لو بلکہ نہا لو تاکہ تازہ دم ہو لو' میں تمہارے لئے چائے بناتی ہوں۔"

"تو..... تو..... اماں یہاں نہیں ہیں؟" ناصر ایک بجھ گیا اور اس کی پریشانی بڑھ گئی۔ "مگر وزیر آباد میں کون ہے جس کے ساتھ اماں رہ رہی ہیں؟ وزیر آباد میں تو ہمارا کوئی بھی نہیں ہے ماسی....."

"لمبا قصہ ہے بیٹا۔" ماسی خیراں نے اپنی آواز کو حتی المقدور پرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "میں تم کو سب کچھ بتا دوں گی مگر تم ذرا سانس تو لے لو' نہا لو میں چائے بناتی ہوں پھر بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کریں گے۔"

"سب لوگ خیریت سے تو ہیں نا ماسی؟" اس نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں..... ہاں..... تمہاری امی بالکل خیریت سے ہیں۔" ماسی خیراں نے جلدی سے کہا۔ اس نے جھوٹ اور سچ کے درمیان کی ایک راہ نکالی تھی۔ "اب تم جاؤ'



جلدی سے نہا لو۔"

ناصر نہانے چلا گیا اور ماسی خیراں ایک بہت بڑے اور بھیانک عذاب سے گزر رہی تھی' کہاں سے شروع کرے؟ بتانا تو تھا' سب کچھ بتانا تھا کچھ بھی چھپایا نہیں جا سکتا تھا اور چھپانے کی ضرورت بھی نہیں تھی اب جبکہ وہ واپس آ ہی گیا تھا تو اس کو کسی نہ کسی طرح تو سب کچھ معلوم ہو ہی جاتا..... کوئی نہ کوئی تو اس کو کچھ بتا ہی دیتا' کتنی لمبی' پیچیدہ المناک اور درد بھری داستان تھی' وہ اس کو کہاں سے شروع کرے؟ بتانا تو سب کچھ ہی تھا۔

ماسی خیراں نے فیصلہ کیا کہ وہ ناصر کو یہ نہیں بتائے گی کہ جنت کو دراصل مراد کی ماں نے جلا کر مار ڈالا تھا ایسا نہ ہو کہ وہ غضب ناک ہو کر کوئی ایسی حرکت کر بیٹھے جس سے خود اس کو بھی نقصان پہنچ جائے جو ہونا تھا' وہ ہو چکا تھا جنت اب زندہ تو نہیں ہو سکتی تھی اور منظوراں کو خود بھی یہ کام کر کے کیا مل گیا تھا؟ مراد کا آج تک کوئی پتہ نہیں تھا اور محمد یونس فالج کا شکار ہو کر گھر میں بستر پر پڑا ہوا تھا' سارا گھر ہی اجڑ کر رہ گیا تھا۔

ماسی خیراں نے ناصر کے لئے چائے تیار کر لی تھی اور اپنے آپ کو بھی تیار کر لیا تھا۔

ناصر کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہہ رہی تھیں اور وہ پھوٹ پھوٹ کر' سسک سسک کر' بلک بلک کر رو رہا تھا۔ ماسی خیراں اس کو سب کچھ بتا چکی تھی سوائے اس ایک بات کے کہ جنت کو اس کی ساس نے جلا کر مار ڈالا تھا اور یہ سب کچھ بتاتے ہوئی وہ خود بھی روتی جا رہی تھی' اس کی آنکھوں سے بھی بار بار آنسو بہہ نکلتے تھے۔

"یہاں اتنا سب کچھ ہو گیا اور مجھے تو کچھ خبر ہی نہیں ہوئی۔" ناصر نے روتے ہوئے کہا۔ "آپا مر گئیں' ابا ملے بھی اور مر بھی گئے' اماں نے دوسری شادی کر لی اور وزیر آباد چلی گئیں اور میں وہاں کراچی میں یہی سمجھتا رہا کہ گھر پر سب کچھ ویسا ہی ہو گا جیسا میں چھوڑ کر آیا تھا' مجھے تو کسی بات کی خبر ہی نہیں تھی میں سمجھ رہا تھا کہ میرا خط مل گیا ہو گا۔"

"یہاں تمہارا کوئی خط نہیں ملا تھا اور کسی کو بھی تم دونوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔" ماسی خیراں نے کہا۔ "اور بیٹا' سب کچھ ویسا ہی کس طرح رہ سکتا تھا؟ حاجی نے تو فوراً ہی دس ہزار کے بارہ ہزار بنا دیئے تھے اور وہ اپنی رقم کی فوری واپسی کا تقاضا کر رہا تھا زمین تو اپنی ساری جمع پونجی اکٹھا کر کے اس کے حوالے کرنے والی تھی پھر تمہاری بہنوں کے لئے اس کے پاس کچھ بھی نہ بچتا' اس موقع پر مراد نے اس کی مدد کی' خدا اس

کو زندگی دے' اس نے بہت بڑا کام کا' اس نے حاجی کا قرضہ ادا کر کے زمین کو آزاد کرا دیا اور جنت سے شادی کر لی..... مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔"

ماسی خیراں بولتی رہی اور ناصر خاموشی سے سر جھکائے' اس کی باتیں سنتا رہا' اس کی بھیگی ہوئی آنکھوں سے اکا دکا آنسو اب بھی لپک رہے تھے۔

"تو..... اماں نے دوسری شادی کر لی۔" بڑی دیر کے بعد ناصر نے خالی خالی' کھوکھلی اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "چلو' ان کی مرضی..... خدا کرے وہ خوش رہیں۔ میں دو ایک دن میں کراچی چلا جاؤں گا' تم یہ پیسے اماں کو بھجوا دینا کسی طرح....."

"نہیں بیٹا یوں نہیں۔" ماسی خیراں نے اس سے کہا۔ "تم خود چل کر زمین کو پیسے دینا' تمہارا انتظار کرتے کرتے تو اس کی آنکھیں تھک گئیں' تمہیں دیکھے گی تو اس کو نئی زندگی مل جائے گی' تم وزیر آباد چلو میں خود تم کو اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی۔ وہ سب لوگ تم کو دیکھ کر کس قدر خوش ہوں گے۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے۔"

"نہیں ماسی خیراں' اماں کو اب میری ضرورت نہیں ہے۔" ناصر نے شکستہ لہجے میں کہا۔ "انہوں نے دوسری شادی کر لی ہے اور نیا گھر بسا لیا ہے' میں اب وہاں جا کر کیا کروں گا۔" اس کا گلا رندھنے لگا اور وہ اس کے آگے کچھ اور نہ کہہ سکا۔

"بات سمجھنے کی کوشش کرو ناصر بیٹے۔" ماسی خیراں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "زمین نے جو کچھ کیا' وہ ٹھیک کیا' وہ اس شادی کے لئے تیار نہیں تھی لیکن خود میں نے اس پر زور دیا کہ وہ مہر علی کا پیغام قبول کر لے' ذرا سوچو..... ایک بیوہ عورت' تین چھوٹی بچیوں کا ساتھ..... اکیلی جان کمانے والی..... ڈھلتی ہوئی عمر..... بچیوں کے سر پر کوئی ہاتھ رکھنے والا نہیں۔ ایک بیٹا سو وہ برسوں سے لاپتہ..... تو ان حالات میں اگر زمین کو ایک مضبوط سہارا مل رہا تھا تو اس کو قبول کر کے اس نے کیا غلطی کی؟ تمہاری تو کوئی خبر ہی نہیں تھی اور میں تم کو سچ بتاتی ہوں' مہر علی کا پیغام قبول کرنے سے پہلے اس نے مجھ سے کتنی بار تمہارا ذکر کیا' وہ بار بار یہی کہتی تھی کہ اگر تم یہاں موجود ہوتے تو اس کو ایسا کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تھی اور پھر..... بیٹا' مہر علی بہت اچھا آدمی ہے' تم اس سے ملو گے تو بہت خوش ہو گے اور وہ بھی تم سے مل کر بہت خوش ہو گا۔"

ماسی خیراں نے ناصر کو سمجھا بجھا کر اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اپنی ماں اور بہنوں



سے ملنے کے لئے اس کے ساتھ وزیر آباد چلے۔ ناصر اس شرط کے ساتھ راضی ہوا تھا کہ وہ ماسی خیراں کے ساتھ وزیر آباد جائے گا اور پھر وہاں صرف ایک دن رہ کر اسی کے ساتھ واپس سیالکوٹ آ جائے گا اور یہاں سے کراچی روانہ ہو جائے گا۔ ماسی خیراں نے اس کی ہر بات مان لی۔

اسی روز شام کے وقت ناصر' ماسی خیراں کے ساتھ مسعود کے گھر گیا۔ ماسی خیراں نے خود ہی اس سے کہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ چلے گی' مسعود کے گھر میں اس وقت سبھی لوگ موجود تھے۔

"تم.....؟" امتیاز اس کو دیکھتے ہی اچھل پڑا۔ "تم..... تم ناصر ہو نا؟ ناصر..... ہو نا....."

"ہاں چاچا۔" ناصر نے آہستہ سے کہا۔ "میں ناصر ہوں..... مسعود نے پیسے بھجوائے ہیں۔" اس نے فریدہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ جو بڑی غصیلی اور نفرت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"پیسے؟" ناصر کی بات سنتے ہی فریدہ ایک دم چونک پڑی' اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی خشونت اور کرختگی ایک دم غائب ہو گئی اور اس کی آنکھیں کسی اندرونی جذبے سے چمکنے لگیں۔ "مسعود نے پیسے بھجوائے ہیں؟ کہاں ہیں؟ کتنے ہیں؟"

"پندرہ ہزار روپے تو حاجی مدد علی قریشی کے قرضے کے ہیں۔" ناصر نے کہا۔ "اور یہ اوپر سے....." اس نے اپنی جیب میں سے رقم نکال کر مسعود کے باپ امتیاز کی طرف بڑھائی۔

"مگر مسعود خود کہاں ہے؟ مسعود کہاں ہے؟" امتیاز سخت اضطراب و ہیجان کے عالم میں بار بار پوچھ رہا تھا۔ ناصر نے جو رقم اس کے ہاتھ میں دی تھی وہ جلدی سے فریدہ نے اپنے ہاتھ میں لے لی اور گننے لگی۔ "تم لوگ کہاں تھے اتنے عرصے تک؟ مسعود کے پاس یہ پیسے کہاں سے آئے؟" امتیاز ایک ہی سانس میں سب کچھ پوچھ لینا چاہتا تھا۔

"ہم لوگ کراچی میں تھے چاچا۔" ناصر نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "ہم وہاں کام کرتے رہے تھے' ہم نے یہاں خط بھیجا تھا مگر ماسی خیراں نے بتایا کہ تم لوگوں کو ہمارا کوئی خط نہیں ملا' ہم یہاں سے کراچی چلے گئے تھے اور وہاں کام کر رہے تھے' مسعود اب دوبئی میں ہے' اسے دوبئی میں نوکری مل گئی ہے۔"

"دوبئی میں نوکری.....؟" فریدہ کی آواز ایک مسرت آمیز چیخ میں بدل گئی اور

اس کا چہرہ ایک دم کھل اٹھا۔ "مسعود دوبئی میں ہے؟ پھر تو وہ وہاں بہت پیسے کمائے گا۔ وہ..... وہ یہاں پیسے بھیجے گا کیا؟"

"ضرور بھیجے گا۔" ناصر نے کہا۔ "وہ مجھ سے کہہ کر گیا تھا کہ وہ اپنے گھر پیسے بھیجتا رہے گا۔"

"لیکن..... ابھی تک تو اس نے کچھ بھی نہیں بھیجا۔" فریدہ نے بے تابی کے ساتھ کہا۔

"اسے گئے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے۔" ناصر نے قدرے بیزاری کے ساتھ کہا۔ "جب اس کو تنخواہ ملنی شروع ہو گی تو پھر وہ گھر پیسے بھیجے گا۔"

فریدہ کی آنکھوں کی چمک اور بڑھ گئی اسے نہیں معلوم تھا اور نہ ہی اس کو اور امتیاز کو کبھی یہ معلوم ہو سکا کہ مسعود تو اس تاریک دنیا کا ایک حصہ بن چکا تھا جہاں پہنچ کر روشنی کی کرن دم توڑ دیتی ہے اور اجالے کی کوئی رمق پلٹ کر واپس نہیں آتی۔

"کم از کم ہم لوگوں سے مل کر تو جاتا۔" امتیاز احمد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "دبئی چلا گیا' اب خدا جانے کب آئے گا۔"

"ارے کام کر رہا ہے وہاں' نوکری کر رہا ہے۔" فریدہ نے اس کو تقریباً ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "پیسے بھیجے گا وہاں سے اور پھر جب نوکری سے چھٹی ملے گی تو یہاں آ بھی جائے گا۔ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟"

فریدہ کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا جبکہ امتیاز احمد کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

"اب تم کھانا کھا کر جانا بیٹے' اور ماسی خیراں تم بھی....." اچانک فریدہ پر ان لوگوں کی محبت پھٹ پڑی تھی اور ان لوگوں کی جانب اس کا رویہ ایک دم بدل گیا تھا۔

"نہیں چاچی۔" ناصر نے کہا۔ "میں بس اب چلوں گا تم لوگوں کو مسعود کی امانت پہنچانی تھی' سو پہنچا دی۔"

"بیٹا' مسعود خیریت سے تو ہے؟" امتیاز احمد نے پوچھا۔ "کچھ دیر تو بیٹھو..... مجھے اس کے بارے میں بتاؤ' اور اپنے بارے میں بھی تم لوگ کراچی میں کیا کرتے رہے..... وہاں کیا کام کرتے تھے' کہاں رہتے تھے..... اور مسعود دوبئی کیسے چلا گیا؟ وہاں جانا تو بہت مشکل ہوتا ہے۔"

ناصر اور ماسی خیراں نے کھانے سے انکار کر دیا تھا اور فریدہ نے فوراً ہی اپنی بڑی بیٹی سے کہا کہ وہ چائے کا پانی چولہے پر چڑھا دے۔ وہ خود وہاں سے اٹھ کر نہیں جانا چاہتی



تھی۔ مسعود کی ذات میں اس کی دلچسپی ایک دم بڑھ گئی تھی اور اب وہ اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی خواہشمند تھی۔

ناصر نے امتیاز کو اختصار کے ساتھ اپنی اور مسعود کی کراچی کی زندگی کے بارے میں بتایا۔ امتیاز احمد کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ ناصر نے اس کو یہ نہیں بتایا کہ مسعود جعلی کاغذات پر کسی اور کے بیٹے کی حیثیت سے دوبئی گیا ہے۔

"یہاں سے ہو کر جاتا تو اچھا ہوتا۔" امتیاز احمد کی آواز بار بار بھرائی جاتی تھی۔

"تنخواہ کتنی ملے گی مسعود کو؟" فریدہ نے بے تابانہ انداز میں پوچھا۔

"مجھے معلوم نہیں۔" ناصر نے کہا۔ "لیکن ظاہر ہے کراچی کے مقابلے میں بہت زیادہ ملے گی۔"

ذرا دیر میں فریدہ کی بیٹی چائے بنا کر لے آئی۔ اس دوران امتیاز احمد اپنے بیٹے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ باتیں پوچھتا رہا۔

"اب سال بھر سے پہلے تو کیا آ سکے گا۔" اس نے دوران گفتگو بڑی اداسی کے ساتھ کہا۔

"جب بھی آئے گا' ڈھیروں پیسے لے کر آئے گا۔" فریدہ نے کہا۔ ناصر کچھ نہیں بولا۔ چائے ختم کرنے کے بعد وہ جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم اب سیالکوٹ میں رہو گے یا وزیر آباد جاؤ گے؟" فریدہ نے محتاط انداز میں اس سے سوال کیا اور ناصر پر جیسے کسی نے اچانک بہت سارا ٹھنڈا پانی ڈال دیا۔

"میں کراچی جاؤں گا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ اور ماسی خیراں کے ساتھ باہر نکل گیا۔

گھر واپس آنے کے بعد ناصر نے ماسی خیراں کے سامنے اپنا سوٹ کیس کھولا اور اس میں سے نکال نکال کر وہ چیزیں اسے دکھائیں جو وہ سب لوگوں کے لئے لے کر آیا تھا۔

"یہ میں آپا کے لئے لایا تھا۔" اس نے جنت کے لئے لائی ہوئی چیزیں ماسی خیراں کو دکھاتے ہوئے کہا اور ایک دم رونے لگا۔ ماسی خیراں خاموشی کے ساتھ دیکھتی رہی اس کی اپنی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ "یہ میں مراد کے لئے لایا تھا۔ اور یہ..... اماں کے لئے..... یہ نصرت کے لئے..... یہ صغرا کے لئے..... یہ کلثوم کے لئے اور ماسی خیراں..... یہ..... تمہارے لئے....."

"میرے لئے؟" ماسی خیراں کی آنکھیں ایک دم چمک اٹھیں اور اس کے چہرے پر

روشنی سی پھیل گئی۔ "میرے لئے؟ تم میرے لئے لائے ہو؟ میرے لئے؟"

"ہاں ماسی خیراں میں کسی کو نہیں بھولا۔" ناصر کی آواز بھرا رہی تھی۔ "میں بھلا کسی کو بھول بھی کیسے سکتا ہوں' تم سب تو میرے اپنے ہو..... کوئی اپنوں کو بھی بھول سکتا ہے؟"

"جیتا رہے میرا بچہ' خدا تیری عمر دراز کرے۔" ماسی خیراں نے اس کو تہہ دل سے دعائیں دیتے ہوئے کہا۔ "تُو نے پردیس میں بھی مجھ کو یاد رکھا۔ میں نے بھی تیری سلامتی اور تندرستی کے لئے اور تیری واپسی کے لئے بہت دعائیں مانگی ہیں بیٹے۔"

"تم لوگوں کی دعاؤں سے ہی تو میں اچھا رہا ماسی۔" ناصر نے کہا اور پھر اس نے وہ ساری رقم جو وہ اپنی ماں کے لئے لایا تھا' ماسی خیراں کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "اسے اپنے پاس رکھ لو ماسی خیراں' کل اماں کو دے دیں گے۔"

ماسی خیراں نے وہ رقم اپنے پاس رکھ لی یہ طے پایا تھا کہ وہ لوگ اگلی صبح ہی وزیر آباد کے لئے روانہ ہو جائیں گے اور ایک دن وہاں گزار کر دوسے دن سیالکوٹ واپس آ جائیں گے جہاں ایک دن کے قیام کے بعد ناصر کراچی کے لئے روانہ ہو جائے گا۔

ناصر' ماسی خیراں کے گھر سے صرف مسعود کے گھر گیا تھا اور بس..... پھر وہ کہیں بھی نہیں گیا وہ گھر سے باہر ہی نہیں نکلا' اتنے بہت سارے لوگ تھے' دوست تھے جن سے ملاقات کے بارے میں وہ راستے میں سوچتا ہوا آیا تھا..... لیکن اب وہ کسی سے بھی ملنا نہیں چاہتا تھا' سب لوگ اس کے لئے اجنبی ہو گئے تھے اور ان سب لوگوں کے لئے اجنبی ہو گیا تھا' وہ تو بس یہاں سے سیدھا کراچی بھاگ جانا چاہتا تھا۔

"ابا کی اور آپا کی قبروں پر ضرور جانا ہے۔" وہ دل میں سوچ رہا تھا۔ "بس وزیر آباد سے واپس آؤں گا تو ان دونوں کی قبروں پر حاضری دوں گا اور پھر اس کے بعد کراچی واپس چلا جاؤں گا۔"

رات کو بہت دیر تک وہ اور ماسی خیراں ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ ماسی خیراں کبھی کراچی نہیں گئی تھی۔ وہ کراچی کے بارے میں بڑی حیرت اور ذوق شوق کے ساتھ سب کچھ سن رہی تھی' ناصر کی باتوں سے تو اسے کراچی کوئی جادو کا شہر لگتا تھا اور ناصر' ماسی خیراں سے یہاں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ باتیں پوچھ لینا چاہتا تھا۔

اگلے دن وہ دونوں صبح ہی بس سے وزیر آباد کے لئے روانہ ہو گئے ناصر نے رقم پہلے ہی ماسی خیراں کو دے دی تھی اور اس نے اس کو بڑی احتیاط کے ساتھ اپنے کپڑوں



میں چھپا کر رکھ لیا تھا۔ خاصی بڑی رقم تھی۔

"میں کتنی جلدی واپس کراچی چلا جاؤں گا۔" ناصر بڑی گہری افسردگی کے ساتھ سوچ رہا تھا۔ "صابر چاچا اور حنیفہ چاچی کو تو اس کی بالکل ہی توقع نہیں ہو گی کہ میں صرف چند دن کے اندر ہی اندر واپس آ جاؤں گا..... مگر میں ان سے کیا کہوں گا؟ کیا بتاؤں گا ان کو اپنے گھر والوں کے بارے میں؟ کیا میں ان سے یہ کہوں گا کہ میری ماں نے دوسری شادی کر لی اور اپنے نئے شوہر کے ساتھ سیالکوٹ سے وزیر آباد چلی گئی؟ نہیں..... نہیں..... یہ سب کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے' میں ان لوگوں کو آپا کی شادی اور موت کے بارے میں بتا دوں گا' ابا کی بازیابی اور موت کے بارے میں بتا دوں گا اور اماں کے بارے میں..... اماں کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا..... بس یہ کہہ دوں گا کہ وہاں سیالکوٹ میں میرا دل نہیں لگا..... ہاں' بس یہ ٹھیک ہے یہی کہہ دوں گا میرا دل نہیں لگا اور میں جلدی ہی کراچی واپس آ گیا..... اماں تو بہت روک رہی تھیں۔"

اور یہ سب کچھ سوچتے سوچتے اس کی آنکھیں ایک بار پھر بھیگنے لگیں۔

تنہائی کا بڑا شدید احساس تھا جو اس کو کھائے جا رہا تھا۔ وہ اچانک ہی خود کو بالکل تنہا محسوس کرنے لگا تھا اور اس وقت اسے بڑی شدت کے ساتھ مسعود کی یاد آ رہی تھی کاش مسعود اس کے ساتھ موجود ہوتا تو وہ خود اس کو اس قدر تنہا نہیں پاتا' اب وہ جب کراچی واپس جائے گا تو وہاں بھی اس کو مسعود کے بغیر تنہا رہنا پڑے گا وہ تو یہاں بھی تنہا ہے اور وہاں بھی تنہا ہو گا' اف خدایا..... کیسی خوفناک تنہائی تھی..... اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔

اچانک بس ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی' وزیر آباد اب بس تھوڑے سے فاصلے پر رہ گیا تھا' دو جیپوں نے اِدھر اُدھر سے آ کر بس کا راستہ روک لیا اور ان میں سے جدید وضع کے آتشیں ہتھیاروں سے لیس کئی آدمی کود کود کر نیچے آ گئے۔ ان میں سے ایک نے سب سے پہلے ڈرائیور کو اتار لیا اور پھر سارے مسافروں کو نیچے اتار دیا۔ ڈاکوؤں کے ہاتھوں میں گنیں تھیں اور وہ باربار مسافروں کو دھمکی دے رہے تھے کہ اگر کسی نے مزاحمت کی تو اس کو بھون کر رکھ دیا جائے گا۔

مسلح ڈاکوؤں نے مسافروں کو دو قطاروں میں کھڑا کر دیا اور پھر وہ ان کی جیبوں میں سے نقد رقم' ان کی گھڑیاں اور دیگر چیزیں چھیننے لگے۔ دو مسلح ڈاکو لوگوں کے سامان وغیرہ کی تلاشی میں مصروف ہو گئے۔ ڈاکو' عورتوں کے زیورات بھی اتروا رہے تھے' سہمی ہوئی

خوف زدہ عورتیں جلدی جلدی اپنے زیورات وغیرہ اتار اتار کر ڈاکوؤں کے حوالے کر رہی تھیں' موت کے خوف سے ان کے چہرے زرد ہوئے جا رہے تھے۔

ماسی خیراں کے جسم پر کوئی زیور نہیں تھا' اپنے لباس اور وضع قطع سے بالکل غریب نظر آنے والی اس بوڑھی عورت کے کانوں میں چاندی کے پتلے پتلے تاروں کی دو بالیاں پڑی ہوئی تھیں جو بالکل بے قیمت تھیں اور ڈاکوؤں نے انہیں نظرانداز کر دیا۔

ایک ڈاکو نے ناصر کے ہاتھ پر بندھی ہوئی گھڑی اتروالی جو ناصر نے فوراً ہی اس کے حوالے کر دی۔ "اور کیا ہے تیرے پاس؟" اس نے ڈپٹ کر ناصر سے پوچھا۔

"کچھ تھوڑے سے پیسے ہیں۔" ناصر نے لرز کر کہا اور اپنا ہاتھ جیب میں ڈال کر رقم نکالنے لگا اس کی جیب میں چند سو روپے تھے باقی ساری رقم تو ماسی خیراں کے پاس تھی۔ اسی وقت اگلی لائن میں ایک آدمی جو ناصر کے عین سامنے تھا۔ مزاحمت کرنے لگا شاید اس کے پاس بہت زیادہ رقم تھی' اس آدمی نے لائن میں سے نکل کر بھاگنے کی کوشش کی۔

ڈاکو نے فوراً فائر کھول دیا اور بھاگنے کی کوشش کرنے والے اس آدمی پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی' گولیاں صرف اس آدمی کے ہی نہیں لگیں دو اور آدمی بھی فائرنگ کی زد میں آ گئے' ان میں سے ایک ناصر تھا' اس کے ہاتھ میں سو سو روپے کے جو نوٹ تھے' وہ اس کے خون میں تر ہو گئے' ایک ڈاکو نے جلدی سے وہ نوٹ اس کے ہاتھ سے چھین کر اپنی جیب میں ٹھونسے اور ایک ٹھوکر سے اس کے نیم مردہ جسم کو ایک طرف سرکا دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ڈاکو اپنا کام ختم کر کے لوٹ کا سارا مال جمع کر کے جیپوں میں بیٹھ کر اطمینان سے وہاں سے روانہ ہو گئے۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر پولیس پارٹی لوٹ کے مال کا جائزہ لینے اور اس کی مالیت کا اندازہ لگانے کے لئے موجود تھی' ڈاکو اپنے پیچھے تین لاشیں چھوڑ گئے تھے' ان میں سے ایک لاش ناصر کی تھی۔

☆=====☆=====☆

وزیر آباد میں مہر علی کے گھر میں سفید کفن میں لپٹی ہوئی ناصر کی لاش ایک چارپائی پر پڑی ہوئی تھی اور زمین سکتے کے عالم میں اس چارپائی کی پٹی پر اپنا سر ٹکائے ہوئے بیٹھی تھی' تینوں بچیاں اس کے پاس بیٹھی تھیں' مہر علی کچھ فاصلے پر خاموش کھڑا ہوا تھا۔

ناصر کی لاش' اس کی موت کے بعد دوسرے دن ہی اسپتال سے مل سکی تھی جہاں دوسری دو لاشوں کے ساتھ اس کا بھی پوسٹ مارٹم کیا گیا تھا۔

ناصر نے اپنا قرض ادا کر دیا تھا ماسی خیراں نے اس کی دی ہوئی رقم کو جسے وہ ڈاکوؤں



سے بچانے میں کامیاب ہو گئی تھی' زیبن کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "اس نے اپنا قرضہ ادا کر دیا زیبن..... اب اس سے کوئی شکوہ نہ کرنا۔" اور زیبن دھاڑیں مار مار کر رونے لگی تھی۔ جنت' گامو اور اب ناصر..... وہ دیوانگی کے عالم میں اپنا سینہ پیٹ رہی تھی اور اپنے سر کے بال نوچ رہی تھی۔ کتنے دکھ..... کتنے دکھ ابھی اور قسمت میں لکھے ہیں؟ کیا ان دکھوں کا کوئی انت ہے یا نہیں؟ آخر کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی جگہ پہنچ کر تو وہ حد آ ہی جاتی ہو گی جہاں سرے دکھوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے..... شاید اسی حد کو موت کہتے ہیں۔

اور پھر' جب وحشی اور خوفناک طوفان ذرا تھما تو زیبن ایک نئی بات سوچنے لگی۔ وہ اس نئے وجود کے بارے میں سوچنے لگی جو اس کے اپنے وجود کے اندر پرورش پا رہا تھا۔ کیا خبر اس کی کوکھ میں پرورش پانے والا بچہ بیٹا ہی ہو..... اور وہ ایک اور ناصر کو جنم دے سکے..... دکھوں کے گہرے اندھیرے میں امید کی ایک ٹمٹماتی ہوئی کرن اس کے حریم جاں کو اجالا بخشنے لگی۔

☆====ختم شد=====☆